خدا بخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۹۰ — ۹۲

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ

۹۰-۹۲

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۳۳۴۲۴/۷۷

شمارہ: نوے - بانوے

سالانہ: ۳۰۰ روپے

۶۰ ڈالر ایشیا، ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک

اس شمارہ کی قیمت پچھتر روپے

۱۹۹۲ء

مصطفےٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، دہلی میں چھپوا کر، خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

اردو رسائل ۱۹۹۳ء میں

نصف اوّل

پیشگفتار

خدابخش لائبریری میں اردو کے قدیم رسائل کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ان تمام قدیم رسائل کی فہرست ماہ و سال کی تفصیلات کے ساتھ جلد ہی شائع کی جا رہی ہے۔

خدابخش میں محفوظ سارے قدیم رسائل کے مشتملات کے اشاریے بھی بنا دیے گئے ہیں۔ جن رسالوں کے اشاریے مکمل ہو چکے ہیں ان کی تعداد چھ سو کے قریب ہے۔ اب ان سب کے اندراجات کو موضوع وار بانٹا جا رہا ہے تاکہ ایک موضوع پر رسائل میں چھپی پوری دولت سے اردو ادب کے طالب علم بیک نظر بہ سہولت مستفیض ہو سکیں۔ موضوع وار اشاریے تقریباً پچاس جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

● اس صدی کے آخری ربع میں اردو رسائل میں کیا اہم تحریریں آتی رہیں' ۱۹۷۶ سے اس کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ ایسی تمام تحریروں کے اشاریے بنائے جاتے رہیں۔ ایک سال کا ایک ایسا ہی خدابخش اشاریہ مکتبہ جامعہ نے مدت ہوئی شائع کر دیا تھا۔ اب دس سالہ اشاریہ اشاعت کے لیے پریس جا رہا ہے۔ جو صدی کے آخری ربع کے پہلے دس سال کے رسائل کے مشتملات کا انڈکس ہے۔

○

صدی تقریبات کا زمانہ گزر رہا تھا کہ ایک خیال یہ بھی آیا کہ خدابخش صدی تقریبات کے بعد اردو رسائل کی کیا صورت حال ہے' ۱۹۹۲ء میں کون کون سے رسالے نکل رہے ہیں' اس کا ایک ایسا اشاریہ بن جائے جو ہر رسالے کے پورے کردار کو روشناس کرا دے' چنانچہ "اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں" کے تحت سارے ماہنامے' سہ ماہی اور سالنامے جو لائبریری میں آتے ہیں' بے بغیر کسی امتیاز کے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی' متعلقہ صفحات کا عکس لے لیا گیا' ساتھ ہی ان رسالوں میں جو اہم تحریریں شائع ہوئیں ان میں کا ایک حصہ اس پیشکش میں ضمیمے کے طور سے شامل کیا گیا۔

اردو میں اس وقت ڈھائی تین سو کے قریب ایسے رسائل نکل رہے ہیں ان میں ۱۹۹۲ء کے جو پرچے ہمیں میسر آ سکے ان کی تعداد دو سو سے زیادہ نکلی۔ ان رسالوں میں شمع' بیسویں صدی جیسے رسائل بھی شامل ہیں؛ بہار رنگ' خاتون مشرق جیسے بھی؛ اور معارف' غالب نامہ' افکار' نقوش اور فنون بھی۔ کچھ رسالے ہمیں نہ مل سکے مثلاً ابتدائی تعلیم (لاہور)' تعلیمی زاویے (لاہور)' مغربی بنگال' ہلال' البشریٰ' سرخیج' نامہ بر' خبر نامہ ہریانہ اردو اکیڈمی' اور اسلام اور عصر جدید وغیرہ۔ ان کا ہمیں افسوس رہا۔ امید تھی ۱۹۹۲ء کے رسائل کا احاطہ کرتے کرتے ان میں سے بھی کچھ مل جائیں گے۔ کچھ نہ کچھ مل بھی گئے!

'اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں' کی اشاعت کے بعد 'اردو رسائل ۱۹۹۳ء میں' پیش خدمت ہے۔ ۱۹۹۳ء کی یہ پیشکش دو حصوں میں ہوگی۔ پہلے حصے میں جنوری۔جون' اور' دوسرے میں جولائی۔دسمبر کے رسائل شامل کیے گئے ہیں

۱۹۹۲ء کے رسائل کیلیے ایسا کیا گیا تھا کہ جتنے پرچے بھی برصغیر سے یا کہیں باہر سے ہمیں میسر آئے یا جن کے بارے میں ہمیں اطلاع مل سکی، ایک بھرپور فہرست بنانے کے لیے ہم نے اُن سب کے ایک/دو/تین متعلقہ صفحات لے لیے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد دو سو سے کچھ اوپر تھی۔ اب ۱۹۹۲ء کے ایسے پرچے جو اُس وقت ہمیں نہیں مل پائے تھے، بلا لحاظ اس کے کہ وہ کس درجے کے ہیں ہم نے انہیں پیش نظر ۱۹۹۳ء کی فہرست میں بطور تتمہ شامل کرلیا ہے۔ ان میں سے کچھ ۱۹۹۲ء کے ہیں جو ہمیں اس وقت میسر نہ آسکے تھے اور کچھ ایسے ہیں جو ہیں تو ۱۹۹۲ء کے' لیکن شائع ہوئے ۱۹۹۳ء میں۔ اس طرح ۱۹۹۳ء میں اردو رسائل کی تعداد دو سو پچاس تک پہنچ گئی ہے۔ یہ وہ پرچے ہیں جو ہمیں میسر آسکے۔(۱۹۹۲ء میں یہ تعداد ۲۰۴ تھی)۔

ریکارڈ کو مکمل کرنے کے لیے، خاص کر اس واسطے کہ پیش نظر جلد کے قاری کو بھی ایک مکمل فہرست فوری طور سے دستیاب رہے، ہم نے مناسب سمجھا کہ ۱۹۹۲ء کی مکمل فہرست کو اس جلد میں دوہرا دیا جائے۔ یہ آخر میں لگائی جا رہی ہے۔

۱۹۹۳ء میں جن رسائل کو علمی ادبی ریسرچ کے سلسلے میں زیادہ کارآمد پایا گیا' ان کی مکمل فہرستیں دی جا رہی ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں محض کسی ایک مہینے کے شمارے کی فہرست دیدی گئی تھی، لیکن اب اہم رسائل کے تمام شماروں کی فہرستیں دی گئی ہیں۔

ترتیب کے آخر میں تین ضمیمے ہیں:

ضمیمہ ۱ کے تحت کچھ مضامین پیش کیے گئے ہیں، ان میں اس بات کا التزام نہیں رکھا گیا ہے کہ یہ مضامین اُنہیں مجلات سے ماخوذ ہوں جن کی مکمل فہرستیں دینا ہم نے ضروری سمجھا ہے۔

ضمیمہ ۲ میں کچھ منتخب مضامین کی ایک فہرست دی گئی ہے' اس کا مقصد ان مضامین سے محض روشناس کرانا ہے، تاکہ دلچسپی رکھنے والوں کو اس کی اطلاع رہے اور اگر وہ ان تحریروں سے استفادہ کرنا چاہیں تو شماروں کے حوالے سے ان تک پہنچ سکیں۔

ضمیمہ ۳ کے طور سے ۱۹۹۲ء کے رسائل کی فہرست دی جا رہی ہے تاکہ ۱۹۹۳ء کے قاری کے سامنے پوری تصویر رہے۔

ــــــــ عرب

فہرست

تتمہ

وہ رسائل جو ۱۹۹۲ء کی فہرست میں شامل نہ ہو پائے

ضمیمہ۔۱

دانشوری (ادبی)

دانشوری (تہذیبی)

دانشوری (مذہبی)

دانشوری (شعری)

دانشوری (پاکستان)

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء

شخصیات (۱)

شخصیات (۲)

اقبال

تذکرہ شعرا (ادب و صحافت)

کتابیں / مخطوطات

ترتیب

ترتیب

ترتیب

"آثار جدید" (مئو) جون ۱۹۹۳ء

ترتیب

آج کراچی

بہار ۱۹۹۳



ترتیب : اجمل کمال

خصوصی شمارہ : عربی کہانیاں

توفیق الحکیم عبدالسّلام العُجیلی زکریا تامر محمد براّدا
علیفہ رفعت حنان شیخ بہاء طاہر محمود دیاب
ابراہیم الکونی یوسف ادریس یوسف شارونی ادوّرد الخرّاط
طیّب صالح نبیل جورجی محمد خضیّر غسّان کنفانی

آج کی کتابیں

ترتیب

آج کل نئی دہلی

جنوری ۱۹۹۳ء

ترتیب

فروری ۱۹۹۳ء

ترتیب

مارچ ۱۹۹۳ء

ترتیب

اپریل ۱۹۹۳ء

ترتیب

مئی ۱۹۹۳ء

ترتیب

جون ۱۹۹۳ء

ترتیب

لوحِ آگہی

جنوری ۱۹۹۳ء

آموزگار

جلد : ۱۲ جنوری ۱۹۹۳ء شمارہ : ۱

ماہنامہ آموزگار

جلد ۱۲ — شمارہ ۲
فروری ۱۹۹۳ء

فہرست

ماہنامہ آموزگار

جلد ۱۲ شمارہ ۳
مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست

آموزگار (بھاگلپور) جون ۱۹۹۳ء

اخبار اردو (اسلام آباد)

جلد: ۱۰ شمارہ: ۱

جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست

★

فروری ۱۹۹۳ء

جلد: ۱۰

شمارہ: ۲

....

فہرست

....

★

مارچ ۱۹۹۳ء

جلد: ۱۰

شمارہ: ۳

....

فہرست

....

★

اپریل ۱۹۹۳ء
جلد: ۱۰
شمارہ: ۴

فہرست

جلد: ۱۰
شمارہ: ۵
مئی ۱۹۹۳ء

فہرست

جلد: ۱۰
شمارہ: ۶
جون ۱۹۹۳ء

فہرست

ادبیات (اسلام آباد) ۲۲۶ بہار ۱۹۹۲ء

فہرست

ارتقا مطبوعات

ادارہ

حسن عابد
واحد بشیر
فقیر محمد لاشاری
راحت سعید

معاونین

نوشابہ زبیری زیبا علوی

مجلس مشاورت

پروفیسر ممتاز حسین فارغ بخاری عبداللہ ملک عبداللہ جان جمالدینی
رضا ہمدانی جعفر اچکزئی خالد علیگ محمد علی صدیقی اسلم رسولپوری
عبدالرحمن نقاش شاہد نقوی

علمی ادبی کتابی سلسلہ نمبر۔۸

پہلا ایڈیشن	فروری ۱۹۹۳ء
تعداد	ایک ہزار
سرورق	انور سمیع
مطبع	رنگین پریس۔ اقبال سینٹر۔ ایم اے جناح روڈ۔ کراچی
ناشر	ارتقاء مطبوعات A/10 ولایت آباد نمبر۲ منگھوپیر روڈ۔ کراچی۔ ۲۹
قیمت	۳۰/- روپے
زر سالانہ	پاکستان: سو روپے۔ بیرونی ممالک: پندرہ امریکی ڈالر
دائمی خریداری	پاکستان: ایک ہزار روپے۔ بیرونی ممالک: ایک سو پچاس امریکی ڈالر

تقسیم کار
ووکس بک سینٹر
۱۰۹ بمبئی ہوٹل۔ آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی

فہرست

ارتقاء سیمینار

موضوع: اشتراکیت کا بحران۔ نظریہ اور عمل

سائنس اور سماجیات

نثری ادب

افسانے

شاعری

گوشۂ عصمت چغتائی — ۲۷۵

بین الاقوامی ادبی دنیا میں اردو کا معتبر جریدہ

URDU INTERNATIONAL

ترتیب

۳ حرفِ آغاز
۴ اس ماہ کی شخصیت ۔ عرفانہ عزیز

حمد و نعت

دنیا مرے آگے

شعر و سخن

افسانے

۲۸ خبریں گھر گھر کی

۸۰ بزمِ خیال

سرورق — مصور

اردو ڈائجسٹ — جنوری ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

بابری مسجد کی شہادت

انارکلی میں جناح ایشین

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

کینگرو دیس میں

جب میں نے اپنے رب کو پکارا

ایک شمارے سے

کینسر

حضرت لوط علیہ السلام

گیلی پولی کا تاریخی معرکہ

آئیوری کوسٹ کا شیطان

ایک شمارے سے

بابل کی غیر مقدس جنگ

دنیا کی آخری جنت

فرمان

ایک صدی کی داستان

اس شمارے میں

شورش کی دلخراش صورت

فطرت کی بیٹی

پیشگوئیاں شاہ نعمت کی

مَیں میکانگ صوں

اس شمارے میں

پاکستان میں حکومتوں کی تبدیلیاں

امریکی ایٹم بموں کا نشانہ ۔۔۔ جاپان ۔۔۔

اس شمارے میں

جلد ۱ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۹۳ء

مدیر: وصی سلیمان ندوی

ماہنامہ

ارمغان شاہ ولی اللہ

مطابق رجب ۱۴۱۳ھ

مجلس مشاورت

○ مولانا محمد کلیم صدیقی ناظم کل ہند جمعیۃ شاہ ولی اللہ ——
○ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی ——
○ مولانا رضی الدین قاسمی پھلتی ——
○ مولانا عبد الحسیب ندوی ——

زر تعاون

فی شمارہ ...... ۳ روپئے
سالانہ ...... ۳۰ روپئے
بیرونی ممالک سے ... ۵ ڈالر

خط و کتابت کا پتہ

دفتر ارمغان
پھلت ضلع مظفر نگر
یوپی ۲۵۱۲۰۱

پرنٹر پبلشر محمد ادریس قریشی نے ستی زن پریس سرور گیٹ مظفر نگر سے چھپوا کر جمعیۃ ولی اللہ پھلت کیلئے شائع کیا —

فہرست عنوان

اسباق (پونہ)، فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء

شمارہ کار

اسباق (پونہ)، مئی ۹۳ء، جنوری ۱۹۹۴ء

شمارہ کار

غزلیں

• [illegible] • مظفر حنفی • اکبر حمیدی • [illegible] • سید معراج جامی
• [illegible] • [illegible] • [illegible] • [illegible] • [illegible]
• [illegible] • [illegible] • [illegible] • [illegible] • [illegible]
[illegible] • [illegible] • [illegible] • [illegible] • [illegible]

• [illegible]
• تبصرے • [illegible]

ماہنامہ
اشراق

جلد ۵	شمارہ ۱
جنوری	۱۹۹۳
رجب	۱۴۱۳

جلد ۵	شمارہ ۲
فروری	۱۹۹۳
شعبان	۱۴۱۳

جلد ۵	شمارہ ۳
مارچ	۱۹۹۳
رمضان	۱۴۱۳

جلد ۵	شمارہ ۴
اپریل	۱۹۹۳ء
شوال	۱۴۱۳ھ

جلد ۵	شمارہ ۵
مئی	۱۹۹۳
ذوالقعدہ	۱۴۱۳

جلد ۵	شمارہ ۶
جون	۱۹۹۳ء
ذوالحجہ	۱۴۱۳ھ

جنوری ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

مہمان مدیر

[illegible]

ادبی البم

[illegible]

خود نوشت

[illegible]

مذاکرہ

[illegible]

نئی نظم

[illegible]

نئی غزل

[illegible]

نیا افسانہ، طنز و مزاح

[illegible]

نئی کتابیں

[illegible]

محفل

[illegible]

فروری ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

مہمان مدیر

[illegible]

ادبی البم

[illegible]

خود نوشت

[illegible]

ادبی حقائق

[illegible]

نئی نظم

[illegible]

نئی غزل

[illegible]

نیا افسانہ، انشائیہ

[illegible]

نئی کتابیں

[illegible]

محفل

[illegible]

مارچ ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

ادبی البم

[illegible]

خود نوشت

[illegible]

جائزہ

[illegible]

نئی نظم

[illegible]

نئی غزل

[illegible]

نیا افسانہ

[illegible]

نئی کتابیں

[illegible]

محفل

[illegible]

ترتیب

اپریل ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

مئی ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

جون ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

اقبال

مدیر اعزازی
ڈاکٹر وحید قریشی

بزم اقبال ○ کلب روڈ ○ لاہور

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر اعزازی
بزم اقبال ۲۰ کلب روڈ ، لاہور
طابع : ایس ایم اظہر رضوی
مطبع : اظہر سنز پرنٹرز ، ۲۰۸ ، لٹن روڈ لاہور

مجلہ اقبال

مجلہ اقبال کا مقصد علامہ اقبال کی زندگی ، شاعری ، افکار اور علوم و فنون کے ان شعبوں کا تحقیقی مطالعہ ہے جن سے انہیں گہری دلچسپی تھی ، مثلاً اسلامیات ، فلسفہ ، عمرانیات ، مذہب ، ادب ، فن وغیرہ ۔

ترسیل مضامین برائے اشاعت ، رسائل جات برائے تبادلہ اور مطبوعات بغرض تبصرہ (دو جلدیں) بنام مدیر اقبال ۔ ترسیل زر اور کاروباری خط و کتابت بنام معتمد ، بزم اقبال ، ۲ ۔ کلب روڈ ، لاہور ۔

سوائے ان مضامین کے جن پر وضاحت کی گئی ہو کہ ان کے حقوق صاحب مضمون کے ہیں ، مجلہ "اقبال" میں مطبوعہ مضامین کے حقوق محفوظ ہیں ۔ نقل کی اجازت کے لیے مدیر اقبال سے رجوع کریں ۔

مضمون نگار حضرات کے افکار و آرا کی ذمہ داری مدیران یا بزم اقبال پر عاید نہیں ہوتی ۔

اگر کسی مضمون کے ہمراہ لفافہ اور ٹکٹ نہ بھیجے جائیں تو اسے واپس نہیں کیا جاتا ۔

سالانہ چندہ : ۱۰۰ روپے / ۲۵ ڈالر / ۱۰ پونڈ
قیمت فی شمارہ : ۲۵ روپے / ۸ ڈالر / ۵ پونڈ
موجودہ شمارہ : ۶۰ روپے

○

فہرست

"اقبال" لاہور (ادبیات اردو نمبر) اپریل/جولائی ۱۹۹۲ء

فہرست

"اقبال" لاہور ۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء ۔ جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست

"اقبال" لاہور ۔ اپریل ۱۹۹۳ء

فہرست

اقبالیات

(مجلّہ اقبال انسٹی ٹیوٹ)

۵

مدیر

ڈاکٹر محمد امین اندرابی

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

• شمارہ — ۵
• ناشر — ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ
• تعداد — پانچ سو
• تاریخ اشاعت — اپریل ۱۹۸۹ء
• مطبع — شالیمار آرٹ پریس سری نگر
• کتابت — عبدالرشید [illegible]
• قیمت — بیس روپیہ

ترتیب

گوشۂ جوش

IQBALIYAT

-6-

اقبالیات ۶

Edited by :

Dr. M.A. Andrabi

۱۹۹۱ء

· IQBAL INSTITUTE
UNIVERSITY OF KASHMIR,
SRINAGAR HAZRATBAL

Price : Rs. 30.00

CONTENTS

Published by the Director, Iqbal Institute
University of Kashmir and printed by him
at Shalimar Art Press, Srinagar.

اتر پردیش اردو اکادمی کا علمی و ادبی مجلہ

جگر مرادآبادی نمبر

دوماہی **اکادمی** لکھنؤ

شمارہ ۴، ۵، ۶	جنوری تا جون ۱۹۹۲ء	جلد ۱۱

ایڈیٹر

ڈاکٹر عزیز الرحمٰن

ترتیب

اتر پردیش اردو اکادمی کا علمی و ادبی مجلہ

افسانہ نمبر

دوماہی **اکادمی** لکھنؤ

شمارہ ۱، ۲، ۳	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲	جلد ۱۲

ایڈیٹر

ڈاکٹر عزیز الرحمٰن

ترتیب

اتر پردیش اردو اکادمی کا علمی و ادبی مجلہ

دوماہی **اکادمی** لکھنؤ

شمارہ ۴، ۵، ۶	جنوری تا جون ۱۹۹۳ء	جلد ۱۲

ایڈیٹر

محمود الٰہی

ترتیب

العلم

پہلی اشاعت
فروری، اپریل، جون
اگست، اکتوبر، دسمبر

ترسیل زر کا پتہ	زر تعاون		ترسیل مضامین کا پتہ
[illegible]	فی شمارہ	۹ روپے	[illegible]
[illegible]	ششماہی	۲۴ روپے	[illegible]
[illegible]	سالانہ	۵۰ روپے	[illegible]
	بیرون ممالک	۱۵ ڈالر	

جلد ۲ / شمارہ ۲ / فروری ۱۹۹۳ء

"العلم" [illegible]

[illegible]

ترتیب

ہمارے لکھنے والے

- [illegible]

جلد ۲ / شمارہ ۳، اپریل ۱۹۹۳ء

ترتیب

ہمارے لکھنے والے

- [illegible]

جلد ۲ / شمارہ ۳، جون ۱۹۹۳ء

مرثیہ و سلام نمبر

مقالات

دو ماہی العلم بمبئی | العلم۔ کراچی جنوری تا جون ١٩٩٣ء

دوماہی العلم بمبئی جون ١٩٩٣ء

جدید جاریہ العلم کراچی اپریل - جون ١٩٩٣ء

مندرجات

مندرجات

الفرقان

الفرقان لکھنؤ (۶۱ (۱–۲) جنوری و فروری ۹۳ء

فہرست مضامین

الفرقان لکھنؤ مارچ ۱۹۹۳ء (۶۱ (۳)

فہرست مضامین

الفرقان (لکھنؤ) اپریل و مئی ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

الفرقان (لکھنؤ) جون ۱۹۹۳ء

۲

فہرست مضامین

عکس ہائے

نمبر	عنوان	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نمبر	عنوان	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نمبر	عنوان	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نمبر	عنوان	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

"الفلاح" بھیکم پور، محرم تا ... جون ۱۹۹۲ء

موضوعات	عناوین	قلم کار	صفحہ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۳
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۵
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۹
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱۰
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱۹
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۲۲
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۲۴
[illegible]	[illegible]	[illegible]	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۳۰
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۳۲
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۳۶
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۳۸
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۰
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۱
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۳
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۴
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۵

المعارف (لاہور)

ترتیب

جلد ۲۶ | جنوری ۱۹۹۳ء — رجب ۱۴۱۳ھ | شمارہ ۱

المعارف (لاہور)

ترتیب

جلد ۲۶ | فروری، مارچ ۱۹۹۳ء — شعبان، رمضان ۱۴۱۳ھ | شمارہ ۲، ۳

المعارف (لاہور)

ترتیب

جلد ۲۶ | اپریل ۱۹۹۳ء — شوال ۱۴۱۳ھ | شمارہ ۴

ترتیب

جلد ۲۶ | مئی، جون ۱۹۹۳ء — ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ | شمارہ ۵، ۶

رسالہ اوراق لاہور مئی، جون ۱۹۹۳ء

ترتیب اوراق

اوراق لاہور	مئی، جون ۱۹۹۳ء	ماہنامہ ایوان اردو دہلی	جنوری ۱۹۹۳ء

[illegible] ۳۰۶
[illegible] ۳۰۷
[illegible] ۳۰۸
[illegible] ۳۰۹

خاکہ

[illegible] ۳۱۰

غزلیں

[illegible] ۳۱۷
[illegible] ۳۱۸
[illegible] ۳۱۹
[illegible] ۳۲۰
[illegible] ۳۲۱
[illegible] ۳۲۲
[illegible] ۳۲۳
[illegible] ۳۲۴
[illegible] ۳۲۵
[illegible] ۳۲۶
[illegible] ۳۲۷
[illegible] ۳۲۸
[illegible] ۳۲۹
[illegible] ۳۳۰
[illegible] ۳۳۱
[illegible] ۳۳۲

مزاحیہ

[illegible] ۳۳۳

غزلیں

[illegible] ۳۳۶
[illegible] ۳۳۷
[illegible] ۳۳۸
[illegible] ۳۳۹
[illegible] ۳۴۰

[illegible] ۳۴۱
[illegible] ۳۴۲
[illegible] ۳۴۳
[illegible] ۳۴۴
[illegible] ۳۴۵
[illegible] ۳۴۶
[illegible] ۳۴۷
[illegible] ۳۴۸
[illegible] ۳۴۹
[illegible] ۳۵۰
[illegible] ۳۵۱

اس کتاب میں

[illegible] ۳۵۲
[illegible] ۳۵۵
[illegible] ۳۵۸
[illegible] ۳۶۰
[illegible] ۳۶۳
[illegible] ۳۶۶
[illegible] ۳۷۳
[illegible] ۳۷۹
[illegible] ۳۸۱
[illegible] ۳۸۲

آپس کی باتیں

۳۸۵

[illegible] ۳۹۸

نئی کتابیں

[illegible] ۳۹۸

اردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر
ایس۔ اشتیاق عابدی
مخمور سعیدی

جلد: ۶ ——— شمارہ: ۹

جنوری ۱۹۹۳ء

[illegible]

جون ۱۹۹۳ء

باز یافت

مجلس مشاورت
- ڈاکٹر قدوس جاوید
- ڈاکٹر نذیر احمد ملک
- ڈاکٹر محبوب [illegible]
- ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

نگران و مدیر اعلیٰ
پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ

مدیر
ڈاکٹر مجید مضمر

جلد ۹	۱۹۹۲ء	شمارہ ۱۲/۱۳

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سرینگر

فہرست

صفحہ

گوشۂ محی الدین حاجنی

جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۲ء | سہ ماہی

بحث و نظر

پھلواری شریف، پٹنہ

فہرست مضامین

اپریل، مئی، جون ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

بُرہان

جنوری و فروری ۱۹۹۳ء

مارچ ۱۹۹۳ء

اپریل ۱۹۹۳ء

مئی ۱۹۹۳ء

جون جولائی ۱۹۹۳ء

تجدید نو لاہور فروری ۱۹۹۲ء

تجدید نو (لاہور) شمارہ ۲ فروری ۱۹۹۲ء

فہرست

گوشہ وفا براہی

مضامین

شاعری

کہانیاں

تجزیے

علاقائی ادب

تحقیقی مجلہ حیدرآباد ۱۹۹۳ء

تحقیقی مجلہ

شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

ایڈیٹر
پروفیسر سیدہ جعفر
صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

معاونین

ڈاکٹر محمد انوار الدین
ریڈر شعبۂ اردو
یونیورسٹی آف حیدرآباد

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی
ریڈر شعبۂ اردو
یونیورسٹی آف حیدرآباد

۱۹۹۳ء

تخلیق لاہور فروری ۱۹۹۲ء

فہرست مضامین

ترتیب

نظمیں ۔ گیت

غزلیں

افسانے

سفر نامے

جائزے

پنجاب رنگ

تبصرے

انجمن خیال
(خطوط)

تخلیق (لاہور) ۲۳ (۲) فروری ۱۹۹۲ء

تخلیق لاہور	اپریل ۱۹۹۳ء	تشکیل کراچی	اکتوبر ۹۲ء تا ستمبر ۹۳ء

تخلیق (لاہور) ۴/۲۴ اپریل ۱۹۹۳ء

ترتیب

لجمال

عصری ادب کا منظر نامہ

سہ ماہی تکمیل بھیونڈی

ایک موضوعی خصوصی شمارہ

عزیز قیسی نمبر

مدیر اعلیٰ (اعزازی)
[illegible] قریشی

مہمان مدیر
یوسف ناظم

شریک مدیر
سعیدہ مظہر

مدیر (اعزازی)
مظہر سلیم

○

● جلد : ۶/۵
شمارہ : اکتوبر ۱۹۹۲ء تا مارچ ۱۹۹۳ء
اس شمارے کی قیمت : ۳۰ روپے
سالانہ : [illegible] روپے

● بیرونی ممالک سے
فی پرچہ : تین ڈالر
سالانہ : بارہ ڈالر

● تزئین کار
[illegible]

● رابطہ : [illegible] بھیونڈی [illegible]
[illegible]

● پرنٹر پبلشر [illegible] قریشی نے [illegible] سے چھپوا کر [illegible] بھیونڈی سے شائع کیا

● تقسیم کار
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ [illegible] دہلی / علی گڑھ

سفر

فہرست

تمثال

سہ ماہی تمثال جلد ا/ ۴-۹ ، ۱۹۹۳ء

شمارہ نما

معیاری تخلیقات کی ایک جستجو

خصوصی شمارہ

تناظر دہلی

تنقید و تحقیق نمبر

نئی دہلی

بطراج ورما

مینیجنگ ایڈیٹر رگھو ناتھ گھنی راج پال سہگل

خوشنویس محمد ہارون

قیمت ۹۰ (نوے) روپے

طباعت سچریہ پرنٹرز سا داتھ انارکلی، دہلی ۔ ۵۱

چوبیسویں (۲۴)

پیشکش

چھ شمارے ایک ساتھ

مئی ۱۹۹۰ء تا جون ۱۹۹۱ء

نگارشات

ماہنامہ تہذیب کراچی

شمارہ جنوری ۹۳ء



مندرجات

شمارہ مارچ ۹۳ء



سر شاہ سلیمان

سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مندرجات

مندرجات شمارہ اپریل ۱۹۹۳ء

شمارہ مئی ۱۹۹۳ء



سید الاحرار مولانا حسرت موہانی

مندرجات

شمارہ جون ۱۹۹۳ء



نواب محمد اسماعیل خان

مندرجات

تہذیب الاخلاق (علیگڑھ) **مندرجات** جنوری ۹۳ء

فروری ۹۳ء

مندرجات

مارچ ۱۹۹۳ء

مندرجات

اپریل ۱۹۹۳ء

مندرجات

مئی ۱۹۹۳ء

مندرجات

جون ۱۹۹۳ء

مندرجات

جامعہ

جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

فروری ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

اپریل ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

مئی ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

جون ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۵۰ روپے
خصوصی معاون ۱۰۰ روپے
قیمت فی پرچہ ۵ روپے

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان
ماہنامہ جامعۃ الرشاد

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
پندرہ ڈالر امریکی
15 ڈالر

جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

فروری ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

اپریل ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

مئی ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

جون، جولائی ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

شعبہ ابلاغ عامہ جامعہ کراچی

سرپرست: ڈاکٹر [illegible]

مشیر: ڈاکٹر محمد شمس الدین

مدیر: طاہر مسعود

جرنلسٹ

جنوری ۱۹۹۳

فہرست مضامین

جمنا ٹٹ (ہریانہ) جنوری۔مارچ ۹۳ء

مشمولات

اپریل تا جون ۱۹۹۳ء

"حریم" (لکھنؤ) جنوری ۱۹۹۳ء

Feb. 93

April 93

May 93

خدا بخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۷۸ - ۸۰

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

فہرست

فہرست

❖

فہرست

دارالعلوم دیوبند

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرف آغاز	مولانا حبیب الرحمن قاسمی	۳
۲	معذوروں کے زیورات کا مسئلہ	اخلاق حسین قاسمی دہلوی	۶
۳	نکاح میں تصویر کشی اور ویڈیو کی شرعی حیثیت	عبد الہادی قاسمی بنگلور	۱۴
۴	ہندوستان اور نظام قضا	خورشید انور گیاوی استاذ دارالعلوم دیوبند	۲۱
۵	مدارس اسلامیہ کیفی مشورہ کی روشنی میں	اختر امام عادل استاذ دارالعلوم حیدرآباد	۲۸
۶	مولانا محمد حسین ملاباری،	نور عالم خلیل امینی — دیوبند	۳۵
۷	بابری مسجد کی شہادت پر مہتمم دارالعلوم	ادارہ	۵۰
۸	حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کا بیان		
	سعودی گزٹ کا ضمیمہ		۵۲

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرف آغاز	حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	۳
۲	سیرت نبوی	مولانا نثار حسین قاسمی پرنسپل انجمن عربی کالج بیجاپور	۷
۳	تاریخ اسپین کا ایک عبرت خیز ورق	مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی	۱۱
۴	راماین اور حضرت ابراہیم علیہ السلام	مولانا عبد الحفیظ رحمانی صاحب نوسہری سدھارتھ نگر	۲۰
۵	جنت نشان انگلینڈ میں شعلے	مولانا شیر الدین صاحب قاسمی برنلے انگلینڈ	۲۴
۶	بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں	مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی	۳۱
۷	رسم المصاحف اور اس کے مصادر	مولانا قاری ابوالحسن اعظمی صاحب	۴۵
۸	موجودہ حالات میں کرنے کا کام	مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	۵۲

دارالعلوم (دیوبند) — اپریل-جون ۱۹۹۳ء

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرف آغاز	مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی	۳
۲	تصوف ایک تعارف	مولانا محمد اعظمی مدرس شیخ العلوم شیخوپورہ، اعظم گڑھ	۸
۳	صوفیت، ایک تعارف	اختر امام عادل، دارالعلوم حیدرآباد	۶۶
۴	سلفی تصوف کتاب و سنت کی روشنی میں	صبغۃ اللہ صاحب بختیاری	۹۲
۵	احسان و سلوک میں حضرت ولی اللہ کا مقام رفیع	زاہد الحسینی صاحب پاکستان	۱۳۱
۶	باطن کی پاکیزگی اور اس کے اثرات	مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی	۱۶۲
۷	سماع، صوفیاء کرام کی نظر میں	مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی	۱۶۹
۸	تصوف اور صوفیاء کا مقصد حیات	پروفیسر خلیق نظامی صاحب	۱۸۷
۹	بیعت کا مقصد	〃 〃 〃	۱۹۰
۱۰	ہندوستان کے قدیم اولیاء و مشائخ	مولانا قاضی محمد اطہر صاحب مبارکپوری	۱۹۳
۱۱	حضرت خواجہ معین الدین اجمیری تاریخ کی روشنی میں	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۲۱۸

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرف آغاز	مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی	۳
۲	محدثین و فقہاء	علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مانچسٹر	۱۰
۳	مولانا معین القضاۃ حیدرآبادی	مولانا عبد الحی فاروقی صاحب جامعہ یونیورسٹی دہلی	۲۵
۴	مدارس اسلامیہ کیفی مشورہ کی روشنی میں	اختر امام عادل استاذ دارالعلوم حیدرآباد	۴۰
۵	اقلیت کا سیاسی مفہوم	ابوالکلام آزاد	۵۱
۶	اہم مشورے (غزل)	جناب محمد قمر الدین قمر رام نگری	۵۳

دانش : اسلام آباد شماره ۲۶ ۱۹۹۳ء

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دانش شماره ۲۶

دانش (اسلام آباد) شماره ۳۲، ۱۹۹۳ء

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دانش شمارهٔ ۳۲

دانش اسلام آباد — شمارہ ۳۲، ۳۳ — ۱۹۹۳ء ● دائرے کراچی — جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء

دانش (اسلام آباد) شمارہ ۳۳، ۱۹۹۳ء

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دائرے (کراچی) جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء

شمارہ نما

دریافت (کراچی)، جنوری ۱۹۹۳ء

اشاریہ

دریافت (کراچی)، فروری، مارچ ۱۹۹۳ء

اشاریہ

دریافت (کراچی)، اپریل، مئی ۱۹۹۳ء





"ذہنِ جدید" دسمبر ۱۹۹۲ء تا جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست

"ذہن جدید"

مارچ تا مئی ۱۹۹۲ء

[illegible]

فہرست

"ذہن جدید" نئی دہلی۔ جون تا اگست ۱۹۹۲ء

فہرست

ماہنامہ **راہ اعتدال** عمرآباد

جلد ۳ — جنوری ۱۹۹۳ء — شمارہ ۱

نشانِ راہ

روحِ ادب کلکتہ اکتوبر تا مارچ ۹۳ء

مشمولات

روح ادب کلکتہ — اپریل تا ستمبر ۱۹۹۳ء | روشن خیال کراچی — جنوری، اپریل ۱۹۹۳ء

"روح ادب" (مغربی بنگال اردو اکیڈمی) اپریل تا ستمبر ۱۹۹۳ء

مشمولات

کچھ بیان اپنا

اداریہ

مضامین

نظمیں

غزلیں

بنگلہ ادب

افسانہ

تبصرہ کتب

وفیات

روشن خیال

خیال نما — جنوری ۹۳ء

خیال نما — اپریل ۱۹۹۳ء

مئی ۱۹۹۲ء — مطابق — ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ

ریاض الجنۃ ماہنامہ

زبان و ادب پٹنہ، جلد ۱۸ (۱-۲)

ترتیب

زبان و ادب پٹنہ

جلد ۱۸ (۳-۴)

ترتیب

زبان وادب (پٹنہ)

جلد ۱۸ (۵-۶)

ترتیب

—— ۵ ——

زبان وادب (پٹنہ)

شمارہ ۱۹/۱-۳، ۱۹۹۲ء

ترتیب

—— ۶ ——

سہ ماہی سائنس کی دنیا دہلی

جنوری۔ مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

اس شمارے میں — عابد علی خان نمبر

سب رس (حیدرآباد) ۵۵۰/ ۳۰۲۰۱ جنوری۔ مارچ ۹۳ء

عابد علی خان نمبر

تعزیتی پیامات

سب رس (حیدرآباد) اس شمارے میں — اپریل ۹۳ء

سب رس (حیدرآباد) اس شمارے میں — مئی ۱۹۹۳ء

سب رس (حیدرآباد) جون ۱۹۹۳ء اس شمارے میں

سب رس (کراچی) جون ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

ہدیۂ تشکر

جناب حاجی محمد شفیع (اشیل والا) کراچی ... ۱۰۰۰ روپے
〃 سید محمد عبد التواب 〃 ۵۰۰ روپے
〃 نفیس نگرانی 〃 ۳۰۰ روپے
〃 محمد علی باوجاب 〃 ۲۰۰ روپے

[illegible]

سوغات (۳) مارچ ۹۳ء

فہرست

ماہنامہ سہیل گیا — شمارہ ۱ تا ۶ ، جلد ۵۲ تا ۵۳ — ماہنامہ شاعر بمبئی — جنوری ۱۹۹۳ء

ماہنامہ سہیل گیا

شمارہ ۱ — جلد ۵۲

— فہرست —

شاعر (بمبئی) جنوری ۹۳ء

ترتیب

شمارہ نمبر ۱ [۱۹۹۳] جلد ۶۳

فروری ۱۹۹۳ء

ترتیب

مارچ ۱۹۹۳ء

ترتیب

اپریل ۱۹۹۳ء

۳۔ خطابات میں ہزاروں

مئی ۱۹۹۳ء

نمبر خاص

جون ۱۹۹۳ء

ترتیب

شب خون



چوُرن (منظومات)

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

صریر (کراچی)

جدول (جنوری ۱۹۹۲ء)

صفا (حیدرآباد) شمارہ ۲۲، اپریل، مئی، جون ۹۳ء

فہرست مضامین

طلوع افکار

ترتیب

جنوری ۱۹۹۳ء شمارہ ۱ جلد ۲۳

طلوع افکار

مندرجات

فروری ۹۳ء شمارہ ۲ جلد ۲۳

مندرجات

مارچ ۹۳ء شمارہ ۳ جلد ۲۳

طلوع افکار (۵) اپریل ۱۹۹۳

مندرجات

اپریل ۹۳ء طلوع شمارہ ۴ جلد ۴۴

مندرجات

مئی ۹۳ء طلوع شمارہ ۵ جلد ۴۴

مندرجات

جون ۹۳ء طلوع شمارہ ۶ جلد ۴۴

عصری ادب

شمارہ ۶۸/ | اپریل ۱۹۹۳ء

ادارۂ تصنیف
ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۱۱۰۰۰۹
فون نمبر: ۷۲۳۲۲۷۴

نگراں
محمد حسن

مدیران
ڈاکٹر روشن آرا
سید ضیاء الدین احمد

فی شمارہ: بیس روپے — زر سالانہ: پچھتر روپے
بیرونی ممالک سے: ایک پاؤنڈ فی شمارہ (علاوہ محصول ڈاک)
پاکستان سے: فی شمارہ بیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

(پرنٹر، پبلشر سید ضیاء الدین احمد نے ایس کے انٹرپرائزز ۱۳۲۹ فراشخانہ دہلی سے چھپوا کر ادارۂ تصنیف، ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۱۱۰۰۰۹ سے شائع کیا)
تصویر سرورق: ندا فاضلی

فہرست

غالب نامہ (نئی دہلی) سید مسعود حسن رضوی نمبر جنوری ۹۳ء

فہرست

(اتر پردیش اردو اکادمی کا امداد یافتہ سہ ماہی رسالہ)

فروغ ادب

مدیر: سید منظور احمد قاسمی

فون: ۵۸۲۲۳

جلد ۳	شمارہ ۱۰	قیمت فی پرچہ ۵ روپے	زر سالانہ ۲۰ روپے

سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد اپریل۔جون ۱۹۹۳ء ● فکر و نظر علی گڑھ ۱/۳۰، ۲/۳۰ ۱۹۹۳ء

سہ ماہی ۔ فکر و نظر ۔ اسلام آباد
تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کے لئے منظور شدہ
(بحوالہ وزارت تعلیم مغربی پاکستان چٹھی نمبر ۶۷-۶۸-۳۰۰/Bureau/CD/edu)
رجب ۔ رمضان ۱۴۱۳ھ ۔ جنوری ۔ مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست

شوال ۔ ذوالحجہ ۱۴۱۳ھ ۔ اپریل ۔ جون ۱۹۹۳ء

فہرست

فکر و نظر (علی گڑھ) ۳۰ (۱) ۱۹۹۳ء

ترتیب

فکر و نظر (علی گڑھ) ۳۰/۱،۲، ۱۹۹۳ء ترتیب :

ادارہ مسلم ویلفیئر سوسائٹی بھٹیا، گوبند پور دھنباد کا

سہ ماہی **فنکار** دھنباد

جلد ۳ شمارہ ۳ ۱۹۹۳ء ۔ قیمت فی شمارہ پانچ روپے
سالانہ ۔ بیس روپے

مدیر : محمد اکرام الانصاری مدیر معاون : راشد انور راشد مجلس مشاورت کالی داس گپتا رضا ڈاکٹر وہاب اشرفی الیاس احمد گدی انوار انصاری ہمایوں اشرف قیس رضا رضوی	
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :- ایڈیٹر فنکار، بھٹیا، گوبند پور، دھنباد، بہار پن - ۸۲۸۱۰۹	

فنون (لاہور) جنوری۔اپریل ۱۹۹۳ء

مندرجات

"فنون" لاہور۔ اپریل۔جولائی ۱۹۹۳ء

مندرجات

قومی زبان" آندھرا پردیش مئی/جون ۱۹۹۳ء

ترتیب

مئی ۱۹۹۳ء

قومی زبان (کراچی) مضمون نما

جلد ۶۵ — شمارہ ۵

فہرست

جنوری ۱۹۹۲ء جلد ۳۳ شمارہ ۱
کتاب نما

اس شمارے میں

فروری ۱۹۹۲ء جلد ۳۳ شمارہ ۲

اس شمارے میں

مارچ ۱۹۹۲ء جلد ۳۳ شمارہ ۳

اس شمارے میں

اپریل ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۴

اس شمارے میں

مئی ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۵

اس شمارے میں

جون ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۶

اس شمارے میں

مجلۂ المآثر مئو۔ جنوری تا جون ۹۳ء • مجلۂ ترجمان الاسلام بنارس جنوری۔ مارچ ۹۳ء • مجلۂ حیات نو اعظم گڑھ مارچ ۹۳ء

فہرست — عنوانات

مجلۂ المآثر (مئو) جنوری۔ مارچ ۹۳ء

فہرست — عنوانات

"مجلہ المآثر" اپریل تا جون ۱۹۹۳ء

مجلۂ ترجمان الاسلام (بنارس) جنوری۔ مارچ ۹۳ء

فہرست مضامین

اپریل، مئی، جون سنہ ۱۹۹۳ء

فہرستِ مضامین

مجلۂ حیات نو (بلریاگنج۔ اعظم گڑھ) مارچ ۹۳ء

نقوش حیات نو

اپریل، مئی ۱۹۹۳ء

محدث بنارس

جنوری، فروری ۱۹۹۳ء

اس شمارہ میں

اس شمارہ میں مارچ ۱۹۹۳ء

اپریل ۱۹۹۳ء

اس شمارہ میں

مئی، جون ۱۹۹۳ء

اس شمارہ میں

مریخ پٹنہ — جون ۱۹۹۳ء — ماہنامہ معارف اعظم گڑھ — جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء

مریخ پٹنہ — جون ۱۹۹۳ء

اندراجات

(معارف (اعظم گڑھ))

جلد ۱۵۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۳ء عدد ۱

مضامین

جلد ۱۵۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۳ء عدد ۲

مضامین

جلد ۱۵۱ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۳ء عدد ۳

مضامین

جلد ۱۵۱ ماہ اپریل ۱۹۹۳ء مطابق ماہ شوال ۱۴۱۳ھ عدد ۴

مضامین

جلد ۱۵۱ ماہ مئی ۱۹۹۳ء مطابق ماہ ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ عدد ۵

مضامین

جلد ۱۵۱ ماہ جون ۱۹۹۳ء مطابق ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ عدد ۶

مضامین

فروری ۱۹۹۳ء

ہفت روزہ

معیار

کراچی

مئی ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

سرورق: اقبال مہدی

جون تا جولائی ۱۹۹۳ء

منادی

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی

معاون مدیر
خواجہ [illegible] نظامی

منادی [illegible]

فہرست

[illegible]	۲	حضرت خواجہ حسن نظامی [illegible]
[illegible]	۳	خواجہ حسن ثانی نظامی
[illegible]	۶	[illegible]
[illegible]	۳	[illegible]
[illegible]	۱۹	خواجہ حسن ثانی نظامی
[illegible]	۲۳	[illegible]
[illegible]	۲۵	خواجہ حسن ثانی نظامی
[illegible]	۳۰	[illegible]
اردو گلستاں	۳۲	حضرت خواجہ حسن نظامی

منادی [illegible]

فہرست

الغاۃ	۲	فرید [illegible]
حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی	۳	ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی
اردو گلستاں	۷	حضرت خواجہ حسن نظامی
حلقہ نظامیہ	۳۱	خواجہ حسن ثانی نظامی

منادی [illegible]

VOL 68 - No: 4 APRIL 1993
REGD No: DL-20001-93 REGD No: 793/57
TELEPHONE: 4619807
TELEGRAMS: KHAJSAN NEW DELHI

THE MUNADI NEW DELHI

فہرست

اعلان عرس	۲	خواجہ حسن ثانی نظامی
[illegible]	۳	حضرت خواجہ حسن نظامی
[illegible]	۳	ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی
[illegible]	۷	[illegible]
مفتاح الفراق	۹	[illegible]
کاکوری	۱۹	ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی
[illegible]	۲۳	[illegible]

منادی [illegible]

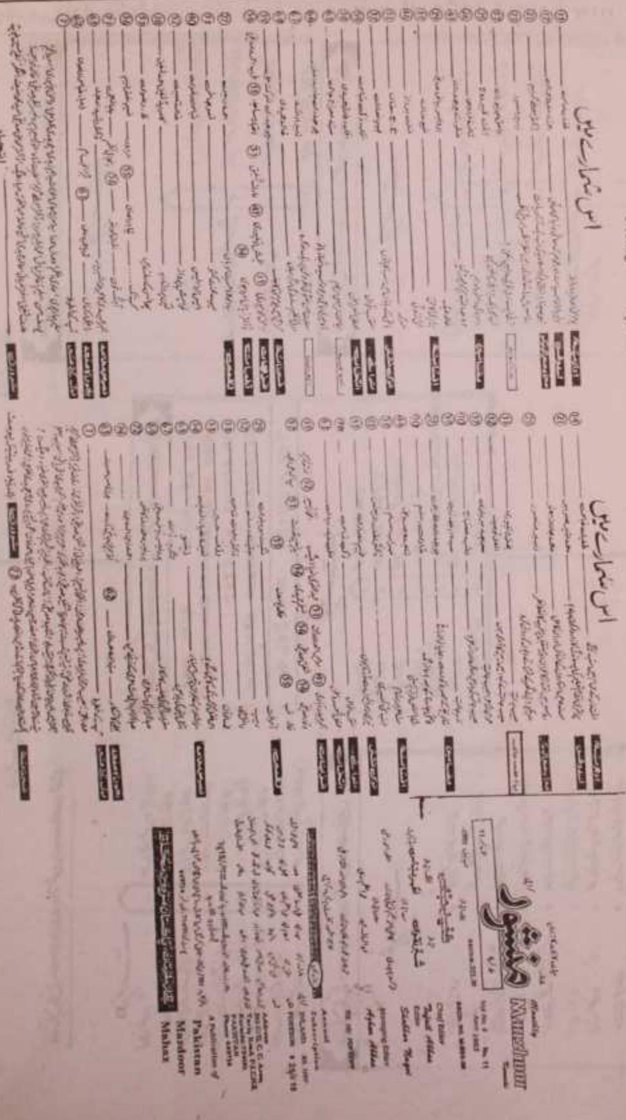
فہرست

[illegible]	۲	حضرت [illegible]
مفتاح الفراق	۳	[illegible]
اردو گلستاں	۱۹	حضرت خواجہ حسن نظامی
[illegible]	۲۲	[illegible]

منادی [illegible]

فہرست

اعلان عرس	۲	خواجہ حسن ثانی نظامی
[illegible]	۳	[illegible]
[illegible]	۴	[illegible]
[illegible]	۵	[illegible]
[illegible]	۶	[illegible]
[illegible]	۷	[illegible]
[illegible]	۸	[illegible]
مفتاح الفراق	۹	[illegible]
اردو گلستاں	۱۰	حضرت خواجہ حسن نظامی
[illegible]	۳۲	[illegible]


منشور کراچی مئی ۱۹۹۲ء
اس شمارے میں
اس شمارے میں
منشور
Manshoor
Chief Editor
Managing Editor
A Publication of
Pakistan
Mazdoor
Mahaz

منشور (کراچی) جون ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

سہ ماہی

نقوشِ میوات

(۱)

اکتوبر ۱۹۹۲ء

سرپرست
حضرت سرور میواتی

نگران
مولانا کمال سالارپوری

مدیر
شبیر احمد خان میواتی

میوات اردو اکادمی
۸/۲ - رائے گلی روشن دین، محلہ کیماں ساندہ خورد، لاہور ۵۴۰۰۰

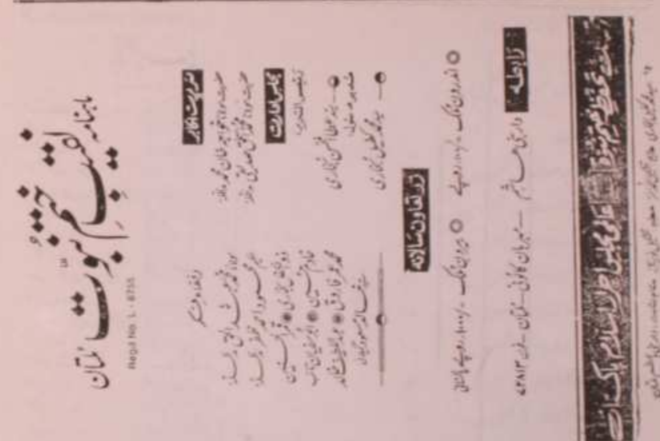
(قیمت ۱۵/- روپے)

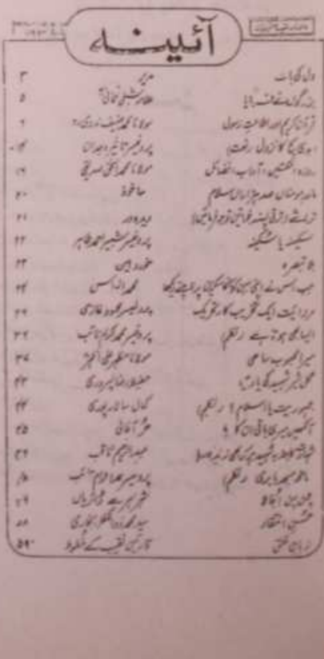
سہ ماہی نقوشِ میوات — اکتوبر ۱۹۹۲ء

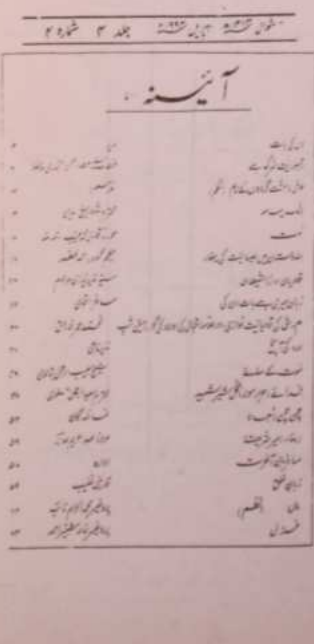
مضمون نما

سہ ماہی نقوشِ میوات — جنوری ۱۹۹۳ء

فہرستِ مضامین




آئینہ


آئینہ

نقیب ختم نبوت (ملتان) مئی ۱۹۹۳ء

آئینہ

نقیب ختم نبوت (ملتان) جون ۱۹۹۳ء

آئینہ

نگار پاکستان (کراچی) جنوری ۹۳ء

فہرست مضامین

"نگار پاکستان" (کراچی) فروری ۱۹۹۳ء

● طلبا تحریک' جنوری ۱۹۵۳ء ● کراچی طلبا تحریک جنوری ۱۹۵۳ء پر ایک کتابچہ ●

"نگار پاکستان" (کراچی) مارچ ۱۹۹۳ء

● ڈاکٹر فرمان فتحپوری ● دیباچے جو مختلف کتابوں میں چھپے ●

"نگار پاکستان" (کراچی) اپریل ۱۹۹۳ء

● اقبال کی فارسی شاعری از فرمان فتحپوری ●

نگار پاکستان (کراچی) مئی ۱۹۹۳ء

● نشاط افسانہ بیگم حسرت موہانی از شفیق صدیقی مرحوم ● سفر نامہ مراقہ و حجاز از بیگم حسرت موہانی ●

نگار پاکستان کراچی جون ۹۳ء ۞ سہ ماہی نوائے ادب بمبئی اپریل ۹۳ء ۞ سہ ماہی نیا ادبی سفر دہلی جنوری مارچ ۹۳ء

نگار پاکستان کراچی

فہرست مضامین

جون ۱۹۹۳ء

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

جلد ۴۳ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۹۳ ع

مندرجات

نیا سفر

ادبی سہ ماہی

جلد اول، شمارہ ۱ جنوری مارچ ۱۹۹۳ء

ایڈیٹر
قمر رئیس

معاون کار
سید اقبال حیدر

مینیجنگ ایڈیٹر
ارتضیٰ کریم

اندرون ملک
قیمت : ۳۰ روپے
زر سالانہ
بذریعہ رجسٹری : ۱۰۰ روپے
لائبریری ایڈیشن : ۳۰۰ روپے
سالانہ : ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک سے
زر سالانہ
بذریعہ رجسٹری
۱۵ پاؤنڈ
۲۵ امریکی ڈالر
۳۰ کینیڈین ڈالر

بک امپوریم
سبزی باغ، پٹنہ ۴

پتہ

C - 166, VIVEK VIHAR, DELHI - 110 095
Tel : 330898

ترتیب

مضامین

افسانے

خطوط

خود نوشت

حسب حال

نیا دور (کراچی) ۸۷-۸۸ خاص شمارہ

ترتیب

خاکے

دس نظمیں

باعنوان غزلیں

افسانے

ضمیر الدین احمد کے خطوط

عنوانات

جنوری فروری ۱۹۹۳ء

عنوانات

جنوری فروری ۱۹۹۳ء

قومی یکجہتی نمبر



مارچ/اپریل ۱۹۹۳ء

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

مئی ۱۹۹۳ء

عنوانات

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جون ۱۹۹۳ء

عنوانات

تتمہ

تتمّہ

وہ رسائل جو ۱۹۹۲ء کی فہرست میں شامل نہ ہو پائے

مارچ ۱۹۹۳ء

آتشِ گل

ساتواں جزیرہ شیطانی جھیل رات کا شہزادہ

ابنِ صفی کے تین مشہور ناول ایک ساتھ

۱۵

ایڈیٹر: تارشی انصاری

شعراء

فی شمارہ ۱۵ روپے   سالانہ قیمت ۲۵۰ روپے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر و مالک تارشی انصاری نے ... پریس ... سے چھپوا کر شائع کیا۔

مقامِ اشاعت: ۲۲۳۰ ... دہلی ۱۱۰۰۰۶

فہرست مضامین

ماہنامہ اخبار نوجوان (نئی دہلی) فروری ۱۹۹۳ء

اخبار نوجوان

جلد بیست شمارہ نمبر ۲۹ فروری ۱۹۹۳ء

ایڈیٹر : سید حامد انیس
ایسوسی ایٹ ایڈیٹر : سید پرویز قیصر
معاون ایڈیٹر : محمد انیس خطاب ۔ ایم اے
فوٹو گرافر : محمد الیاس
مشیر : سعید سہروردی

نامہ نگار : اندرون و بیرون ممالک
بمبئی : سی ۔ ایس ۔ طارق
کلکتہ : مسعود الدین ندوی
پٹنہ : سید انور حبیب
حیدرآباد : سید افضل حسین
سعودی عرب : لیاقت حسین
عرب امارات : خالد حسین
انگلینڈ : علاء الدین احمد
امریکہ : نیلوفر رضوی

زر تعاون اندرون ملک

دیگر ممالک سے سالانہ امریکی ڈالر



اردو میڈیا

جلد ۳ شمارہ ۶ جون ۱۹۹۳ء

فی کاپی پانچ روپے سالانہ پچاس روپے لائف ممبر شپ ایک ہزار روپے

اس شمارے میں

ماہنامہ اردو میڈیا (نئی دہلی) جون ۱۹۹۳ء

[illegible]
ماہنامہ
اصنام
جلد [illegible] ○ اپریل / مئی ۱۹۹۳ء ○ شمارہ [illegible]

مدیر
انجم [illegible]
مدیر اعزازی
ڈاکٹر مقبول فاروقی
مجلس مشاورت
غلام ربانی تشنہ [illegible]

[illegible]
سالانہ [illegible] Rs. 100/-
خصوصی سالانہ [illegible] Rs. 200/-
فی شمارہ [illegible] Rs. 8/-

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
انجم [illegible] 45 - 28 [illegible]
[illegible] 44444

ترتیبِ اصنام

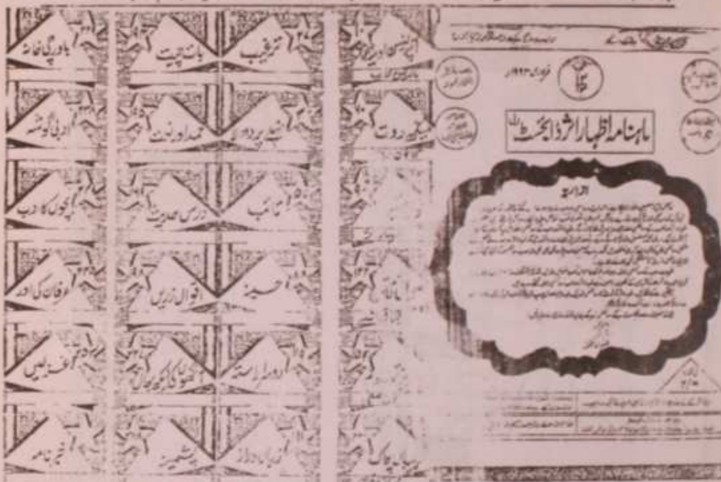
ترتیبِ اصنام اپریل / مئی ۱۹۹۲ء

ہمارے خصوصی ممبران و معاونین

جناب [illegible]
[illegible]

عید نمبر
[illegible]

ماہنامہ اظہار اثر ڈائجسٹ (دہلی) فروری ۱۹۹۳ء — امنگ (نئی دہلی) جنوری ۱۹۹۳ء — بھیانک جرائم (دہلی) مارچ ۱۹۹۳ء





بھیانک جرائم (دہلی) مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست: داستانِ وفا ۶ • ایک شادی ۸ • [illegible]
بھیانک انجام ۲۲ • [illegible] ۲۵ • مالک بیت ۲۸ • [illegible] ۲۸ • [illegible] ۳۰ • [illegible] ۳۴ • [illegible]
[illegible]
[illegible]

پیغام ثقلین (نئی دہلی) اپریل، مئی، جون ۱۹۹۳ء

ثقلین

پیغام

جلد ۱ شمارہ ۱

ترتیب

سہ ماہی تنویر ہومیوپیتھی (اعظم گڑھ) اپریل، مئی، جون ۱۹۹۳ء

ادارۂ تحقیق

پیغام ثقلین

[illegible]

[illegible] نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ / اپریل، مئی، جون ۱۹۹۳ء

اردو سہ ماہی تنویر ہومیوپیتھی

جلد ۸ - شمارہ ۲

اپریل، مئی، جون ۱۹۹۳ء

ہدایت

Regd No PN 46035/85

URDU QUARTERLY TANVEER-H. MEP

MUBARAKPUR 276404, AZAMGARH (U.P.)

[illegible]

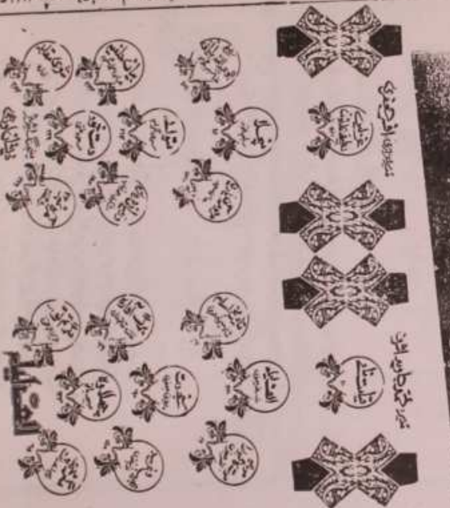
"توازن" (مالیگاؤں) جنوری تا اپریل ۱۹۹۳ء

فہرست

جدید الف لیلہ (دہلی) مارچ ۱۹۹۳ء



ماہنامہ جرائم (نئی دہلی) مارچ ۱۹۹۳ء



ماہنامہ جرائم دہلی

شمارہ نمبر ۹۹

مارچ ۱۹۹۳ء

فون: ۵۷۰۰۲۸۶

مینجنگ ایڈیٹر
حفیظ الرحمٰن خاں

ایڈیٹر
شاہد نعیم

جوائنٹ ایڈیٹر
صبیحہ خانم

MEMBER I. N. S.
MEMBER
PRESS COUNCIL OF INDIA

فی شمارہ: ۷ روپے
سالانہ: ۸۰ روپے

[redacted]

فہرست:

ماہنامہ جفاکش کراچی

ٹیلیفون: ۶۶۲۵۱۳۳ فیکس: ۶۶۳۳۱۰-۰۲۱

بانی مدیر: فادر آرنلڈ ہیریڈیا

مدیر: توقیر چغتائی

نمائندے
محمد شریف بٹ
ساجد نجمی
پرویز تنک
جاوید نصر ناصری

جلد: ۱۹ شمارہ: ۱ | جنوری ۱۹۹۳ء | قیمت ۵ روپے

اس شمارے میں

مدیر
مشتاق روشن

جلد: ۱۹ شمارہ: ۲ | فروری ۱۹۹۳ء | قیمت ۵ روپے

اس شمارے میں

جلد: ۱۹ شمارہ: ۳ | مارچ ۱۹۹۳ء | قیمت ۷ روپے

اس شمارے میں

جلد: ۱۹ شمارہ: ۳ | اپریل ۱۹۹۳ء | قیمت ۱۵ روپے

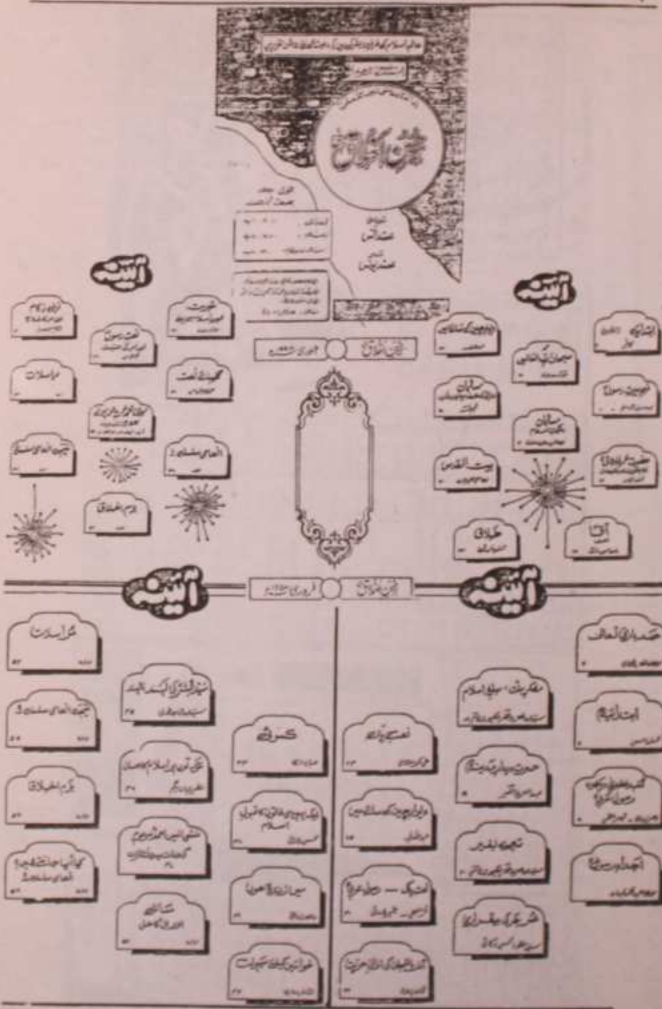
اس شمارے میں

جلد: ۱۹ شمارہ: ۵ | قیمت: ۷ روپے | مئی ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

جلد ۱۹ شمارہ ۶ | قیمت: ۷ روپے | جون ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں


آئینہ
آئینہ
آئینہ
آئینہ

ماہنامہ حسن پرست دہلی فروری ۱۹۹۳ء

حکمت قرآن

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور



اس شمارے میں

حسن پرست

ادارہ حسن پرست

مبارک باد

پیش کرتا ہے

فروری ۱۹۹۳ء

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور مئی ۱۹۹۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible]

سہ ماہی دستگیر کوئٹہ

جلد نمبر : ۳ | [illegible] | شمارہ : ۲

اپریل تا جون ۱۹۹۳ء

[illegible]

فہرست

[illegible]

ماہنامہ شرف، کراچی دسمبر ۱۹۹۰ء، جنوری ۱۹۹۱ء



اِس شمارے میں

سہ ماہی شفاء اپریل، مئی، جون ۱۹۹۳ء



اس شمارہ میں

نو فکر — جون ۱۹۶۳ء

مندرجات

جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۱

[illegible]

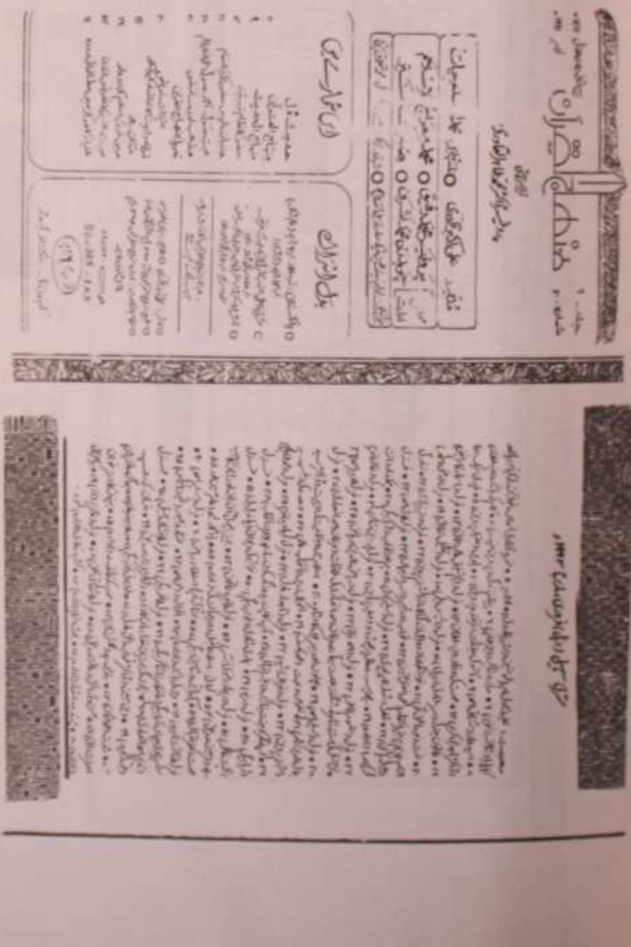
فہرست مضامین

رنگ برنگے پھول

رنگ برنگے پھول



[illegible] مارچ ۱۹۹۳ء — منہاج القرآن لاہور — نومبر ۱۹۹۱ء


منہاج القرآن

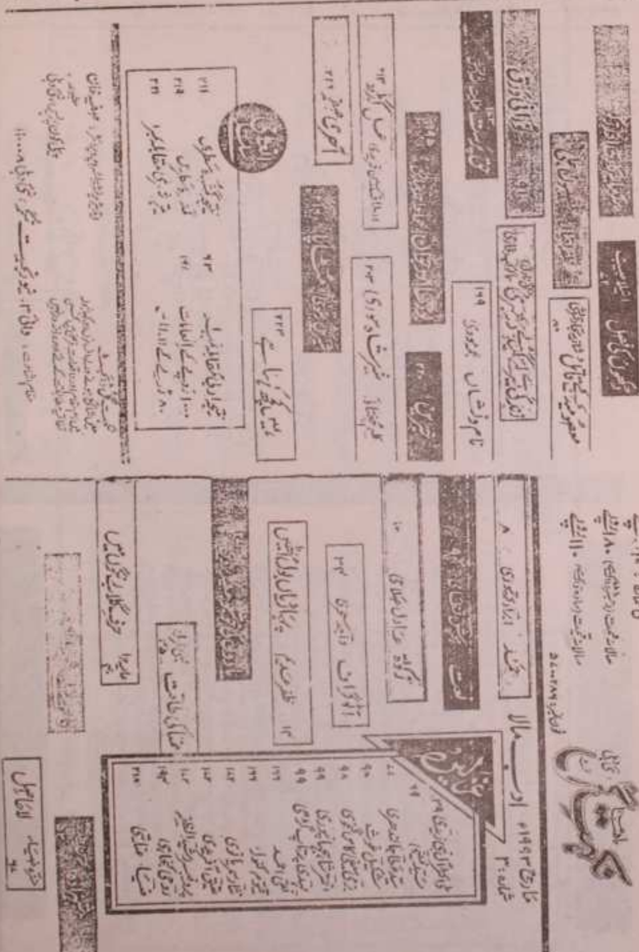
زیر نگرانی
پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

مدیر علی اکبر قادری ○ منیجر محمد ...

پروفیسر محمد رفیق ○ محمد معراج الاسلام
چوہدری محمد اشرف ○ ...

بدل اشتراک

اس شمارے میں



ہمارے نونہال
بچوں کا رسالہ حیدرآباد
جلد (۴) فروری ۹۴ء شمارہ (۵)

اپنی بات

ہمارے نونہال الحمدللہ پابندی سے آپ کے ہاتھوں میں آرہا ہے۔ ہماری پہلی کوشش یہ تھی کہ اردو کے دوسرے پرچوں کی طرح یہ کسی نظم کا شکار نہ ہو اور پابندی سے نکل سکے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس میں اب تک کامیاب رہے ہیں ہماری دوسری کوشش یہ ہے کہ اس کی چھپائی کو خوبصورت بنائیں۔ اور صفحات میں اضافہ کریں آپ سب کی مدد شامل رہی تو یہ بھی جلد ہی کرلیں گے۔ اچھے لکھنے والوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ ہمارا تعاون کریں

(وحید)

ایڈیٹر
ابوالفہیم وحید علی خاں
نمائندہ برائے جدہ
صلاح الدین سعدی
زر تعاون
سالانہ 36 روپے
ششماہی 18 روپے
فی پرچہ 3 روپے
دفتر کا پتہ
ہمارے نونہال
22-2-33
مغل پورہ
حیدرآباد 500002
فون نمبر
523684
P.P.

پرنٹر پبلیشر ایڈیٹر، وحید علی خاں نے اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد سے چھپوا کر دفتر ہمارے نونہال 22-2-33 مغل پورہ حیدرآباد سے شائع کیا۔

ضمیمہ

ضمیمہ۔۱

۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء

شخصیات (۱)

شخصیات (۲)

اقبال

تذکرہ شعرا (ادب و صحافت)

کتابیں/ مخطوطات

شیخ سعدی نے کہا تھا

"شیخ سعدی کے بارے میں ایک کہاوت یاد آتی ہے کہ بھری دوپہر میں وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اناج کی سوکھی ہوئی روٹیاں نمک کے ساتھ کھا رہے تھے۔ قریب ہی سے بادشاہ کا درباری شاعر ایک گھوڑے پر سوار گزرا۔ درباری شاعر نے شیخ سعدی کو دیکھا اور پہچان لیا۔ گھوڑے سے اُتر کر قریب گیا۔ کہنے لگا:

"اے شیخ! اگر تم نے زندگی میں بادشاہ کے دربار میں جا کر کبھی کبھی سلام کرنے کی عادت ڈالی ہوتی تو آج اس طرح روکھی سوکھی روٹی نہ کھا رہے ہوتے۔"

شیخ سعدی نے منہ میں رکھے لقمے کو اچھی طرح چبایا نگل چکے اور مسکرائے پھر گویا ہوئے۔ "اے رفیق! اگر تم نے روکھی سوکھی کھانے کی عادت ڈالی ہوتی تو تم کو کبھی بادشاہ کے دربار میں جا کر سلام نہ کرنا پڑتا۔"

اب دیکھیے کتنی عجیب بات ہے کہ شیخ سعدی کا نام مجھے ابھی تک یاد ہے مگر درباری شاعر کا نام بھول گیا ہوں مگر آپ میں سے اکثر کو اس درباری شاعر کا نام بھی ضرور یاد ہوگا اور بادشاہِ وقت کا نام بھی جس کے دربار میں جا کر سلام عرض کرتا تھا۔"

(سریندر پرکاش: "سنڈے" جمشید پور، ص۱۲)

"عصری ادب" اپریل ۹۳ء

تاریخ: ۶ مارچ ۱۹۹۳ء

مدیر دریافت کے نام

مدیر محترم

یہاں واپس آیا تو "دریافت" کے تین شمارے ایک ساتھ ملے۔ ان میں نومبر ۱۹۹۲ء کا وہ شمارہ بھی تھا جس میں آپ نے میرا مضمون "تنقید کے ڈھکوسلے" اور ساتھ ہی پروفیسر گوپی چند نارنگ کا جوابی مضمون "مشتے چند در ساختیات" شائع کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے طنزیہ و تمسخرانہ انداز میں میری پگڑی اتارنے اور اپنے سر پر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ ایاز کی ٹوپی محمود کے سر پر آتی بھی ہے یا نہیں؟۔ ویسے بھی' جیسا آپ جانتے ہیں' نارنگ صاحب میرے دوست اور مجھے عزیز بھی ہیں۔ اگر یہ پگڑی ان کے سر پر صحیح آتی ہے تو وہ بے شک اسے اپنے سر پر رکھیں اور رکھے رہیں۔ جہاں محبت کے رشتے ہوں وہاں حساب دوستاں در دل کا مقولہ مناسب رہتا ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں ایک نقطہ نظر پیش کیا تھا جس میں اس بات پر زور تھا کہ ان نظریوں سے امریکی ادب کا بھلا ہوا ہے اور نہ اردو ادب کا بھلا ہوگا۔ ساتھ ہی میں نے اپنے مضمون کے حاشیے میں چار کتابوں اور ان کے مصنفوں کے نام درج کیے تھے تاکہ اہل علم ان کتابوں کو پڑھ کر اس نقطہ نظر کو مزید سمجھ سکیں۔ آپ نے معلوم نہیں کیوں اس مختصر سے حاشیے کو میرے مضمون کے ساتھ شائع نہیں کیا؟۔ رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔

نقاد کی حیثیت سے میرا یہ اصول رہا ہے کہ جب بھی ادب میں کوئی منفی رجحان داخل ہوا تو میں نے بساط بھر اس رجحان کا قبلہ درست کرنے کی کوشش کی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۸۳ء میں میں نے ایک مضمون "علامتی افسانہ۔۔۔۔۔ ایک منفی رجحان" کے عنوان سے لکھ کر اسے کراچی کے ایک سیمینار میں پیش کیا تھا اور "اوراق" میں ڈاکٹر وزیر آغا نے کئی صاحبان قلم سے اس مضمون کے جواب میں مضامین لکھوا کر "سوال یہ ہے" کے تحت شائع کیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی عرض کیا تھا کہ اب علامتی افسانے کا زور ٹوٹے گا اور ہمارے افسانہ نگار اپنی تخلیقات کو نئی صورت دینے پر غور کریں گے اور آپ نے دیکھا کہ اس کے بعد علامتی افسانے کا زور ٹوٹ گیا بلکہ اب جدید تر صورت ہی بدل گئی ہے اور "کہانی" پھر واپس آگئی ہے۔ یہی مقصد "تنقید کے ڈھکوسلے" لکھنے کا تھا تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے اور باذوق قاری اور ادیب اس نقطہ نظر پر بھی غور فرمائیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے جوابی مضمون میں یہ جملہ لکھ کر کہ "حضرت جب آپ کو ساختیات کے بنیاد گزاروں کے نام تک معلوم نہیں تو تم لگا کیا ضرور ہے" "دس بارہ ساختیاؤں" کے نام دیے ہیں جن میں سے کئی وہ ہیں جن کے [illegible] مضمون میں بھی آئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ناموں کے تلفظ کی غلطی کی وجہ سے ان ناموں میں سے کئی کا املا تک درست نہیں ہے۔ ناموں کی یہ بے محل فہرست دیکھ کر مجھے گاؤں کے وہ ماسٹر صاحب بہت یاد آئے جن کے اسکول کے معائنے کے لیے انسپکٹر صاحب تشریف لانے والے تھے۔ ماسٹر صاحب نے چند سوالات بچوں کو اچھی طرح یاد کرادیے اور سوچا کہ جب انسپکٹر صاحب آئیں گے تو وہ یہی سوال بچوں سے پوچھیں گے۔ جیسے ہی انسپکٹر صاحب کلاس میں داخل ہوئے تو ماسٹر صاحب نے بچوں سے پوچھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ "بچو بتاؤ! رانا سانگا میدان جنگ سے کیا دبا کر بھاگا؟ سب بچوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔۔۔۔۔۔ "دم" ۔۔۔۔ ماسٹر صاحب نے کہا۔۔۔۔۔ "شاباش" ماسٹر صاحب نے اب دوسرا سوال پوچھا" بچو بتاؤ! چوہیا اپنے گھر پر کیا ہوتی ہے؟۔ سب بچوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔۔۔۔۔ "شیر" ماسٹر صاحب نے کہا۔۔۔۔۔ "شاباش"۔ میرے دوست پروفیسر نارنگ صاحب نے تلفظ و املا کے ساتھ ناموں کی ایک فہرست پیش کرکے گاؤں کے روایتی ماسٹر صاحب والا کارنامہ انجام دیا ہے۔ دیکھیے نا! بھلا میں "دم" اور "شیر" جیسے ناموں سے کیا واقف ہو سکتا ہوں! ان سے تو گاؤں کے ماسٹر صاحب ہی واقف ہو سکتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں "سارک" کے سیمیناروں میں شرکت کے لیے مجھے بھارت بھیجا گیا تھا۔ وہاں جس روایت اور معمول کے مطابق نارنگ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کام کی باتیں کرنے کے بجائے اس بار "رد تعمیر" کے موضوع پر میرے مضمون کے حوالے سے گفتگو کرتے رہے۔ اس وقت برادرم ضیا جالندھری بھی موجود تھے۔ آدمی سفر پر جائے اور وہاں یار دیرینہ "رد تعمیر" کے موضوع پر بات کرے تو انسان الجھنے لگتا ہے۔ میں نے کہا پروفیسر نارنگ آپ اس مضمون کے جواب میں ایک مضمون لکھیے لیکن یاد رہے کہ منہ نہیں بگڑنا چاہیے۔ منہ چڑانے سے انا کی پوجا تو ہوتی ہے لیکن فکر و عمل کی پرورش نہیں ہوتی۔ میں نے جس سطح پر بات کی ہے اسی سطح پر آپ بھی گفتگو کیجیے۔ یاد رہے کہ میرے مضمون (تنقید کے ڈھکوسلے) میں براہ راست یا بالواسطہ کہیں بھی نارنگ صاحب کا حوالہ نہیں ہے بلکہ یقین کیجیے مضمون لکھتے وقت مجھے ان کا خیال تک نہیں آیا۔ اب انہوں نے

جوابی مضمون لکھا ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ سارے مضمون میں مجھ پر کیچڑ اچھالنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا۔ نہ میرے نقطہ نظر کو رد کیا۔ نہ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی البتہ ذاتی سطح پر مجھے رد کرنے کی کوشش ضرور کی اور کلکتہ و علی گڑھ سے بھیجے ہوئے ان ذاتی خطوط کے اقتباس ضرور درج فرمائے جن میں میری تنگ نظری، صیہونیت دشمنی اور مذہبی فکر کا رونا رویا گیا ہے اور پھر انتظار حسین کی کہانی سے اقتباس دے کر اسے خود اوڑھنے کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے مضمون میں آگے چل کر میرے ایک اور مضمون کا حوالہ دیا ہے اور اسے ایک ایسے رنگ میں پیش کیا ہے جس کا تعلق میرے اس مضمون سے نہیں ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بے جان [illegible] ہے سیکا کے ہاتھ میں۔ یہ دوسرا مضمون میں نے ژاں پال سارتر اور سائمن دی بووار کے حوالے سے (یہودی لابی کے تعلق سے) ماہنامہ "علامت" لاہور میں لکھا تھا۔ نارنگ صاحب نے ایمان داری یہ برتی ہے کہ اس کے ڈانڈے "تنقید کے ڈھکوسلے" سے ملا دیے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ میرا مضمون (تنقید کے ڈھکوسلے) "دریافت" کے اسی شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں ان کا جوابی مضمون شائع ہوا ہے۔ قارئین کرام دونوں مضامین ایک ساتھ پڑھ کر دیکھ لیں۔ ان کو خود اندازہ ہوجائے گا۔ اس حصے کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ پروفیسر موصوف پستی سے اتر گئے ہیں اور من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید کے مقولے کا عملی ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ اسی کو کہتے ہیں۔

مدیر محترم! میں ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہوں۔ علم و ادب میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہ میرا پیشہ ہے اور نہ پی آر۔ اب اگر میں نارنگ صاحب کے جوابی مضمون کا جواب دوں تو ظاہر ہے کہ مجھے نارنگ صاحب کے اس لہجے کو اور تیز اور شدید کرنا پڑے گا جس لہجے میں انہوں نے جوابی مضمون لکھا ہے۔ مجھے بھی ان خطوط کے اقتباسات پیش کرنے پڑیں گے جو کراچی، لاہور، راولپنڈی کے علاوہ دلی، لکھنؤ، حیدر آباد اور پٹنہ سے ان کے جوابی مضمون کے حوالے سے موصول ہوئے ہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے مضمون میں پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک نقطہ نظر پیش کیا ہے جو سرگی والا نظریہ نہیں ہے۔ میں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا جوابی مضمون پڑھ کر یہ طے کیا ہے کہ میں ایک اور مضمون اس سلسلے میں لکھوں گا اور نارنگ صاحب کی سطح پر اتر کر جوابی مضمون ہرگز نہیں لکھوں گا۔ آپ چاہیں گے تو یہ مضمون آپ ہی کو اشاعت کے لیے بھیج دوں گا۔ نارنگ صاحب میرے دوست ہیں اور دوست سے گفتگو اس سطح پر نہیں ہوتی جس طرح پر نارنگ صاحب نے میرے بارے میں فرمائی ہے۔ خدا انہیں شاد و آباد رکھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے میرے مضمون کے نقطہ نظر اور اس میں اٹھائے گئے سوالوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا اور اسی لیے ان کا ایک بھی تیر نشانے پر نہیں بیٹھا۔ ان کا مضمون پڑھ کر یہ شعر یاد آرہا ہے:

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

وہ چار کتابیں جن کا ذکر میں نے اس خط میں کیا ہے یہ ہیں:

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا مخلص
(ڈاکٹر جمیل جالبی)

1. David Lehman, Signs of Times : Decoi structuction and the Fall of Paul Deman
2. Davic Lodge, After Bakhtin , Essaysin Fiction and Criticism
3. David Lodge, Small World
4. Interview of Prof. Frank Kermode, Published in Criticism in Society by Imre Salusinszky

"دریافت" جنوری ۱۹۹۳ء

ستیہ پال آنند

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۴۸۵ ۔ ریاض ۱۱۶۹۱ (سعودی عربیہ)





غزل پر ایک اور مکالمہ

شاعر شمارہ نمبر ۶ (۱۹۹۱ء) میں اندر موہن کیف صاحب کا خط غور طلب ہے۔ ویسے بھی اب یہ ضروری ہے کہ "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے تحت ہوئی بحث کی روشنی میں کچھ معروضات کو ایک بار پھر پرکھا اور تولا جائے۔ میں کیف صاحب کا ممنون ہوں انہوں نے ناقدانہ نظر سے ان تمام نکات کا جائزہ لیا ہے جو میرے انٹرویو سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ یوں بھی غلاتیات کے کیچڑ سے بچ کر جن احباب نے میرے افکار اور خیالات پر رائے زنی کی ہے۔ وہ بھی کیف صاحب کی طرح مندرجہ ذیل باتوں پر متفق ہیں۔ اختلاف رائے تو وجوہ کے بارے میں ہے۔ نتائج کے بارے میں نہیں۔

- ایک : تقسیم ہند کے بعد صنف نظم کی ترقی دھیمی رہی ہے۔ اس کی نشو و نما نہیں ہو سکی۔
- دو : وجہ غالباً صنف غزل کی عامیانہ مقبولیت ہے۔ جسے شاعروں سے ہر دل عزیز ہونے کی سند ملی ہے۔
- تین : جن نظم گو شعراء کو فوقیت حاصل ہوئی بھی ہے۔ وہ سبھی (اختر الایمان صاحب مستثنیٰ ہیں) غزل کی لفظیات کے دائرے میں رہ کر نظموں کی تخلیق کرتے ہیں۔ غزلیں کہتے ہیں اور مشاعرے پڑھتے ہیں۔
- چار : غزل کی صنف برصغیر کے تہذیبی ورثے سے اس حد تک جڑی ہوئی ہے کہ یہاں کی شعری روایات کے سیاق و سباق میں ہی اس پر غور و خوض ہو سکتا ہے۔ میرے انٹرویو میں اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور جو پیمانے میں نے استعمال کیے ہیں۔ وہ مغربی ادب کے لیے تو موزوں ہیں۔ صنف غزل کے لیے نہیں ہیں۔
- پانچ : تنقید نگار حضرات اس الزام سے نہیں بچ سکتے کہ انہوں نے کبھی اس صورت حال کو پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، اردو کا شعری ادب عصری عالمی شاعری کے مقابل اپنی کوئی حیثیت کیوں نہیں متعین کر پاتا۔ اور مغرب کی یونیورسٹیوں کے کورسز میں جہاں جاپانی چینی کوریائی اور جنوبی امریکہ کے ہسپانوی ادب کے شہ پارے پائے جاتے ہیں۔ وہاں اردو کا عمل دخل کیوں نہیں ہے۔ جب کہ اردو ایک بڑی زبان ہے اسے کروڑوں لوگ بولتے ہیں اور اردو کی نئی بستیوں میں تارک الوطن اردو داں احباب نے اسے چار دانگ عالم میں پھیلا دیا ہے۔
- چھ : فیض احمد فیض کیا اس لیے شہرت دوام کی سند حاصل کر سکے کہ وہ بہت اچھے شاعر تھے؟ یا ترقی پسند تھے اور کمیونسٹ تھے؟ یا اپنی نظموں میں بھی روایت سے عبارت لفظیات، استعارات اور تشبیہات سے اور پر نثر کہ انہوں نے غزل کی لفظیات کا احترام کیا؟

کیا وہ واقعی عالمی سطح کے شاعر تھے؟ کیا ان کا درجہ ن م راشد سے واقعی بلند تھا؟ کیا POETS' POET ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ایک پوری نسل کو متاثر کر کے اردو شاعری کو فیض یاب کیا یا نقصان پہنچایا؟ یہ مورد بحث طلب ہیں اور ان پر بحث ہونی چاہیے۔

میں اس خط میں "دست برگ" کا ذکر نہیں کروں گا جو ۱۹۹۱ء میں چھپی۔ ان نظموں کا بھی ذکر نہیں کروں گا جو "وقت لاوقت" (زیر طبع) میں شامل ہیں اور اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ میں نے کبھی نہ تو ان نظموں کو "ردِ غزل" کے طور پر دیکھا ہے اور نہ ہی اس غرض سے تخلیق کیا ہے کہ وہ ترجمہ ہو سکیں اس لیے اس شک کا ازالہ ضروری ہے۔ میں نے اپنے انٹرویو میں یہ کبھی نہیں کہا کہ چونکہ غزلیہ شاعری ترجمے کی زد میں نہیں آ سکتی۔ اس لیے اس میں اچھا شعر بننا ممکن ہی نہیں ہے۔ صرف یہ عرض کیا ہے کہ عصری عالمی شاعری کے مد مقابل کوئی بھی شعری تخلیق صرف اپنی ترجمہ شدہ حالت میں ہی رکھی جا سکتی ہے اور چونکہ غزل کا ہر شعر اپنی لسانی حد بندیوں میں مقید اس فرد واحد کی طرح ہے جو اپنی مادری زبان کے سوائے کچھ نہیں بول سکتا عصری عالمی شاعری اس کا متاثر نا ممکن ہے۔ وہ بیرونی دنیا کی شاعری سے ہم کلام نہیں ہو سکتا ___ غالب صدی کی تقریبات کے دنوں میں کم از کم تین ترجمے دیکھا

غالب کے انگریزی میں ترجمے بھی وہ کہاں ہیں؟ کیا باہر کی دنیا نے کر لیے۔ تو کیا ہم ان کی رسائی ہو گئی ہے؟ کیا برصغیر میں ہی انگریزی کا ادبی طبقہ ہی ان تراجم کا ذکر ہوا ہے؟ یہ پوچھنے سے میری مراد غالب کے بارے میں کوئی VALUE JUDGMENT دینا نہیں ہے۔ صرف ایک حقیقت کا اظہار ہے جسے بیشتر خطوط میں تسلیم کیا گیا ہے کہ غزل یا شاعری ترجمے کی زد میں نہیں آ سکتی۔

بہ خوب اس بات کا اعادہ تو نہیں کہ تفصیل سے کہا جائے ہم بھی یہ ضروری ہے کہ صنف غزل کے بارے میں کچھ باتیں جو انٹرویو کا حصہ نہیں تھیں، اب کی جائیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ "غزل پر ایک تنقیدی مکالمہ" انٹرویو کے صرف اس حصے پر مبنی تھا۔ جو غزل کے بارے میں ہے۔ اور کئی جانب سے تشنہ رہ گیا ہے۔

کچھ نکتے جو میں نے اپنے ایک حالیہ مضمون (مطبوعہ طلوعِ افکار، کراچی) میں اٹھائے ہیں۔ ان کا ذکر ضروری ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ غزل کی بنیادی ضرورت مضمون آفرینی ہے۔ معنی آفرینی نہیں۔ اور جس حد تک یہ مضمون آفرینی کی خواہش کے لئے معنی آفرینی سے گریز کرتی ہے اس حد تک یہ روایت سے بندھی چلی جاتی ہے۔ اس مضمون آفرینی کو سمجھنے کے لئے اور غزل کے سیاق و سباق میں اس کا تجزیہ کرنے کے لئے MICHAEL RIFFATERRE کے اس نظریے کو جاننا ضروری ہے جسے انگریزی میں SUBMERGED MATRIX کہا گیا ہے۔ ایک اور پیمانہ جس کا استعمال تجزیاتی کیا جا سکتا ہے۔ وہ کرسٹیوا اور اس کے پیروکاروں کا ہے جسے INTER TEXTUALITY کہتے ہیں۔ کرسٹیوا کے انٹرٹیکسچوئلٹی کے نظریے کو نواز نے ہم علم یونگ JUNG کے اجتماعی نسلی لاشعور کی بیداری COLLECTIVE RACIAL PARAMNESIA سے جوڑیں تو جو تصویر غزل میں مضمون آفرینی کی نکلتی ہے۔ وہ یہ ہے:

• غزل یا ہر شعر متقدمین اور ہم عصر شعراء کے مضامین کے SUBMERGED MATRIX کو اپنے استعارات، اپنی علامتوں اور اپنی لفظیات میں TREAT کرتا ہے اور انہیں خود میں جذب کرتے ہوئے نئے یا پرانے ڈھنگ سے، نئے یا پرانے علامتی یا استعاراتی سیاق و سباق میں وہی بات بار بار کہتا ہے۔"

[انگریزی سے ترجمہ۔ پلاجیٹ رپورٹ صفحہ ۲۱]

اس بات کو ختم کرنے سے پہلے صرف ایک مثال دے کر اپنا استشہاد واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ زیر نظر شمارہ نمبر ۲ کے صفحہ ۸۰ پر محترم دوست محمود سعید کی ایک غزل ہے جو اسی بحر میں ہے جس میں "دست برگ" کی بیشتر نظمیں ہیں، یعنی بحر خفیف مسدس مخبون مقصور۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن۔ شعری روایت سے عبارت اور عہد رفتہ کے شعراء یا ہم عصروں سے حاصل شدہ داخلی متنیت کے استعاروں کی رینج RANGE کس قدر محدود ہے اور انٹرٹیکسچوئلٹی کے منتشر ریا ایک ہی راگ کے ایک ہی سر کو، یعنی ایک ہی مضمون کو کیسے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس کی ایک نہایت کارگر مثال یہ غزل ہے۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ مضمون کی بنیاد استعارہ ہے لیکن کوئی بھی استعارہ کیسا ہی PARADIGMATIC نہیں، بلکہ یہ SYNTAGMATIC بھی ہے۔ مغربی دنیا کی POETICS کی تھیوریز کے مطابق استعارہ لفظ اصل تصویر کی SUBSTITUTION سے بنتا ہے لیکن غزل کے اشعار میں ہمارے ہاں CONTINUITY سے بھی استعارہ تشکیل پاتا ہے۔ اس غزل میں کل پندرہ ۱۵ اشعار ہیں۔ ان پندرہ میں سے لگ بھگ آدھی تعداد یعنی سات اشعار "سفر" کے استعارے سے عبارت ہیں۔ یعنی میرے محترم دوست محمود سعید کے پاس ہر دوسرے شعر کے لئے اپنی غزل میں ایک ہی مضمون ہے جس کی "آفرینی" کے لئے انہوں نے مختلف ذیلی پیکر تراشی کے نمونوں کا لیا ہے۔ یہ غالباً انٹرٹیکسچوئلٹی کی کھلی مثال ہے۔

••

حرفِ اوّل

موضوعِ تحریر کی تمہید کے طور پر ایک مختصر سی تمثیل بے محل نہ ہوگی۔ اُردو غزل کی سولہ سنگار والی روایتی حسینہ کا تصور کیجیے۔ یا پھر ساٹھ ستر سال پہلے تک کی موروثی ہندوستانی تہذیب کی دیہاتی دلہن کو یاد کیجیے۔ اگر حقیقی دلہن نہ دیکھی ہو تو فلموں میں یا کتابی تصویروں میں تو ضرور دیکھی ہوگی۔ آج ویسی ہی ایک حسینہ یا دیسی ہی ایک دلہن کو لوگ یوں کہنے لگے کہ تم تو ان بوجھل زیوروں میں کیسی واہیات سی لگتی ہو۔ تمھاری ساری فطری رعنائیوں کو ان مکروہ زیوروں نے ناقص بنا رکھا ہے۔ اور اس طرح ستم ظریفوں نے حسینہ کو مسلسل بہکا بہکا کر پاؤں کے بچھوے سے لے کر کان کی بالی تک اس کے سارے زیور اُتروا دیئے۔ آخر میں ناک کی دمکتی ہوئی کیل بچ گئی، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ محض یہ ایک کیل بھی عورت کے سولہ سنگار پر بھاری پڑتی ہے۔ دشمنوں نے کہہ کہہ کر آخر وہ بھی نکلوا دی۔ تب پیراہن کی باری آئی ــــ ظالموں نے نقص نکال نکال کر ایک ایک کر کے وہ بھی اُتروا دیئے۔ جب سارے زیور اور پیراہن اتر گئے تو حریفوں کو اس پر بھی صبر نہ آیا۔ ان کی نگاہِ بد جانِ غزل کی اسی زلف پر ٹک گئی جس کی شان میں ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیّاد آگیا

یہ زلف بھی شاطر حریفوں کی آنکھ کا کانٹا بنی رہی۔ کیوں کہ یہ گھنی گھنی زلفِ دراز حسینہ کے لیے ذرا سی ستر پوشی کا کام بھی دے جاتی تھی۔ اس کے لیے بھی لوگ طعنہ زن ہوئے کہ یہ کیا فضول سا جنگل جھاڑ سر پر ڈھوئے پھرتی ہو۔ صانعِ فطرت نے تمھاری جسمانی ساخت کو جو قاتل حُسن بخشا ہے اُس سارے کو تو تمھارے سر کا بے تحاشا لمبی گھاس ڈھانپے رہتی ہے۔ مگر کم از کم اس معاملے میں غزل کی حسینہ جب جھانسے میں نہ آئی تو یاروں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زبردستی اس کا سر مونڈ ڈالا۔

اب آپ تصور کریں کہ ان سانحات کے گذر چکنے پر وہ حسینہ کیا رہ گئی! ــــ اور خاکم بدہن یہی حشر تو آپ کی پیاری اُردو کا بھی نامحسوس تدریج سے ہونے والا ہے۔ وہی اُردو جس سے آپ کو وہی مشہور پیار ہے جو ایک طوائف کو اپنے عاشق سے ہوتا ہے، بُرا نہ مانیے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ آپ کو اُردو ہرگز عزیز نہیں بلکہ آپ کو محض اپنے وہ ذاتی مفادات عزیز ہیں جو اُردو کے طفیل یا اُردو کے وسیلے سے حاصل ہیں۔ یعنی آپ صرف پھل کھاتے رہنا چاہتے ہیں، درخت کی زندگی کی خیر نہیں مناتے۔ آپ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس درخت کی شاخوں پر تو پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا ہے، مگر اس کی جڑ کھود کر کھوکھلی کی جا رہی ہے۔ یعنی اس کی 'شناخت' مٹائی جا رہی ہے۔

غریب اُردو کے خلاف زمانے میں کیا کیا نہ فتنے اُٹھتے رہے ہیں۔ کیا کیا نہ الزامات ہیں اس غریب پر! یہ غیر ملکی زبان ہے، یہ بنجارے کی زبان ہے۔ یہ تُرک کی زبان ہے۔ یہ پاکستانی زبان ہے۔ یہ مسلمانوں کی زبان ہے ــــ یہ تو کھلے ہوئے بداندیشوں اور اُردو دشمنوں کی باتیں ہیں۔ یعنی جو ان کے دل میں ہے وہی ان کی زبان پر بھی ہے۔ کم از کم وہ ریاکار نہیں ہیں۔

کچھ لوگ بعض حلق کے اوپر سے کہتے ہیں کہ یہ اتحاد اور سیکولرزم کی زبان ہے۔ یہ جنگ آزادی کی زبان ہے جس نے بھارت کو "انقلاب زندہ باد" جیسا جوشیلا نعرہ دیا۔ اور وہ لوگ اس کی کتنی ہی خوبیاں گنواتے ہیں۔ اس کے حقوق کا اعتراف اور اس کی حق تلفیوں کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ اس کو خالص بھارتی زبان تک مانتے ہیں۔ دل بہلاوے کی ان باتوں سے اُردو کا فی الواقع کہاں تک بھلا ہو پاتا ہے وہ تو اظہر من الشمس ہے۔ حق تو یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اردو زبان سکڑتی سمٹتی ہی جارہی ہے۔ وجود اور استعمال دونوں اعتبار سے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے روایتی گہوارہ اتر پردیش میں بھی اردو کو جینے تک کے لالے پڑ گئے ہیں۔ بس ایک فعال و متحرک بہار ہے جہاں نیم دلانہ ماحول میں بھی کسی طور سخت جان اردو کا کچھ بھرم قائم ہے۔

ایک طرف تو اُردو پر بہ عنوانِ دیگر اضمحلال اور انحطاط طاری ہے مزید برآں بعض اشتہاری غم خواروں اور ان سے ساز باز رکھنے والے منافق نمک خواروں کا پیہم مطالبہ چلا آتا ہے کہ اردو کو ترقی دینے کے لیے اس کا موجودہ رسم الخط ترک کر دیا جائے۔ اردو زبان کو "عام فہم" (؟) بنا دیا جائے۔ خیر اس پر تو بہت بحثیں چل چکی ہیں۔ وہ لوگ اہلِ اردو کو تو کسی دلیل سے قائل نہیں کر پاتے بلکہ خود ہی لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ اس شاطرانہ مشورے کا لب لباب صرف یہ نکلتا ہے کہ اردو زبان کو عربی اور فارسی کی ان صوتیات سے محروم و معرّا کر دیا جائے جن کا تلفظ اور ہجے دوسری زبانوں (بطور خاص ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط) میں نہیں ہو سکتا ــــ مثلاً: ث، ح، خ، ذ، ز، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق ــــ پھر اُردو زبان ان صوتیات سے محروم ہو کر کیا چیز رہ جائے گی۔ ذرا تصور کیجیے ــــ وہی غزل والی شکستہ و ریختہ حسینہ ــــ کیوں؟

اردو زبان کے خلاف ایک اور فتنہ وقتاً فوقتاً اس کو "آسان" بنانے کا انتشار رہتا ہے۔ اس میں کبھی کبھی بعض دور کوتاہ اندیش حضرات بھی سُر میں سُر ملا دیا کرتے ہیں جو واقعی اردو کی ترقی چاہتے ہیں۔ گر "آسان" سے مراد زبان کو ثقیل نہ بنانا ہو تو اس کی تائید ہر کسی کو کرنی چاہیے۔ بلکہ زبان کو ثقالت سے محفوظ رکھنے کی تلقین و فہمائش تو ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ لیکن اب "آسان" کا مفہوم بدل گیا ہے۔ اب "آسان" بنانے کا مفہوم "شناخت" کو معدوم کرنے کا ہے۔ ہر زبان کی طرح اردو کا بھی اپنا ایک چہرہ اور اس کی ایک تہذیبی شناخت ہے۔ اور اس تہذیبی "شناخت" کے مظہر زیادہ تر فارسی و عربی سے کسب اور جذب کردہ وہ الفاظ، محاورات، استعارات، ضرب الامثال اور تشبیہات وغیرہ ہیں جو اُردو زبان میں گویا "حلول" کر چکے ہیں۔ "نامہربان مشفق" کو سب سے زیادہ شکایت اردو میں مستعمل فارسی اضافت (یعنی زیر) اور موصوف مرکب الفاظ سے ہے۔ سچ پوچھیے تو جہاں تک اردو زبان کے چہرے کا سوال ہے اس کے خدوخال اور رنگ و روغن پر غالب عنصر ہندی ہی کا ہے۔ کیونکہ ہندی اور اردو کی پیدائش تو ایک ہی خمیر ایک ہی کوکھ سے ہے۔ پھر بھی ایک ہی کوکھ سے پیدا ہونے والی دو صورتیں من و عن ایک تو نہیں ہو سکتیں۔ تو کیا بعد میں پیدا ہونے والی صورت کو "پلاسٹک سرجری" کر کے پہلے پیدا ہونے والی صورت کی فوٹو کاپی بنا دیا جائے؟ ستم گروں کا اصل مطالبہ یہی ہے۔ اردو کو آسان بنانے کی ریاکارانہ خیر خواہی کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما ہے۔ اور اردو کو "آسان" بنانے کا سب سے سائنٹفک فارمولا یہ ہے کہ (۱) اس کا رسم الخط ترک کر دیا جائے (۲) اس کو فارسی اور عربی سے "در کرنے والی" صوتیات سے "پاک" کر دیا جائے۔ (۳) اس کو فارسی اور عربی کے الفاظ، محاورات وغیرہ سے کشید (Distil) کر کے "منزّا" کر لیا جائے۔ (۴) ضرورت پڑنے پر کچھ اور آسان بنانے کے لیے اردو کا ترجمہ بھی اردو میں کر لیا جائے۔ یہی تصور ہے "فتنہ کاروں" کے ہاں خالص، پاک صاف اور آسان اردو کا! ــــ جس میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔

"زبان و ادب" ۱۸ (۱-۲۰۱)

ادارہ



سید محمد عقیل

محمود منزل، عسیا باد، الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

کہانیاں کیوں لکھتے ہو اور کس لیئے؟

بھلا کسی نے کہا کہ تم کہانیاں لکھو؟ مگر تم بھی اس کے جواب میں کہہ سکتے ہو کہ کس نے کہا کہ تم ہماری کہانیاں پڑھو۔ مگر میں تو قاری ہوں ورنہ بغیر پڑھے ہوئے تمہاری کہانی بیکار ہوگی۔ آخر تم کہانیاں لکھتے کیا کیوں ہو۔ اگر مجھے پڑھنے سے روکتے ہو تو کیا تمہارے لکھنے کا کوئی مقصد ہے یا یوں ہی بس تمہارے جی میں آئی اور تم نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ کیا جو کچھ اپنے گرد و پیش تم دیکھتے ہو اور محسوس کرتے ہو۔ وہی لکھتے ہو یا محض خیالی اور "بے معنی زندگی" اور صرف کہانی لکھنے کا ایک نیا ڈھنگ ہی تمہارے پیش نظر رہتا ہے۔ کہاں تمہیں شوق یہ تم کہانی لکھو، مگر ہمیں بھی تو اپنے ساتھ شریک کرو۔ آخر تم کس دنیا کی باتیں کرتے ہو۔ کن کے تجربے بیان کرتے ہو اور کن لوگوں کے لیے؟ لکھتے ہو کہ آخر فن اور آرٹ بھی تو کوئی چیز ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم تجربے ہی بیان کریں۔ وہ جو الف لیلیٰ و لیلیٰ، فرضی کہانیاں لکھتے تھے، جو دیو اور پریوں کے قصے لکھا کرتے تھے، وہ جھوٹی سی دنیا اور تصاویر FANTACY تخلیق کرتے تھے، وہ کس لئے لکھتے تھے۔ اور ان میں زندگی کے کون سے تجربے ہوا کرتے تھے؟ مگر یہ کہانیاں قاری کو ایسا پکڑ لیتی تھیں کہ بھلا انہیں شروع کر کے پڑھنا یا سننا چھوڑ سکتے تھے؟ یا آج بھی کیا تم چھوڑ دو گے؟ کیا زندگی اور اس کی معنویت وجہ ہے جیسا کہ تم جیسے قاری کا کہنا ہے کیا زندگی اور حقیقت زندگی کا مکمل عرفان ممکن ہے۔؟

تصورات اور واہموں کے مختلف امکانات، زندگی کیوں نہیں؟ اگر ان تصورات کو زبان نہیں ملتی تو اس کا ما فی الضمیر تلاش کرو، تم کو کہانی مل جائے گی۔ داستانوں اور الف لیلیٰ، صورتوں کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ کیا دیو اور پریوں کی کارگزاریاں، زندگی کی تخلیقیں تھیں؟ نہیں، ان داستانوں اور الف لیلوی صورتوں کو چھوڑنا ممکن نہیں، کیونکہ ان کہانیوں میں انسانی ذہن اور اس کی تمناؤں کا سب سے بڑا راز چھپا ہوتا ہے اور وہی قاری کو ان کی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ راز ہے، ایک تجسس، جو انسانی اعمال اور کارناموں کی سب سے بڑی طاقت ہے، جو آرزوؤں کو بھی لپیٹ کر چلتا ہے۔ زندگی سراب ہی میں گم ہو جانے کا نام نہیں بلکہ نئی نئی صورتوں کی تلاش اور نئے نئے امکانات پیدا کرنے کا نام ہے اور انہیں امکانات کی تلاش نے زندگی کو میدان عمل میں متحرک کیا ہے اور قصوں کہانیوں کا پیٹ بھی جو "پھر کیا ہوا" کی چاٹ چھپی ہوئی ہے، اسی کی تلاش نے قدیم کہانیوں اور واقعات میں لپیٹ رکھا ہے۔ تو کہانی کی ریڑھ وہی جو اسے قائم رکھنے والی ہڈی ہے۔ وہ جستجو ہی ہے اور باقی باتیں اس کی تزئین DECORATION کے لیے ہیں۔ اب تجسس یا تلاش کس بات کی؟ یا تو زندگی کی بصیرت کی یا اس کے نئے امکانات کی یا پھر نئے تجربوں سے کچھ نئے نتائج تلاش کرنے کی سعی یا لالچ۔ دیو پریوں کی کہانیاں، الف لیلیٰ و لیلیٰ کے قصے، میرامن کی داستانوں، یا طلسم ہوشربا کے واقعات، سب زندگی کے امکانات اور انسان کی قوت فکر و عمل کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور پھر اس کی "انہونی" کے "ہو جانے" کی تمنا، قاری کو اور سامع کو واقعات میں لپیٹے رہتی ہے۔ اور پھر ان کوششوں سے اچھے برے نتائج کی تلاش۔ اچھے برے نتائج جو ایک موجود سوسائٹی کے حلال و حرام اور ایجاب و انکار TOTEM AND TABOO سے آئے ہیں۔ یا پھر عالمی VICE VERSA ہیں مگر ہمارا زندگی کی بصیرت ہے اور اس کے جلال و جمال کی تفتیش۔ حضرت امیر حمزہ تیر و تفنگ کی ملامت میں تو ان کے واقعات میں قاری جبر و نیکی اور اپنی کامیابی تلاش کر کے، ان کا طرف دار ہو جاتا ہے جبکہ عمار طرار یا

حیات جاوداں، احتشام نقارہ نواز اور ملک احمر گو ہر پوشش، بدی اور آخر کار شکست کی علامتیں ہیں۔ اور پھر قاری ان کا مخالف ہو کر ایسی بدی VILLAIN سمجھنے لگتا ہے اور ان کی ہزیمت پر تالیاں بجاتا ہے اور اگر کہیں داستانی قصوں کو دلچسپ کہا جاتا ہی ہو تو منظر نظر کرنے لگتا ہے۔ تاہم ان کے ہر عمل پر ان کے ساتھ ساتھ چلتا محسوس ہوتا ہے۔ راقم الحروف نے ایسے مناظر بھی دیکھے ہیں جہاں کسی بیٹھک میں دس پانچ آدمی بیٹھے ہوئے، ایمون گھول رہے ہیں اور داستان گو، طلسم ہوش ربا پڑھ رہا ہے، یا اس کا کوئی قصہ بیان کر رہا ہے۔ اگر عمرو عیار کسی ساحر کے گھر میں پھنس جاتا ہے تو سب افیون چھوڑ کر دست بدعا ہو جاتے ہیں اور جب عمرو عیار ساحر کو مار کر اس کے گھر سے نجات پاتا ہے تو سب شکر کا کلمہ بجا لاتے ہیں اور پھر خوش ہو کر افیون کی چسکی لینے لگتے ہیں جیسا کہ داستانوں کا ذہین قاری، صرف مسکرا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ابھی بہت گھرانوں کے کچھ پرانے افراد موجود ہوں گے، جہاں جب طلسم ہوش ربا پڑھی جاتی تھی تو گھروں میں عورتیں کھانا پکانا چھوڑ کر داستانوں میں گم ہو جاتی تھیں اور بازار سے کھانا منگا کر کھایا جاتا تھا۔ آخر یہ محویت کیوں؟ اور کیسے؟ پھر نیک کرداروں کے ساتھ قاری کو اپنی پسند اور قدروں کی تسکین ملتی تھی مگر بد کرداروں کی پیش کش اور ان کے انجام کی بھی شاید یہی ضرورت تھی؟ افراسیاب اور تاریک لقا جیسے بد کرداروں میں بھی قاری کی دلچسپی کیوں؟ شاید اس لئے کہ وہ قاری کے لئے ایک چیلنج تھے اور وہ انہیں اور دین کو اپنے کیفر کردار کو پہنچتا دیکھنا چاہتا تھا۔ تجسس کا انتظار، جوڑ توڑ اور پھر بقول غالب "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" بھی ایک سبب تھا۔ اس کا بھی خود تخلیق کار ایک خاص دور کی سوسائٹی سے جو اچھے اور برے معیار، زندگی کے بنیادی اقدار لئے ہوئے تھے، ان کو کیا بتلانا یا سمجھنا چاہئے کہ کیا صحیح اور غلط ہے پر ہر دور کے فنکار کی نظر رہی ہے۔ وہ فنکار کو اس نظریے سے بھی آشکار رہا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کی حیرت اور پیچیدگیوں کو کہاں تک پکڑا ہے اور پھر ان کا حل کن راستوں سے تلاش کیا ہے اور یہ حل کہاں تک حقیقی زندگی میں ممکن ہے۔ کیا ہم اپنی زندگی کے عمل و ارتقا کی تصدیق اور وضاحتیں بھی کرتے ہیں؟ سوسائٹی میں ایسے افراد ہوتے ہیں جو خیر اور سادگی اور بھلائی سے تعبیر کئے جاتے ہیں اور شر، کو چالاکی اور کامیابی سمجھتے ہیں اور اس طرح ذہنی کشمکش کا پیدا ہونا بھی، کامیابیوں کی نمایاں ضرورت ہے۔ مثلاً آج کے افسانہ نگار کی ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ وہ آج کی زندگی کے خیر و شر کی وضاحت اور توجیہ کس طرح کرے؟ بیشتر بازاروں کی سوسائٹی کے خیر و شر، اور نقل و حرکت کی، بیوروکریسی کی بنیاد ہے۔ یا شرکی طاقت سے مغلوب کار نے چراغ کے اخلاقی جواز اور اس کی محرومی برداشت میں اضافے کی راہیں تلاش کرنا، مطلق، دھوکہ دھڑی کا اور تصنع بازیوں کو کامیابیاں سمجھنے والی سوسائٹی کے معیاروں کو کس طرح تحقیق کر دیکھے اور پھر کہانیاں لکھتے وقت ہم جمع کے مفاد کا خیال رکھے اور کہاں اپنے ضمیر کی آواز کے ساتھ چلے۔ پھر کہانی کار کی ذمہ داری کیا ہوگی؟ کبھی کبھی حالات گونگا اور ضمیر کی آواز بہرا ہوتا ہے اور گھٹن برداشت ہی حالت کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ تقسیم سے لے کر جب حالات اور معاشرے نے کروٹیں لیں، چند برس بعد یہ صورتیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں پھر سوسائٹی اور جتنا ہو کر، پوری قوم کی تصدیق اور خاموشی، منظوری بھی آزادی سے آتی ہے۔

جارج ڈی نور یا الڈوس کی تخلیقات کا مطالعہ قوم کی کمزوریوں اور شاہی محل سرائے کی قیاسیوں کے اظہار کے لئے، شرابِ کے دور پر، انگریز بیمار کی بدولت تہذیب بھی کو فنا نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ کہانی کار اور ناول نگار کا ضمیر آزاد ہو کر بھی خائف رہتا ہے۔ آج ان تمام باتوں سے نپٹنا آسان نہیں۔ پھر کہانی کار کے پاس صرف تعلیم اور اظہارِ بیت ہی کا راستہ ہے جس سے وہ سوسائٹی کے مزاج کو کچھ سا بھی جانتا ہے اور اسی میں تبدیلی لانے کی استطاعت سے حاصل ہو سکتی ہے اور اس طرح، وہ اپنا نقطہ نظر بھی بیان کر سکتا ہے۔ اردو میں جدید علامتی کہانیاں جو آج لکھی گئی ہیں، ان کے مصنفین، "یہ لوگ اپنے لئے لکھتے ہوں، یا سب کے لئے لکھتے ہوں، یہ کہنے کے لئے نہیں لکھتے۔" بلکہ صرف تجربے کے لئے لکھتے ہوں اور یہ صرف لکھنے کے لئے لکھتا ہوں، جیسے تمام موضوعات اور علامتیں بھی بحث سے گزر رہے ہیں۔ ان تمام صورتوں میں بہت سی کہانیاں لکھی گئیں اور علامتی کہانیوں میں کچھ اچھی اچھی کہانیاں لکھی گئیں مگر زیادہ تر علامتی کہانیوں کو گمراہ نہ کر سکیں۔ کچھ کہانیوں کی مثال میں نے ایک کہانی خیمہ کی طرف کرائیں کہ، کہانی کار کے حاشیہ خیال میں بھی وہ بات نہیں ہوگی جیسے انور سجاد کی کہانی "گاے"، یا رشیدہ امجد کی کہانی "جسم تنہا، جسم ہمارا" یہ فروان کا ایک لمحہ۔ محمد کے لئے برکی کا زاویہ جو کہانی قوت بڑھائی اور وجود کا تجربہ ہے..... جہاں پر حقیقت کی روشنی کا بہاؤ روح کو جذب کرتا ہے اور ایک اجاگر کا احساس جنم لیتا ہے۔" انور سجاد کی کہانی کو بھی خبرات عجیب عجیب طریقے سے لگائی ہیں۔ کچھ نے پاکستان ہی کی حکومت کے خلاف احتجاج کی کہانی بتاتے ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ یہ کہانی پاکستان کی بدلتی ہوئی تہذیب کی کہانی ہے۔ کچھ اسے نئی نسل اور پرانی نسل کی آویزش کی کہانی سمجھتے ہیں۔ یہ تقسیم ہند کی بھی کہانی ہو سکتی ہے کہ اگر ہندوستان کو یہ سمجھا جائے تو گائے، ہندوستانی تہذیب کے وہ عناصر بھی ہو سکتے ہیں جس پاکستان کی بنتی ہوئی تہذیب اور خصوصاً وہاں کے مولویوں کی تہذیب، دھیلی نکالا دے رہی ہے۔ کو کیا کہنا، کو قدامت پرستی کی علامت بھی کہہ سکتا ہے۔ یہ اب دنیا کی کچھ مروانی تہذیب مرگ ہی ہو کر باہر پھینک دینا چاہتی ہے۔ مثلاً انتظار حسین، ناصر شہزاد اور دا ابن اشت اور کچھ حد جدید نئے لکھنے والوں نے رنجیدہ تک کہانی کے پردے میں ماضی کی بازیافت کا شغل اختیار کیا، ناصر شہزاد دلیت کی تحاسری میں عرض میں لکھ کر، ہندوؤں کے دور کی تہذیب کے گن گا رہے ہیں۔ قوم کی لا متوں اور غیرت کا کوئی احساس نہیں ہے۔ خام خیالی کے پردے میں لوگوں کو دیا

سنائی دیتے ہیں، یہاں بھی مگر جہاں فاری ہے، کہانی جب سر سحر اگر واپس لوٹ آتا ہو تو پھر ایک کہانیوں اور بیانات کا حاصل؟ کچھ نمونے ایسی کہانیوں کے دیکھتے ہیں۔

① میں نے دیکھا گرد اڑاتی سیاہ راہ پر گاڑی کا ہیولیٰ ابھر رہا ہے۔ سفید بیل جن کی آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے ہیں اور ناکوں میں موٹے رسے اور سیاہ کپڑوں، میلی چادروں لے کر بکلوں میں چہرہ چھپائے، نیم خوابیدہ گاڑی بان جو شاید اس کا تھا، جو کہ دکھ، دہشت بھری جبک کی ہمہ وقت قربت سے بے ہوش رہتے ہیں اور ان کے پیچھے سیاہ پردے۔ ایک لرزش، مجھے میرے پاؤں تک روند گئی۔ تینوں دیہاتیوں کی آنکھوں سے چمک رخصت ہو گئی۔ جیسے وہ موت کے قریب ہو نا۔ گاڑی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ گاڑی بالکل قریب آ گئی یہاں تک کہ ہمارے برابر سے گزر گئی۔ گاڑی بانوں کے چہرے چادروں میں چھپے تھے۔ اور سیاہ پردے (یا دیواریں) مدہم ہوا سے ہلنے کے باوجود نہ ہلتے تھے۔ اچانک وہ تینوں اس گاڑی کے پیچھے بھاگے اور ایک ساتھ انہوں نے پردہ اٹھا دیا۔ ان کے سر پردے میں جیسے گئے مگر پردہ اٹھنے کے باوجود نہ اٹھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دہشت زدہ عجزان کی چیخ کے ساتھ وہ تینوں پلٹے اور دیوانوں کی صورت دیہات کی طرف بھاگے۔ "تم نے کیا دیکھا"؟ "تم نے کیا دیکھا؟" میں ان کے پیچھے بھاگا مگر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ بھاگتے رہے۔ "بولو" "بولو" میں نے ان کی منت کی مگر وہ بھاگتے رہے یہاں تک کہ میں بھی ان کے ساتھ بھاگتا بھاگتا، شہر سے کوسوں دور نکل آیا۔ "مجھے بتاؤ، مجھے بتاؤ" بالآخر میں نے ایک شخص کی چادر پکڑ لی۔ اس نے پٹی پھٹی آنکھیں میری جانب پھیر دیں اور پھر اپنا منہ کھول دیا۔ اس کی زبان تالو کے ساتھ چپک چکی تھی۔ وہ تینوں گنگ ہو چکے تھے۔ میں چکرا کر گر گیا مگر وہ تینوں بھاگتے رہے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے پیچھے گرد اڑتی رہی۔ پھر وہ بھی بیٹھ گئی اور میں گھر لوٹ آیا......... اسی دن سے گاڑی نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔ اب وہ شہر سے نہیں گزرتی ــــ بلکہ ہو کر جنگل میں اتر جاتی ہے اور مضافات کا رخ کرتی ہے۔ اہل شہر اس دکھ، دہشت بھری جبک کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ اس کا احساس نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ تلوار کی کاٹ کا محض ایک پرانا دکھ تھی۔ بھولی بسری کہانی کی طرح۔ مگر میں، اب بھی انہیں اپنے جسم میں اترتا جان پاتا ہوں اور کوئی دن رات میرے اندر ہوتا ہے "اب تمہاری باری کا جب تم دیکھو گے"! اور آتا میں اسی پل پر آن کھڑا ہوا ہوں ــــ اسی سواری کے انتظار میں!

(سواری۔ خالدہ حسین۔ مجموعہ پہچان)

② جب تم یہاں تک آ گئے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دوسرے راستے پر چل رہے ہو، ورنہ تم تیسرے راستے پہ ہوتے۔ اور یہ دیکھو میں نے روزن نہیں کھودا تھا۔ آج کوئی معنی نہیں لاحق ہے۔ بس تمہارا راستہ ہے، پڑھ کون اور داخل ــــ تو یہ تعویذ کھولو اور گزر جاؤ۔ الوداع۔ اس لئے کہ اب تمہاری واپسی ناممکن ہے کیونکہ تمہارا نقش قدم بھی مٹایا جا رہا ہے جس کے اسباب تمہیں اکیسویں منزل پر معلوم ہوں گے کہ حکام نے وقت مقرر کر رکھا ہے۔

وہ بہت تیز بھاگتا وہاں سے گزر گیا اور کئی منزل آگے آنے کے بعد جب اس تعویذ کا خیال آیا تو کھول کر پڑھنے کی خواہش ہوئی۔ لیکن اس شخص نے تو منع کیا تھا کہ کھولنا نہیں ورنہ اثر زائل ہو جائے گا۔ نہ جانے وہ کون شخص تھا۔ مرد تھا یا کوئی جن۔

جب اس نے تعویذ کھولا تو اس میں لکھا تھا

ہوز ایسم فزمزدان ہنر ہنر ماس درزماس
ہر شیوہ ہر دیوار ذ شیدہ شتہ تے ہر شندہ
ہر شنگر زمریاں فزو ہیدرد

شام	کا	دیپک	جلا	مٹی	کا
دیا	بجھنے	لگا	یا	ربوس	شام
کا	دیپک	ج	من	کا	دیا

یہیں سے اس نے تیسری تباہی میں قدم رکھا۔ یعنی جب وہ دشت قراقرم واضح ہو کر قراقرم ایک پہاڑ ہے دشت نہیں کو عبور کر کے ۱۱ویں منزل میں آ گیا تو احساس ہوا جیسے اس کے پیچھے کوئی گھسٹ رہا ہو۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ چونکہ میں اتنی دور نکل آیا ہوں، اس لیے اس بار تو میرے نشانات واضح ہوں گے لیکن جب مڑ کر دیکھا تو ہتھیار چیخوں سے دوسروں کی نیندیں اچاٹ ہونے لگیں۔ نہ جانے کس منزل سے ایک لاش اس کے ساتھ گھسٹتی آ رہی تھی جو اس کے رک جانے کے بعد بھی گھسٹ رہی تھی۔"

[ہونزا، میم۔ فیروز قمر احسن]

(۲) بلندیاں سی آنکھ سے پہلے گزرے کل، کھلے آسمان تلے۔ یہی ان جانے میں، ان گنت لفظ کھو بیٹھا۔ تاریخ، جغرافیہ، دیومالا، کچا دینی خون کے رشتے، نمک اور دل کے معاملات، صبح و شام تھے۔ کبوتروں کا پھڑپھڑانا، پھرکی تھی اور عزشش یا پیاسا، جنتے جنتے روتے ہنسا شاعری تھی اور روتے روتے ہنس دینا کہانی۔ پو پھٹنے سے پہلے جو صوت، جو دوپہر، بچّام اور شام ڈھلے، دیوداس۔ کبھی قدر تھا کی آنکھیں جسے کلم کی تصویر دیکھئے اور کبھی ادھ کھلے گیسو بال، پریشان، سیاہ بالوں میں سورج کے ذرّے۔ بازو وا کیے پریشانوں کا جیسا سادہ باوا۔ موسم گرما کی دھوپ۔ پھولوں کا لمس، الاؤ کی آنچ اور بدنوں کا ملاپ، بارش اور تجدید بارش کا لمحہ ـــــ زبان زبانوں کا ایک سازش کو جس کو میں شکار تھا، گو میں بھی میں شریک تھا جیسے ہر ایک وقت سازش کا شکار اور سازش میں شریک تھا۔ لفظوں کو معنی نہ دیئے، لفظ چھوڑ دئے۔ گرما، سرما، خزاں، بہار کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ موسم جو لفظ تھے، معنی نہ تھے۔ سازش کا شکار میں تھا مقدر میں تھا اور سازش میں شریک یوں تھا کہ میں نے اس معمار کو توڑنے کی کوشش نہ کی۔ وہ دن ہوس پرستوں اور شہرت پسندوں کے دن تھے۔ [آخری کمپوزیشن۔ جرائت میرزا]

(یہ کہانی بھی، دوسری نادر تحریروں کی طرح، شب خون [الہ آباد] میں بڑے اہتمام سے شائع کی گئی تھی اور دونوں ادبی حلقوں میں، اس کہانی کے بڑے چرچے تھے۔)

کیا یہ شاید کہانی کی کسوٹی کو متعین کرتی ہیں؟ یا کہانی کا کوئی نیا کسوٹی نیا ہی ہے۔؟ تو وہ کون سی کسوٹی ہے؟ آخر کہانی یا انسانی زندگی سے، ان کا کیا تعلق ہے؟ پھر تجسس کو بھی یہ کتنا متعین کرتی ہیں؟ فینٹسی FANTASY اور خیال کی اڑان نے یقیناً انسانوں کی مدد کی ہے۔ ذہن کی یہ صورتیں، ہوائی قلعے تعمیر کرتی ہیں۔ شاید یہ ہوائی قلعے انسانوں کو سوچنے پر مجبور کرتے رہے ہیں کہ کیا ان ہوائی قلعوں کو بھی راہِ عمل مل سکتی ہے؟ ـــ

اور آج انہیں راہِ عمل مل گئی تو یہی ہوائی قلعے زندگی کی حقیقت بھی بن جاتے ہیں۔ طلسم ہوش ربا میں افراسیاب جادو کے بنائے ہوئے طلسم تھے، جب تمام کام کرتے تھے تو قارئین اور سامعین انہیں محض خیالی اور ایک ناممکن العمل چیزیں سمجھتے تھے مگر جب انہیں خیالی صورتوں نے آج روبو ROBOT کی شکل اختیار کر لی۔ اپنی پیٹھ پر گیس کے ڈبے باندھ کر، گوشت و پوست کے انسان کھلی ہوا میں آسمان میں پرواز کرنے لگے اور خلا بازیاں دکھانے لگے اور خلائی، آرمسٹرانگ، ایلیس جب چاند ستاروں میں پہنچنے لگے، تو تختِ زبرجد پر سوار ہو کر عمرو عیار کا اڑنا، حقیقی اور عملی دنیا کا کارنامہ معلوم ہونے لگا۔ طلسم ہوش ربا کے جادوگروں کا زمین میں ڈوب کر زمین کاٹتے ہوئے چلنا، کسی قدر محیر العقول اور ناممکن العمل معلوم ہوتا تھا۔ لوگ اسے محض زیب داستان سمجھتے تھے مگر آج زمین دوز ریلوں اور کوئلے کی کانوں میں کام کرتی ہوئی مشینوں نے ان تمام محض خیالی باتوں کو حقیقت بنا دیا ہے ـــــ

کیا یہ انسانی ذہن کے تجسس اور عمل کی کارفرمائی نہیں ہے؟ مثالیں اور بھی ہو سکتی ہیں مگر خیر لیکن ان تمام خیالات اور فینٹسی نے کچھ تفہیم کا دامن نہیں چھوڑا کہ یہی تفہیم اور توجیہات تو خیالات کو حقیقت کا روپ دینے میں مدد کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان باتوں سے خفا ہو کر تجریدی افسانے لکھنے والا کوئی ہمارا افسانہ نگار تن کر کھڑا ہو جائے اور کہے کہ جب زبان اور لکھے پرانے مفہوم تک منتقل ہونے کے اصول ختم ہو چکے ہوں گے اور زبان اپنی تفہیم اور رسل و رسائل کے نئے اصول بنائے گی اور واقعات سننے یا پڑھنے کے بجائے صرف دیکھنے VISUAL کی چیز بن کر رہ جائیں گے۔ کیونکہ جس طرح سمعی اور بصری AUDIO VISUAL تجربے اور امکانات بڑھتے جاتے ہیں، شاید کچھ دنوں میں لکھنے پڑھنے کا کام ہی ختم ہو جائے۔ جب پورا ناول چند کیپسولوں میں قید ہو جائے گا تو کوئی کتابیں کیوں چھپوائے گا اور کوئی کتابوں کا اتنا بڑا بوجھ کیوں اٹھائے پھرے گا۔ تب ان تجریدی افسانوں کی زبان اور ان کا مافی الضمیر محض آواز کے اختصار اور علامتوں سے اپنا مفہوم ادا کر پائے گے اور تب ان افسانوں میں تحریر شدہ باتیں صرف تصویروں کے پس منظر سے ابھاری جائیں گی اور تب مجبوراً اعتراف کرنا ہوگا، ہونزہ، میم، فن، چپ چرواہا، بچھو، غار، لفظی اور نوری داستان (نیر مسعود) حتیٰ کہ محمود ہاشمی بچھو کا پہچرا (مرزا حامد بیگ کا افسانہ) اب کا "تعمیر آئی تمام" اور اسی کی "تیرہ زینہ" وغیرہ سب اپنا طلسم در بند کھول دیں گے۔

لیکن دنیا کی کوئی نثر یا تجربہ، جو عام انسانوں کی مشترک ذات کو اپنے ساتھ نہیں لیتے، وہ عام انسانوں کی دلچسپی کا سبب کبھی نہیں بنتے۔ عام انسانی سوسائٹی، ہر فکر، خیال اور تجربے میں اپنے تجربوں اور سوچ کی تصویر دیکھنا چاہتی ہے، اور جب تک، یہ مشترک صورت کسی طرز تحریر میں اٹھتے نہیں ملتی، ایسے تجربے کبھی پسندیدہ نہیں ہوتے ـــ

اس لئے افسانے کی نئی نسل نے ایسے افسانوں اور ایسی افسانوی "حکمت" کو ثابت باہر کر دیا ہے اور اپنی زمانی تفہیم اور زندگی کے نئے معانی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ آگے بڑھنا ہی زندگی کی دلیل ہے اور زندگی سے محبت بھی، کیونکہ خیال کے آگے بڑھنے کے ساتھ، زندگی بھی بہتر صورتوں کے تقاضے لے کر آگے بڑھتی ہے۔ ماضی تو صرف تاریخ بن جاتا ہے، لیکن مستقبل تاریخ بناتا ہے اور انسانوں کے لئے کسی بہتر دنیا کی تعمیر کی فکر کرتا ہے۔ بیان کو ادا کر سکتا ہے کہ لیے

افسانے بھی آج کی زندگی کے تناظر اور اس کی لایعنیت اور پیچیدگیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ آج "جبر" کی بھی مختلف پرتیں بن گئی ہیں اور "سَتر" میں بھی ان گنت تہیں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ کہانیاں بھی ایک الجھی ہوئی سطح کر زندگی کی کہانیاں ہیں اور نئی زندگی کی پُراسراریت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کچھ برا نہ تھا۔ مگر سارا مسئلہ تو اخباریت ہی کا ہے اور گرد و پیش کی حقیقی زندگی سے ان کا تطابق۔ یہ صحیح ہے کہ سماج میں سب کچھ اچھا اچھا ہی نہیں ہوتا رہتا۔ لیکن خراب سچویشن میں بھی اچھی کہانی بنتی ہے۔ ایجابی بھی، اختلافی بھی۔ مگر تلاش اور گرفت، تجسس کے بغیر کہاں ہاتھ آتے ہیں۔ تجسس، واقعات اور حالات کا جس پر کہانی کے فن کی نادرہ کاریاں منحصر ہوتی ہیں اور نادرہ کاری ناقابلِ تقسیم علامتوں سے نہیں پیدا ہوتی۔ زندگی کا نیا پن حسن

کا معیار بدلتا ہے اور اس کی بالغ اور شعوری گرفت، کہانی کی نئی صورتیں پیدا کرتی ہے۔ پریم چند نے جب حسن کے معیار کو بدلنے کی بات کہی تھی تو وہ بھی یہی کہی تھی کہ جاگیردارانہ سماج نظام اور بورژوا دادے نے جو حسن کا معیار، اپنے مفاد اور لطف کے لئے بنایا تھا اس سے الگ ہٹ کر آج کی اصلیت کو تلاش کرو۔ اس حسن کا بھی ادراک کرو جو جھونپڑوں کے صحن دالانوں میں ہے، یہ حسن محلوں اور محفلوں کے حسن بیچارے الگ اور کہیں زیادہ حسین ہے اس حسن کی تلاش، ضروری ہے۔ کہ یہ ایک نئی طاقت ایک نیا جذبہ اور نئی تلاش ہے جو اپنی عصری زندگی کے نئے رخ کا ادراک ہے۔ یہی حسن کی نئی قدر و قیمت ہے کہ اس زندگی میں بھی انسانوں کی ایک دنیا بستی ہے۔ اسی دنیا اور اس کے مسائل کو دیکھنا بھی تو کہانی کار کا فرض بنتا ہے۔ کہانی کا تجسس صرف یہ نہیں کہ قاری ایک خواب سے چونک کر دوسرے خواب میں چلا جائے۔

بادلوں کی پٹریوں کے نیچے، ایک بزرگ نماز پڑھتے ہوئے ملیں اور قاری دریائے حیرت میں غوطہ کھانے لگے یا پھر ایک برج گلاس سے اوپر آئے اور دوسری سے نیچے جا کر کنوئیں کی تہہ میں پانی کا منبع تلاش کرنے میں لگ جائے۔ کہانی کا تجسس ان طاقتوں کا ڈھونڈنا بھی ہے جو اپنی سیاسی فتح اور کامرانی کے لئے، انسانوں کی لاشوں کو کھیتوں میں بیج کی طرح آخر کس لئے بو رہی ہیں اور ایسا کرنے میں ان کی کس ذہنیت اور سیاست کا اظہار ہوتا ہے۔ ان چھپے ہاتھوں اور گھناؤنی سازشوں پر کہانیاں لکھا کیا نئے کہانی کار کا فرض نہیں؟ کیا فرقہ واریت کی نئی لہر کی لپیٹ میں آئی ہوئی ہندوستانی قوم اس کی بے بسی اور الجھنیں ہمارے کہانی کاروں کا مسئلہ نہیں؟ شاید ہمارے افسانہ نگار ان باتوں کو لمحاتی سمجھتے ہیں اور جو چیز وقتی اور لمحاتی ہو اسے بہت سے لوگ ادب نہیں سمجھتے۔ اگر ملک میں ہونے والے یہ واقعات، جو ایک گٹھے WELL KNITT سماج کے انتشار کا سبب بنے ہوئے ہیں ہمارے ادب اور ادیبوں کا مسئلہ نہیں تو پھر، موضوع تمہاری کہانی کا کیا ہوگا؟ یہ جو نئی کلچر تہذیب سے زندگی کے عدم تحفظ اور آتنک واد کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں کیا یہ تمہاری کہانیوں کا مسئلہ نہیں؟ کیا آج کی زندگی کو حقیقی میں بدلنے والوں کے چہرے سے نقاب ہٹانا، جدید دور کا تجسس نہیں ہے؟ کیا میرٹھ، گجرات، کانپور اور کلکتہ کے قتل عام میں مرنے والے انسان، تمہاری کہانیاں نہیں۔ کہانی کارو! یہ نہ بھولو کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب تمہاری سماجی تاریخ بھی ہے جسے آواز چاہیے۔ مجرمانہ خاموشی نہیں، عزم و ہمت چاہیے، خوف کا پرچار نہیں، درد کا شعور چاہیے "دُردشا کا بچھوؤں سے بھرا کمنڈل" نہیں۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہے جس میں ملک کا پورا کردار داؤں پر لگا ہوا ہے ہزاروں سال کی مشترکہ تہذیب منتشر ہو رہی ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہے جس میں اس گنگا جمنی تہذیب کے تار و پود بکھر رہے ہیں۔ ان حقیقتوں کو اپنی کہانیوں میں سمیٹ لو اور اپنے فیصلے کی آواز کو تیز کرو اور اپنے اشاروں کی سمتیں واضح۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ وقت آ جائے جب تم کو اس کی اجازت بھی نہ ملے کہ تم اپنے محسوسات کا اظہار بھی کر سکو۔

نازی جرمنی کے ادیبوں کی طرح اور تمہارے دیکھنے کے لئے صرف حکومت کی آنکھ رہ جائے یا پھر تم کنسنٹریشن کیمپ میں پہنچ جاؤ جہاں تمہارے محسوسات اور تمہاری آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ کنوئیں کے اندر سے کیا آواز آ رہی ہے؟ سواری کے انتظار میں کوئی خوف سے پیلا چہرہ بنائے اپنے وجود کی لایعنیت تلاش کر رہا ہے، سورج سے اپنا مکھڑا تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہو۔ مگر یہ تمہارے اپنے سماج اور دور میں جو موت کے کنوئیں بن رہے ہیں، جو گیس چیمبروں میں انسانوں کو ڈالنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، جو استحصال اور اقدار کی نفی کا بازار گرم ہے، وہ تمہیں دکھائی نہیں پڑتا؟ فرقہ پرستی کی آگ میں جلتا ہوا ہندوستان، پاکستان میں مہاجروں کے مسئلے اور عالمی گدھ بازیاں تمہارے ضمیر کو کیوں کھنگال نہیں دیتے؟ اگر ان باتوں کے لئے تمہارا دل نہیں دھڑکتا، تمہارا قلم متحرک نہیں ہوتا، ان لوگوں کے یہ غم اور یہ مسائل تمہیں متاثر نہیں کرتے جو برِّ صغیر اور عالمی افق پر ایک مستقل مسئلہ بنے ہوئے ہیں تو پھر نہ زندگی تمہارا مسئلہ ہے، اور نہ آرٹ، نہ انسان۔ تو پھر تم کس کی کہانیاں، کس لئے اور کس کے لئے لکھ رہے ہو؟ ✻

«شاعر» مارچ ۹۳ء

پنڈت نہرو کی نگاہ میں ہندوستانی مسلمان

۱۹۵۳ء میں ہند کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے وزرائے اعلیٰ کو ایک خط لکھا تھا جس میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کے متعلق اندیشوں کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ یہ خط جوں کا توں ہم یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

نئی دہلی، ۲۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

مائی ڈیر چیف منسٹر!

میرے ساتھی وزیر داخلہ، ڈاکٹر کاٹجو آپ کو الگ سے ایک نوٹ بھیج رہے ہیں جو ہندوستان میں عدالتی نظام کی اصلاح کے بارے میں ہے۔ یہ نوٹ اس مسئلے کو حل کرنے کی ایک ابتدائی کوشش کی ہے اور اس پر تفصیل سے غور و خوض کرنے سے قبل ہم آپ کی رائے جاننا چاہتے ہیں۔ عدلیہ کے ذمہ داروں اور دوسرے متعلقہ افراد سے بھی ہم صلاح و مشورہ کریں گے، تاہم مشاورت کے کسی طویل عمل سے گذرنے کی خواہش نہیں ہے، کیونکہ ایسی صورت میں بہت تاخیر ہو جائے گی، اور ہم جلد اس کو کرنا چاہتے ہیں آئندہ نومبر کے پارلیمنٹ کے سیشن میں اس سلسلے میں ایک بل پیش کرنے کی ہم ہر ممکن کوشش کریں گے۔

میرے دل میں جو چند اندیشے سر ابھار رہے ہیں ان میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ اقلیتوں سے

متعلق ہندوستان میں صورت حال کئی لحاظ سے بگڑ رہی ہے اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا آئین اچھا ہے اور ہم اپنے قوانین و ضوابط میں کسی کے ساتھ امتیاز نہیں کرتے، مگر انتظامیہ کے طریق کار افسروں کے طرز عمل سے دبے پاؤں ایسی تبدیلیاں آرہی ہیں جو ان قوانین و ضوابط پر اثر انداز ہوتی ہیں، اکثر یہ تبدیلیاں جان بوجھ کر نہیں کی جاتیں، مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

جہاں تک سرکاری ملازمتوں کا تعلق ہے عام طور پر اقلیتوں کی نمائندگی کا تناسب کم ہے اور کچھ جگہوں پر دراصل کچھ زیادہ ہی کم ہے، یہ درست ہے کہ ملک کے بعض ممتاز عہدوں پر اقلیتی طبقوں کے لوگ فائز ہیں، اور ان ہی میں سے خارجہ مشن میں بھی اعلا مناصب پر کام کر رہے ہیں لیکن جہاں تک مرکزی حکومت اور بعض دوسری جگہوں کے اعداد و شمار کا تعلق ہے مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی ہے کہ اقلیتوں کی حالت بہت خراب ہے خصوصاً مسلمانوں کی اور بعض جگہ دوسروں کی بھی۔

ہماری دفاعی خدمات میں بہ مشکل کوئی مسلمان باقی رہ گیا ہے۔ دہلی کے اتنے بڑے سنٹرل سکریٹریٹ میں معدودے چند مسلمان ہیں، شاید صوبوں میں صورت حال کسی قدر بہتر ہو، مگر بہت زیادہ نہیں جس چیز کا مجھے زیادہ احساس ہے وہ یہ ہے کہ اس صورتِ حال کو سدھارنے کی کوئی کوشش نہیں کی جارہی ہے، اگر اس صورت حال کو روکا نہیں گیا تو اور زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

ہمارے لئے یہ کہنا بہت آسان ہے کہ تقرر ات کے سلسلے میں ہم کسی فرقہ وارانہ اور ایسے ہی دوسرے احساسات سے بالکل کام نہیں لیتے ہیں، فرقہ پرستی اور اس کے طریق کار کا میں حامی نہیں ہوں، اور میرے نزدیک ہندوستان میں یہ انتہائی خطرناک ذہنیت ہے جس کا ہر محاذ پر مقابلہ کرنا چاہئے، اس کے ساتھ ہمیں یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ ہندوستان جیسے وسیع اور مخلوط آبادی کے ملک کے تمام علاقوں اور تمام فرقوں میں توازن کا احساس، نیز منصفانہ سلوک اور خوش آئند مستقبل کی ضمانت دی جانی چاہئے، اگر کسی بھی توازن کو بگاڑنے کا رجحان ہو، یا ایک پہلو کو دوسرے کے عوض ابھارا جائے تو اس کا نتیجہ مختلف بڑے گروہوں کے درمیان توازن کی کمی بے اطمینانی اور مایوسی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

بالکل ایسا ہی ہو رہا ہے، اور یہ اچھی بات نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ جہاں تک سرکاری ملازمتوں کا تعلق ہے ہمیں اس غلط رجحان کو روکنے کے لئے خصوصی کوشش کرنی چاہئے، اگرچہ سرکاری ملازمین ہندستان کے نظام کا ایک اہم جزو ہیں مگر جس صورت حال سے ہم دو چار ہیں وہ سرکاری ملازمتوں سے بھی زیادہ اہم اور وسیع ہے، ہمارا فرض ہے کہ ملک کے ہر فرد اور ہر طبقے میں یہ احساس پیدا کردیں کہ وہ ایک دوسرے کے شریک کار ہیں، نیز وہ فوائد اور مواقع میں بھی مکمل طور پر حصہ دار ہیں، یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہم صحیح ذہنی رویہ پیدا کریں گے۔ مجھے اس سے زیادہ بیجا بات اور کوئی نہیں معلوم ہوتی کہ ہم دوسروں کو وفاداری کا سبق دیں " وفاداری " کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص ہمارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔ یہ بالکل وہی رویہ ہے جسے دنیا کے ایک حصے میں کمیونسٹوں نے اختیار کیا ہے، اور دوسرے حصے میں امریکیوں نے، دونوں ہی اپنے اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق یکسانیت اور فرماں برداری کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کی وجہ سے بین اقوامی فضا میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے، یہی طرز نظر قومی پیمانے پر بھی، لازمی طور پر ٹکراؤ کا باعث ہوگا، اس سے قطع نظر فی نفسہٖ یہ غلط بات ہے۔

اوپر میں نے مسلمانوں کا حوالہ دیا ہے مگر اس کا اطلاق عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں پر بھی ہوتا ہے، بدقسمتی سے ہمارے وطن میں عیسائی مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد میں تشویش کا احساس پایا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر سوچتے ہیں کہ

ہندستان میں ان کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندستان ایک مخلوط ملک ہے۔ "مخلوط" بہت سے معنوں میں، مذہب، رسم و رواج، زبان، طرز زندگی وغیرہ۔ اکثریتی فرقے کی دوسروں پر اپنے آپ کو مسلط کرنے کی کوشش محض اندرونی کشاکش کو دعوت دینا ہے جو کہ اتنی ہی بری ہے جتنی کہ بیرونی۔ ہمارے لئے آج ہندوستان میں بنیادی مسئلہ، حقیقی اور معنوی لحاظ سے، ہندوستان کی تعمیر کا ہے، یعنی ہماری قوم کی نفسیاتی یکجہتی کا۔

میں سمجھتا ہوں کہ زبان سے متعلق رویہ اکثر بہت زیادہ خوش کن نہیں ہوتا، اگرچہ میرے خیال میں کچھ عرصے سے اس میں کچھ بہتری آئی ہے۔ ہم ہندی کو قومی زبان بنانا چاہتے ہیں اور میرے نزدیک ایسا ہونا بہت ضروری ہے، اس کے لئے ہمیں کام کرنا چاہیے لیکن اس کا طریقہ بہت اہمیت رکھتا ہے اگر یہ طریقہ درست نہ ہوگا تو ہم اپنے مقصد سے اور زیادہ دور ہو جائیں گے۔ زبان کا معاملہ جذبات سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے بڑی سی احتیاط کی ضرورت ہے، جس نے بھی یوروپ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، اسے معلوم ہے کہ وہاں زبان کے اختلاف نے دوسرے تمام مسائل سے زیادہ مشکلات پیدا کی ہیں اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ کسی زبان کو کچلنے کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلا ہے۔ اس تجربے کے بعد اہل یوروپ کشاکش یا دباؤ کے کسی قسم کے اظہار سے بچنے کے لئے متعدد اور متنوع زبانیں تک قبول کرنے کا میلان رکھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں نے بھی سرکاری طور پر کئی زبانوں اور بعض اوقات ایک سے زائد رسم الخط کو اختیار کیا ہے۔

اردو کے مسئلے سے جس طرح ہندوستان کے مختلف حصوں میں عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس سے مجھے بہت دکھ پہنچا ہے۔ یہ سب محض تہذیبی وجوہ کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ سیاسی اسباب کی بنا پر ہے۔ میں اس سوال کی خوبیوں میں جا سکتا تھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ خوبیاں بہت وقیع ہیں، لیکن ایسے معاملات میں محض خوبیاں ہی اہم نہیں ہوتیں بلکہ وہ نفسیات اور ذہنی ردعمل بھی اہمیت رکھتے ہیں جو اس کے ساتھ لوگوں کی بڑی تعداد کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد اردو بولتی اور لکھتی ہے۔ پنجاب، دہلی اور شمال یوپی میں ایسے لوگ کافی ہیں، ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے لوگوں کی خاصی تعداد ہے، خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں درحقیقت ایسے گروہ پورے ہی ہندستان میں موجود ہیں اور بعض اوقات ان کی تعداد بھی خاصی بڑی ہوتی ہے۔ جنوب میں اردو لکھنے اور بولنے والوں کی تعداد دیکھ کر مجھے تعجب ہوا خاص طور پر حیدرآباد اور آندھرا پردیش کے سرحدی علاقوں میں جب بھی وہاں جاتا ہوں تو اکثر لوگ میری زبان آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

یہ حقیقت بہت اہم ہے کہ ہندوستان میں اردو ایک خاص قوت کی حامل ہے اور یہ تاثر دینا کہ ہم اس کے خلاف ہیں بہت بڑی تعداد کی دل آزاری کا باعث ہوگا اور ان میں یہ احساس پیدا کرے گا کہ ہم اس چیز کے خلاف ہیں جو ان کو بہت زیادہ عزیز ہے۔ دوسرے معاملات کی طرح اس کو اس طرح نہیں دیکھا جا سکتا کہ ہم اس کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں بلکہ یہ متعلقہ افراد کیا محسوس کرتے ہیں یہ نہیں کہ اکثریت کیا سوچتی ہے بلکہ یہ کہ اقلیت کا ردعمل کیا ہے، اس لئے کہ ہمارا مقصد ہمیشہ اقلیت کے ذہن میں تکمیل آرزو کا احساس پیدا کرنا رہا ہے۔

جب میں اردو کی بات کرتا ہوں تو میرا مطلب اردو کے ساتھ فارسی رسم خط بھی ہوتا ہے۔ یہ زبان کسی تاریخی نقطۂ نظر

نے ہمارے لئے غیر ملکی ہو سکتی ہے، مگر ہندستان میں اس کا استعمال صدیوں سے قابل لحاظ پیمانے پر ہوتا آرہا ہے۔ وسط ایشیا کے کچھ علاقوں اور مغربی ایشیا اور ہندستان کے درمیان یہ رابطے کی کڑی رہی ہے، اور اب بھی ہے، اس کی وجہ سے ان ملکوں سے جن کی دوستی ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، سیاسی اور دوسرے قسم کے تعلقات قائم اور استوار ہوئے ہیں۔

تہذیبی طور پر اردو ان رجحانات کی حامل رہی ہے جن سے ماضی میں ہندی کو تقویت ملی ہے اور یہ بات مستقبل میں بھی ہو سکتی ہے، یہ یقیناً ہندی کی حریف نہیں ہے، اور یہ ممکن بھی نہیں ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کی اہمیت ہندستان میں آہستہ آہستہ کم ہوتی جائے اور یہ ایک تاریخی ارتقاء ہوگا، ہندی اور اردو اپنی ساخت اور اسلوب کے لحاظ سے بتدریج ایک دوسرے کے نزدیک آسکتی ہیں۔ اور ایسا ہونا ہی چاہیے۔ ناگری رسم خط کا پھیلاؤ لازمی ہے، لیکن ایسا کرتے وقت اردو اور اس کے رسم خط کو دبانے کا تاثر پیدا کرنا ایک غلط پالیسی ہے، اور ہمارے تہذیبی نظریے کو محدود کرنا ہے، اور ہمارے آئینی منصوبے کے خلاف ہے۔

لیکن میں لوگوں کی بڑی تعداد پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں زیادہ فکرمند ہوں، خواہ یہ تاثر ہمیں ناواجب نظر آئے، تاہم اس حقیقت کو سیاسی اور تہذیبی دونوں نقطۂ نظر سے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ ہمیں اس صورت حال کا دانشمندی سے سامنا کرنا ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو اور اس کے رسم الخط سے متعلق موجودہ پالیسیوں کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ خاصی حد تک ہندوؤں اور دوسروں میں بھی محرومی اور ناامیدی کا گہرا احساس پایا جاتا ہے۔ کچھ صوبوں میں حکومت نے اردو کی حوصلہ شکنی کے لئے واضح اقدامات کئے ہیں اور ایسے اسکولوں کی مالی امداد روک دی ہے جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے بہت سے بچے اور ان کے والدین جو اردو پڑھنے کے خواہشمند تھے اب اس سے محروم ہیں، بہت سی جگہوں پر اردو کے خلاف تیز اور جارحانہ تحریکیں چلائی جا رہی ہیں گویا اردو ہماری کوئی خطرناک دشمن ہے، اگر ایسا ہی ہے تو ہم انھیں جو اس کو چاہتے ہیں نہ صرف ناراض کریں گے بلکہ لڑائی پر اکسائیں گے بھی۔ میں اس موضوع پر بہت متفکر ہوں، اس لئے کہ ایسا کرنے سے میرے تمام تہذیبی معیار متاثر ہوتے ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ ہندستان کی یکجہتی کا مستقبل بھی مجھے بگڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر اس دانشمندی کو فراموش کر چکے ہیں جس کا گاندھی جی نے اس ملک کے بعض اہم مسئلوں کو سلجھانے کے سلسلے میں استعمال کیا تھا، ایسا ہی اہم مسئلہ زبان کا بھی تھا اور انہوں نے اردو کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ہم پر زور ڈالا تھا، اس وقت کے مقابلہ میں اب صورت حال بدل چکی ہے اور غالباً ہم اب وہاں تک نہیں جا سکتے جہاں تک اس سلسلہ میں گاندھی جی لے جانا چاہتے تھے تاہم بنیادی فکر اب بھی ویسی ہی ہونا چاہئے اور وہ دن تو بہت ہی برا دن ہوگا جب عوامی ہنگامے اور ناجائز مخالفت کی وجہ سے اس مسئلے پر یا کسی بھی اور مسئلے پر ہتھیار ڈال دیں گے۔

قومیت کا جذبہ کسی بھی فرد یا قوم کے لئے (ذہنی طور پر) وسعت اور پھیلاؤ کا تجربہ ہے خصوصاً ایک ایسے ملک کے لئے جو غیر ملکی قبضے میں ہو، قوم پروری ایک جوڑنے والی اور متحد کرنے والی قوت ہوتی ہے، لیکن ایک وقت ایسا بھی آسکتا جب اس اثر کا دائرہ کار بہت سکڑ کر رہ جائے۔ بعض اوقات جیسا کہ یوروپ میں ہوا، یہ جذبہ جارحانہ اور جنگجویانہ ہو جاتا ہے اور خود کو دوسرے لوگوں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ ہر قوم اس عجیب دھوکہ کا شکار ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے ممتاز اور برتر قوم

ہے، وہ جب طاقت ور اور مضبوط ہو جاتی ہے تو خود کو اور اپنے طور طریقوں کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتی ہے۔ اپنی اس کوشش میں کبھی نہ کبھی وہ بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور لڑکھڑا کر گر پڑتی ہے، جرمنی اور جاپان کی انتہا پسند قوم پروری کا معاملہ ٹھیک ایسا ہی تھا۔

لیکن قوم پروری کی ایک غیر محسوس شکل ذہنوں کی وہ تنگ نظری ہے جو ملک میں اس وقت پھیلتی ہے جب اکثریتی فرقہ خود کو ہی پوری قوم سمجھتا ہے اور اقلیت کو خود میں جذب کرنے کی کوشش میں دراصل اسے اور زیادہ الگ کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں ذات پات کے نظام اور علاحدگی پسندانہ طور طریقوں کی وجہ سے خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے، ہمارے اندر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو کر اپنی وسیع تر یک جہتی کو بھول جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

فرقہ پرست تنظیمیں شدید تنگ نظری کی ایسی واضح مثالیں ہیں جو قوم پرستی کے بھیس میں ابھر کر سامنے آ رہی ہیں، اتحاد کے نام پر وہ تقسیم کرتی ہیں اور تباہ کر ڈالتی ہیں، سماجیاتی اصلاح کے مطابق وہ بد ترین رد عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں، ہمیں ایسی فرقہ پرست تنظیموں کی ملامت کرنی چاہئے مگر بہت سے دوسرے لوگ بھی اس تنگ نظری سے آزاد نہیں۔ یہ بہت ہی عجیب بات ہے کہ ہندوستان کی وسعت، جو اپنے میں ایک پوری دنیا ہے، اپنے اندر رہنے والوں کو نہ صرف بے فکر بناتی ہے بلکہ باقی دنیا کے معاملات کے تئیں ناواقف اور تنگ نظر بھی بناتی ہے۔ ہمیں ان تمام قوتوں کے خلاف صف آرا ہونا ہے۔

کشمیر کے حالیہ واقعات سے بہت سے لوگوں کو خوشی ہوئی ہے جو شاید یہ نہیں جانتے کہ ایسا کر کے انہوں نے مستقبل میں اپنے لئے ضرور دشواریاں پیدا کر دی ہیں یہ تبدیلیاں ناگزیر تھیں اور ان کا تجزیہ کرنے پر ہم ایک بہت بڑے سبب تک پہنچ سکتے ہیں یعنی ہندوستان کے بہت سے لوگوں کی تنگ نظری اور متعصبانہ نقطۂ نظر کا کشمیریوں پر رد عمل۔ میں محض جن سنگھ اور پرجا پریشد کا حوالہ نہیں دے رہا ہوں گو انہوں نے اس سلسلے میں اہم رول ادا کیا ہے اگر ہندوستان کو واقعی ایسا عظیم ہونا ہے جیسا کہ ہم سب کی خواہش ہے تو اسے اندرونی یا بیرونی طور پر کسی ایک ہی کا ہو کر نہیں رہنا ہوگا اسے ایسی ہر چیز کو ترک کرنا پڑے گا جو ذہنوں کی ترقی اور سماجی زندگی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہو۔

ایسا ہی ایک مسئلہ اور ہے جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، یہ عورتوں سے متعلق ہے گذشتہ عام انتخابات میں، میں نے خاتون امیدواروں پر زیادہ اصرار کیا تھا میری کوششوں کے باوجود معدودے چند عورتوں کو ہی امیدوار بنایا گیا یا منتخب کیا گیا، آج ہماری سیاسی تنظیم میں بہت کم عورتیں کام کر رہی ہیں، اگرچہ ہندوستانی عورت کا معیار کافی بلند ہے اور دنیا میں مردوں کی بہ نسبت عورتوں نے ہمیں زیادہ متاثر کیا ہے، کوئی بھی قوم عورتوں کو ساتھ لئے بغیر بہت آگے تک نہیں جا سکتی۔ چینی انقلاب مختلف اعتبار سے بہت اہم ہے لیکن اس کا ایک اہم پہلو جس کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم ہے وہ عورتوں کی حیثیت میں ہونے والی تبدیلی ہے اور یہی اصل انقلاب تھا۔

ان وجوہات کے علاوہ ایک خالص سیاسی وجہ یہ ہے کہ ووٹ دینے والوں کی کل تعداد کا تقریباً نصف عورتوں پر مشتمل ہے، انہیں ووٹ کا حق دینے کے بعد ہمیں اپنے عمل کی پیروی میں ان کیلئے کچھ اور دروازے بھی کھولنا ضروری ہوں گے، اگر ہم ان کو یہ مواقع مہیا نہیں کرتے تو ہم گویا ووٹروں کی آدھی تعداد کو نظر انداز کرتے ہیں اور یہ انتہائی غیر دانشمندانہ فعل ہوگا۔ میں نے اپنے ذہن میں آنے والے کچھ خیالات

بے تکلفی سے آپکو لکھنے کی جسارت کی ہے، میری خواہش ہے کہ آپ ان پر غور و فکر کریں۔ یہ اہم معاملات ہیں اور ہمارے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ معمول کے مطابق ہر پندرہ روز پر خط بھیجنے میں میں کسی قدر غافل رہا، یہ خصوصی خط ہے اور پندرہ روزہ خط کے علاوہ ہے جس کے بارے میں مجھے امید ہے کہ اس کا سلسلہ جلد شروع ہو جائے گا۔

آپ کا مخلص
جواہر لال نہرو

(آواز ملک - ۱۶/۱۲/۹۲ء)

"محدث" جنوری، فروری ۹۳ء

جی ایم جگنو
۱۷۱/۱، چھاتا والی گلی، کلکتہ ۱۲

فرقہ وارانہ فسادات کے گھیرے میں

سیاہ اتوار ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء سے لے کر جو دس دن گذرے ان دس دنوں نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے "سیاہ باب" کا اضافہ کیا ہے۔ ان دس دنوں کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نفاق و نفرت کی راہ پر کس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ اب پیچھے ہٹنا مشکل ہو گیا ہے۔ ان دنوں میں جو کچھ ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اس سے ہمیں ۱۹۴۷ء کی یاد آتی ہے جب خود غرض سیاست دانوں کی مفاد پرستی نے ہندو مسلم اتحاد میں شگاف ڈال کر مفاہمت کی تمام راہیں بند کر دی تھیں اور ملک کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ایودھیا میں ایک طرف کار سیوک بابری مسجد کو شہید کرنے کے نام پر ملک کی یکجہتی اور عدلیہ کے دستور کو تباہ و برباد کر رہے تھے تو دوسری طرف ان کے ساتھی لٹیرے پورے ایودھیا میں مسلمانوں کے مکانات اور مسجدوں کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ ایودھیا جہاں مسلمانوں کے چار سو سے زیادہ گھر تھے اور جن کی آبادی تقریباً پانچ ہزار تھی اور مسجدوں کی تعداد ۳۵ تھی۔ مسلمانوں کے تمام گھروں کو پہلے لوٹا گیا اور پھر پھونک دیا گیا۔ بہت سے لوگ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بہت سے لوگ لاپتہ ہو گئے اور بہت سے لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ بابری مسجد کے انہدام کے ساتھ ساتھ ایودھیا کی تقریباً تمام مسجدوں کو مسمار کر دیا گیا اور وہاں آگ لگا دی گئی۔ وہاں فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا بلکہ ایودھیا میں مسلم کشی کی گئی۔ ان واقعات کا موازنہ ہم جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کے حالات سے ہی کر سکتے ہیں جب جمہوریت پسند سوشل ڈیموکریٹک طاقتوں کی کمزوری کے باعث ملک میں فاشزم کا عروج ہوا اور ہٹلر اقتدار میں آیا۔ بابری مسجد کے سانحے کے بعد ملک بھر میں جو فسادات ہوئے ہیں ان میں ۵ ہزار سے زیادہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ فرقہ وارانہ فسادات تو ہندوستان میں آئے دن ہوتے ہیں مگر یہ فسادات گویا آنے والے کل کی بہت بڑی خونریزی کا پیش خیمہ ہیں۔ ان فسادات کا الزام کانگریس والے سیدھے سیدھے بی جے پی کے سر نہیں ڈال سکتے کیونکہ جہاں کانگریس کی حکومتیں تھیں وہاں بھی فسادات کی شدت ایسی ہی تھی بلکہ زیادہ ہی تھی۔ مغربی بنگال جہاں کئی برسوں سے کوئی بڑا فساد نہیں ہوا ایسی ہی زبردست لوٹ مار اور آتشزنی کی وارداتیں ہوئیں۔ وزیر اعلیٰ جیوتی باسو بھی کئی دنوں تک بے دست و پا نظر آتے تھے۔ تیلنی پاڑہ اور مٹیا برج میں بلوائیوں کے ساتھ پولیس نے بھی انتہائی بے رحمی کے ساتھ بے پناہ ظلم ڈھایا۔ کلکتہ شہر میں جو خونریزی ہوئی اس سے کئی لوگوں کو اگست ۱۹۴۶ء کی یاد تازہ ہو گئی جب ایک پارٹی کی طرف سے ایکشن شروع کر کے شہر خون میں نہلا دیا گیا تھا۔

ان تمام فسادات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کہیں ایسا نہیں لگا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین لڑائی ہو رہی ہے بلکہ واضح طور پر لگ رہا تھا کہ مسلم اقلیت کو ختم کرنے کی مہم شروع کر دی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ فسادات میں زیادہ تر لوگوں کی اموات پولیس کی گولیوں سے ہوئی ہیں اور چھرے بازی میں کم لوگ مرے۔ پولیس والے پہلے بھی فسادات میں ملوث رہے ہیں۔ خواہ وہ میرٹھ کا فساد ہو یا بھاگلپور کا۔ حالیہ فساد تو بڑے وسیع پیمانے پر تھا اس لیے پولیس والوں نے بھی بڑے پیمانے پر وحشیانہ رول ادا کیا۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست کسی بھی پارٹی کی ہو لیکن پولیس کا کردار ہر جگہ یکساں بالکل ایک جیسا ہے خواہ وہ مدھیہ پردیش ہو کہ اتر پردیش، ہریانہ ہو کہ گجرات، مہاراشٹر ہو کہ بنگال ہر جگہ پولیس والوں کا کردار ایک جیسا ہی نظر آیا۔ رام نام بھی

یو دھیا جہاں مسلمانوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا وہاں بھی پولیس والوں نے ملک کے دیگر علاقوں کی پولیس والا رول ادا کیا مگر رام جنم بھومی کا دادر اروغہ ڈی پی شنگلا ایسا تھا جس نے کم از کم دو سو مسلم عورتوں، بچوں اور مردوں کو اپنی جان پر کھیل کر بچایا۔ اس مہم میں اس کا ساتھ تیواری نامی ایک شخص نے دیا۔ ان کے علاوہ عام ہندوؤں میں سے تقریباً دو درجن افراد نے مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ اتر پردیش کی پی اے سی پورے ملک میں سب سے زیادہ بدنام ہے۔ حالیہ فسادات میں پورے ملک میں مسلمانوں کے خلاف لوٹ پھونک کا سلسلہ جاری ہوتا رہا اور پولیس ان سارے واقعات کو اندھی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ شہر کی سڑکوں پر ظلم و تشدد کا بازار گرم دکھائی دے رہا تھا۔ فسادات کے وقت پولیس جو کچھ کرتی ہے اس کی کئی وجوہ ہیں اس سلسلہ میں دو باتیں زیادہ اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریاست میں حکمراں پارٹی کے لیڈر پولیس کے کام میں بے جا مداخلت کرتے ہیں اور حساس مقامات پر پولیس تعینات کرتے وقت اس کی صلاحیت نہیں دیکھی جاتی بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون سا پولیس افسر حکمراں پارٹی کے مفاد کی حفاظت کرے گا۔ دوسری بات یہ کہ پولیس والوں کے ساتھ سماج دشمن عناصر کا میل جول اس قدر بڑھ گیا ہے کہ بعض مقامات پر ان کالا دھندہ کرنے والوں اور پولیس والوں میں کوئی فرق ہی نہیں رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فساد ہوتا ہے تو پولیس والے فسادیوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مغربی بنگال میں اگرچہ گزشتہ پندرہ سالوں سے کوئی بہت بڑا فساد نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سی پی ایم اور اس کے کارکنوں کے ساتھ ساتھ ان کی قیادت نے کبھی ایسے حالات ہی پیدا نہیں ہونے دیئے کہ ہندو مسلم آپس میں لڑنے لگیں مگر بابری مسجد کے انہدام کے بعد اگر مغربی بنگال خاص طور پر کلکتہ کی صورت حال وزیر اعلیٰ جیوتی باسو کے بس سے باہر ہو گئی تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ریاستی حکومت نے اتنا بڑا سانحہ اور المیہ دیکھ کر بھی کوئی حفاظتی تدابیر نہیں کیں۔ لگتا ہے ریاستی حکومت کو اپنے کارکنوں اور پولیس پر بے پناہ اعتماد تھا مگر مغربی بنگال میں پہلی جیسی بات نہیں ہے۔ پہلے سی پی ایم ورکرز انقلابی کمیونسٹ تھے جو ہر طرح کی سختیاں جھیل کر بھی اپنے نصب العین کو نہیں چھوڑتے تھے مگر برسوں سے اقتدار میں رہنے کے بعد اب زندگی میں زیادہ آسائشوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ اب ورکرز پارٹی ڈسپلن کے بھی پابند نہیں رہے اور انہوں نے سماج دشمن عناصر سے بھی راہ و رسم پیدا کر لی ہے۔ یہی حال اب کلکتہ پولیس کا بھی ہے۔ ان لوگوں کی کمزوریوں نے مغربی بنگال میں فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ دہرا دی۔

پورے ملک میں بہار جو کہ فرقہ وارانہ فسادات کے معاملہ میں ہمیشہ سرفہرست رہا ہے وہاں ملک کے دیگر مقامات کے مقابلے میں امن رہا۔ دنگے وہاں بھی ہوئے مگر برائے نام تھوڑے سے علاقوں میں ہی محدود رہے۔ وہاں کے وزیر اعلیٰ لالو پرشاد یادو واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بہار میں فسادات روک دیئے۔ انہوں نے بے پناہ جسارت کا مظاہرہ کیا اور اضلاع کے حکام کو بروقت متنبہ کیا ساتھ ہی ساتھ بدامنی کو روکنے کے انتظامات کی ذاتی طور پر نگرانی کرتے رہے۔ انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ بابری مسجد ڈھائے جانے کے بعد کار سیوک جب بہار میں اپنے گھروں کو واپس آئیں تو انہیں فساد کرنے کا موقع نہ ملے۔ بہر حال حکومت بہار نے تو یہ ثابت کر دیا کہ اگر کوشش کرے تو وہ انتہائی سنگین حالات میں بھی فساد کو پھیلنے سے روک سکتی ہے۔

ہندوستان کو ہمیشہ روایتی تہذیب و ثقافت اور فرقہ وارانہ اتحاد کا گلشن کہا گیا ہے لیکن بابری مسجد کے انہدام کے بعد ان گلشنوں میں ایسا زہر پھیلا جس نے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور تشدد کے آتش فشاں کا روپ دھار لیا۔ ایودھیا سانحے کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات میں جو لوگ مرے ان میں ۹۵ فیصد لوگ شہروں میں رہنے والے تھے۔

بڑے شہروں میں جو لوگ مرے اور جو زخمی ہوئے ان کی تعداد کچھ اس طرح ہے۔

شہروں کے نام	مرنے والوں کی تعداد	زخمیوں کی تعداد
بمبئی	٥٠٠	١٠٠٠
سورت	١٨٤	٦٠٠
بھوپال	١٣٩	٤٥٠
کلکتہ	٢٥	٥٠
احمد آباد	١٥٠	٧٠٠
کانپور	٦٢	١١٨
حیدر آباد	١٣	٥٠
میسور	٩	٢٦٠
بنگلور	٢٨	١٥٠

مسجد ڈھائے جانے کے ڈیڑھ مہینے بعد بھی بمبئی اور احمد آباد وحشی پن اور تشدد کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ لوگ زندہ جلائے جا رہے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کی جا رہی ہے (اس سلسلے میں سورت کے سانحہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ سترہ عورتوں کے ساتھ متعدد مرتبہ اجتماعی عصمت دری کی گئی۔ اس کے علاوہ سات عورتوں کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کی گئی اور پھر انہیں قتل کر دیا گیا)۔ معصوم بچوں کے سامنے ماں باپ کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ دو فرقوں کے مابین خلیج اتنی گہری کبھی نہیں ہوئی جتنی اب شہری حلقوں میں نظر آ رہی ہے۔

ایک ماہ بعد اچانک ۶ جنوری ۱۹۹۳ء کو وسطی بمبئی کے ڈونگری اور پائی دھونی جیسے مسلم اکثریت علاقوں میں تشدد کا لاوا پھوٹ پڑا۔ ۷ جنوری کو جوگیشوری میں آتش زنی کی واردات نے تشدد کا ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ چار دنوں تک شہر میں مسلمانوں کے گھروں اور کاروبار کو نشانہ بنایا گیا۔ تباہی مچانے والے شیو سینک

تھے۔ تاہم دہرادون، بانچلہ، بریلی، اور الٰہ آباد اور سہام جیسے علاقوں سے فسادات کی خبریں موصول ہوئیں اور ... تک پھیل گئی کہ ... اور ... کے علاقے بھی ... اس کی لپیٹ میں آکر جھلس گئے، جب تک نوبت کو سنبھالا تب تک فرقہ وارانہ تشدد میں پانچ سو افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

بمبئی کے فرقہ وارانہ فساد سے بہت پہلے یہ فساد منصوبہ بند تھا۔ مسلمانوں کی دکانیں، ریستوراں، املاک اور دیگر املاک کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔

بمبئی میں ہونے والے تازہ فرقہ وارانہ فساد میں پولیس نے بلوائیوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ شاید اسی لئے کہ دسمبر کے فساد پر پولیس ... میں ناکام رہی تھی تو اس پر کافی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اردو بلٹز کے ایڈیٹر ہارون رشید نے ... اور ... کتابوں اور اپنی ڈائریوں کو جلنے سے بچا لے اور نہ پولیس ان کی کوئی مدد کر سکی۔ "انقلاب" کے دفتر پر دو دن تک حملہ ہوتا رہا۔ "انقلاب" کے چیف رپورٹر وسیم انصاری اور "اردو ٹائمز" کے صحافی فاروق انصاری کی گاڑی نذر آتش کر دی گئی۔ آٹھ ہیرو مسلمان خوش نصیب تھے جنہیں اپنی جان پر کھیل کر سنیل گواسکر نے بچا لیا۔ بمبئی کئی دنوں تک سلگتی اور جلتی رہی۔ خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی۔ تشدد کا طوفان کم ہونے تک بہت سی زندگیاں لقمۂ اجل بن گئی تھیں اربوں کی املاک لوٹی جا چکی اور تباہ کی جا چکی تھیں۔

بمبئی شہر میں یہ سب ہوتا رہا اور کانگریس کی حکومت ... کے فساد کی ذمہ داری شیوسینا نے قبول کر لی تھی اس کے باوجود حکومت نے شیوسینا کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ ایک طرح سے پولیس شیوسینا کے حکم کے مطابق کام کر رہی ہے۔ بمبئی کی تین سو سالہ تاریخ میں جنوری ۱۹۹۳ء کا فرقہ وارانہ فساد ہندوستان کا سب سے بڑا اور ہولناک فساد ہے جس میں اتنی تباہی ہوئی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ دہلی میں بیٹھے ... لگاتار ... میں جلتی رہی، اپنی ... کے خونی فساد کا نظارہ دیکھا کئے اور خاموش بیٹھے رہے۔ ایسے حالات میں ۱۲ جنوری کو ... حکومت کے سربراہ ایک ارادے ... ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں ...

گئی۔ وہ صرف ... نہیں بلکہ ایک منظر کا تھا۔ ایک ایسا منظر جو ... تھا۔ وہ نظارہ کوئی اور نہیں بلکہ سنیل دت تھا۔ سنیل دت ... جس طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھتے آگ اور ... وہ اپنے علاقے کے لوگوں سے ... تھا اور ان کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ انہیں ... نہیں بچا سکتا تھا۔ وہ دکھ سے ... کو ... کر دیا اور ... اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

ان تمام واقعات کے باوجود مرکزی حکومت خاموش تماشائی بنی رہی۔ فلمی ستاروں کے ایک وفد نے اس سلسلے میں وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے ملاقات کی اور بمبئی کے حالات پر قابو پانے کے لئے موثر کارروائی کا مطالبہ کیا۔ بعد میں کچھ صحافیوں نے بھی ان سے ملاقات کی جنہوں نے یہی بات کہی۔ ... دونوں وفود نے محسوس کیا کہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ محض خاموش تماشائی ہیں۔

بمبئی کے حالیہ فساد نے پورے ملک کے مسلمانوں کو کیا دیا ہے۔ آج مسلمان سر جھکائے ... ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں۔ وہ اب کس طرف ... آج مسلمانوں کے سینے کھوکھلے ہو گئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں مسلمان خود کو تنہا نہیں ... ان کے ساتھ ہیں۔ مگر حقیقت دیکھی جائے تو مسلمانوں کا کوئی ہمدرد و غم گسار نہیں ہے کوئی مددگار نہیں۔ حکومت ... ہوگئی ہے۔

... ہے اور ایسے میں مسلمان خود کو محفوظ نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے پاس ... ہے۔ ... اور ساتھ ہی یہ جذبہ ہے کہ پورے ملک کو ہندو رنگ میں رنگ دیا جائے اور جو لوگ اس رنگ کو قبول کرنے سے انکار کریں انہیں نکال باہر کیا جائے۔

انشاء مارچ ۹۳ء

ایم۔ بی۔ خان

فرقہ اور مذہب کے نام پر فسادات

مسلمانوں پر آر ایس ایس کے اعتراضات کی روشنی میں

ہمارے ملک میں جاریہ فرقہ وارانہ فسادات نے تاریخ کے اوراق کو معصوم بچوں، عورتوں اور بے قصور سینکڑوں افراد کے خون سے تربہ تر کر دیا ہے۔ ملک میں موجودہ سیاسی بحران جس کی دھیمی روئی کی آگ برسوں سے اندر اندر سُلگ رہی تھی اسی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہم نے اس روئی کی آگ کی طرف سے شعوری یا غیر شعوری طور پر آنکھیں موندلی تھیں۔ آج جبکہ اس آگ کے شعلے آسمانوں کو چھو رہے ہیں تو ہم ہڑبڑا کر اٹھے ہیں اور ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہیجانی یا شدید اضطراب کی حالت میں جو ردِ عمل ظاہر ہوتے ہیں وہ لازماً معقولیت پر مبنی نہیں ہوتے۔ سماج میں جو بھی واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں بہت ہی کم واقعات اچانک وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ورنہ ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں فرقہ واریت اور خاص کر ہندو مسلم فرقہ واریت کا عروج بھی اپنی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ اس بڑھتی ہوئی فرقہ واریت نے ایک ایسی مکروہ شکل اختیار کر لی ہے کہ جس کے نتیجے میں ملک میں فسطائی اور نازی طاقتوں کا برسرِ اقتدار آنا مستقبل قریب میں ناممکن نظر نہیں آتا۔ اس صورت حال کے لئے ملک کی ہر بڑی سیاسی پارٹی اور خاص کر بائیں بازو کی جماعتیں ذمہ دار ہیں کیونکہ ان پارٹیوں نے ہندو اور مسلم فرقہ پرست عناصر کے عوام میں پھیلتے ہوئے اثر و رسوخ کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بات کو ممتاز صحافی پریم شنکر جھا نے ۱ر جنوری ۱۹۹۳ء کے روزنامہ "سیاست" (حیدرآباد) میں شائع اپنے مضمون میں واضح کیا ہے۔ ملک میں آر ایس ایس پریوار (جس میں وشوا ہندو پریشد، بجرنگ دل، بی جے پی اور دوسرے کئی محاذی ادارے شامل ہیں) ایک طرف اور دوسری طرف جماعت اسلامی، اسلامک اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آئی ایس او)، مسلم لیگ اور مجلس اتحاد المسلمین جیسی جماعتیں گزشتہ کئی برسوں سے ہندوؤں

اور مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کے رجحانات کو بھڑکاتے رہے ہیں۔ ملک کی معاشی پسماندگی، غریبی اور افلاس جیسے مسائل پر ان جماعتوں نے عوام میں ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ کے خلاف بھڑکانے کا کام کیا۔ آر ایس ایس مسلسل یہ کہتی رہی ہے (برسوں سے) کہ ملک کی تقسیم اور یہاں کے عوام میں افلاس، غریبی، بے روزگاری اور آبادی میں غیر معمولی اضافہ کے لئے صرف اور صرف مسلمان ذمہ دار ہیں۔ آر ایس ایس پریوار کا استدلال ہے کہ مسلمانوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ ریاست پاکستان حاصل کر لی اس لئے قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا قابلِ اعتراض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ Muslims want to have their Cake & eat it too. وہ کہتے ہیں ایک طرف ملک کی تقسیم کے ذریعہ پاکستان حاصل کر لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں جمہوریت اور سیکولرزم کے فوائد بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا ایک اور اعتراض یہ بھی ہے کہ ہندوستانی مسلم جماعتیں ملک میں جمہوریت اور سیکولرزم چاہتی ہیں لیکن یہی بات پاکستان کے تعلق سے نہیں کہتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کی مخالفت کی جا سکتی ہے تو پاکستان میں مذہبی حکومت کے بجائے سیکولر جمہوری حکومت کے قیام کی بات کیوں نہیں کی جاتی۔ ہندوستان کی مسلم جماعتیں جب اپنے ملک میں جمہوریت اور سیکولرزم کی تائید کرتی ہیں تو وہ یہی بات دنیا کی دیگر مذہبی حکومتوں کے تعلق سے کیوں اختیار نہیں کرتے۔ آر ایس ایس کا یہ بھی کہنا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی (FAMILY PLANNING) کو جب کئی مسلم ممالک میں اور خود پاکستان میں رائج کیا گیا ہے تو یہاں ہندوستان کی مسلم جماعتوں کو اس پر اعتراض کیوں ہے۔ اسی طرح ان کا کہنا ہے کہ جب ترکی، عراق اور مصر جیسے ممالک میں مسلم معاشرہ میں ترقی پسند تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں تو بعض افراد اور جماعتوں کی جانب سے ہندوستان کے عام مسلمانوں کو اس قسم کی

تہذیبوں سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے۔ ان تمام اعتراضات کے پس منظر میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ مسلم جماعتیں ہندوستان کے مسلمانوں کو ملک کے معاشرے سے علیحدہ رکھنا چاہتی ہیں۔ اس موقع پر یہ ضروری لگتا ہے کہ ہم ایماندارانہ طور پر ان اعتراضات کا جو غلط ہیں مدلل جواب دیں اور ایسے اعتراض جن میں واجبیت ہے انہیں تسلیم کرنے کی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کریں۔ سب سے پہلا اعتراض کہ برصغیر ہندوستان کے مسلمان ملک کی تقسیم کے لئے ذمہ دار ہیں، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ پاکستان کا مطالبہ برصغیر کے عام مسلمانوں کا مطالبہ نہیں تھا۔ انگریزوں سے اقتدار کی منتقلی کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال میں پنجاب، یو پی اور دیگر علاقوں میں رہنے والے بڑے زمیندار، تعلقہ دار اور برصغیر کی مسلم ELITE کو خدشہ تھا کہ ان کی پوزیشن برقرار نہیں رہے گی۔ ان "بااثر" مسلمانوں نے اپنے معاشی اور سیاسی مفادات کی حفاظت کی خاطر عام مسلمانوں میں بھی (جن میں نوے فیصد سے زیادہ غریب تھے) ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دی کہ "مسلمانوں کے وجود" کو برقرار رکھنے کے لئے ملک کی تقسیم اور پاکستان کا قیام ناگزیر تھا۔ اس طرح سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کا عام مسلمان بہکاوے کا شکار ہو گیا۔ شعوری طور پر پاکستان کے قیام کے لئے ان کروڑوں غریب مسلمان باشندوں یا دستکاروں کو ذمہ دار قرار دینا ناانصافی ہوگی جو اس وقت ہندوستان اور خاص کر شمالی اور جنوبی ہندوستان کے دیہات میں رہتے تھے۔ یہ کروڑوں مسلمان آج بھی بہت حد تک اپنے اطراف کے سماج میں گھل مل کر رہتے ہیں۔ ان کی زبان مقامی زبان ہے، ان کے رسم و رواج مشترک ہیں بلکہ ایک دوسرے کی موجودگی پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر بنارسی سلک اور دیگر کپڑا بننے والے اور دستکار مسلمانوں کی کسی علیحدہ "شناخت" کا کوئی احساس ان میں آج بھی نہیں ہے۔ یہی حال جنوبی ہند میں رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کا ہے جو مقامی زبان اور رہن سہن میں دیگر مذاہب کے پیروؤں سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اس طرح سے ایک طرف تو آر ایس ایس کے اس الزام کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے قیام کے لئے ہندوستان کا عام مسلمان ذمہ دار تھا تو دوسری طرف اس بات کا بھی اعتراف ضروری ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ان کروڑوں مسلمانوں کا جنہوں نے ہندوستان میں قیام کو پسند کیا مذہبی شناخت کو برقرار رکھنے کے علاوہ کسی اور بنیاد پر علیحدہ شناخت کی بات کرنا اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت دینا نامناسب ہے۔

ہندوستان کے کروڑوں مسلمان آسام سے لے کر گجرات تک، کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک آباد ہیں۔ لسانی اور معاشی طور پر اور عام رسم و رواج میں مقامی عوام سے کسی طور پر علیحدہ نہیں ہیں۔ کشمیری مسلمان کشمیری زبان بولتا ہے۔ آسامی مسلمان کی زبان آسامی، بنگالی مسلمان بنگالی اور گجراتی مسلمان کی زبان گجراتی ہے۔ یو پی کے ہزاروں دیہات میں، بہار میں، مدھیہ پردیش میں اور راجستھان کے دیہات میں جو مسلمان ہیں ان میں سوائے مذہبی روایات اور مراسم کے کوئی اور علیحدگی کے رجحانات نہیں پائے جاتے۔ لسانی اور تمدنی سطح پر وہ مقامی کلچر کا ایک اہم جزو ہیں۔ ان حقائق کو نظرانداز کرتے ہوئے یہ کہنا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پورے ملک میں یکساں طور پر کوئی علیحدہ شناخت ہو سکتی ہے، غیر صحیح ہوگا۔ اسی طرح MUSLIM INDIA (جو کہ جناب شہاب الدین کے رسالہ کا نام ہے) کی بات کرنا بھی نامناسب ہے۔ انڈین مسلم کی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن مسلم انڈیا کیا ہوتا ہے۔ جب مسلم انڈیا ہو سکتا ہے تو ہندو انڈیا اور کرسچین انڈیا کی بات کو جواز

حاصل ہوتا ہے جیسے خطرناک بات ہوگی۔ آر ایس ایس کا دوسرا اعتراض کہ ہندوستان کی مسلم جماعتیں دیگر مسلم ممالک میں ہونے والی تنگ پسندانہ تبدیلیوں سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ بعض دوسرے دقیانوسی مسلم ممالک کی پرجوش تائید کرتے ہیں، اس کی بھی تاریخ اسی صدی کے دوسرے دہے سے شروع ہوتی ہے جبکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو "تحریک خلافت" کے دوران زوال پذیر خلافت عثمانی کی تائید میں اور کمال اتاترک کی ترقی پسند تحریک کے خلاف ورغلایا گیا اور PAN ISLAMISM کی غیر حقیقت پسندانہ بات شروع کی گئی جس کا مطلب تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک وحدت ہیں اور ان کا اپنا کوئی مخصوص وطن نہیں ہوتا۔ ایسا کہنا اس وقت غلط ثابت ہوا جبکہ قوم، وطن اور زبان کے تقاضے ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کے درمیان مذہب سے زیادہ مضبوط اور گہرے ثابت ہونے لگے۔ نسلی طور پر ایک ہونے کے باوجود یورپ، مغربی ایشیا اور ایشیا میں کئی قومیں موجود ہیں۔ عیسائی مذہب کے پیرو ہونے کے باوجود یورپ کے باشندے علیحدہ علیحدہ قوموں میں تقسیم ہیں۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے، بدھسٹوں کا ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ وطنیت کی تشخیص محض مذہب یا زبان کی یکسانیت کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ چین میں پیدا ہونے والے مسلمان کی تربیت چینی ہی ہوگی جبکہ امریکی مسلمان کی وطنیت امریکی ہوگی اور اسے اسی بات پر فخر ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ہندوستان کے مسلمانوں کی وطنیت اور قومیت ہندوستانی ہی ہوگی اور ہندوستان کا ہر مسلمان اپنے وطن سے محبت رکھتا ہے۔ اس کی ترقی اور خوشحالی کے مسائل میں اتنا ہی ذمہ دار ہے (باقی صفحہ ۳۷ پر)

جتنا کوئی اور مذہب کا پیرو ہو سکتا ہے۔ آر ایس ایس پرچار کا یہ کہنا کہ عام ہندوستانی مسلمان ملک کی معاشی بدحالی اور پسماندگی کا ذمہ دار ہے، قطعی بے بنیاد اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ ملک کی معاشی بدحالی کے لئے وہ ایک سو اجارہ دار اور خاندان ذمہ دار ہیں جو ملک کی کل دولت کا پچاس فیصد اپنے قبضہ میں لئے رکھے ہیں۔ اس ملک کے برسر اقتدار طبقے اس صورت حال کے سو فیصد ذمہ دار ہیں کیونکہ انہوں نے مذہب، ذات پات، زبان اور علاقوں کی بنیاد پر انتخابات کے طریقہ کو رائج کیا اور ان ہی بنیادوں پر غریب عوام کو مسلسل تقسیم کرتے آ رہے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ تقریباً تمام سیاسی جماعتیں بشمول بائیں بازو کی جماعتیں بھی اس سازش کا شکار ہو چکی ہیں۔ پسماندہ معاشی ماحول میں سماج کا ہر طبقہ چاہے وہ مذہبی گروہ ہو یا ذات پات کی بنیاد پر ہو، یہی چاہتا ہے کہ محدود وسائل میں وہ اپنے لئے کچھ حاصل کر سکے۔ اس معاشی جد و جہد سے جو تصادم کا عمل شروع ہوتا ہے برسر اقتدار سرمایہ دار طبقہ اسے فرقہ وارانہ رنگ دے دیتا ہے۔ اسی جد و جہد میں رجعت پسند جماعتیں یہ پرچار کرتی ہیں کہ دیکھو تمہاری پسماندگی کے لئے فلاں گروہ ذمہ دار ہے جو خود بھی اپنی بقا کے لئے جد و جہد میں مصروف ہے۔ ملک میں ایک ہی مذہب کے ماننے والے مختلف گروہوں کے درمیان تصادم اسی کی مثال ہے۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے تمام غریب و مفلس عوام زبان، علاقہ اور مذہب نیز ذات پات کی الگ الگ شناخت کے باوجود ملک میں معاشی اور سماجی انقلاب کے لئے ایک متحدہ جد و جہد کے لئے تیار ہو جائیں اور فرقہ وارانہ تنازعات کو ختم کریں۔

انجلی ویش پانڈے

بمبئی ایک زخمی اور خوفزدہ شہر

صنعت کار سیاستدان ۔ تال میل ۔: شیو سینا کی طاقت کو بڑھانے میں مدد کی ہے ، تب ہی وسنت راؤ نائک کی حکمرانی کے زمانے میں شیو سینکوں کو عام طور پر 'وسنت سینا' کہا جاتا تھا۔

ہندوؤں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کو بچانے کی کوشش کیں لیکن یہ گنی چنی تھیں

عروس البلاد کہلائے جانے والے شہر میں حالات کے معمول پر آنے کا کیا مطلب ہے جہاں ابھی تک مسلمان پناہ گزین کیمپوں میں رہتے ہیں یا تو اس بنا پر کہ ان کے جسموں پر قمیص کے سوا کچھ نہیں رہ گیا ہے یا پھر اس سبب سے کہ وہ گھر سے زیادہ اس جگہ محفوظ ہیں؟

بمبئی کو اپنی ر نگا رنگ ثقافت پر بڑا ناز تھا اب وہ پہلے جیسی محفوظ بندرگاہ نہیں رہ گیا ہے۔ یہ شہر جو اپنے معصوم شہریوں میں سے ہزاروں بے مطلب وبلا سبب ہلاکتوں کے ہولناک مناظر سے گزر چکا ہے اور بہت بڑے پیمانے پر املاک کی تباہی دیکھ چکا ہے اب وہ ایک زخمی اور خوفزدہ شہر کی تصویر پیش کر رہا ہے جہاں اس بات کا کوئی تیقن نہیں ہے کہ وہاں ایسی زندگی لوٹ کر آسکتی ہے جس میں انتقام اور تشدد کا جذبہ کار فرمانہ ہو۔

شیو سینکوں کے غولوں نے جو دہشت پھیلائی تھی وہ اس کے شہریوں خاص طور پر مسلمانوں، مسلم ایریا میں رہنے والوں اور شہر کے غریبوں کے چہروں پر اب تک نظر آتی ہے۔ یہ لوگ وہ سب کچھ کھو چکے ہیں جو ان کے لئے بیش قیمت تھی۔

مسلمانوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا تھا اور غنڈوں کے غولوں نے جو بالکل آزادانہ طور پر منڈلاتے پھرتے تھے، مسلمانوں کی املاک کو بلا روک ٹوک پھونک ڈالا اور حد تو یہ ہے کہ زندہ انسانوں کو بھی جنونی بھیڑ نے زندہ جلا دیا۔ یہ سب کچھ ایک منظم قتل عام سے ہی مشابہ لگتا تھا۔

"بمبئی میں آج کل حالات معمول پر آنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آتش زنی نہیں ہوگی" یہ بات جنز گروپ کے ٹیپ ریکارڈ مدیرہ سانا تھ نے کہی ہے۔ وہ ارود بلٹز کے ایڈیٹر ہارون رشید کے ساتھ دہلی آئے تھے۔ رشید کا مکان بمبئی کے عالی شان علاقے ڈائمنڈ جوبلی کمپاؤنڈ میں ہے جو آج کل جلے ہوئے کوئلوں کا ایک ڈھیر لگتا ہے۔

رشید مقامی شیو سینا کے کونسلر کے قریبی دوست تھے اور یہ صاحب ان کی سڑک کے سامنے ان کی بلڈنگ کے پیچھے کے ساتھ ہی رہتے ہیں، جہاں کارپوریٹر اب بھی رہتے ہیں۔ شیو سینکوں نے ڈائمنڈ جوبلی کمپاؤنڈ پر حملہ کیا تھا۔ صبح دس بجے سے شروع ہو کر یہ حملہ شام ۵ بجے تک جاری رہا اور ۳۰ خاندانوں نے جن میں ایک ہندو خاندان بھی تھا اس محصور بلڈنگ کو خالی کر دیا تو بلڈنگ کو آگ لگا دی گئی اور یہ آگ سرچ لائٹوں اور پٹرول بم چلانے والی گنوں (لانچروں) سے لگائی گئی تھی۔

آگ کو بجھانے کے لئے آگ بجھانے واول ۲ بھی عملہ نہیں آیا۔ پولیس نے سینکوں کو روکنے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ شیو سینا کارپوریٹر نے رشید کو بار بار یقین دلایا تھا کہ وہ ان کو بچالے گا لیکن جب حملہ آوروں نے بلڈنگ کو آگ لگائی اور زمین پر اس کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا تو کارپوریٹر نے اپنی انگلی تک نہیں ہلائی۔

"دوست کی حیثیت سے کارپوریٹر کم از کم مجھے اتنا بتا دیتا کہ وہ میری مدد نہیں کر سکتا ہے۔" رشید نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ جب وہ ان ہولناک لمحوں کو بیان کر رہے تھے جن سے وہ گزر چکے تھے۔ انہوں نے رنج و تاسف کے انداز میں کہا۔ "دوستی پر سے میرا اعتماد اٹھ چکا ہے"۔

"شیو سینکوں کے حملوں کا اصل بوجھ مسلمانوں پر پڑتا ہے" پی۔ سائی ناتھ نے کہا۔ "ان کو اتنے بڑے پیمانے پر تباہی اور نقصان کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہندوؤں کا بھی تھوڑا بہت نقصان ہونا ہی تھا اور وہ بھی اتفاقیہ ہوا ہے۔ شکار ہونے والوں کی اکثریت مسلمانوں کے زیادہ غریب حصوں کی ہے۔ جنہوں نے اپنی دکانیں، روزگار، گھر اور تمام دنیاوی املاک کھو دی ہیں"۔

ان دونوں صحافیوں نے کہا "شیو سینکوں کی دہشت گردی کا موازنہ ایک جنگی منظر کے ہونے قتل عام سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں کی شناخت کرنے کے لئے ان کے پاس رائے دہندگان کی فہرستیں تھیں۔ وہ پٹرول بموں اور پتھروں سے لدے ہوئے ہاتھوں سے کھینچنے والے ٹھیلے لے کر آئے تھے۔ انہوں نے چھتوں پر انبار لگا دیئے تھے جو پٹرول بموں اور پتھروں سے بھرے ہوئے تھے"۔

نقصان کا ابتدائی تخمینہ دو ہزار کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔ ہاتھ نمبر مارکیٹ میں جو آٹھ منزلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ۲۰ میٹر کے جنگل کے برابر کپڑے جلا کر راکھ کر دی گئی۔ یہ مارکیٹ مسلمانوں کا تھا اور اس کو جلا کر راکھ بنا دیا گیا ہے۔

زیادہ تر جوان بستیوں کے رہنے والے پہچان گئے تھے جب ان پر حملہ ہوا تھا۔ ان ہلاکت و تاراج کرنے والی بھیڑ میں وہ نوجوان شامل تھے جو ایک دن پہلے تک مسلم نوجوانوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے رہے تھے اور مقامی ہوٹلوں میں چائے پیتے رہے تھے۔

آج کل دادر میں ۲۰ انچ کے رنگین ٹی۔ وی سیٹ ۲ ہزار روپے کی معمولی رقم میں فروخت کئے جا رہے ہیں۔ اور یہ سب مسلمانوں کے گھروں سے آئے ہیں۔ ان خاندانوں سے جنہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر دس ہزار روپے سے پندرہ ہزار روپے میں ان میں سے ایک خریدا تھا۔

ان مستند صحافیوں کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے بال ٹھاکرے نے اپنے دستخطوں سے شیو سینا کے اخبار "سامنا" کے اداریے میں دعویٰ کیا تھا کہ مسلمان جنہیں ابال دینے والے سفید جھنڈے لہراتے ہوئے بھاگ رہے ہیں اور کہا "ہمیں اس وقت روکا نہیں جانا چاہئے"۔

"حکومت ہلا دینے والا" پیغام خود حکومت جو اس سے زیادہ اور کیا شہادت طلب کر سکتی ہیں۔ جب کہ شیو سینا کا "آپ کے دستخطوں سے ہر روز صاف طور پر قبول کر رہا ہے"۔ غصہ سے بھرے ہوئے سادھوؤں نے در پیش کیا اور بال ٹھاکرے اور اس کے بعض بچوں کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کیا۔

بمبئی میں جس حد تک میں صنعتی سرمایہ کو شعلوں کی نذر کیا گیا ہے اس سے بہت سے لوگ بھونچکے رہ گئے اور اس پرانی کہانی کے بکھرنے سے ڈر گئے کہ وہ کاسموپولیٹن کلچر کا واحد شہر ہے۔ لیکن خود بمبئی والوں کو حیرت نہیں ہوئی کیونکہ انہوں نے اس کے تعلیم یافتہ اور پیشہ ور متوسط طبقات کا بتدریج تنزل ہوتے دیکھا ہے۔

بے تحاشہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری، فلک بھرے غریبوں کی مسلسل در اندازی، قتل و رحم سے عاری حالات، بے نظیر عیاشی و عشرت کے جلو میں رہنے موجود ہے۔ ان سب باتوں نے شیو سینا کے لئے پنپنے اور بڑھنے کے حالات پیدا کر دیئے اور پولیس ایڈمنسٹریشن اور تیجر کے ڈھانچے میں جگہیں بنا لیں۔

بمبئی، تھانے، بیلٹ پر ۱۹۷۹ میں صنعتی مزدور طبقہ کی ۸۰ فیصد تھی آج کل اس کی ۲۳ فیصد ہے۔ روزگار کے مواقع کمپیوٹر، ہوٹل اور سروس کے شعبوں میں بڑھ گئے اور مزدور طبقوں کو بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کم سے کم ۱۰ ہزار کارخانے بیمار قرار دے دیئے گئے ہیں۔

ایسے حالات کے اندر شیو سینا کو بڑی زرخیز زمین مل گئی جس میں انہوں نے مسلمانوں کو "دشمنوں" کے روپ میں پیش کیا جنہوں نے روزگار چھین لیا ہے۔ صنعت کاروں نے شیو سینکوں کو پالا پوسا تاکہ ساتویں دہائی میں ریڈیکل ٹریڈ یونینوں کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی جائے۔ نویں دہائی میں وہ صنعت کی کیفیت کمزور ہونے کے بعد اپنی پرانی کوئی ساکھ حاصل نہ کر سکا کیونکہ ہزاروں مزدوروں کو ٹیکسٹائل ملوں کو بند کر کے سڑکوں پر پھینک دیا گیا تھا۔

بال ٹھاکرے کو صنعت کاروں سے جو حمایت حاصل ہوئی ہے اس کی بہترین تصویر کشی پورے صفحہ کے رنگین اشتہارات سے ملتی ہے جو ان بزنس لیڈروں نے "سامنا" کو دیئے ہیں۔

صنعت کار، سیاستدان تک میل نے بیمار حالات کو بڑھانے میں مدد کی ہے۔ "وسنت دادا نائیک کی حکمرانی کے زمانے میں شیو سینکوں کو عام طور پر "وسنت سینا" کہا جاتا تھا"۔ سماجی کارکن نے کہا۔ وسنت راؤ نائیک موجودہ چیف منسٹر سدھاکر راؤ نائیک کے چچا ہیں۔

وزیر دفاع شرد پوار کا نام بھی سینا کے منصوبہ کی سمت میں عمل کر لیا جا رہا ہے۔ سینا کی تعمیر میں ان کا کردار جنوری کے منظم قتل عام کے دوران صاف طور پر نظر آ گیا تھا۔ "بمبئی میں پولیس والے پڑے تھے فوج کو گولی چلانے کی بات تو دور رہی اپنی گاڑیوں سے نیچے اترنے کا بھی حکم نہیں تھا۔"

رشید کا کہنا ہے۔ "انہوں نے ناسک کے سامنے سے گزرتے ہوئے فوج کے دستے سے مداخلت کرنے اور دہشت زدہ کیمپوں میں چھپے ہوئے پولیس خاندانوں کو بچانے کی ناکام التجائیں کیں۔ اخباروں کے ایک حصے میں خبروں کے برخلاف وزیر دفاع کی شہر میں موجودگی کا بھی صورت حال پر کوئی سودمند اثر نہیں پڑا تھا"۔

بمبئی میں یہ ... منظر ہے۔ مسلمان یہ نہیں بھول سکتے کہ ... نے ان سے کہا کہ "پاکستان چلے جاؤ" بجائے اس کے کہ وہ پانی سے بھری بالٹیاں لے کر مدد کے لئے دوڑ پڑتے۔ وہ یہ نہیں بھول سکتے کہ پولیس افسران نے نہ صرف یہ کہ مدد کرنے سے انکار کر دیا بلکہ تباہی و بربادی پھیلانے والے سینکوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے

تھے۔

ادھر ہندوؤں کے گروہوں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کو بچانے کی کوشش کی۔ لیکن ایسی مداخلتیں گنی چنی تھیں اور عام بمبئی والے وہ لوگ جو چیخ و پکار کرتے اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد اور شیو سینا کے ساتھ نہیں ہیں، حیرت زدہ تھے کہ وہ (مرد یا عورت) مسلح بھیڑ کا سامنا کیسے کر سکتے ہیں جب کہ ریاست ڈھے چکی تھی اور حکومت کا وجود ہی نہیں تھا۔

اس کا تیقن کرنے کے لئے کہ سلم (گندی بستیوں کے) علاقے اور دوسری بستیاں جو اس تشدد اور آتش زدگی کی مہم میں صاف کر دی گئی ہیں، وہ سود خوروں اور بلڈروں کے ہاتھوں فروخت نہ کر دی جائیں اور پرانے کرائے داروں کے حقوق بحال رہیں اس کے لئے ایک آرڈی ننس جاری کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

حکومت کی جانب سے اس طرح کا اقدام ان لوگوں کی ہمت افزائی کرے گا جو فسادات کے دوران اپنے فلیٹوں سے بھاگ گئے تھے جان بچا کر۔ آیا وہ لوگ جو شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں واپس آجائیں گے یا نہیں؟ یہ ایک قطعی الگ سوال ہے۔ لوگوں کے لئے وہ جگہ واپس آجانے کے لئے محفوظ نہیں ہے۔ یہ بات دونوں ... مانی محسوس کرتے ہیں۔

لیکن بمبئی میں بہت سے مسلمان اس پر زور دیتے ہیں کہ وہ نئے سرے سے شہر میں اپنی زندگی بتائیں گے جو کئی دہائیوں سے ان کا گھر ہے۔ "میں اپنا فلیٹ ٹھیک اسی جگہ پر پھر تعمیر کروں گا" رشید کا کہنا ہے۔ ان کا خاموش عزم اور تلخی کی عدم موجودگی، امید کی موہوم کرن سی ہے، جو بادلوں سے بھرے افق میں نظر آتی ہے۔

■

"روشن خیال" (۱۹۹۳)

کیا شاہانِ ہند نے مندر مسمار کیے ہیں

ہندوستان کے نامور مورخ اور پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب "انڈیا ڈیوائیڈیڈ" میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ "مسلم شاہانِ ہند نے ہندوستان پر جو حملے کئے ہیں ان کا اسلام پھیلانے یا مذہبی جوش سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ ان کا واحد مقصد دوسری فاتح قوموں کی طرح مادی مفادات حاصل کرنا تھا جس کا کھلا ہوا ثبوت کہ انھوں نے جہاں بعض لڑائیاں ہندو راجاؤں کے خلاف لڑی ہیں وہاں بیشتر لڑائیاں اپنے ہم مذہب مسلم بادشاہوں کے خلاف بھی لڑی ہیں" یہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی رائے ہے لیکن ہندو رجعت پسندوں کا کہنا یہ ہے کہ "مسلم حملہ آوروں کا واحد مقصد تلوار کے ذریعہ اسلام پھیلانا اور ہندو مندروں کو توڑ کر ان کی جگہ مساجد تعمیر کرنا تھا" یہ غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈہ محض اس لئے کیا جا رہا ہے تاکہ "ہندو دھرم" کے نام پر اکثریت کو مشتعل کر کے کسی طرح اس ملک میں "راشٹریہ سنگھی راج" قائم کیا جا سکے اور رجعت پسندوں کو اقتدار حاصل ہو جائے چنانچہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر راجندر پرشاد آنجہانی نے اپنی مشہور کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض حصوں کا ترجمہ اور خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے

ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ "ڈاکٹر راجندر پرشاد" کی رائے



(مشہور کتاب "انڈیا ڈیوائیڈیڈ" سے ماخوذ)

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملوں کا آغاز نویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم نے کیا تھا، اور آخری حملہ آور احمد شاہ ابدالی اٹھارویں صدی عیسوی میں یہاں آئے تھے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تقریباً نو سال تک اس ملک پر مسلمانوں کے جو حملے ہوتے رہے تھے ان میں سے کوئی حملہ بھی مذہبی جوش کا نتیجہ یا مذہب کو پھیلانے کے مقصد پر مبنی نہیں تھا بلکہ دوسری فاتح قوموں کی فتوحات کی طرح مسلمانوں کے حملوں اور فتوحات کا مقصد بھی اسلام پھیلانا نہیں تھا بلکہ مادی مفادات حاصل کرنا تھا۔

ابتدائی زمانہ میں ہندوستان میں صرف ہندو ہی آباد تھے اس لیے ہندوؤں ہی نے قدرتی طور پر مسلم حملہ آوروں کی مزاحمت بھی کی تھی اسی بنا پر ابتدائی لڑائیوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائیاں کہا جا سکتا ہے لیکن یہ بات بھی ہے کہ پہلے بادشاہ سے ان تمام مسلم حملہ آوروں کی خواہش یہ رہی تھی کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیں چنانچہ بارہویں صدی میں شہاب الدین غوری کے حملہ کے بعد سے ہندوستان میں مسلمان حملہ آور بھی آتے رہے خواہ وہ پٹھان تھے یا تاتاری مغل ترک تھے یا افغان۔ وہ ہندوستان کے کئی علاقوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان کے مقبوضہ علاقوں میں توسیع بھی شروع ہو گئی تھی۔

پھر جہاں جہاں ان مسلم حملہ آوروں کی سلطنت قائم اور وسیع ہوتی گئی وہاں ان کے لئے اپنے دارالسلطنت سے پورے ملک کا انتظام چلانا بھی مشکل ہو گیا تھا اور انہیں مختلف علاقوں میں اپنے گورنر مقرر کرنے پڑے تھے لیکن یہ گورنر بھی مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے تھے اور موقع ملتے ہی اپنے اپنے صوبوں میں اپنی خود مختار بادشاہتوں کا اعلان کر دیتے تھے اور بغاوت کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے۔

چنانچہ اسی بنا پر ہمیں ہندوستان میں مسلمانوں کے طویل دور حکومت کی تاریخ میں دو قسم کی لڑائیوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ ان میں ایک قسم کی لڑائیاں تو وہ تھیں جو مسلم سلاطین اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے برپا کرتے رہتے تھے اور چونکہ اس وقت ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر ہندو ہی حکمراں تھے انہیں مسلمان فتح کرکے دہلی کی سلطنت کے ساتھ ملحق کرنا چاہتے تھے اس لیے قدرتی طور پر ان لڑائیوں میں ہندوؤں ہی کو ایک فریق کی حیثیت حاصل تھی۔

اس کے بعد ایک وقت وہ بھی آیا جب دہلی کی مرکزی حکومت کے مقابلہ میں باغی گورنروں اور باغی عناصر کی بنا پر بہت سی دوسری آزاد مسلم بادشاہتیں بھی قائم ہوگئیں تو ان دوسری قسم کی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو خود مسلمان حکمراں دوسرے مسلمان حکمرانوں کے خلاف لڑتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں دہلی کے مسلم بادشاہوں کو جو لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں ان میں سے بیشتر لڑائیاں دوسرے مسلم بادشاہوں اور مسلم باغی گورنروں کے خلاف تھیں۔ ان لڑائیوں میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی طرف سے لڑتے تھے کیونکہ ہر فریق کی فوج میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی پائے جاتے تھے۔

یہاں ہمیں اس تاریخی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ غوریوں کے حملہ کے بعد شمال و مغرب کی طرف سے جو مسلمان بھی حملہ آور کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تھے انھوں نے ہندوستان کی کسی ہندو ریاست پر نہیں بلکہ کسی نہ کسی مسلم سلطنت ہی پر حملہ کیا تھا۔ اور وہ ہندوستان ہی کے کسی ایسے مسلم بادشاہ سے لڑے تھے جو ان سے پہلے یہاں اپنی سلطنت قائم کر چکا تھا اور ان حملہ آوروں نے خصوصی طور پر دہلی ہی کے کسی حکمراں کو شکست دی تھی۔

مثال کے طور پر تیمور اور نادر شاہ کے حملے کسی ہندو راجہ پر نہیں ہوئے تھے بلکہ ہندوستان کے مسلم سلاطین اور بادشاہوں پر کئے گئے تھے اور مسلمانوں ہی نے ان مسلم حملہ آوروں کا مقابلہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ بابر نے ہندوستان پر مغل سلطنت قائم کرنے سے پہلے پانی پت میں کسی ہندو راجہ سے جنگ نہیں کی تھی بلکہ دہلی کے مسلمان بادشاہ ابراہیم لودھی کے خلاف جنگ کرکے اسے شکست دی تھی۔ پھر جب ۱۵۲۷ء میں بابر کو میواڑ کے راجہ رانا سنگا کے خلاف جنگ لڑنی پڑی تھی تو اس جنگ میں راجپوتوں کے علاوہ میوات کا حسن خاں اور سکندر لودھی کا لڑکا محمود لودھی بھی مسلمان ہونے کے باوجود ہندو راجہ رانا سنگا کے ساتھ تھے اور رانا سنگا کی فوج ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر مشتمل تھی۔

پھر بابر کے فرزند شہنشاہ ہمایوں کو مسلمان بادشاہ شیر شاہ کے مقابلہ ہی میں شکست کھا کر ہندوستان کے تخت کو عارضی طور پر چھوڑنا پڑا تھا اور جب شیر شاہ کی موت کے بعد ہمایوں ہندوستان کا دوبارہ حکمراں بنا تھا تو اسے شیر شاہ کی اولاد سے جو سب مسلمان تھے جنگ لڑنی پڑی تھی۔

ہندوستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شہنشاہ ہمایوں اور اکبر سے لے کر اورنگزیب تک مغل بادشاہوں کا بیشتر وقت اور ان کی بیشتر توجہ یا تو باغی گورنروں کی سرکوبی میں صرف ہوتی رہی تھیں یا پھر وہ ہندوستان کے خود مختار بادشاہوں کو زیر کرنے میں مصروف رہے تھے۔ چنانچہ اورنگزیب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ جنوبی ہند کی مسلم بادشاہتوں یعنی گولکنڈہ اور بیجاپور کی تسخیر پر صرف کر دیا تھا۔

ان حالات میں نہ تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ملک میں مسلمان اسلام پھیلانے کے لیے آئے تھے اور انھوں نے ہندو مندر توڑے تھے یا انہوں نے ہندو راجاؤں کے خلاف جو لڑائیاں لڑی تھیں وہ ان کے مذہبی جوش کا نتیجہ تھیں اور نہ اس الزام ہی کو درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہاں اپنی حکومتیں قائم کرکے انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی امتیاز یا فرق برقرار رکھا تھا۔

مسلمان بادشاہوں کی غیر فرقہ وارانہ پالیسی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر شہنشاہ اکبر کے دور میں راجہ مان سنگھ اور بھگوان سنگھ جیسے ہندو جرنیل ان کی فوج کی قیادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو اورنگزیب کے زمانہ میں ممتاز فوجی جرنیلوں میں جے سنگھ اور جسونت سنگھ کے نام سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے ضرور داخل ہوئے مگر ان کی فتوحات میں اسلام اور تبلیغ اسلام کا کوئی جذبہ نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد محض اپنی سلطنت کو وسعت دینا تھا اور اس غرض کے لیے انہوں نے اس ملک کے ہندو امرا اور عوام کی ہمیشہ غیر معمولی دلداری کی ہے۔ اور چونکہ ہندوستان کے مسلم حکمراں جہانبانی اور حکمرانی کے اصول سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے ان کی اسٹیٹ پالیسی ہمیشہ غیر فرقہ وارانہ رہی ہے اور انہوں نے ہمیشہ اس ملک کے ہندوؤں اور اس ملک کی جملہ اقوام و مذاہب کو ایک ہی نظر سے دیکھا ہے اور ان کی اس وسیع النظری کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود سیکڑوں سال تک اس ملک کی ہندو اکثریت پر حکومت کرتے رہے۔

"دین دنیا" جنوری ۹۲ء

دین دنیا جنوری ۱۹۹۲ء

(ایک انگریز مورخ کے قلم سے)



شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے مسلسل پچاس سال تک جس شان اور وقار کے ساتھ حکومت کی ہے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مفقود ہے۔ [illegible] اس کی حکمرانی [illegible] لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اسی حکمران کو سب سے زیادہ بدنام بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں اس عظیم حکمران کے بارے میں ایک مقالہ پیش کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نے ہندوستان پر کس رواداری کے ساتھ حکومت کی ہے

شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ

وہ نیک دل حکمران جسے سب سے زیادہ بدنام کیا گیا ہے

اورنگزیب کی بابت عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کا سخت دشمن تھا لیکن اس کے "ہندو دشمنی" کے الزام کی اصل حقیقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فوجی سپہ سالار راجہ جے سنگھ تھا چنانچہ جب تک راجہ جے سنگھ زندہ رہا اس نے جنگی معاملات میں اس ہندو جرنیل کے مقابلہ میں کسی مسلم سپہ سالار کو ترجیح [illegible] یہاں تک کہ اس نے اپنے اصول شائستہ [illegible] سے شیواجی کے مقابلہ میں بھی ہندو جرنیل جے سنگھ کو بھیجا تھا۔ اگر اورنگزیب متعصب بادشاہ ہوتا تو وہ ایک ہندو جرنیل کو تمام مسلم سپہ سالاروں پر ہرگز فوقیت نہ دیتا۔

[illegible] اورنگزیب نے [illegible] ہندو راجاؤں کو اندرونی معاملات میں بالکل خود مختار رکھا اورنگزیب نے ان کے اختیارات کو جوں کا توں برقرار رکھا لیکن اورنگزیب کی مخالف ریاستوں کو اپنی مملکت میں ضم کر لیا۔ کیا ہندو دشمن بادشاہ ایسا ہی [illegible] پھر منصب خطاب اور جاگیروں کی [illegible] نے کبھی کسی کمی [illegible] کھلے دل کے ساتھ نوازا [illegible] مسلموں کا [illegible] افغانی [illegible]

[illegible] کیا اورنگزیب [illegible] ہندوؤں میں سے کسی کو [illegible] کہا جاتا ہے کیا یہ اورنگزیب کے ساتھ کھلی [illegible] ہے۔

ایک ہندو شہزادی اور دین دار مسلمان ہونے کے باوجود اورنگزیب اپنے بیٹے شہزادہ محمد معظم کی شادی بڑی دھوم دھام سے راجہ روپ سنگھ کی بیٹی کے ساتھ کرتا ہے

چنانچہ ایک حقیقت ہے کہ متعصب مورخوں نے جتنا اورنگزیب کو بدنام اور رسوا کیا ہے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں ملنی ناممکن ہے۔ [illegible] دشمن حکمران بنا دیا جاتا ہے۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے لاکھوں غیر مسلموں کو بالجبر مسلمان کر لیا اور سکھوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے ہزاروں مندر ڈھا دیئے۔ اسے متعصب، متشدد، ظالم اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا ہے۔ [illegible] اس بادشاہ کے سر تھوپ دیا گیا ہے حالانکہ [illegible] سے کہ ایک [illegible] اور جہانگیر کی طرح [illegible] مذہبی معاملات میں [illegible] اسلامی [illegible] کے ساتھ پابند تھا اس کا سب سے بڑا گناہ تھا۔

اور کبھی اس ہندو لڑکی پر مسلمان ہونے پر زور نہیں دیتا، بلکہ اس کے مذہب میں مداخلت کرنا بدترین گناہ خیال کرتا ہے اور اس شادی سے اتنا خوش ہوتا ہے کہ دلہن کو اپنی طرف سے لاکھوں روپے کا زیور عطا کرتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ کیا کسی متعصب بادشاہ سے اس وسیع نظری کی امید کی جاسکتی ہے؟ پھر خود اورنگزیب کے محل میں راجپوت رانی بائی اودے پوری موجود تھی۔ اورنگزیب نے اس پر کبھی تبدیلی مذہب کے لیے زور دیا، اور نہ مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت کی۔ کیا کوئی متعصب بادشاہ یہ طریقہ کار اختیار کرسکتا ہے؟

غور کرنے کی بات ہے کہ جس بادشاہ نے خود اپنی بیوی بہو اور دوسری راجپوت رشتہ دار عورتوں اور مردوں پر کبھی تبدیلی مذہب پر زور نہیں دیا، وہ بھلا غیروں کو مسلمان بنانے کے لیے کیوں جبر کرتا، اور بالجبر مسلمان بنانا تو درکنار، اس نے تو اپنی حکومت میں تبلیغ اور اشاعت اسلام تک کا کوئی شعبہ نہیں کھولا تھا جس کے مدد سے بعض واعظ اور پنڈ کے ذریعہ لاکھوں غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی جاسکتی تھی۔

اورنگزیب کے خلاف سب سے بڑا اور سنگین الزام یہ ہے کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت خانوں اور بت خانوں کو دیکھ ہی نہیں سکتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ سب مندروں کا اتنا بڑا دشمن تھا تو دکن میں ایلورا کے وہ بت کدے کیسے باقی رہ گئے جو عین اورنگزیب کی دکھنی چھاؤنی دولت آباد اور اورنگ آباد کے نواح میں تھے۔ اورنگزیب دکن میں ایک دو دن نہیں، بلکہ اس کی زندگی کے آخری ۲۰ سال دکن ہی میں گذرے ہیں، اس مدت میں نہ جانے کتنی مرتبہ وہ ان بت کدوں کے پاس سے مع اپنے لشکر کے گذرا ہوگا، لیکن اس نے انہیں جوں کا توں برقرار رکھا۔ کیا ایک بت شکن کو ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ دہلی، متھرا، بنارس اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں دس بیس نہیں بلکہ اورنگزیب کے زمانہ کے ہزاروں مندر آج بھی موجود ہیں جن کو توڑنا تو درکنار کبھی کسی نے ان کی مورتیوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور جو بھی اورنگزیب پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت خانوں کا بہت بڑا دشمن تھا۔

اورنگزیب کی مذہبی رواداری اور اصل حقیقت کا اندازہ ہندوستان کے مشہور ہندو مورخین ایشوری پرشاد اور سرجادو ناتھ سرکار اور پنڈت سندر لال کی تصانیف سے بخوبی ہوسکتا ہے جن میں کہ ان لائق مورخوں نے اورنگزیب کے بہت سے ایسے فرامین درج کیے ہیں جن کی رو سے اورنگزیب نے مندروں کے لیے زمینیں اور جاگیریں عطا کی تھیں۔ اس کے علاوہ ظہیر الدین فاروقی نے اپنی تاریخ میں اورنگزیب کے متعدد ایسے فرمان درج کیے ہیں جن کے ذریعہ مقامی حکام کو مندروں کی حفاظت کے لیے تنبیہ کی گئی ہے مثلاً ۱۰۶۵ھ اور ۱۰۹۰ھ کے فرامین میں حکام کو تاکید کی گئی ہے کہ بنارس کے ادھر ادھر کے گرد و نواح کے مندروں میں وہ دخل نہ دیں اور جو زمین مندر کی تعمیر کے لیے دی گئی ہے اس پر قبضہ نہ کریں، اسی طرح ایک دوسرے فرمان میں جو

۱۰۹۰ھ کا ہے یہ حکم دیا گیا ہے کہ بنارس کا کوئی برہمن اپنے مذہب کے فرائض کی ادائیگی میں تنگ نہ کیا جائے اور کوئی پرانا مندر مسمار نہ کیا جائے۔

مسجد گیان باپی بنارس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے مندر توڑ کر اسے بنوایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ مندر کسی زمانہ میں بھی نہ تھا بلکہ وہاں اکبر کے دین الٰہی کا ادارہ تھا جہاں سے اکبر کے نئے دین کی تبلیغ کی جاتی تھی اپنے دادا کے قائم کردہ اس ادارے کو توڑ کر اورنگزیب نے نہیں بلکہ شاہجہاں نے ۱۰۴۸ھ میں مسجد بنوائی تھی اور اس کا تاریخی نام "ایوان شریعت" رکھا گیا تھا۔ ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں بھلا کون انصاف پسند مورخ اورنگزیب پر مندر شکنی کا الزام لگا سکتا ہے۔

اورنگزیب پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ اس نے مرہٹوں کو بری طرح کچلا، اُن کے ٹھکانوں کو اجاڑ کر رکھ دیا، سیواجی کے بیٹے سمبھاجی اور اس کے برہمن وزیر کو بے دردی سے قتل کرادیا اور سیواجی کی اولاد کو قید خانہ میں ڈال دیا لیکن اس پر کوئی غور نہیں کرتا کہ مرہٹوں نے خود اورنگزیب کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ذرا سوچیے اور غور کرنے کی بات ہے کہ کیا موجودہ زمانہ کی کوئی مہذب سے مہذب حکومت بھی اس قسم کے سیاسی باغیوں کو برداشت کرسکتی ہے لیکن اورنگزیب نے پھر بھی سیواجی کی اولاد کے ساتھ رحم و مروت کا برتاؤ کیا۔ سیواجی کے پوتے کو منصب اور جاگیر عطا کی۔ سیواجی کے خاندان کے ایک ایک بچے کے لیے وظیفے مقرر کیے لیکن انھوں نے پھر بھی فساد برپا کیں۔ ان فسادیوں کے جواب میں اگر ان کے ساتھ سختی کی جاتی ہے تو اس خالص سیاسی معاملہ کو مذہب کے رنگ میں رنگ دینا کہاں کا انصاف ہے۔

اورنگزیب تو حکومت کے معاملہ میں اس قدر سخت تھا کہ اس نے نہ باپ کو بخشا نہ بھائیوں کے ساتھ رعایت کی اور نہ اولاد کے ساتھ مروت کی تو ایسی حالت میں مرہٹوں کو اس سے کیا شکایت ہوسکتی ہے اگر اورنگزیب نے سیواجی کی مرہٹہ حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا تو اس نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی اسلامی حکومتوں کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ ان حقائق کی موجودگی میں تعجب ہے کہ اس پر مذہبی تعصب کا الزام کیونکر لگایا جاسکتا ہے۔ اورنگزیب کے تعصب اور مذہبی تنگ نظری کا صحیح اندازہ اورنگزیب کے زمانہ کے ایک انگریز سیاح کپتان ہملٹن کے سفرنامہ سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ یہ انگریز سیاح اورنگزیب کی مذہبی رواداری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور اسی طرح تہوار مناتے ہیں جیسے کہ گذشتہ زمانہ میں مناتے

"دین دنیا" مارچ ۹۲ء

ڈاکٹر سیّد حامد

مقابلے کے امتحانوں کی تیاری

قارئین کرام کو غالباً علم ہوگا کہ اب زیادہ تر ملازمتوں کی بھرتی کمیشنوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ چونکہ بیروزگاری کی وجہ سے امیدواروں کی ایک بڑی تعداد سرکاری ملازمتوں کے لیے درخواست دیتی ہے۔ اس لیے یہ نظام قائم کیا گیا ہے کہ امیدواروں کی صلاحیت کو مختلف مرحلوں میں جانچا جائے اور صلاحیت کی بنیاد پر ان کا انتخاب کیا جائے۔

سرکاری ملازمتیں مرکزی ہوتی ہیں یا ریاستی۔ مرکز کے دو اہم کمیشن، پبلک سروس کمیشن اور اسٹاف سلیکشن کمیشن ہیں۔ ہر ریاست میں بالعموم ایک ریاستی پبلک سروس کمیشن ہوتا ہے جو ریاستی سول سروسوں کے لیے تحریری امتحان اور انٹرویو کے ذریعے امیدواروں کو منتخب کرتا ہے۔

مذکورہ بالا دو مرکزی کمیشنوں میں سے یونین پبلک سروس کمیشن اعلیٰ سروسوں اور بڑی ملازمتوں کے لیے انتخاب کرتا ہے، مثلاً آئی اے ایس، آئی پی ایس، آئی ایف ایس، انڈین ریونیو سروس، انڈین پوسٹل سروس، انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس، کسٹم اینڈ سینٹرل ایکسائز، انکم ٹیکس وغیرہ۔ اسٹاف سلیکشن کمیشن کے دائرۂ انتخاب میں کلرک اور انسپکٹر، آڈیٹر، اِن دلیسی گریڈ وغیرہ آتے ہیں۔

پبلک سروس انڈرٹیکنگس ملازمتوں کی بھرتی کے لیے اپنا نظم الگ رکھتی ہیں۔ ریلوے سروس کمیشن جن کی تعداد ۹ ہے، ریلوے کی ملازمتوں کے لیے امتحان اور انٹرویو لیتے ہیں۔ اسی طرح بینکوں کے اپنے بہت سے کمیشن مختلف علاقوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

ریاستوں میں ریاستی پبلک سروس کمیشن ریاستی سول سروس کے لیے بھرتی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستوں میں ماتحت یا سبارڈینیٹ ملازمتوں کے لیے مرکزی اسٹاف سلیکشن کمیشن وضع کرکے ریاستی کمیشن قائم کیے گئے ہیں۔ —— مندرجہ بالا بیان سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اب بیشتر ملازمتوں کے لیے صلاحیت کو معیار بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے مقابلوں کی تیاری کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

ایک اور بات جو اس سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے شہریوں کی زندگی میں حکومتوں کا گھٹنے نہ بڑھتا ہوا نفوذ و اثر۔ اس لیے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ جو طبقہ ترقی کرنا چاہتا ہے اور خوش حال رہنا چاہتا ہے وہ حکومت اور اس کے دفاتر میں مناسب نمائندگی حاصل کرے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ملک کے جمہوری اور انتظامی نظام میں سرکاری دفاتر میں نمائندگی حاصل کرنے کا واحد طریقہ مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کرنا اور ان میں بیٹھنا ہے۔

مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے، یہ احساس شدت پکڑتا جارہا ہے کہ انہیں ملک کے بندوبست میں برائے نام نمائندگی حاصل ہے۔ آزادی کے ۴۳ سالوں کے دوران سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب دن بہ دن کم ہوتا چلا گیا۔ دفاتر میں خواہ وہ مرکزی ہوں یا ریاستی، وہ شاذونادر ہی نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کی درخواستوں پر دھیان بالعموم ہمدردی اور تیز رفتاری کے ساتھ دھیان نہیں دیا جاتا اور ادھر ان کو اس سلسلے میں طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ جان فرسا احساس ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا کہ اپنے ملک کے انتظام اور نشوونما میں ان کو دخل نہیں دیا جاتا۔

ہمارے پاس اس قسم کے اعداد و شمار نہیں ہیں کہ مختلف ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب کیا ہے؟ لیکن اگر مثال کے طور پر اعلیٰ ملازمتوں کو لیا جائے تو ہر سال تقریباً ۸۰۰ یا ۹۰۰ جگہوں میں سے ۱۰ یا ۱۲ جگہیں ان کے ہاتھ آتی ہیں حالانکہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہر سال ان کے ۱۰۰ امیدواروں کو منتخب ہونا چاہیے تھا۔ ایک قباحت یہ بھی ہے کہ آبادی کے تناسب سے مقابلوں کے مختلف امتحانوں میں مسلمان امیدواروں کے بیٹھنے کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ اور جو بیٹھتے بھی ہیں وہ ان میں سے بہت سے پوری تیاری نہیں کرتے۔ انہیں یہ شکایت بھی رہتی ہے کہ ان کے ساتھ مقابلے کے امتحانوں میں انصاف نہیں کیا جاتا ــــ اس وجہ سے بعض طالب علم ان امتحانات میں قسمت آزمائی سے گریز کرتے ہیں۔

یہ شکایت صرف جزوی طور پر صحیح ہو سکتی ہے۔ بعض امتحانات اور امتحان لینے والے کمیشن جانب داری کے شک و شبہے سے بالاتر ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے امتحانوں کا نظم و نسق اس وضع کا ہے کہ ممتحنوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ کاپی کس امیدوار کی ہے اور اس کا کیا نام ہے؟ بعض امتحانوں اور بھرتیوں میں انٹرویو کام کر جاتے ہیں اور بعض جگہ انٹرویو بورڈ کا یہ رویہ بڑے طور پر ہو سکتا ہے کہ منصفانہ نہ ہو۔ لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں کے لیے انتخابات میں اثرات کارفرما نہیں ہو پاتے۔ اور اگر چھوٹی ملازمتوں کے انتخاب میں کہیں نا انصافی راہ پاتی ہے تو وہ بھی جزوی طور پر۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ اگر کوئی امیدوار نمایاں طور پر اچھا ہے تو اس کی راہ میں تنگ نظری حائل نہیں ہو سکتی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں کو مناسب روزگار اور اپنے ملک کے انتظام اور ترقی میں معقول حصہ حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مقابلے کے امتحانوں میں جاں فشانی کے ساتھ شریک ہوں اور ہر شہر میں اس قسم کا انتظام کیا جائے کہ انہیں ملازمتوں کے مواقع اور مقابلے کے امتحانوں کی بابت ضروری اطلاعات ملتی رہیں اور کچھ نہ کچھ رہنمائی ملتی بھی ہو جس کے تحت وہ تیاری کر سکیں، فارم بھر سکیں اور مضامین کا صحیح انتخاب کر سکیں۔

چھوٹے پیمانے پر یہ کام ہر شہر میں وہ لوگ کر سکتے ہیں جو ملازمتوں سے سبک دوش ہو چکے ہیں ــ یا جو ملازمت کے دوران بھی کچھ وقت خدمتِ خلق کے لیے نکال سکتے ہوں۔

ہماری حکومت نے جسے اقلیتوں کی دراصل زیادہ فکر نہیں رہتی لیکن جو اپنی فکرمندی کا اظہار کرتی رہتی ہے، اس بات کی جانب دھیان دیا ہے کہ مسلمانوں کا تناسب سرکاری ملازمتوں میں کم کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ وہ یہ دھیان زیادہ پہلے اور زیادہ موثر طریقے سے دیتی اگر مسلمانوں کے رہنما صرف سیاست کو زندگی کا مقصد نہ بنا لیتے، بلکہ مسلمانوں کی تعلیم، تعمیر اور صلاحیت کے مقابلے کی طرف توجہ دیتے۔ بہرکیف حکومت کا دھیان خاموشی کے ساتھ اس طرف دلایا گیا۔ اور تین چار سال کی متواتر کوشش کے بعد حکومت نے طے کیا کہ چونکہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لیے کوئی ریزرویشن نہیں ہو سکتا اس لیے کم سے کم انہیں ملازمتوں کا اہل بنانے کی کوشش کی جائے۔

یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کو ہدایت دی گئی کہ وہ ان یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں جہاں اقلیت کے طالب علموں کی معقول تعداد ہو، وہاں مقابلے کی تیاری کے لیے مراکز کھولے۔ اس ہدایت کے تحت شروع میں سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس کوچنگ سینٹر کے لیے جو وہاں پہلے سے کام کر رہا تھا، امداد دی گئی۔ اور اس کے بعد ۳۵ ر اور مراکز ملک بھر میں کھولے گئے جن میں ۲۰ ر یونی ورسٹیاں ہیں اور ۱۵ ر ڈگری کالج ہیں۔

ہر چند کہ یہ اسکیم ۱۹۸۴ء میں شروع کی گئی لیکن اس کے نتائج ہنوز امید افزا نہیں ہیں۔ راقم الحروف کو یو جی سی نے اس کمیٹی کا صدر بنا کر بھیجا جس کا کام یہ تھا کہ وہ ان مراکز کی جانچ کرے اور اسکیم کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اپنی سفارشات پیش کرے۔ یہ رپورٹ شمالی، مشرقی اور جنوبی ہندوستان کے بعض مراکز کو دیکھنے کے بعد یو جی سی کو دے دی گئی۔ ان مراکز میں کامیابی حسب امید نہ ہونے کی وجوہات اجمالاً حسب ذیل ہیں:

(۱) بعض مراکز ایسی جگہوں پر کھولے گئے جہاں مقصود اقلیتوں کی تعداد کم ہے۔

(۲) تربیت دینے والوں میں فنی مہارت اور دلچسپی کی کمی پائی گئی۔

(۳) ان مراکز کی موجودگی کو ڈھنگ سے اور بڑے پیمانے پر مشتہر نہیں کیا گیا۔

(۴) مقامی مشورہ اور تائید حاصل کرنے کی کوشش بھی پورے طور سے نہیں کی جا سکی۔

(۵) تعلیمی طور پر پس ماندہ اقلیتوں کی طرف سے ان مراکز کی پذیرائی اور ان سے استفادہ خاطر خواہ نہیں کیا گیا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ اگر ۵۰ ر امیدواروں کی تربیت کا انتظام ہے تو ان میں پانچ یا دس سے زیادہ مذکورہ اقلیتوں کے امیدوار نہیں ہیں۔ اس کے نتیجے میں بقیہ ۴۰ یا ۴۵ نشستیں دوسرے طالب علموں کو دے دی گئیں۔ اس طرح مقابلے کے ضمن میں دوسرے طبقوں اور پس ماندہ اقلیتوں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گیا۔

(۶) بعض جگہ اس اسکیم کو الگ سے چلانے کے بجائے مقابلے کے امتحانوں کی عام اسکیموں یا درج فہرست ذاتوں اور قبائلیوں کی اسکیم میں مدغم کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کا اصل مقصد فوت ہو گیا۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ حکومت ہند نے اپنی دستاویز "نئی تعلیمی پالیسی — عملی پروگرام سنہ ۱۹۸۶ء" میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان میں دو فرقے تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں — ایک مسلمان اور دوسرے نو بودھ جو ڈاکٹر امبیڈکر کی پیروی میں بدھ مت کے دائرے میں داخل ہوئے۔

(۷) مسلمان طلبہ بالعموم ایسے گھروں سے آتے ہیں جہاں تعلیم کا چرچا نہیں ہے اور جہاں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے دوران ان کو گھر پر تعلیمی مدد نہیں ملتی، لہٰذا وہ کلاس میں اپنے ہم جماعتوں کا بالعموم مقابلہ نہیں کر پاتے۔ اس سے سب سے بڑی خرابی یہ بھی رونما ہوتی ہے کہ ان کا اعتماد اپنی صلاحیتوں سے ہٹ جاتا ہے اور وہ خود کو کم اہل اور ہیچ سمجھنے لگتے ہیں۔ ایک بار اگر حوصلہ پست ہو گیا تو زندگی کی دوڑ میں اچھا دشوار ہو جاتا ہے!

آخری دشواری۔ جس کا ذکر ساتویں وجہ کے طور پر اوپر آیا ہے، کے دو حل ہیں: ایک طویل مدتی اور دوسرا فوری۔ طویل مدتی حل جس کے بغیر بات دراصل بنے گی نہیں، یہ ہے کہ مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلانے کو پہلے ترجیح دیں تاکہ نئی نسل، اس تعلیمی امداد سے جو بچوں کو بہر حال درکار ہوتی ہے، محروم نہ رہے — فوری حل یہ ہے کہ ہمارے گھر جو کچھ فراہم نہیں کر پا رہے ہیں، ہمارا سماج یا معاشرہ اس کی ذمہ داری لے۔ اس کے لیے اسکول کے اوقات کے باہر ایسے کلاس جنہیں اصلاحی

یا تقویتی کہلاتا ہے کھولے جائیں جن میں اوسط سے بہتر طالب علموں کی کمزوریوں کو دور کیا جائے اور انہیں اس لائق بنایا جائے کہ وہ یونیورسٹی کی سطح تک پہنچتے پہنچتے اپنے ہم وطنوں کے برابر آ سکیں۔ یہ کام بھی شہر شہر مقامی ہمدردوں کی کوششوں سے کیا جا سکتا ہے۔

غور کیجیے تو اس وقت دو ہی کام کرنے کے ہیں — پہلا تعلیم کی زبردست توسیع جس میں تعلیم نسواں کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ دوسرا مقابلے کی صلاحیت پیدا کرنے کے طور پر زندگی کی دوڑ میں مقابلے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ اور منظم کوششیں — یہی نسخۂ کیمیا — جس سے ہماری بقا اور سرخروئی کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

اقلیت کے افراد کو بہر حال اکثریت کے افراد سے زیادہ محنت اور جاں فشانی کرنی چاہیے۔ کچھ اس لیے بھی کہ اکثریت کو جو سہولتیں اور رعایتیں حاصل ہو جاتی ہیں ان سے بھی عہدہ برآ ہوا جا سکے۔

کوچنگ سینٹرز یا تربیتی مراکز کی تفصیل منسلک ہے، ہماری اپنے قارئین سے اپیل ہے کہ ان مراکز میں دلچسپی لیں اور ان کے قرب و جوار میں جو مسلمان اور بدھ مذہب کے ماننے والے رہتے ہیں ان تک یہ بات پہنچائیں کہ ان مراکز سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو ملازمت ملنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ پروموشنل اور ایڈجسٹمنٹ کلاسز بھی کھولے جائیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھیے کہ اس دور کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان چھوٹی سی ملازمت سے شروع کر کے بڑے سے بڑے عہدے تک پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا ہم اس میں عار محسوس نہ کریں کہ ایک چھوٹی سی ملازمت کے لیے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ رہے ہیں۔

ہر مقابلے کا ہر امتحان خواہ کسی منصب کے لیے ہو، دوسرے مناصب کے امتحانات کی تیاری میں بھی معاون ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو چھوٹی سی ملازمت میں داخل ہو گئے ہیں، یہ کھلی چھوٹ ہے کہ وہ بڑے مناصب کے امتحان میں بیٹھ سکیں اور ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ایک شخص جو کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہوا اس نے سول سروسز کے امتحان کے ذریعے آئی اے ایس میں جگہ پائی۔

جمہوریت میں ترقی کی حد آسمان ہے ہمیں ان مواقع کی تشکیل کرنی چاہیے۔ اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جو کسی جمہوری نظام میں ہر شہری کا بنیادی حق ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہر شہر میں ایسے لوگوں کا کمر کس کے میدان میں آ جانا ضروری ہے۔ جو نئی نسل کی رہنمائی اور مدد کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تام جھام کی ضرورت ہے نہ لاؤ لشکر کی ضرورت ہے۔ تھوڑے سے خلوص، تنظیم، باخبری اور سلیقہ کی۔ اور یہ چیزیں ہر جگہ فراہم ہو سکتی ہیں۔

یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے پتے جہاں اقلیت کے لیے کوچنگ سنٹر قائم ہیں

یونی ورسٹیاں

(۱) آگرہ یونیورسٹی، آگرہ ۲۸۲۰۰۴ (یوپی)
(۲) علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ (یوپی)
(۳) الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۲ (یوپی)
(۴) بنگلور یونی ورسٹی، بنگلور ۵۶۰۰۵۶ (کرناٹک)
(۵) بھوپال یونیورسٹی، بھوپال ۴۶۲۰۰۱ (ایم پی)
(۶) کالی کٹ یونیورسٹی، کالی کٹ ۶۷۳۶۳۵ (کیرل)
(۷) دیوی اہلیہ وشو ودھیالیہ، اندور ۴۵۲۰۰۱ (ایم پی)
(۸) گوہاٹی یونیورسٹی، گوہاٹی ۷۸۱۰۱۴ (آسام)

(۹) گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور ۲۷۳۰۰۱ (یوپی)
(۱۰) جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱-۲۵
(۱۱) جموں یونیورسٹی، جموں
(۱۲) ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ بہار
(۱۳) کشمیر یونیورسٹی سری نگر
(۱۴) لکھنؤ یونیورسٹی (یوپی)
(۱۵) ایم ڈی یونیورسٹی روہتک (ہریانہ)
(۱۶) میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ (یوپی)
(۱۷) ناگپور یونیورسٹی ناگپور (مہاراشٹر)
(۱۸) عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
(۱۹) پٹنہ یونیورسٹی
(۲۰) ساؤتھ گجرات یونیورسٹی سورت (گجرات)

کالج

(۱) بابائے کے بی ڈگری کالج اکبرپور فیض آباد یوپی
(۲) گاندھی فیضان کالج شاہ جہاں پور (یوپی)
(۳) گورنمنٹ کالج سرگوڈ (کیرالا)
(۴) حمیدیہ گرلس ڈگری کالج الہ آباد
(۵) کرامت حسین مسلم گرلس کالج لکھنؤ
(۶) لال بہادر شاستری ڈگری کالج گونڈا (یوپی)
(۷) سیفیہ کالج بھوپال
(۸) شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ
(۹) انوارالعلوم کالج حیدرآباد
(۱۰) انجمن اسلام نہرو کالج ہبلی
(۱۱) حلیم مسلم ڈگری کالج کانپور
(۱۲) سرسید کالج تلیپارمبا (کیرالا)
(۱۳) مولانا آزاد کالج اورنگ آباد ـــــ اور دیگر اہم کالج۔

"آموزگار" مئی ۹۳ء

راکیش شرما
ترجمہ: نجیب انصاری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں
ہندوؤں کا تعاون

- مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے سرسید احمد خاں نے ۱۸۶۳ء میں غازی آباد میں ایک سائنٹفک سوسائٹی بنائی تھی۔ اس کے ممبران میں ۱۰۰ مسلم اور ۸۲ ہندو تھے۔ سرسید کے بہت قریبی دوستوں میں مہاراجہ ایشوری پرشاد نرائن سنگھ، لالہ اجودھیا پرشاد منصف مرزاپور، راجہ جے کشن داس، بابو شیو پرشاد بنارسی اور رائے بختاور سنگھ شامل تھے۔
- یکم اگست ۱۸۸۲ء کو یونیورسٹی کے قیام سے قبل مشاورتی میٹنگ ہوئی۔ اس میں ۵ ہندو ممبران تھے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی مجلس منتظمہ میں ۶ ہندو ممبران تھے۔
- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے گریجویٹ ایشوری پرشاد تھے۔ خان عبدالغفار خاں (سرحدی گاندھی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹوں کے بیچ میں تھے۔
- لالہ ملک چند دیوان سرسید کے ماموں کی جانب سے مقرر کردہ ان کے سرپرست تھے۔ سرسید کے نانا نواب فخرالدین خاں نے اپنی جائداد کی تقسیم کے وقت لالہ ملک چند کو اپنے بیٹوں کے برابر حصہ دیا تھا۔
- اپنے پوتے راس مسعود کی بسم اللہ کے موقع پر سرسید نے راس مسعود کو اپنے دوست راجہ جے کشن داس کی گود میں بٹھایا تھا۔
- مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سرسید کے دادا کے بھائی خواجہ نجیب الدین کو اپنا ہیڈ خزانچی بنایا تھا۔
- سرسید کے غازی پور مدرسے کے سرپرست راجہ دیو نرائن سنگھ تھے۔ مدرسہ غازی پور میں سنسکرت بھی پڑھائی جاتی تھی۔
- ۱۸۸۴ء میں انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے صدر دیال سنگھ نے سرسید کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا تھا:
  "آپ کا سب کے لئے محبت کا جذبہ نایاب تحفہ ہے اس ملک کے باشندوں کے لیے۔"
- ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں سرسید نے مسلمانوں کے ایک جلسے میں کہا تھا:
  "دوستو! جس طرح اونچی ذات کے ہندو دور دراز سے آئے اور اس ملک کو اپنا بنالیا اسی طرح مسلمانوں کو بھی خود سے اسی ملک کے ساتھ جوڑ لینا چاہیے۔ یہی ہماری جنت ہے۔ اسے جنت ہی رکھنا ہے۔"
- گورداسپور میں ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو انھوں نے کہا تھا:
  "ہم (ہندو مسلمان) ایک ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ ایک جگہ پیدا ہوتے اور دفنائے جاتے ہیں۔ ہم جب جب مل کر کھڑے ہوئے، دنیا کو ہلا دیا۔ جب ایک دوسرے کے خلاف ہوئے، تباہی کا سامنا کیا..... کیا مسلمان جو ہندوستان میں رہتے ہیں، ان کو کوئی اور ملک اپنا سکتا ہے؟ کیا ہندو بنا مسلمانوں کے رہ کے خوش رہ سکتے ہیں؟ ہم مل کر ہی ایک ملک ہیں، الگ ہو کر ڈرتے ہوئے محض سے زیادہ

کچھ جھلکیاں:

- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے پرنسپل [illegible] تھے اور پہلے [illegible] پرنسپل [illegible] تھا۔
- وائسرائے پرنسپل [illegible] کو [illegible] سے [illegible] تھی۔ [illegible] کا تقرر پرنسپل کے تقرر سے پانچ سال پہلے ہو گیا تھا۔ [illegible] کو ۱۰ روپے اور مولوی صاحب کو [illegible] روپے ماہانہ ملتے تھے۔
- ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیان اس کالج میں دس ہندو اساتذہ کا تقرر کیا گیا تھا۔
- یونیورسٹی کے قیام کے ابتدائی برسوں میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء کے درمیان اساتذہ میں ۷ ہندو اساتذہ تھے، ۵ عیسائی اور ایک پارسی۔
- اس وقت یونیورسٹی میں [illegible] پروفیسر، ۹۵ ریڈر اور [illegible] لیکچرر ہندو ہیں۔
- یونیورسٹی میں [illegible] سے سنسکرت کا شعبہ قائم ہے جس کے پہلے صدر پنڈت رام [illegible] تھے۔
- [illegible] تک [illegible] طلبا نے یہاں سنسکرت میں پی ایچ ڈی کیا۔ پہلی ڈگری [illegible] کو ملی تھی۔
- یونیورسٹی کی لائبریری میں [illegible] سے زیادہ ہندی اور [illegible] سنسکرت کی کتابیں ہیں۔
- یونیورسٹی کے کچھ ہال / ہاسٹل [illegible] (راجہ جے کشن داس ہاسٹل) [illegible] ہاسٹل، [illegible] ہاسٹل وغیرہ ہندوؤں کے نام سے ہیں۔
- ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۰ء کے درمیان [illegible] کی ڈگری حاصل کرنے والوں میں [illegible] کا نام نمایاں تھا۔
- ۱۹۴۳ء سے ۱۹۹۰ء کے درمیان [illegible] انجینئرنگ میں [illegible] اور سائنس [illegible] میں [illegible] ہندو [illegible] پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
- ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۵ء کے درمیان مختلف درجات میں تقریباً ۵۳ ہندو طلبا اعلا اور اعلاترین پوزیشن پر رہے۔
- یونیورسٹی کے قیام کے لیے [illegible] میں مدد دینے والوں میں راجہ جے کشن داس، [illegible] ٹھاکر [illegible] سنگھ، [illegible] سنگھ، راجہ [illegible] سنگھ اور [illegible] سنگھ شامل تھے۔
- یونیورسٹی کی لائبریری میں تقریباً [illegible] کتابیں مختلف ہندو [illegible] کی جانب سے عطیہ کی ہوئی ہیں۔
- یونیورسٹی نے [illegible] کی بنیاد پر جن شخصیتوں کو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۹۰ء تک یونیورسٹی کے [illegible] اعزاز سے خطاب کیا ان میں سے کچھ کے نام درج ذیل ہیں:

پنڈت جواہر لال نہرو (۱۹۳۵ء)، ڈاکٹر [illegible] (۱۹۳۰ء)، پنڈت گووند ولبھ پنت (۱۹۵۰ء)، شری [illegible] (۱۹۵۰ء)، ڈاکٹر [illegible] پرشاد (۱۹۵۲ء)، سر [illegible] ڈاکٹر [illegible] (۱۹۵۲ء)، ڈاکٹر [illegible] (۱۹۵۳ء)، شری کے ایس [illegible] (۱۹۵۵ء)، ڈاکٹر [illegible] (۱۹۵۵ء)، شری وی وی گری (۱۹۵۹ء)، شری ڈی ایس کوٹھاری (۱۹۶۲ء)، شری [illegible] (۱۹۶۲ء)، شری [illegible] شاستری (۱۹۶۳ء)، شری [illegible] (۱۹۶۰ء)، شری [illegible] (۱۹۶۰ء)، شری [illegible] (۱۹۶۹ء)، شری [illegible] (۱۹۷۰ء)، شری [illegible] (۱۹۷۲ء)، شری [illegible] (۱۹۷۰ء)، ڈاکٹر [illegible] سنگھ (۱۹۷۳ء)، ڈاکٹر [illegible] (۱۹۷۲ء)، شری ڈی ایس کوٹھاری (۱۹۷۰ء)

اس کے علاوہ بہت سی ہندو شخصیتوں کو یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری سے نوازا۔ یونیورسٹی کی [illegible] سالہ تاریخ میں [illegible] ہندو طلبا اور [illegible] کو اعزازی ڈگری دی گئی۔

ماخذ

- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی روایات
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خطبات (۱۹۸۳ء)
- مرتبہ [illegible] کے مختلف لیکچر
- [illegible] ایم اے [illegible]

دنیش مشرا، ڈاکٹر محمد عباس،
کاظم رضوی
تلخیص و ترجمہ: مجیب انصاری

بنارس ہندو یونیورسٹی اور قومی یکجہتی

بنارس ہندو یونیورسٹی، قومی یکجہتی اور ہندوستانی ثقافت میں نوعِ انسانی کے فروغ اور ترقی کا مرکز رہی ہے۔ اس کے قیام اور ترقی میں جہاں ایک طرف اس کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ کا تعاون تھا وہیں دوسری طرف دیگر مذاہب کے ماننے والوں اور ان کے ساتھیوں کا بھی تعاون تھا۔ نتیجے کے طور پر بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام میں مالویہ جی کو مسلمانوں سے جو تعاون اور حوصلہ افزائی ملی وہ قابلِ تعریف ہے۔
اسی سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اتھوپیا کے بادشاہ، ہز میجسٹی کنگ ابن سعود آف عرب، ہز ہائی نس مہاراجہ نظام حیدرآباد، نواب رام پور اور سلطان احمد خان کا ایثار کا اس یونیورسٹی کی تعمیر میں خصوصی تعاون شامل رہا۔ آج بھی اس یونیورسٹی میں شعبۂ تکنیکی تعلیم کا رام پور ہال اور یونیورسٹی کیمپس میں نظام حیدرآباد کالونی، جو اساتذہ کی رہائشی کالونی ہے، کے ساتھ ہی سعودی عرب کے شاہ کے تعاون سے یونیورسٹی میں سوئمنگ پول قائم ہے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ہم آہنگی کی ایک بہترین مثال ہے۔
پٹنہ کے علی امام صاحب نے یونیورسٹی کے قیام میں تعاون کے طور پر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کو جہاں ایک لاکھ ایک ہزار روپے کی رقم چندے میں دی تھی، وہیں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو صرف اکیاون ہزار روپے بطور چندہ دیے تھے، جسے کم ہونے کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے قبول نہیں کیا۔ اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ جب علی امام صاحب سے پوچھا گیا کہ "آپ نے بنارس ہندو یونیورسٹی کو ایک لاکھ ایک ہزار روپیہ چندہ دیا، جبکہ مسلمان ہونے کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو صرف اکیاون ہزار روپے ہی دیے"۔ تو انھوں نے جواب دیا:
"میں پیشے کے اعتبار سے وکیل ہوں اور ہندو اکثریت والے علاقے میں پریکٹس کرتا ہوں، لہٰذا میری یہ آمدنی ہندوؤں کی وجہ سے ہے۔ اس لیے میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں مالویہ جی کی یونیورسٹی کی زیادہ سے زیادہ امداد کروں۔ اسی لیے میں نے ہندو یونیورسٹی کو ایک لاکھ ایک ہزار روپے کی رقم چندے میں دی ہے۔"
اس سلسلے میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے جگری دوست علامہ محمد حسن فائز بنارسی کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ۱۹۰۰ء میں ایک سووینیر شائع کیا تھا جس میں بھارت رتن ڈاکٹر بھگوان داس کے حوالے سے شائع شدہ ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ اخلاقی طور پر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کو ان کے جگری دوست علامہ محمد حسن فائز بنارسی نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام میں جتنا تعاون دیا ہے اتنا کسی فرقے کے کسی شخص نے نہیں دیا۔
مشہور شاعر، ماہرِ تعلیم اور دانشور علامہ فائز بنارسی، پنڈت مدن موہن مالویہ، بھارت رتن ڈاکٹر بھگوان داس اور دیش رتن بابو شیو پرشاد گپت کے گہرے دوستوں میں تھے۔ آغا حشر کشمیری، [illegible] جگن ناتھ داس رتناکر، ڈاکٹر سمپورنانند

اور شری پرکاش جی سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔ علامہ محو حسن ناظر بنارسی، مالویہ جی اور ڈاکٹر بھگوان داس کو لوگ بنارس میں تری مورتی (تین مورتی) کے نام سے جانتے تھے۔ ناظر بنارسی سے نظام حیدرآباد کی بڑی دوستی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جب مالویہ جی مالی امداد کے لیے نظام حیدرآباد سے ملے تھے تو اپنے ساتھ ناظر بنارسی کا خط لے گئے تھے۔ ناظر صاحب نے اپنی پوری زندگی مالویہ جی کے لیے وقف کر دی تھی۔

آج بھی بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ، طلباء اور ملازمین قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لیے کمربستہ ہیں۔ گزشتہ دنوں کے واقعات کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر چندر شیکھر جی نے اپنے اساتذہ، طلباء اور ملازمین کے ساتھ برت رکھا۔ اور مالویہ بھون سے مہاتما گاندھی کے مجسمے (ٹاؤن ہال) تک امن مارچ کی قیادت کی، جس میں عمائدین شہر کے ساتھ ساتھ عام ہندوؤں اور مسلمانوں نے شرکت کی۔

[redacted]

سوراج کا مطلب یہ ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی سبھی اپنے اپنے مذہب پر آزادی کے ساتھ عمل کر سکیں۔

——— مہاتما گاندھی

"نیا دور" مارچ، اپریل ۱۹۹۳ء

عمر ضائع کر دی

مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی گواہی جو علماء کے لیے دلیلِ راہ ہے

مفتی محمد شفیعؒ

قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوتا تھا اور مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال حسب معمول جلسے میں تشریف لائے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت اندھیرے میں سر پکڑے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا: "حضرت! کیسا مزاج ہے؟" کہا: "ہاں! ٹھیک ہی ہے۔ میاں، مزاج کیا پوچھتے ہو؟ عمر ضائع کر دی۔"

میں نے عرض کیا: "حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت اور دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ آپ کے ہزاروں شاگرد علماء اور مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟" فرمایا: "میں تم سے صحیح کہتا ہوں، عمر ضائع کر دی۔" میں نے عرض کیا: "حضرت، بات کیا ہے؟"

فرمایا: "ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں، امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

"اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی! ابو حنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

"اور ہم امام شافعیؒ، مالکؒ اور احمدؒ بن حنبل اور دوسرے مسلک کے فقہا کے مقابلے میں یہ جو ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے اس کا؟

اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو **"صواب محتمل الخطا"** (درست مسلک میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو "خطا محتمل الصواب" (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں۔ اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں، **تدقیقات** اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔"

پھر فرمایا: "ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا' لہٰذا اجتہادی مسائل کا صرف اس دنیا میں فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح' یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو' اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی' قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین' حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر' حق تھی یا بالسر حق تھی۔

"اللہ تعالیٰ شافعی کو رسوا کرے گا نہ ابو حنیفہ کو' مالک کو رسوا کرے گا نہ احمد بن حنبل کو۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے' جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے' جنہوں نے نور ہدایت چار سو پھیلایا ہے' جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں' اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدان حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابو حنیفہ نے صحیح کہا تھا یا شافعی نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس۔

"تو جس چیز کو دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں اور نہ محشر میں' اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی' مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی ضروریات جو سبھی کے نزدیک اہم تھیں' جن کی دعوت انبیائے کرام لے کر آئے تھے' جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور جن منکرات کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی' آج وہ دعوت تو نہیں دی جا رہی۔ آج ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے اور اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں۔ اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیے تھا' پھیل رہے ہیں۔ گمراہی پھیل رہی ہے' الحاد آ رہا ہے' شرک و بت پرستی چل رہی ہے اور حلال و حرام کا امتیاز اٹھ رہا ہے' لیکن ہم لگے ہوتے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔"

حضرت شاہ صاحب نے آخر میں فرمایا: "یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی!"

مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کے مسائل اور ان کا حل

مولانا صدرالدین اصلاحی

(۱۲ نومبر ۱۹۷۷ء کو آل انڈیا جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع منعقدہ حیدرآباد کے موقع پر "ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کے بنیادی مسائل" کے موضوع پر اس وقت کے حالات کے اعتبار سے ایک سمپوزیم منعقد کیا گیا جس میں ملک کی سربرآوردہ جماعتوں کے رہنماؤں نے حصہ لیا۔ یہ سمپوزیم مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی رکن شوریٰ نے اس موضوع پر جو مقالہ پڑھا اسے افادۂ عام کی غرض سے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔)

حضرات! ہر فرد کی اپنی ایک مخصوص شخصیت ہوتی ہے۔ وہ بعض امتیازی خصوصیات رکھتا ہے جن سے اسکی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ یہی انفرادیت اسکی ذات کو ممتاز اور نمایاں کرتی ہے اور اسی پر اس کا ذاتی تشخص موقوف ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی اس مخصوص شخصیت اور ان امتیازی خصوصیات سے محروم ہو رہے یا اس کو ان سے بجبر محروم کر دیا جائے تو گویا اسے اپنے آپ سے محروم کر دیا گیا اور اسے ایک دوسری شخصیت اڑھا دی گئی۔ اسی وجہ سے مہذب سماج کا یہ بنیادی وصف مانا گیا ہے کہ اس کے اندر انسان کی انفرادیت باقی رہے اور اسے اپنے طور پر پروان چڑھنے کی معقول آزادی حاصل ہو اور اس آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ حائل ہونے دی جائے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ایک سیاسی نظام اور ایک حکومتی ادارے کے قیام کی بنیادی غرض و غایت ہی اس آزادی کا تحفظ ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی آمرانہ نظام نے لوگوں کے اس سب سے اہم بنیادی حق پر کوئی پابندی عائد کر دی تو انسانی ضمیر اسے کبھی برداشت نہ کر سکا اور اس کے خلاف برابر بغاوتیں کرتا رہا۔

یہ بات جس حد تک افراد کے حق میں ایک مسلمہ ہے۔ قوموں ملتوں اور تہذیبی گروہوں

کے بارے میں اس سے ہزار گنا اہم تر اور عظیم تر مسلمہ ہوگی۔ اتنا ہی اہم تر اور منظم تر جتنا کہ ایک پورا گروہ ایک فرد کے مقابلہ میں ہوا کرتا ہے۔ مذہبی اور تہذیبی گروہوں کی اپنی انفرادیت ہی تو ان کی اصل متاع ہوتی ہے۔ وہ فی الواقع اسی وقت تک زندہ اور موجود ہوتے ہیں جب تک کہ ان کا تشخص برقرار رہتا ہے، ان کے اپنے اصول انکی عام زندگی کی رہنمائی کررہے ہوتے ہیں اور انہیں اپنے مخصوص تصورات کے مطابق اپنے حال اور مستقبل کی تعمیر کی آزادی حاصل ہوا کرتی ہے۔ اس تشخص کا فنا یا مضمحل ہوجانا اور ان اصول و تصورات کا ان کی زندگی کے میدان سے بے دخل کردیا جانا دراصل ان تہذیبی اکائیوں کا ختم ہوجانا ہے۔ اس لئے کسی مذہبی یا تہذیبی گروہ کے لئے بنیادی اور اصل مسئلہ صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے تہذیبی تشخص اور اپنی زندگی کی دینی بنیادوں کو پوری طرح محفوظ رکھنے میں ہر خوف اور ہر خطرے سے آزاد ہو۔ اور ان کے مطابق اپنے مستقبل کی تعمیر میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

تہذیب کشی اور اسکا انجام بد

جب مذہبی آزادی اور تہذیبی حق خود اختیاری کا انسانی زندگی میں یہ مقام ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس آزادی کی نفی اور ان حقوق کا انکار دنیا کا سب سے بھیانک ظلم ہوگا۔ ایک انسان کے قتل کو سب سے بڑے جرائم میں شمار کیا جاتا ہے۔ تہذیب کشی تو ایک پورے گروہ اور ایک پوری ملت کا معنوی قتل ہے۔ اس لئے کوئی شک نہیں کہ اس ظلم کی ہولناکی اپنی مثال آپ ہی ہوسکتی ہے لیکن معلوم رہنا چاہئے کہ اس ظلم اور خون ناحق کی تلوار بھی دو دھاری ہوتی ہے۔ جب وہ چلائی جاتی ہے تو مظلوم ہی پر نہیں ظالم پر بھی گرتی ہے۔ واضح بات ہے کہ ظلم کی جو چھری وہ کسی دوسری گردن پر چلانے بڑھتا ہے وہ قبل اس کے کہ وہاں تک پہنچے خود اس کے اپنے ضمیر اور اسکی اپنی انسانیت پر کاری ضرب لگا چکی ہوتی ہے۔ ایسی حرکتوں کے نتیجے میں اسکی ذہنیت سخت ناہموار اور اسکی اخلاقی حس پامال ہورہی ہے۔ اسکے ضمیر میں شرپسندی اور اسکے مزاج میں بربریت گھر کرلیتی ہے اسکا کھلا ہوا مطلب یہی تو ہوا کہ دوسروں کو تباہ کرنیوالا اپنے کو بھی اخلاقی تباہی کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔

جماعت افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ اس لئے جو بات ایک فرد کے بارے میں حقیقت ہوگی وہ جماعت کے بارے میں بھی حقیقت ہی ہوگی۔ لہٰذا اگر کوئی جماعت کسی دوسری

جماعت کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کی اور کوئی ملت کسی دوسری ملت کی تہذیب اور اس کے مذہب کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کرتی ہے تو اس کا مطلب یقینی طور پر یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کو حق دشمنی، شر پسندی ظلم اور غارت گری کی ٹریننگ دے رہی ہے۔ حالانکہ یہ حق دشمنی اور ظلم و غارت گری جہاں ہوتی ہے وہاں سے مذہب رخصت ہو جاتا ہے اور تہذیب دم توڑ دیتی ہے۔ اس لئے کسی قوم کی تہذیب کشی انجام کے اعتبار سے خود کشی بھی ہے۔ دوسرے مذہبوں اور تہذیبوں کے خلاف، جارحیت اختیار کرنے والے خود اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے بھی جانی دشمن ثابت ہوتے ہیں، اور یہ اس لئے کہ جب کسی گروہ کو ظلم و تعدی کا چسکا پڑ جاتا ہے تو وہ کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ جب تک دوسرے سامنے موجود ہوتے ہیں اس وقت تو انکی جان و مال اور انکی تہذیب و مذہب کا خون اس کے ذوق خون آشامی کو تسکین دیتا رہتا ہے، مگر جب دوسرے موجود نہیں رہ جاتے یا ان کی رگیں خشک کی جا چکی ہوتی ہیں تو فطری طور پر انکی اس سفاک ذہنیت کا رخ اپنوں ہی کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس طرح ظلم و بربریت کی یہ آگ جب کھانے کے لئے کچھ اور نہیں پاتی تو خود اپنے ہی کو کھانے لگتی ہے۔

ہندوستان اور اُسکی ملی وحدتیں ہم جس ملک کے باشندے ہیں اسکی حدود ہی لمبی چوڑی نہیں ہیں بلکہ اسکی برادری بھی بڑی ہے۔ یہاں دنیا کے سارے بڑے مذاہب موجود ہیں اور یہ زمین مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے دنیا کی زندگی مسائل کی زندگی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کہ یہاں بھی ہر مذہب کے پیرووں اور ہر تہذیب کے علمبردار گروہ کے لئے مسائل کا پایا جانا ایک قدرتی بات ہے۔ ان مسائل کا اگر تجزیہ کیجئے تو وہ دو قسم کے دکھائی دیں گے۔ ایک قسم ان مسائل کی ہوگی جو ان گروہوں میں سے صرف اقلیتی گروہوں کے مخصوص مسائل ہیں، اور دوسری ان مسائل کی ہوگی جو عام اور ہمہ گیر نوعیت کے ہیں اور ان سے صرف وہی ملتیں دوچار نہیں جو اقلیت میں ہونے کے باعث سیاسی دشواریوں میں گھری ہوئی ہیں بلکہ اس اکثریتی گروہ کے لئے بھی یہ مسائل برابر کی اہمیت رکھتے ہیں جو سیاسی حیثیت سے بالادست اور اپنے دینی اور تہذیبی معاملہ میں

کسی بھی بیرونی دباؤ یا خوف سے یکسر آزاد ہے۔

مشترک مسائل

ان مسائل میں سے جو اس ملک کی سبھی ملتوں اور تہذیبی گروہوں کو درپیش ہیں۔ چند مسائل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس وقت میں انہی پر روشنی ڈالوں گا۔

پہلا مسئلہ وہ مادی ذہنیت ہے جو آندھی طوفان کی طرح اس ملک کے باشندوں پر چھاتی چلی جا رہی ہے، اور جس نے یہاں مذہبی اور روحانی اقدار کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں یہ ذہنیت بنیادی طور پر مغربی تہذیب کے قاہرانہ تسلط کا نتیجہ ہے۔ اس تسلط کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس وقت ملک کی سیاسی سربراہی یا اس کی گرفت سب سے سخت ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں یہاں کی فکری رہنمائی اور اجتماعی لیڈرشپ ہے وہ بالعموم اسی مغربیت کے اندھے مرید ہیں۔ حتی کہ ان میں سے اکثر تو اس کی آخری حد، الحاد و انکار مذہب تک جا پہنچے ہیں۔ جب تک یہ صورت حال باقی رہے گی یہاں کے ہر مذہب اور تہذیب کے لئے مسائل ہی مسائل پیدا ہوتے رہیں گے اور ان کا مستقبل کبھی روشن نہ ہو سکے گا۔

دوسرا مسئلہ نظام تعلیم کا ہے۔ برطانوی دور حکومت میں یہاں تعلیم کا جو نصاب اور نظام جاری کیا گیا تھا وہ اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے ساتھ آج بھی بدستور موجود ہے۔ اس نظام تعلیم پر جو بھی اپنے مذہب، اپنی اخلاقی اقدار اور اپنی تہذیب کے نقطۂ نظر سے غور کرے گا وہ اپنے حق میں اسے سم قاتل ہی جانے گا۔ اس تعلیم کی خالص سائنسی برکتیں اپنی جگہ پر لاکھ قابل قدر سہی مگر اس کے اندر خون کی طرح دوڑنے والی فکر اسے قطعی طور پر اپنے خدا سے، اپنے مذہب سے، اپنی اخلاقیات سے، اپنی روحانی اقدار سے اور اپنے تہذیبی مزاج سے دور پھینک دینے والی ہے۔ چنانچہ جس حد تک بھی یہ نظام تعلیم ہماری نسلوں کو اپنے سانچے میں ڈھالتا گیا ہے۔ یہاں کے مذاہب کی اور یہاں کی تہذیبوں کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی چلی گئی ہیں قطعی بات ہے کہ یہ نامبارک سلسلہ اگر آئندہ بھی جاری رہا تو اس کے یہ نتائج اور زیادہ مہلک ہوتے چلے جائیں گے۔

تیسرا مسئلہ اہل مذاہب کا اپنی مذہبی تعلیمات اور اپنے تہذیبی اصولوں سے بے اعتنائی

کا خوفناک رویہ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ ملک خدا پرستی اور روحانیت کا گہوارہ ہے۔ نظری اور روایتی طور پر یہ دعویٰ چاہے جتنا بھی صحیح ہو مگر عمل کی کسوٹی اس دعوے کو کھوٹ ہی کھوٹ قرار دیتی ہے۔ وہ یہاں تک بتاتی ہے کہ بعض پہلوؤں سے اس "مذہبی اور روحانی" ملک کا حال مادہ پرست مغرب سے بھی ابتر ہے۔ چنانچہ اپنے کاروباری اور قومی معاملات میں جن اخلاقیات کی پابندی کا وہ مظاہرہ کرتا ہے ہمارا ملکی معاشرہ نوے فی صدی اس سے بھی محروم ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ ایک قلیل عنصر کو چھوڑ کر باقی پورا سماج مادیت، خود غرضی اور نفس پرستی میں بری طرح غرق ہے اور انہی صفات میں مسابقت کر رہا ہے اگرچہ ساتھ ہی وہ اپنے مذہب کا نام بھی بڑے جوش عقیدت سے لیتا رہتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ مذہب کی تعلیمات اور تہذیب کے اصولوں کی کھلی ہوئی عملی مخالفت کے ساتھ ان کے حق میں یہ زبانی اظہار عقیدت ایک تکلیف دہ مذاق سے کم نہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جو پارٹیاں اور تنظیمی ادارے اپنے دعوے کے لحاظ سے مذہب اور تہذیب کی حفاظت و ترقی ہی کے لئے وجود میں آئی ہیں۔ اور انکی زبانوں پر دن رات دھرم اور سنسکرتی ہی کے نام رہا کرتے ہیں، ان کے رویے اور مشاغل میں بھی دوسروں سے نفرت اور دوسروں کے خلاف عداوت ہی کا زور شور سرفہرست رہتا ہے، کم از کم بیرونی حلقوں میں تو وہ اسی حیثیت میں جانی پہچانی جاتی ہیں۔ تہذیب کے نام پر فی الواقع یہ افسوسناک قسم کی بدتہذیبی اور مذہب کے نام پر فی الواقع یہ افسوسناک قسم کی مذہب دشمنی ہے۔ جس سے تہذیب اور مذہب کا مستقبل صرف تاریک تر ہی بن سکتا ہے۔ یقین رکھئے کہ یہ متعفن تہذیب نوازی اور یہ سڑی ہوئی مذہبیت مذہب کے خلاف آج ملحدوں اور منکروں کا سب سے کارگر ہتھیار بنا ہوا ہے۔ یہ روش دین و دیانت کے خلاف ایسی ناطق دلیل ہے جس کے ہوتے ہوئے یہاں مذہب بیزاری اور مادہ پرستی کو اپنے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ مذہب کے نادان اور نام نہاد پیروؤں کے ان سیاہ کارناموں کو وہ عوام کے سامنے پیش کر کے انہیں بڑی آسانی سے مذہب سے متنفر بنا سکتے اور انہیں اپنی صف میں لے جا کر کھڑا کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

۴

چوتھا مسئلہ مذہب کے پیروؤں اور تہذیب کے علمبرداروں کا فکری جمود اور

انکی ذہنی مرعوبیت ہے۔ جو چھوٹا سا گروہ اہل مذہب کا اس بے عملی کے روگ سے بچا ہوا ہے اور مذہب کی مخلصانہ پیروی اور اپنی تہذیب کی صدق دلانہ حفاظت اور ترقی کا سچا جذبہ رکھتا ہے اسکا بھی حال بالعموم یہ ہے کہ وہ سینکڑوں اور ہزاروں برس کی پرانی دنیا میں رہ کر سوچتا ہے اور اس کی زمین ابھی تک ٹھہری ہوئی ہے۔

بظاہر اس فکری پس ماندگی کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نکل ہی نہیں سکتا تھا کہ ان کا دین عبادت خانوں میں بند رہے اور انکی تہذیب زمانے کی رہنمائی کرنے کے بجائے اس کے پیچھے چلتی بلکہ گھسٹتی رہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ خود یہ اہل مذہب اب عموماً یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مذہب کا دنیا کے معاملات سے اور انسان کی فکری عملی اور تمدنی رہنمائی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا کام تو انسان کو بس ایک "روحانی تسکین" بہم پہونچانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے اپنی زندگیوں کا ایک کامیاب اور زندہ نظام بنائے رکھنے کے خیال تک سے محروم ہو چکے ہیں۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے مذہب کی پاکیزہ روح اور اس کے بلند مقاصد سے دوری اور اس کی حقیقی توانائیوں سے بے خبری کا۔ اس بے خبری کے ہوتے ہوئے ان کے مذہب اور تہذیب کا مستقبل کبھی نہیں سنور سکتا یہی نہیں بلکہ یہ تہذیب نت نئے صدموں سے دوچار ہوتی رہے گی۔

(۲) اقلیتی گروہوں کے مخصوص مسائل

ان عام اور ہمہ گیر مسائل کے علاوہ دوسرے مسائل جو یہاں کے بعض اقلیتی گروہوں کو خاص طور سے درپیش ہیں، یہ ہیں۔

پہلا مسئلہ یہاں کے اکثریتی گروہوں کے اندر پائے جانے والے ایک ایسے طاقتور عنصر کا وجود ہے جو بعض اقلیتی گروہوں خصوصاً مسلمانوں کی مذہبی انفرادیت اور ان کے تہذیبی تشخص کو مستقلاً نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ اور جس کی اس جارحانہ روش کے خلاف اس گروہ کے اچھے اور انصاف پسند لوگ بھی بڑی حد تک بے بس بنے ہوئے ہیں۔ ان عناصر کو اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کی حفاظت و ترقی سے اتنی گہری دلچسپی نہیں ہے جتنی کہ دوسروں کے مذاہب اور انکی تہذیبوں کی بیخ کنی سے ہے۔ انہیں اس بات پر غم اور غصہ کم ہے کہ ان کے پرسنل لا میں خود انہیں کے اپنے نمائندوں کی کثرت رائے سے تبدیلی کیوں کر دی گئی، بلکہ غصہ اس بات

پرزیادہ ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لاکو ابھی تک کیوں نہیں بدل ڈالا گیا۔ انہیں تعیش کے سامانوں کی درآمد پر برباد ہونے والے زرمبادلہ کا اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ اسلام کے ایک رکن دحج ،کی ادائیگی پر صرف ہونے والے زرمبادلہ کا ہوا کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ضمیر پر انتہائی سخت قسم کے پہرے بٹھا دیے ہیں۔ ورنہ اخلاقی موت کے منھ میں پھاند پڑنے کے لیے وہ اتنی بے تابی کا مظاہرہ ہرگز نہ کرتے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر ایک دلچسپ مگر فی الواقع انتہائی افسوسناک واقعہ کا ذکر کر دوں۔ آزادی کے تین چار سال بعد جب بہار میں مسلمانوں کے خلاف انتہائی شدید قسم کے فسادات ہو رہے تھے۔ اس دوران اپنے ایک تعلیم یافتہ جن سنگھی دوست سے گفتگو کے دوران ہم نے یہ سوال اٹھایا کہ یہاں اب مسلمانوں کو رہنے نہ دیا جائے گا؟ موصوف نے فوراً جواب میں فرمایا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم ہندوؤں میں اور جانوروں میں فرق ہی کیا رہا۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ اگلے ہی دن آر۔ ایس۔ ایس کے سب سے بڑے رہنما کا اخباروں میں یہ بیان آیا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو نکال دینا چاہئے۔ اب اندازہ کیجئے کہ جس ملت کے ساتھ ان کے بالادست ہم وطنوں کا طرزِ فکر اور رویہ اس حد تک مخاصمانہ ہو اس کے لئے ہندوستان "مسائلستان" نہ بنا رہے گا تو اور کیا ہوگا۔

دوسرا مسئلہ خود موجودہ دستور حکومت کے کچھ اجزاء خصوصاً اس کے بعض رہنما اصول ہیں۔ اس دستور کا یہ بڑا عجیب اور بڑا پر معنے تضاد ہے کہ ایک طرف تو وہ سماجی انصاف، مذہبی آزادی اور جمہوریت پسندی کے اونچے اصولوں اور حسین دعووں سے بھرا ہوا ہے۔ دوسری طرف اس میں مختلف مذہبی اور تہذیبی گروہوں کے شخصی قوانین تک کے وجود کو ناقابل گوارا ٹھہرا دیا گیا ہے اور ریاست کی یہ ایک بنیادی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ملک کے تمام فرقوں اور ملی گروہوں کے لئے یکساں سول کوڈ بنا کر نافذ کرے۔ گویا مذہبی اور تہذیبی آزادی کا جو وعدہ اصولی طور پر اور گول مول انداز میں کر دیا گیا تھا۔ دستور کے اس رہنما اصول کے ذریعے اس کی ایسی تشریح کر دی گئی ہے جس سے وہ بڑی حد تک بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے کوئی شک نہیں کہ اس اصول کا اور انہی جیسی بعض دوسری دفعات کا دستوری وجود ملتوں اور تہذیبوں کے سر پر لٹکتی ہوئی ایک ایسی تلوار ہے جو انہیں کسی اطمینان کا سانس نہ لینے دیگی۔

دستور کا یہ رہنما اصول اگرچہ اکثریت اور اقلیت میں کوئی امتیاز نہیں برتتا۔ جسکی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اکثریت کے لئے بھی اسی طرح ایک مسئلہ ہے جس طرح کہ اقلیتوں کے لئے ہے۔ لیکن یہ بات صحیح اسی وقت ہو سکتی تھی جب دستوری طور پر یہ ضروری قرار دیا گیا ہوتا کہ کسی بھی ملی گروہ کا پرسنل لا اس کے مستند نمائندوں ہی کی رائے سے بدلا جا سکے گا۔ مگر پارلیمنٹ کی عام کثرت رائے سے یہاں اکثریت کے نمائندوں کا تناسب اسی فی صدی سے بھی زائد ہے۔ ایسی پارلیمنٹ اگر اپنی کثرت رائے سے اکثریتی پرسنل لا میں کوئی ترمیم کرتی ہے تو وہ بلاشبہ وہ خود اکثریت کے اپنے ہی نمائندوں کی رائے اور فیصلے کا نتیجہ ہوگا۔ جبکہ اقلیتی گروہوں کے بارے میں معاملے کی نوعیت بالکل دوسری ہوگی۔ اس لئے اس اصول کا وجود اگر ایک مسئلہ ہے تو صرف اقلیتی گروہوں کے لئے ہے، اکثریتی گروہ کے لئے ہرگز نہیں ہے۔

یہ شیطان کا سب سے بڑا کید اور دور حاضر کی سیاست کا سب سے بڑا فریب ہے کہ مذہب کا انسان کی مختلف اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور افسوس کہ مذہب کے مخصوص پیرو بھی اپنی کم نظری اور پست ہمتی کے باعث اس فریب کے بالعموم شکار ہو چکے ہیں۔ حالانکہ وہ مذہب مذہب نہیں جو مسائل حیات کے سلسلہ میں پوری پوری رہنمائی نہ دے سکے۔ اس لئے وقت کی یہ اہم ترین ضرورت ہے کہ مذہبی اور تہذیبی گروہ ذہنی مرعوبیت اور فکری جمود کی پستیوں سے باہر نکلیں، زندگی کے مسائل کا سامنا کریں۔ تمدنی بلندی نظری اور سیاسی سوجھ بوجھ سے آراستہ ہوں اور اخلاق اور خدا پرستی، نیکی و راست بازی، عدل و احسان کی صفات ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ترقی پذیر تمدنی ثقافتی اور اجتماعی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیتوں میں بھی اپنی برتری ثابت کر دیں۔ یہی وقت ہوگا جب کہ انکی زندگی کی زمام کار ان کے مذہبی اور تہذیبی اصولوں کے ہاتھ میں آسکے گی اور وہ اپنے مسائل پر آسانی کے ساتھ قابو حاصل کر سکیں گے۔ ورنہ مذہب کو عبادت خانے میں مقید اور تہذیب کو صرف چند رسموں تک محدود رکھنا اور باقی پوری زندگی کو کسی اور نظام فکر و عمل کے حوالے کئے رہنا مذہب اور تہذیب کے حق میں وہی نتیجہ پیدا کرتا رہے گا جو دو کشتیوں کی سواری کا انجام ہوا کرتا ہے۔ مسائل تو زندگی کے میدان میں پیدا ہوتے ہیں اور اسی طاقت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جو وہاں برسر کار ہوا کرتی ہے۔ اس لئے اگر یہ طاقت کسی اور نظام فکر و عمل

کی ہو گی تو اس کے فیصلے مذہب کے حق میں نہیں اس کے خلاف ہی ہوا کریں گے۔ اور اگر وہ اپنی تنگ دوو سے ایک مسئلہ حل کر پائے گا تو دو نئے مسئلے پیدا ہو چکے ہوں گے۔ اس لئے بالکل ضروری ہے کہ مذہب کی فکری قوت کو بھی بروئے کار لایا جائے اور زندگی کے پورے نظم پر اس کی صالح سیادت قائم کر دی جائے۔

حضرات! اب اقلیتی گروہوں کے تینوں مخصوص مسائل کے حل کو لیجئے۔

پہلے یعنی اکثریتی گروہ کا فرض اس سلسلے میں یہ ہے کہ اس کے خیر پسند اور منصف مزاج افراد اپنے بے راہ ہم مذہبوں کی ساری غلط کاریوں اور ظالمانہ حرکتوں کا ذمہ دار خود اپنے آپ کو سمجھیں اور پھر ان کی ذہنی اصلاح کی بھرپور اور جرأت مندانہ جدوجہد میں لگ جائیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ کام جس طرح اقلیتی گروہوں کے مفاد میں ہے۔ اسی طرح خود ان کے اپنے دھرم اور تہذیب کے بھی مفاد کا عین تقاضا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ اس کے ذریعے دوسروں کے مذہب اور تہذیب پر ہونے والے مظالم ہی کو نہ روکیں گے۔ بلکہ خود اپنی سنسکرتی اور اپنے دھرم کو بھی ان کے نادان پیرووں کے ہاتھوں سے داغ دار بنا دیے جانے سے بچا لیں گے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں متعدد مذہبی اور تہذیبی گروہ موجود ہوں۔ صحیح معقول اور منصفانہ بات صرف یہ ہو گی کہ تمام مذہبوں اور تہذیبوں کو اپنے اپنے طور پر آزادی کے ساتھ نشوونما پانے کا موقع دیا جائے۔ ان کے درمیان حریفانہ کشمکش اور جارحانہ زور آزمائی کے بجائے صحت مند اور پرامن تعمیری مقابلہ ہو۔ اس طرح تجربے اور عمل کی کسوٹی پر ہر ایک کا کھرا کھوٹا آپ سے آپ نمایاں ہو جائے گا۔ جو کچھ کھوٹا ہو گا وہ خود بخود رد ہو کر رہ جائے گا۔ جو کھرا ہو گا وہ باقی رہے گا۔ یہی ملک کے مستقبل کے لئے بھی صحیح اور مفید ہے۔ یہی بنیادی انسانی حقوق کے بھی مطابق ہے۔ یہی تقاضائے انصاف بھی ہے اور حق بھی۔ یہی تہذیب کی اصل روح بھی ہے اور مذہب کی پسندیدہ راہ بھی۔ یہ تو ہوا اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں اکثریتی گروہ کا فرض۔ اقلیتی گروہوں کے کرنے کا کام اس سلسلے میں یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود شناسی اور جرأت و عزیمت کے دوگونہ جوہر سے آراستہ کریں اور زندگی کا یہ راز ذہن میں بٹھالیں کہ جینے کا حق ملا نہیں کرتا، حاصل کیا جاتا ہے۔ کوئی قوم یا ملت دوسروں کے احساس فرض

کے نتیجے میں مذہبی آزادی اور تہذیبی حق خود اختیاری سے بہرہ ور نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے یہاں کی اکثریت کا انسانی مذہبی اور تہذیبی فریضہ جو کچھ بھی ہو اور اس کے ادا کرنے کے بارے میں وہ چاہے جو رویہ بھی اختیار کرے، اقلیت کو اپنی جگہ یقین رکھنا چاہیے کہ اس کے مذہبی اور تہذیبی مستقبل کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا سر تا سر اس کے اپنے ہی عزم حیات، اپنی ہی جرأت، اپنی ہی سرفروشی پر موقوف ہے۔ دوسروں کا احساس فرض اور دوسرے ذرائع وعوامل صرف مدد دے سکتے ہیں۔ اور یہ بھی اسی وقت ہوتا ہے جب حقیقی عامل یعنی اقلیت کا خود اپنا احساس فرض سرگرم کار ہو۔ یہ "حقیقی عامل" جیسا کہ عرض کیا گیا دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کے اندر خود شناسی موجود ہو، وہ جانتی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے، اسے اس حقیقت کا علم ہو کہ اس کا دین اسے کس مقام پر اور کس حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے جس مقام پر اور جس حیثیت میں ہونا چاہیے اس مقام اور اس حیثیت کو حاصل کر لینے کا اس کے اندر پورا عزم اور کامل یکسوئی موجود ہو۔ ان دونوں باتوں کا ثمرہ ہوگا کہ اسکی زندگی کا پورا زاویہ بدل جائے گا، اس کے اندر سیرت کی بلندی، انسانیت کا درد ہمدردی و غمخواری کا سوز، ایثار و قربانی کا جذبہ اور دلوں کو جیتنے کی امنگ پیدا ہوگی، وہ اپنے اصول حیات اور مقصد زندگی سے قریب آنے لگے گی، اس کے اندر عادلانہ بنیادوں پر قائم ہونے والی اجتماعیت اور صالح مقاصد پر مبنی یکجہتی پیدا ہونے لگے گی۔ مذہبی آن اور تہذیبی غیرت ابھرے گی اور اس کے تمام افراد اپنے ملی تشخص کو دل و جان سے عزیز رکھنے اور اس کی بقا و حفاظت کے لیے اپنی بہترین کوششیں صرف کر دینے پر آمادہ ہو جائیں گے اور یہ کوششیں بھی صحیح سمت میں ہوں گی۔ غرض کسی بھی ملت کی اندرونی توانائی کا ابھار ہی اس کے مسائل کے حل کی شاہ کلید ہے۔ اسی سے وہ آگ بھی بجھے گی جو اکثریتی گروہ کے جذباتی طبقے کی شعلہ مزاجیوں نے اس کے ارد گرد لگا رکھی ہے اور اسی سے وہ برف بھی پگھلے گی جو خود اس کے اپنے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔

دوسرے مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ مذہبی انفرادیت اور تہذیبی تشخص کا پورا پورا یقینی تحفظ حاصل کر لیا جائے اور اس غرض کیلئے دستور کی ان دفعات کو لازماً حذف کرا دیا جائے

جو اس انفرادیت اور تشخص کو ختم کرنے کی محرک بن رہی ہیں۔ دوسرے کاموں کی طرح یہ کام بھی یقیناً بڑا ہی دشوار ہے اور بڑی انتھک جد وجہد چاہتا ہے مگر ہمیں معلوم ہے کہ قوموں اور ملتوں کی انفرادیت انکی تہذیبی بقا اور انکا مذہبی تشخص اتنی قیمتی چیز ہے کہ اس کے لئے ہر کوشش کم اور ہر قربانی ہیچ ہے۔ یہی تشخص ان کا اصل سرمایہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اس سے اپنی کوئی تدبیر کوئی سعی اور کوئی پونجی بچار کھنے کی بات سوچی ہی نہیں جا سکتی۔ ایک فرد بھی اگر اپنی عزت اور عظمت کا تحفظ چاہتا ہے تو بسا اوقات اسے اپنی زندگی کی ساری جد وجہد وقف کر دینا پڑتی ہے۔ پھر ایک پوری ملت کی تہذیبی عزت اور دینی عظمت کا حقیقی تحفظ معمولی کوششوں سے حاصل ہو جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

تیسرے مسئلہ کا حل چند ہمہ جہتی تدبیروں پر موقوف ہے اور ان تدبیروں کا مؤثر ہونا اقلیتی گروہوں کے اپنے عزم پر منحصر ہے۔ اگر وہ اپنی جگہ یہ طے کرلیں کہ اپنی نئی نسلوں کا دینی و تہذیبی مستقبل ہر حال میں محفوظ رکھیں گے تو یہ صورت حال یقیناً بدل جائے گی جو انکی تہذیب کو برابر چیلنج دے رہی ہے۔ اس کے لئے پہلی کوشش تو انہیں یہ کرنی ہوگی کہ ارباب حکومت پر معاملہ کی نوعیت اور اس کی سنگینی تفصیل کے ساتھ واضح کر دیں اور آپ ان کے احساس ذمہ داری کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ بلا تاخیر اس نصاب تعلیم کو اکثریتی گروہ کے مخصوص عقائد اور روایات سے پاک کر دیں۔ (اگر یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکے تو ماہرین قانون کے مشورے سے عدالتی چارہ جوئی کی جائے) تیسری کوشش اور تدبیر یہ کی جائے کہ اپنے پرائیوٹ تعلیمی ادارے کثرت سے قائم کیے جائیں جہاں بچے اپنے دین اور اپنی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق تعلیم بھی حاصل کر سکیں اور تربیت بھی حاصل کر سکیں۔ یہ ہر صورت میں کرنے کا اور ضروری کام ہے۔ کیونکہ سرکاری اسکولوں کا نصاب تعلیم انتہائی بہتر اور غیر جانبدار کیوں نہ بنوا لیا جائے وہ کسی حال میں بھی اقلیتی گروہوں کے تہذیبی مزاج اور دینی طرز فکر سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا، اس کے نتائج ان کے حق میں ہمیشہ ناقابل اطمینان ہی رہیں گے۔

حضرات! ہندوستان کے مذہبی اور تہذیبی گروہوں کے اہم مسائل کے تعین اور ان کے حل کی تشخیص کے بارے میں میرے خیالات کا خلاصہ یہی ہے۔ قدرتی طور پر میں نے

یہ گفتگو صرف اصولی باتوں ہی کے بیان تک محدود رکھی ہے کیونکہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن امید ہے کہ یہ مختصر سی گفتگو بھی ضرورت کے مطابق ثابت ہوگی اور بحث کے ضروری خطوط اس سے واضح ہو گئے ہونگے

آخر میں ایک اصولی اور بنیادی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کسی دینی یا تہذیبی گروہ کے مسائل کے حل کے لئے اختیار کی ہوئی تدبیریں کامیاب اس وقت ہو سکتی ہیں جب اس کے اندر ایک عام جذبہ اور ایک اجتماعی حرکت پیدا ہو چکی ہو۔ کیونکہ بلاشبہ ان مسائل میں سے ہر مسئلہ ایک بھاری چٹان ہے اور اس کے حل کی ہر کوشش گویا جوئے شیر لانا ہے۔ اس لئے مسلسل اور منظم کوششیں ہی کامیابی سے ہم کنار ہو سکتی ہیں۔ جس تہذیبی اکائی کو اپنا دینی اور تہذیبی وجود عزیز ہوگا۔ اس سے توقع یہی کی جائے گی کہ وہ اس کی بقا اور حفاظت کے لئے اپنی گروہ بندیاں بھی چھوڑ دے گی اپنے اندر کی جماعتی رقابتیں بھی ختم کر دے گی۔ ورنہ جینے کی آرزو خواب ہی بنی رہے گی۔ اور بکھرے ہوئے تنکے امن وسکون کا آشیانہ کبھی نہ بن سکیں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

"حیات نو" مارچ ۱۹۳ء

از: مولانا عبدالحفیظ رحمانی، ڈومریاگنج، سدھارتھ نگر۔

رامائن اور حضرت ابراہیم علیہ السلام

جماعت اسلامی کا ایک نیا شگوفہ

ماہنامہ دارالعلوم بابت ماہ اپریل ۱۹۹۲ء میں میرا ایک تنقیدی مضمون جماعت اسلامی کے ایک ممتاز اہل قلم پروفیسر عمر حیات غوری کے اس نظریہ کے خلاف شائع ہوا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی رام ہیں اور انہوں نے جو ثبوت فراہم کئے تھے ان کی حیثیت واضح کردی گئی تھی، غوری صاحب نے راجہ دشرتھ کے سوانح کا جو تقابل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات زندگی سے پیش کرکے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر چسپاں کرنے کی کوشش کی تھی اس مغالطہ کو بھی دو دو چار کی طرح واضح کردیا تھا۔ لیکن غوری صاحب نے میرے اس مضمون کا جواب ماہنامہ زندگی نومبر ۱۹۹۲ء نئی دہلی میں شائع کرایا ہے۔ اور اس جوابی مضمون میں ان کو اصرار ہے کہ ثابت ہو نہ ہو، ثبوت ملے نہ ملے، شبہہ سے بھی فائدہ اٹھاکر سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رام کہہ دیا جائے۔

پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ اگر رام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک ثابت کردیا جائے تو "اس سے دعوتی کام کے لئے زمین ہموار کرنے میں بڑی مدد ملے گی" یہ خیال بجائے خود غلط مقدمات پر مبنی ہے۔ انہوں نے فرض کرلیا ہے کہ ہماری تحقیق رام کو اوتار ماننے والے بے کم وکاست قبول کرلیں گے اور دونوں شخصیات کو ایک تسلیم کرتے ہوئے اسلام کی طرف متوجہ ہوجائیں گے۔ اس کو خوش فہمی یا غلط فہمی سے تعبیر نہ کیا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ اس کا ایک واضح ثبوت غوری صاحب کے اسی جوابی مضمون میں بھی موجود ہے کہ "ابھی یہ بات بھی محتاجِ ثبوت ہے کہ ہندوستان میں کبھی رام پیدا بھی ہوئے تھے۔ یہاں اس کی حیثیت محض اساطیری قصوں سے زیادہ کچھ نہیں" یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود جماعتِ اسلامی کے یہ دیدہ ور رام کو موضوع بحث بناکر تحقیق کا لوہا منوا رہے ہیں۔ مگر مجھے کہنا یہ ہے کہ رام کی شخصیت محتاج ثبوت ہوتے ہوئے بھی ہندوؤں کے لئے مسلم اور مرجع عقیدت ہے یا نہیں؟ کتنے ہندو ان کے وجود کے قائل نہیں ہیں، اور رام سے منسوب واقعات کو سچا باور نہیں کرتے۔ ان حالات میں اگر غوری صاحب اپنی تحقیق کو مکمل بھی کرلیں تو اس انکشاف کے اثرات کیا مرتب ہوں گے اور دعوتی کاموں کے لئے زمین کس قدر ہموار ہوگی، زیادہ امکان منفی اثرات کے مرتب ہونے کا ہی ہے۔ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا قضیہ تو سب کے

سامنے ہے علاوہ ازیں تحقیقی کاموں سے دل چسپی لینے والا حلقہ بہت محدود ہوتا ہے جو داد تحقیق تو دے دیتا ہے لیکن اس کو حرف آخر سمجھ کر مذہبی عقیدت کا درجہ نہیں دیتا۔ پھر اس کدو کاوش کا حاصل کیا ہوگا۔ دعوتی کاموں کا دائرہ تو بہت وسیع ہے اور دعوت کے متعدد طریقے ہیں جو مثبت انداز میں کام کرنے کی اپیل کرتے ہیں۔ نیک نیتی سے کسی مثبت طریقہ دعوت کو اپنانا ہی دانشمندی ہے۔ پھر بھی پروفیسر صاحب کو اصرار ہے تو تحقیق فرمائیں۔ مگر تحقیق کے دامن پر اس طرح بدنما داغ نہ لگائیں کہ "رام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فلسطینی نام ابرام سے ماخوذ ہے" درحقیقت رام قدیم عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت باسعادت سے پہلے یہ لفظ رائج تھا۔ توریت کے بیان کے مطابق۔ بنوسام میں عبر کے پوتے یقطان کے بیٹے کا نام ہدورام رکھا گیا تھا۔ یہ ہدو اور رام دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بنوسام میں ایک شخص کا نام ارام بھی تھا۔ اس طرح کے اور بھی متعدد نام توریت میں آئے ہیں۔ عمرام۔ ابرام۔ اخرام۔ یہورام وغیرہ مرکب نام ہیں۔ اس لئے محترم غوری صاحب کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "رام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے ماخوذ ہے" صحیح یہ ہے کہ رام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسم گرامی کا ایک جزو ہے۔ خود ابراہیم مرکب نام ہے۔ عبرانی میں بھی ابی رام تھا۔ تعریب میں ابراہیم ہوا ہے۔

"دارالعلوم" فروری ۹۳ء

احمد ندیم قاسمی

کرۂ ارض

یہ زمیں کتنی اکیلی تھی
جب آدم ابھی تخلیق کے بحران میں تھا
کتنے سناٹوں کے انبار لدے تھے اس پر
کتنی صبحیں تھیں
جو انوار لٹاتی ہوئی آتی تھیں
مگر کوئی انہیں دیکھنے والا ہی نہ تھا
کتنی شامیں تھیں
جنہیں دستِ شفق حُسن کے مفہوم سُجھاتا تھا
مگر کوئی انہیں جانچنے والا ہی نہ تھا
پھول کھلتے تھے تو حیران نظر آتے تھے
اپنے ہی پھیلتے گھٹتے ہوئے سایوں کی طرف
دیکھ کے ڈرتے تھے شجر
اور دریا تھے، تو یوں بہتے تھے
جیسے بیگار میں پکڑا ہو عناصر نے اُنہیں
بحر کی سطح کچھ اس طرح سے لرزاں تھی،
کہ جیسے اُس نے
اپنی گہرائی میں جھانکا ہو تو کانپ اُٹھی ہو
چاند روٹھا ہوا بچہ تھا — تو خورشید کو تنور کی مانند
بھڑکنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا
یہ زمیں تھی کہ کوئی دشتِ پُراسرار تھا — آسیب زدہ
حکمراں اس پہ وہ تنہائی تھی
جو ازل اور ابد کی طرح ابہام کے تابوت
میں آسودہ تھی

تب وہ مخلوق زمیں پر اُتری
اپنے ہمراہ جو لے آئی محبت کا طلسم

پھر تو ہر چیز کا ، ہر چیز سے پیدا ہوا
اک ربط و نسبت
پھول مسکراتے تھے تو اشجار کو وجد آتا تھا
چاند کے نور کو پیتا تھا
تو انگڑائیاں لیتا تھا سمندر کا شباب
جنہیں جانب خورشید سفر کرتی تھیں
شامیں تھپکاتی تھیں اور صبحیں پرندوں کے
اٹھتے نغموں سے سینے جگانے کے لیے آتی تھیں
کبھی کبھی کا وہ عالم تھا
کہ ہر چیز توانائی کی تجسیم نظر آتی تھی
اور خدا —— وقت کے آئینے میں
اپنی تخلیق کی رعنائیاں جب دیکھتا تھا
—— جھومتا تھا !

لیکن اے اہلِ جہاں !
یہ جو ہر شہر کے مرکز میں ، صلیبوں پہ
گڑے ہیں ڈھانچے
یہ جو ہر موڑ پہ عریاں بدنی بکتی ہے
اور تعفن بھری آغوش میں معصومیتیں ٹوٹ کے
رہ جاتی ہیں

یہ جو اک لقمۂ تر کے لیے چھن جاتا ہے
کھیتوں کا سہاگ
یہ جو اک شخص کے قبضے میں رکھا رہتا ہے
لاکھوں کا وجود
اس سے بہتر تو یہی تھا کہ زمیں اب بھی اکیلی ہوتی
صبحیں انوار لٹاتے ہوئے ، نغمات سناتے
ہوئے گھبرا جاتیں
شامیں تاروں کے کفن اوڑھ کے مرتی رہتیں
پھول کھلتے تو فقط اس لیے کھلتے کہ
انہیں کھلنا تھا
اور اشجار پہ اک ہول سا طاری رہتا
سرِ دریا کوئی سایہ بھی نہ آنے پاتا
بحرِ پُرغیظ سے بپھری ہوئی موجوں کے بگولے چلتے
سورج اور چاند ، سرِ مصحفِ افلاک
چمکتے ہوئے دھبے ہوتے
ابنِ آدم —— سرِ فردوسِ بریں
اپنے خدام فرشتوں کے جلو میں چلتا
اور زمیں دوسرے سیاروں کی مانند
فقط گردشِ بے سود میں تا حشر بھٹکتی رہتی !

احمد ندیم قاسمی

دھرتی کا لمس

لمس دھرتی کا نہ محسوس ہو جس شاعر کو
اس کا انسان کی سوچوں پہ کبھی بس نہ چلے

کیا خبر اُس کو، کہ ویرانۂ دل میں کیسے
گردباد اُٹھتے ہی اُڑ جاتا ہے صحرا کا قرار
اور اُفق تا بہ اُفق بنتے ہیں ٹیلوں کے مزار

اس کو معلوم ہی کیا، ذہن کے ایوانوں میں
کتنے فانوس جلے، جَل کے بجھے، بُجھ کے جلے
زندگی ایک ابابیل ہے، جس کا اک پَر
کوئی صیاد لئے بیٹھا ہے پاؤں کے تلے!

اس کو کیا علم، کہ اضداد کا مفہوم ہے کیا
کیسے تلوار بھی کھینچو تو کوئی اُف نہ کرے
اور اگر پھول بھی مارو تو سسک کر رہ جائے

کیا پتہ اس کو، کہ جذبے کے مسافر اکثر!
دن کی ظلمت میں بھٹکتے ہیں بعنوانِ اصُول
رات کی دھوپ میں جَل جاتے ہیں اُمّید کے پھول
صبح کی دُھند سے چھا جاتی ہے احساس پہ شام
گلستانوں میں اُلجھ جاتی ہے دامن سے ببول
ریگزاروں میں مہکتے ہیں بہاروں کے رسول

"تخلیق" فروری ۱۹۳ء



جے شری رام

تم اگر
جے شری رام کی تلوار کے ساتھ آئے ہو
تو آگے بڑھو
سر حاضر ہے
قلم کر لو
تلوار کے سامنے میری زبان سے
پرنتو شبد کبھی نہیں نکلیں گے
لیکن اگر
تم جے شری رام کے پاون شبد کے ساتھ آئے ہو
تو گلے لگ جاؤ
پھر میرے آگے نہیں
میرے پیچھے پیچھے چلو
تاکہ میں اپنے دیش کی سرحدوں کے اس پار بھی
ساری دنیا کی آلودہ فضاؤں کو
رام کے مبارک نام کی گونج سے بھر دوں!!

انور منال یم
۲۶۱ - فطرت لین، نشاط گنج، لکھنؤ

"الشارہ" مارچ ۱۹۹۳ء

خطاب بہ جاوید! (ساتواں اور آٹھواں بند)۔
نئی نسل سے:

جام خالی ہیں جوانوں کے تو لب سوکھے ہیں
رخ مسعود ہیں، اندھیروں میں گھر ڈوبے ہیں
بے جبیں، تنگ نظر اور ہیں مایوس کرم
ان کی آنکھوں نے تو دیکھا نہ کعبہ نہ حرم
اپنے منکر ہیں، مگر غیر پہ رکھتے ہیں جبیں
حرم و دیر ہیں ان کے لیے کچھ فرق نہیں
درس گاہیں ہیں، کہ بے مقصد و بے فیض ہیں اب
جن کو معلوم نہیں کہ پستی شاہیں کا سبب
نور فطرت کو کیا روح جہاں سے ناپید
یوں ہوا اک گل رعنا بھی یہاں سے ناپید
عشق اول ہی پہ معمار پھسل جاتے ہیں
بط کی مانند جو شہباز کو سکھلاتے ہیں
علم جب تک کہ غم زیست کا واقف نہ بنے
دل کسی طرح بھی اسرار کا کاشف نہ بنے
علم کے نور سے روشن ہیں خیالات ترے
علم ہی تجھ کو دکھاتا ہے مقامات ترے
اپنے احساس کی آتش میں جلائے خود کو
مس کم تر سے زر و سیم بنائے خود کو
علم، اول میں تو احساس ہے، آخر میں حضور
اور آخر ہے حضوری کا، کہ غائب ہے شعور
سینکڑوں درس لیے اہل ہنر سے تو نے
یہ وہ اک بات، جو لی اہل نظر سے تو نے
مے پرستی ہے جو آنکھوں سے، وہ ہے سب کے لیے
عہد مستی ہے مگر ظرف پہ طے، سب کے لیے
وہ ہوا جس سے کہ بجھتا ہے چراغ سحری
اس سے گلشن میں کھل اٹھتا ہے اجالا سحری
کم خور و کم گو و کم خواب بنالے خود کو
گرچہ خود صورت پرکار گھما لے خود کو
منکر حق کو کہیں ملا و واعظ کافر
اپنا منکر مرے نزدیک ہے اس سے بدتر
وہ تو کہتا ہے انکار خدا سے مرتد
یہ تو مرتد بھی ہے اور ظالم و جاہل۔ بے حد
راہ اخلاص پہ چل، نیت اخلاص کے ساتھ
خوف شاہوں کا مٹا قلب سے، وسواس کے ساتھ
دامن صلح بہر حال ترے ہاتھ میں ہو
عیش و عشرت ہو، توازن تری ہر بات میں ہو
حکم دشوار سہی، کاوش حاصل نہ گرا
دل جو روشن ہے تو پھر شکوہ تحصیل نہ کر
ذکر اور فکر تری روح کا ہے پہرہ دار
جسم کا حفظ جوانی میں ترا صبر و قرار
جان اور تن کی حفاظت جو نہیں کر سکتا
کسی عالم پہ حکومت وہ نہیں کر سکتا
لذت سیر نہیں ہے تو سفر کچھ بھی نہیں
آشیاں گر ہے، تو پھر قوت پر کچھ بھی نہیں
چاند چاہتا ہے کہ آئے کہیں رکنے کا مقام
سیر آدم میں جو آئے، تو مقام اس پہ حرام
مقصد ذات بجز لذت پرواز نہیں
آشیاں جو بھی بنا لے گا وہ شہباز نہیں
زاغ و کرگس کو تو گھر سے ہے رہائی کی تلاش
اور شاہیں کو سر و مہر پہ ملتا ہے معاش

جمشید چشتی

«کاوش» (۲) ۱۹۹۲ء (جشن سال ششم نمبر)



گیت

رحمان خاور

سچے بول نہ بول سائیں
سچے بول نہ بول
جھوٹ کو لے کر کھنگ آیا اُت کا پڑا اکال
چاروں اور دھرا پر پھیلا موہ جایا کا جال
امرت میں بھی آج کسے نے زہر دیا ہے گھول
سچے بول نہ بول
سارے ساتھی سارے سنگی ڈسنے والے ناگ
پھول کھلے ہونٹوں پر جن میں بھری کپٹ کی آگ
ان بیری ناگوں پر اپنے من کا دوار نہ کھول
سچے بول نہ بول
کیا گیانی اور کیا اگیانی سب چھایا سب دھوپ
سبھی نے اپنا روپ گنوایا بھر بھر کے بہروپ
سچائی کی رت ہے تو بھی جھوٹے موتی رول
سچے بول نہ بول سائیں
سچے بول نہ بول

(معیار، مئی ۹۳ء)

امیرِ شہر! کچھ بتا

ریحانہ نجم عابدی

امیرِ شہرا
کچھ بتا
گلاب رت ہوا چلی
امیر شہرا
بتا تو
حنا کے پھول کس لیے جبینوں سے ہٹ گئے؟
چمکتی مانگ میں سیاہ راکھ کیسے بھر گئی؟
لہو سفید، رنگ شہر سرمئی کیسے ہو گیا؟
یہ کیا ہوا؟
یہ کیوں ہوا؟
یہ کس کے ہاتھ تھے کہ جو
ہوائیں آگ بن گئیں
دعائیں بانجھ ہو گئیں
جو چاند جیسی صورتیں تھیں
وہ کیسے سانحہ ہو گئیں؟
امیر شہرا بتا تو ذرا ... ذرا تو!
امیر شہر کیا کہے!!
کہ اس کی بین پہ سجے ہوئے
تمام داغ لہو کے ہیں!
کہ اس کی آستین میں بسے ہوئے
تمام رنگ ہی لہو کے ہیں!
کہ اس کی آنکھ میں بسے ہوئے
تمام عکس ہی
لہو کے ہیں!!!
امیر شہر کیا کہے!!
وہ پھول جیسے لوگ کون تھے
کہ جن کے پیرہن کے سلسلے تمام لٹ گئے
عکس عکس تھا جن کا مشک زا
وہ گل عذار لٹ گئے
وہ بے قرار جسم رہا
حرم کشاں
رواں دواں
کہاں گردشِ زماں
وہ کس کا رزق ہو گئے؟
کفن پہ چاک کے سو گئے؟
وہ کس خلا میں کھو گئے؟
کہ فرش کا کون سا کھا تھا
جہاں "نسلِ زار کی"
سہاگ کی فصل بو گئے؟
امیر شہرا
بتا تو
کچھ تو ہو کو پتہ
کہ ان چمکتے راستوں پہ دھول کیسے جم گئی؟
جو روشنی کے ہم تھی
وہ سانس کیسے تھم گئی؟
وفائے رسم کیا ہوئی؟

(روشن خیال اپریل ۹۳ء)

اشعار: ضمیر جعفری

بعد مدت آج نسبتِ غم تری یاد آ گئی
جیسے بکھر جائے اچانک بانس کے جنگل میں آگ
جیسے مایوسی میں لب پر دفعتاً آجائے راگ
یا کوئی بجلی سنہری دھوپ میں لہرا گئی

کھلتی ہیں یہ فراق کی تنہائیاں مجھے
عالم جو بن گیا ہے مٹایا نہ جائے گا
بے ہوش ہو کے ہوش میں آیا نہ جائے گا
اب راس آ چکیں تری رسوائیاں مجھے

میرا مان اور میری مایا، سائیں نظر تمہاری
میں ہے کری اور گن ہاری میں پاگل مت ماری

گھونٹے۔ یہ ٹھگ آئے تو بجھ بجھ خاطر داری
دام نہیں تو در کیوں کھولیں، تُف کنجروں کی یاری

محل، منارے، جھروکے، چوبارے، مسجد، کلس، شوالے
ہنر جوڑنے سے بھی پہلے سوچیں سوچنے والے

ہُوا یونہی سے آئے تو یہ سمجھو بادل ہرے
نیلے پیلے موتی رنگوں سے بھر یہ بھی کیوں ترے

پایانِ شب سراغِ سحر بھی نہیں رہا
منزل تو کیا ملے گی سفر بھی نہیں رہا

یہ بے حسی کہ جیسے رگوں میں لہو نہ ہو
یہ بے دلی کہ موت کا ڈر بھی نہیں رہا

جس میں کبھی کبھی اُتر آتی تھی چاندنی
دیوار میں وہ روزنِ در بھی نہیں رہا

تقدیسِ آرزو کے بغیر آرزو عبث
دستار گر گئی ہے تو سر بھی نہیں رہا

ظہیر احمد صدیقی

بیدل کی فارسی غزل کا ترجمہ

مرزا عبدالقادر بیدل

صبح از چہ خرابات جنون کرد بہارش؟
کآفاق بخمیازہ گرفتہ است خمارش!

شام این ہمہ سامان کدورت ز کجا یافت؟
کز رنگ نشد پاک کف آئینہ دارش!

گردون بتماشای چہ گل میرود از خویش!
عمریست کہ بر گردش رنگ است مدارش

دریا بحضور چہ جمالست مقابل!
کز خانۂ آئینہ گرو برد کنارش

صحرا برم ناز چہ محمل نظر افگند
کاندیشہ پریخانہ شد از رقص غبارش!

ظہیر احمد صدیقی

صبح کس بزم خرابات جنوں کی ہے بہار؟
کہ جہاں سارا ہے خمیازہ کش درد خمار

کیوں ملا شام کو سامانِ کدورت آخر!
نہ ہوا رنگ سے پاک اس کا کفِ آئینہ دار!

آسماں کس گلِ نظارہ کے جلووں میں ہے گم؟
گردشِ رنگ پہ اک عمر سے رکھتا ہے مدار!

وہ حسیں کون ہے دریا ہے مقابل جس کے!
کس لیے خانۂ آئینہ ہوا اس کا کنار!

چشمِ صحرا میں ہے کیا کوئی رمِ محملِ ناز؟
کہ پری خانۂ اندیشہ بنا رقصِ غبار

مرزا عبدالقادر بیدل

شبنم بچہ حیرت قدم افسرد کہ چون اشک؟
یک آبلہ گردید، بہر گام دو چارش!

آئینہ ز تمکین چہ مشرب زدہ ساغر!
کز ہر چہ رسد پیش نہ فرار است و نہ عارش

دل ریز چہ سحر است کہ در دیدۂ تحقیق
حسن است و نیفتاد بجز آئینہ کارش

عمر از چہ شتاب این ہمہ آشفتگی انگیخت
کآتش بنفس ورزد و بگرفت شرارش!

بیدل ز چہ مکتب سبقِ آگہی آموخت؟
کاینسان جنبشِ خامہ گرفتہ است قرارش

ظہیر احمد صدیقی

لو حیرت یوں ہوئی جم گئے شبنم کے قدم
مثل اشک آبلہ ہر گام پہ اس سے ہے دوچار

جانے آئینہ ہے کس مذہب و مشرب کا امین
سامنے آئے جو اس سے ہے اسے فخر نہ عار

دل عجب چیز ہے تخمین کی قطروں میں تو وہ
حسن ہے اور نہیں آئینے سے اس کو سروکار

کس شتابی سے ہوئی عمر یوں آشفتہ دماغ
سانس کو بھی دکھا کے اسے کرتی ہے شمار

دولت ابھی بیدل تجھے کس نے بخشی
ترے افکار سے ہے نوکِ قلم گوہر بار

میرزا عبدالقادر بیدل

کوہ از چہ ادب ضبطِ نفس کرد کہ بر سنگ
بردل، مژہ خوابانْد چراغانِ شرارش!
ابر از چہ تلاش این ہمہ سامان عرق داشت؟
کآئینہ چکید از نمد خوردہ فشارش
برق از چہ طربِ رقصِ بہ بہیر طلب داد؟
کز عرض برون داد لبِ خندہ سوارش!
گلشن ز چہ عیشِ اینقدر اندوخت گلشن؟
کافتاد سروکار بہ دلہای نگارش!
بلبل ز چہ سازِ انجمن آرای طرب بود؟
کز یک نی منقار ستودند ہزارش
طاؤس بپرواز چہ گلزار پرافشاندہ؟
کز خلد چکید آرزوی نقش و نگارش!

ظہیر احمد صدیقی

دم بخود کس کے ادب سے ہیں یہ سارے کہسار؟
دل ہر سنگ میں خفتہ ہے چراغانِ شرار!

ابر کو کس کی تلاش ایسی کہ ہے غرقِ عرق؟
لو نمد جکا بنا کما کے فشار آئینہ بار!

برق کو ایسی خوشی کیا ہے کہ ہے خندہ بلب؟
دے ہے مہمیز طلب رخشِ تقریر ہے سوار!

عیش وہ کیا ہے کہ ہوا جس سے گلشن یوں چمن
کہ رکھیں اس سے تعلق سبھی دلہائے نگار

جانے کس ساز سے بلبل ہوئی نغمہ پیرا؟
اس کی منقار کی نے ایک ہے نام اس کا ہزار!

بالِ طاؤس ہے پرواز میں گلزار فشاں؟
خلد سے اتری ہے یا آرزوئے نقش و نگار

میرزا عبدالقادر بیدل

زہے چمن ساز صبح فطرت تبسم لعل مہر جوت
زبوی گل تا نوای بلبل ندای تنبیہ گفتگوت

سر نسیمی در آمد از در پیام گلزار وصل در بر
چوں رنگ رفتم ز خویش دیگر چہ رنگ باشد نثار بوت

اگر بہارم تو آبیاری وگر چرا غم تو شعلہ کاری
ز حیرت من خبر نداری بہارم آئینہ روبروت

بعشق نازد دل ہوس ہم پیالہ از شعلہ خار وخس ہم
رسا ست سررشتہ نفس ہم بقدر افسون جستجوت

کجا ست مضمون اشتہاری کہ بیدل انشا کند نثاری
بساختم پیکر نزاری بگنجم پیش تار موت

ظہیر احمد صدیقی

عجب چمن ساز صبح فطرت تبسم لعل مہر جو ہے
نوائے بلبل سے بوئے گل تک ندائے تنبیہ گفتگو ہے

صبا سر گرِ چمن سے آئی پیام گلزار وصل لیکر
ہوا میں بے خود خبر یہ سنکر کہ جان میری اسے جان تو ہے

اگر چمن ہوں بہار تو ہے چراغ اگر ہوں تو نور تو ہے
تو میری حیرت سے بے خبر ہے لے آئینہ تیرے روبرو
ہے

جنوں پہ نازاں دل ہوس بھی ضرر سے اترائیں خار و خس بھی
رسا ہے یہ رشتۂ نفس بھی کہ جس قدر تیری جستجو ہے

کہاں ہے مضمون ہیچ ایسا کرے جو بیدل اسے بیِ انشا
ہے نثر بلیغ زار کی بس، اسے جان جو نغمہ تار سو ہے

○

میرزا عبدالقادر بیدل

بوی وصل بست در رنگ بہار آئینہ
بیگدازم دل کہ گردم آبیار آئینہ

کیست تا بندد زبان بیمانیہای من
نشہ دیدار می خواہد غبار آئینہ

بسکہ سر جوش تو گشت سراپای من
حیرتم عکس است اگر گردم دوچار آئینہ

نور دل خواہی بکر ظاہر آرائی مباش
جوش زنگار است و بس نقش و نگار آئینہ

دام جوہر لخت طاؤس دارد در بغل
دستگاہ رنگی کہ شد یارب شکار آئینہ

بے خودی ساغر کش کیفیت دیدار کیست
در شکست رنگ ما ہم بہار آئینہ

○

ظہیر احمد صدیقی

وصل کی خوشبو رکھے رنگ بہار آئینہ
دل کو پگھلاؤں ہنوں میں آبیار آئینہ

کون ہے جو کہے میری بے ماجی کی زبان
تشنۂ دیدار مانگے ہے غبار آئینہ

میں سراپا بسکہ خود ہی جلوہ جانے دوست ہوں
میری حیرت عکس ہو گر ہوں دو چار آئینہ

نور دل کی گر طلب ہے ظاہر آرائی نہ کر
جوش ہے زنگار کا نقش و نگار آئینہ

لخت طاؤس رکھے دام جوہر در بغل
کیسے کیسے رنگ یارب ہیں شکار آئینہ

بے خودی نے مست کر کے بادۂ دیدار کی
ہیں شکست رنگ میں دیکھوں بہار آئینہ

○

میرزا عبدالقادر بیدل

امروز کیست مست تماشای آئینہ
کز تاب صبح میرود اجزای آئینہ

شد عمر صرف جلوہ پرستی دلی چو سوز
گم رفت لیکن دل ما جای آئینہ

حسن و ہر زہ لخت نیرنگ در بغل
ما و دل و یک ورق انشای آئینہ

بودی کہ داد عرض نزاکت میان یار
التفات مو بہ پردۂ پیدای آئینہ

دانگہ چشم باز کنی جلوہ میدہد
سبت شبت ز مسای آئینہ

دل بہر دلی ندھند آرزوی داغ
لندر است باب تمنای آئینہ

○

یراحمد صدیقی
ہے آج کون ست تماشائے آئینہ
را رہے ہیں ناز سے، اجزائے آئینہ

چند عمر جلوہ پرستی میں صرف کی
ں کو مرے گر نہ مل جائے آئینہ

حسن اور ہزار لٹو نیرنگ در بغل
میں اور دل کا اک ورق الشائے آئینہ

جس دن میان یار نزاکت نما ہوئی
بال آ گیا بدیدہ بینائے آئینہ

جس سو نگاہ کیجئے جلوے ہیں روبرو
ہے اسم شبت تو مسا ہے آئینہ

ہر دل کو کب کریں وہ عطا، آرزوے داغ
بیدل سکندری ہے تمنائے آئینہ

"کاوش" (۲) ۱۹۹۲ء

عابد اللہ غازی

مہاجر

ہم آگئے ہیں، مگر خالی ہاتھ آئے ہیں
ہمارے خواب تھے ایسے
کہ ساتھ آنہ سکے
حسین خیال، جنھیں ہم سفر بنا نہ سکے۔
تصورات!
جو راہِ سفر میں چھوٹ گئے
تخیلات
جو ٹکرائے یادِ ماضی سے
بکھر کے ٹوٹ گئے

یہ راستہ ہے کہ منزل؟
پتہ نہیں چلتا
گمان ہوتا ہے اکثر
قریبِ منزل کا
زمیں یہاں کی الگ
آسماں یہاں کا جدا
شعارِ زیست عجب
طریقِ فکر نیا

وہ خواب!
پالا تھا برسوں سے جن کو سینے میں
یہاں وہ خواب حقیقت بنا نہیں سکتا
تصورات کو
پھر سے جلا نہیں سکتا
تخیلات کی دنیا
سجا نہیں سکتا۔

کٹھن ہے زیست بہت
مگر!
میں لوٹ کے واپس بھی
جا نہیں سکتا۔

931, SMITH LAFLIN
CHICAGO, ILLINOIS 60607(U.S

(شاعر ۶۳ (۱۱) ۱۹۹۲ء)

دُوسرا بن باس

کیفی اعظمی

رام بن باس سے لوٹ کر جب گھر میں آئے
یاد جنگل بہت آیا جو نگر میں آئے
رقصِ دیوانگی آنگن میں جو دیکھا ہوگا
۶ دسمبر کو شری رام نے سوچا ہوگا
اتنے دیوانے کہاں سے مرے گھر میں آئے

جگمگاتے تھے جہاں رام کے قدموں کے نشاں
پیار کی کہکشاں لیتی تھی انگڑائی جہاں
موڑ نفرت کے اسی راہ گزر میں آئے

دھرم کیا ان کا ہے، کیا ذات ہے، یہ جانتا کون
گھر نہ جلتا تو انہیں رات میں پہچانتا کون
گھر جلانے کو مرے یار جو گھر میں آئے

شاکاہاری ہے مرے دوست تمہارا خنجر
تم نے بابر کی طرف پھینکے تھے سارے پتھر
ہے مرے سر کی خطا زخم جو سر میں آئے

پاؤں سرجو میں ابھی رام نے دھوئے بھی نہ تھے
کہ نظر آئے وہاں خون کے گہرے دھبے
پاؤں دھوئے بنا سرجو کے کنارے سے اٹھے
راج دھانی کی فضا آئی نہیں راس مجھے
۶ دسمبر کو ملا دوسرا بن باس مجھے

[روشن خیال ۱(۴)]

ہمیں انسان رہنے دو



محمود شام

ہمام وین حق مانگا
تو ہم اجڑے
ہمارے گھر چھنے
ورثے لٹے
ہم کٹ گئے صدیوں کے رشتوں سے
پرانے حق تو کیا ملتے
نئی محرومیاں ہی ریزہ ریزہ کر گئیں ہم کو
پرانے موسموں میں پھر بھی غیرت تھی' مروت تھی
نئے موسم نہ جانے کونسی مٹی سے اٹھے تھے
روایتی خواہشوں کی آندھیوں میں اتنے اندھے تھے
کہ ہم وطنوں کی آوازیں بھی ان کو زہر لگتی تھیں
جو ہم وطنی میں حق مانگا
تو پھر اجڑے
لہو بہنے لگا
کٹنے لگے بازو
بدن کی دھجیاں اڑنے لگیں' روحیں تڑپتی تھیں
ہمارے حق تو کیا ملتے
ہمیں پھر بانٹ ڈالا۔ کاٹ ڈالا
فاصلے بڑھتے گئے دم دم
اسی حق کی تمنا میں ہمیں بانٹا گیا پھر سے
چلو اب کے زباں کے نام پر مانگو
بلند آواز سے مانگو
کلاشنکوف سے مانگو
مگر اپنا مقدر پھر وہی ویرانیاں مقتل
لہو' وحشت' ستم' بے روزگاری' دربدر ہم تم
کوئی بھی حق تو کیا ملتا
نئی مایوسیوں کا دور دورہ ہے
چلو اس بار ہم انسان بن کے مانگنے نکلیں
نہ پھر تقسیم ہم ہوں گے
نہ پھر تسخیر ہم ہوں گے
نئی پہچان ہوگی اور نہ اب کوئی نیا نعرہ
ہماری ایک خواہش ہے
ہمارا ایک نعرہ ہے
ہمیں انسان بننے دو
ہمیں انسان رہنے دو

"معیار" مئی ۹۳ء

کیسی قوم کہاں کا ملک!

یہ بات کہیں گے ہم تو کیسی قوم کہاں کا ملک
پہلے اپنی فکر ہے ہم کو کیسی قوم کہاں کا ملک
مہر و وفا پر مٹی ڈالو کیسی قوم کہاں کا ملک
اپنے جسم و جاں کو دیکھو کیسی قوم کہاں کا ملک
ملت ہے کس کھیت کی مولی دھن ہے کس چڑیا کا نام
کوئی دوسرا قصہ چھیڑو کیسی قوم کہاں کا ملک
ملک و قوم ہماری جیب میں پیسہ بن کر بولتے ہیں
پیسے کی جھنکار پہ جھومو کیسی قوم کہاں کا ملک
قومی ترانے سب افسانے تم دیوانے ہم دیوانے
راک اینڈ رول، اور ڈسکو ناچو کیسی قوم کہاں کا ملک
ہم تو اپنے شوق کی خاطر ساری سیاست کرتے ہیں
اس کو ہماری ہابی سمجھو کیسی قوم کہاں کا ملک
اپنی ذات ہے سب سے آگے باقی سب ہیں خواب کے دھاگے
ان دھاگوں کو توڑو پھینکو کیسی قوم کہاں کا ملک
یارو تمہاری طنز بھری ان باتوں سے دم گھٹتا ہے
اٹھو ہمارے پاس سے اٹھو کیسی قوم کہاں کا ملک

"مشکور حسین یاد"

احمد فراز

○

اُس نے سکوتِ شب میں بھی، اپنا پیام رکھ دیا
ہجر کی رات، بام پر ماہِ تمام رکھ دیا

آمدِ دوست کی نوید، کوئے وفا میں عام تھی
میں نے بھی اک چراغ سا دل، سرِ شام رکھ دیا

شدتِ تشنگی میں بھی غیرتِ میکشی رہی
اُس نے جو پھیر لی نظر، میں نے بھی جام رکھ دیا

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں، بر سرِ عام رکھ دیا

اب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
کبکِ دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا

اس نے نظر نظر میں ہی۔ ایسے بھلے سخن کہے
میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

○

تُو نہ چاہے تو نہیں ہوں۔ تُو جو چاہے تو میں ہوں
مری اوقات ہی کیا ہے، پرِ کاہ ہے تو میں ہوں

تیرے غم نے مری ہستی کی ضمانت دی تھی
تُو اگر اپنے تعلق کو نبھاہے تو میں ہوں

دل نے کب شیوۂ دریوزہ گری ترک کیا
تیرے در پر نہ ہوا میں، سرِ راہے تو میں ہوں

تُو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں تیری
یاد، اکثر نہ سہی، گاہے بگاہے تو میں ہوں

حیف اُس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر جائے
وقت اگر کل بھی سخن میرے سراہے، تو میں ہوں

اور کیا چاہیئے اس فقر و فقیری میں فراز
صاحبِ خرقہ و پیوند کلاہے تو میں ہوں

"فنون" جنوری-اپریل ۹۲

احمد ندیم قاسمی

○

انجام بُرا ہوا اَنا کا
در بند ملا مجھے خُدا کا

میں تکتا رہا ہوں شام تا شام
رستہ کسی دیر آشنا کا

اب عشق کریں تو کس بھرم پر
معیار ہی گر گیا وفا کا

دلہن کی ہتھیلیوں سے پُوچھو
کیوں زرد رہا اثر حنا کا

نکلیں اگر ابتدا سے ہم لوگ
تب مرحلہ طے ہو انتہا کا

زیتون کی شاخ کو سنبھالو
پَر ٹوٹ گیا ہے فاختہ کا

چڑیاں بھی خموش ہو گئی ہیں
شاید یہی وقت ہے دُعا کا

(فنون ۳۷، ستمبر و دسمبر ۱۹۹۲ء)

احمد ندیم قاسمی

○

تیری جانب سفر، حیات مری
تُو مرا ہے تو کائنات مری

عکس در عکس تُو نظر آئے
بٹ گئی آئنوں میں ذات مری

اپنی اپنی ہماری مملکتیں
سارا دن تیرا، ساری رات مری

پوری دنیا سراپا استعجاب
سُن کے اک سیدھی سادی بات مری

میں کہ مسجود ہوں فرشتوں کا
عرش تک حدِ ممکنات مری

میرے اندر ہزار دنیائیں
اور پھر اَن گنت جہات مری

میرا فن میرے بعد بھی زندہ
یوں ہوئی موت سے نجات مری

اپنے باطن کا ترجماں ہوں ندیم
میرا ہر شعر، واردات مری

"فنون" جنوری۔ اپریل ۹۳ء

انور شعور

○

کٹ رہی ہے بُری بھلی میری
جیسے اوقات ہو یہی میری

در و دیوار کے سوا گھر میں
بات سُنتا نہیں کوئی میری

پیار دو چار دن کا کھیل نہیں
عمر برباد ہو گئی میری

کوئی گزرے تو گونج اُٹھتی ہے
کتنی سنسان ہے گلی میری

دب گئیں اک تری تمنا میں
آرزوئیں بڑی بڑی میری

تھا بڑا شور صبح آنے کا
آنکھ تک تو نہیں کھلی میری

رنگ بکھرے ہوئے ہیں محفل میں
کون دیکھے گا سادگی میری

جو تمہارے مزاج میں آئے
کیا خوشی اور ناخوشی میری

نام کس کا بتاؤں، کس کا نہیں
شہر بھر سے ہے دوستی میری

ایسا لگتا ہے بات چیت اُس سے
ہو رہی تھی ابھی ابھی میری

آپ کیوں منہ بگاڑتے ہیں شعور
میرے ہونٹوں پہ ہے ہنسی میری

○

ذرا دیر آشیانہ چاہتا ہوں
مسافر ہوں، ٹھکانا چاہتا ہوں

سکوں ملتا ہے رونے سے نہایت
مگر میں مسکرانا چاہتا ہوں

جسے بھولے ہوئے ہے ایک دنیا
اُسی کو میں بھلانا چاہتا ہوں

سفر کی دھول کیسے صاف کرلوں
اُسے صورت دکھانا چاہتا ہوں

میں اُس کے سامنے خاموش رہ کر
نہ جانے کیا چھپانا چاہتا ہوں

مرے آنے کا مقصد پوچھتے ہو؟
اِدھر دیکھو، بتانا چاہتا ہوں

شعور اپنا وطن، اپنا وطن ہے
یہیں کا آب و دانہ چاہتا ہوں

سید ضمیر جعفری

○

دشت آئے گا، پہاڑ آئیں گے، دریا آئے گا
پھر کسی بستی سے باہر کوئی خیمہ آئے گا

چھوٹی چھوٹی حسرتوں پر اتنی نا آسودگی
تو اگر دریا پہ بھی جائے تو پیاسا آئے گا

کب تک آخر ان سیہ محرومیوں کی عمر قید
کوئی تو دیوارِ زنداں میں دریچہ آئے گا

گاؤں یوں گم سم ہیں جیسے ان کی گلیوں سے کبھی
اب کوئی بارات گزرے گی نہ دولہا آئے گا

اک عجب لذت ہے بچپن کے گھروں کا لمس بھی
پیڑ جب تک کٹ نہیں جاتا، پرندہ آئے گا

کل کے بچوں کے کنول چہروں سے دھل جائے گی دھول
خواب فردا دیکھنے والو! وہ فردا آئے گا

یہ ستارے تو فلک کی ناخلف اولاد ہیں
کون کہہ سکتا تھا۔ ایسا بھی زمانہ آئے گا

تم کوئی اپنے لہو سے عہد نامہ تو لکھو
بات میں رس اور لفظوں میں کرشمہ آئے گا

آدمی کے ساتھ اُس کے خواب مر جاتے نہیں
ہیر اب بھی منتظر ہے، اُس کا رانجھا آئے گا

ہم تو خیر انسان تھے، کچھ الفاظ پگھلے بھی تو کیا
دھوپ اتنی ہے کہ پتھر کو پسینہ آئے گا

کون موتی لا سکا ہے بحر میں ڈوبے بغیر
موت سے تم زندگی مانگو تو جینا آئے گا

آسماں پر سرخ صادق رونقیں جاگی تو ہیں
رات کو جانا ہے، جائے گی، سویرا آئے گا

فطرتِ فیاض سے مایوس ہونا ہے غلط
تم کسی پتھر سے گزرو گے تو رستہ آئے گا

تو محاذِ جنگ سے پسپا ہوا تو راہ میں
جو بھی شخص آئے گا، تیرے قد سے اونچا آئے گا

راستے سارے کھلے ہیں راہ رو کے واسطے
رُخ اگر قبلے کی جانب ہے، مدینہ آئے گا

کس نے جنگل میں اکیلی بھیڑ دیکھی ہے ضمیرؔ
شیر شہروں میں بھی آئے گا تو تنہا آئے گا

ظفر اقبال

کچھ ابھی کھویا نہیں ہے اور برابر ڈھونڈتے ہیں
کوئی دنیا ہے جسے دنیا کے اندر ڈھونڈتے ہیں

جو ابھی گنجان گلیوں میں کہیں بچھڑا تھا ہم سے
آؤ اس کو شہر سے باہر نکل کر ڈھونڈتے ہیں

جستجوئے رنگِ رفتہ ہے سرِ خاکِ تماشا
نقش جو آنکھوں میں تھے ان کو ہوا پر ڈھونڈتے ہیں

خواب سا آنکھوں میں رکھ کر اک تلاشِ رائگاں کو
جو کہیں ہوتا نہیں ہے اس کو اکثر ڈھونڈتے ہیں

کون سی آنکھوں سے کس کو دیکھنا ہے کس جگہ پر
طے ابھی کچھ بھی نہیں ہے اور سراسر ڈھونڈتے ہیں

جو کہیں باہر ہے اس کو کھوجتے ہیں جان و دل میں
جو چھپا بیٹھا ہے اندر اس کو باہر ڈھونڈتے ہیں

یہ وہ ہے بھی یا نہیں شک سا ہے کوئی اپنے اندر
جس کو پایا ہے اسی کو بارِ دیگر ڈھونڈتے ہیں

شہر سے جا بھی چکا دیوانہ اپنی بات کہہ کر
اور یہ لڑکے ابھی سڑکوں پہ پتھر ڈھونڈتے ہیں

بارِ معنی سے جھکی شاخِ سخن ٹوٹی تھی کیسی
کیا وہ لمحہ تھا ظفر جس کو مکرر ڈھونڈتے ہیں

بہت مشکل میں رہنا اور کبھی آسان ہو جانا
اگر کچھ بھی نہ ہو سکنا تو بس حیران ہو جانا

کسی طوفان سے گھر جانا ہے جیسے شام پڑتے ہی
پھر اس میں رفتہ رفتہ آپ بھی طوفان ہو جانا

کوئی دشمن نہیں کوئی مخالف بھی نہیں لیکن
یہ کس سے لڑتے لڑتے اس طرح ہلکان ہو جانا

بدل جاتا بھی ہو اندر کا یہ موسم کسی لمحے
بہت آباد بھی ہوتے ہوئے ویران ہو جانا

سفر کی شرط ہی کرنی ہے پوری جس طرح بھی ہو
سواری ہو نہیں سکتا تو پھر سامان ہو جانا

ہماری تو سمجھ میں ہی نہیں آتا کسی صورت
یہ بے آباد گھر میں آپ کا مہمان ہو جانا

ہم اس کے گھر کا حصہ ہی جو بن پائیں تو کیا کم ہے
در و دیوار ہو رہنا کبھی دالان ہو جانا

کبھی اس بھیڑ سے باہر نکل سکنا بھی ہو ممکن
اکیلے بیٹھے بیٹھے اس قدر گنجان ہو جانا

ظفر رکھنا تھا آواز و ہوا سے رابطہ کچھ تو
بہت اچھا نہیں لگتا ہے یوں سنسان ہو جانا

"شب خون"
جنوری، فروری ۹۳

ظفر اقبال

بہتا نہیں خاموش گھنیرے میں اندھیرا
کچھ اور دھڑکتا ہے اندھیرے میں اندھیرا

جو صورت حالات ہے پہلے تو نہیں تھی
کیا ہے گھٹا ٹوپ تو ڈیرے میں اندھیرا

تانی ہوئی تھی رات نے پہلے ہی سے چادر
بادل نے کیا اور بسیرے میں اندھیرا

البتہ سمندر کی سیاہی ہے الگ پر تیز
مچھلی میں ہے اتنا نہ مچھیرے میں اندھیرا

کچھ دل کو ٹٹولیں گے تو ہوگا کہیں معلوم
تیرے میں زیادہ ہے کہ میرے میں اندھیرا

یہ پیار کا دھندا بھی عجب ہے کہ جہاں پر
گھاٹے میں اجالا ہے ودھیرے میں اندھیرا

میں وسط میں ہوں اور مجھے اندازہ نہیں کچھ
ہے میرے اگیرے کہ پچھیرے میں اندھیرا

گھٹتی ہی گئی روشنی، خواب معانی
بڑھتا رہا الفاظ کے گھیرے میں اندھیرا

تو شام حریفاں پہ ظفر خوش نہ بہت ہو
اتنا ہے ترے اپنے سویرے میں اندھیرا

شیشۂ جاں پہ ذرا سا ہی ضرر لے جائے
ہم سے ملتا ہے سو اتنا تو اثر لے جائے

شاید اس بار نتائج ہوں کوئی اور، اگر
اپنی محفل میں ہمیں بار دگر لے جائے

مجھے دے جائے وہ اک لمحۂ خوں گشتۂ خواب
اور مجھ سے یہ مرے شام و سحر لے جائے

راستے ہی میں کئے بیٹھا ہوں رکے تو قیام
کوئی آکر مرا سامان سفر لے جائے

یونہی بے سمت نکل پڑنا ہے دوبارہ کہیں
اس سے پہلے کہ مجھے راہگزر لے جائے

لے کے جائیں گے جہاں تک مجھے یہ عیب کبھی
غیر ممکن ہے وہاں میرا ہنر لے جائے

شہر میں کوئی اگر ہے مرا ہوتا سوتا
راستہ بھول گیا ہوں، مجھے گھر لے جائے

منتظر پھرتا ہوں جس موج ملاقات کا میں
اگر آئے بھی تو کیا جانے کدھر لے جائے

اب تو میں آپ بھی تیار ہوں جانے کو ظفر
آخری عمر کا یہ عشق جدھر لے جائے

شب خون جون، جولائی ۹۳



عابد اللہ غازی

◆

کیا ضمانت کہ تمہیں وقت بچا لے جائے
آئے طوفان تو سب کچھ نہ بہا لے جائے

پھول سی یادوں کے ہمراہ بھی سفر میں نکلا
جانے کس دشت میں یہ آبلہ پا لے جائے

شاخ سے ٹوٹ کے بے سمت سفر ہے اپنا
اب جہاں چاہے زمانے کی ہوا لے جائے

برگِ آوارہ کے ہم ہاتھوں پہ لکھا ہے ہم نے
نامۂ شوق جہاں چاہے صبا لے جائے

وقت اچھا بھی اگر ہو تو بھروسہ کیا ہے
گلعذاروں سے یہ کب رنگِ حیا لے جائے

حسنِ تعبیر سے بے رونقیِ ہستی عابد
کوئی آنکھوں سے نہ خوابوں کو چرا لے جائے

◆

ذکرِ یارانِ وطن سے دل کو بہلاتے ہیں ہم
ہم صفیرانِ چمن تم کو بھی یاد آتے ہیں ہم

مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ دل سے یادوں کے نقوش
جانے پہچانے وہ چہرے بھولتے جاتے ہیں ہم

ایسی وحشت ہے کہ دل لگتا نہیں احباب میں
اور تنہائی میسر ہو تو گھبراتے ہیں ہم

انقلابِ دہر سمجھوں یا اسے تاثیرِ عشق
بے محابا وہ ملتے ہیں تو شرماتے ہیں ہم

اپنی اس عادت پہ ہم اکثر پشیماں ہو چکے
جب زباں پر بات آتی ہے تو کہہ جاتے ہیں ہم

یہ شرابِ وصل ہے ملتی نہیں بازار میں
اس کی چشمِ شوق سے خود کھینچ کر لاتے ہیں ہم

اس نے عابد مجھ کو دیکھا ہے کچھ اس انداز سے
جیسے کہتے ہوں کہ تجھ سے خوش نہ رہتے ہیں ہم

محسن نقوی

○

آسماں تھا کہ زمیں، یاد نہیں
اس کو دیکھا تھا کہیں، یاد نہیں

چاند پگھلا تھا، کہ لو دیتی تھی
دھوپ میں اُس کی جبیں، یاد نہیں

تیرے اقرار پہ دل دھڑکا تھا
وہ گماں تھا کہ یقیں، یاد نہیں

دار کو دار کی رُت بھول گئی
تخت کو تخت نشیں یاد نہیں

دل وہ برباد مکاں ہے اب تو
جس کو خود اپنے مکیں یاد نہیں

دل پہ جب ہجر کا محشر گزرا
کون تھا دل کے قریں، یاد نہیں

جس سے زخمی ہوئیں آنکھیں محسن
وہ شرر تھا کہ نگیں، یاد نہیں



ندا فاضلی

غزل

اٹھ کے کپڑے بدل گھر سے باہر نکل، جو ہوا سو ہوا
رات کے بعد دن آج کے بعد کل جو ہوا سو ہوا

جب تلک سانس ہے، بھوک ہے، پیاس ہے، یہ ہی اتہاس ہے
رکھ کے کاندھے پہ ہل کھیت کی اور چل جو ہوا سو ہوا

خون سے تر بہ تر کر کے ہر رہگزر، تھک چکے جانور
لکڑیوں کی طرح پھر سے چولہے میں جل جو ہوا سو ہوا

جو مرا کیوں مرا، جو لٹا کیوں لٹا، جو جلا کیوں جلا
مدتوں سے ہیں گم ان سوالوں کے حل جو ہوا سو ہوا..

مندروں میں بھجن، مسجدوں میں اذاں، آدمی ہے کہاں..
آدمی کے لیے کوئی تازہ غزل جو ہوا سو ہوا..!

مسلم شمیم

ہمیں پاکستان میں اقلیتوں کو وہی منصب اور حیثیت دینی ہوگی جس کے ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے طالب ہیں ــــــ

یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا (فیض)

سوویت یونین کے انہدام کے المیہ پر گفتگو جاری ہے اور عرصہ دراز تک جاری رہے گی ماضی قریب میں ایک نیا المیہ بھی جنوبی ایشیاء میں وقوع ہوا ہے یا اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ یہ المیہ دنیا کے سب سے بڑے جمہوریہ ہندوستان میں سیکولرزم کے انہدام کی سنگین صورت حال کا المیہ ہے۔ ہندوستان میں بنیاد پرستی اور مذہبی احیاء پرستی جس فسطائیت کو جنم دے کر پروان چڑھا رہی ہے اس سے ہندوستانی معاشرہ ہی متاثر نہیں ہوگا بلکہ اس کے اثرات ساری دنیا پر پڑیں گے۔ اور خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک پر۔ جنوبی ایشیاء کے ممالک تو براہ راست زد پر ہوگے ہی۔ اہل فکر و دانش کے لئے یہ انتہائی سنگین مسئلہ تاریخ کا ویسا ہی مرحلہ ہے جب اسپین میں دوسری جنگ عظیم سے کچھ ہی پہلے جنرل فرانکوس کی قیادت میں فسطائیت کے عفریت نے سر ابھارا تھا۔ اس دور کے جمہوریت پسندوں نے اسے مجموعی طور پر انسانی تہذیب و تمدن اور ثقافتی ورثہ پر یلغار قرار دے کر جمہوریت اور ثقافت کی مدافعت کرنے کے لئے بین الاقوامی پیمانے پر ایک بریگیڈ تشکیل دیا تھا جس میں اہل دانش اور اہل قلم بھی شریک ہوئے تھے اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے۔ ہندوستانی معاشرے کو جس فسطائیت کا سامنا ہے اس کے ہولناک نتائج اور اثرات کا عالمی برادری اور عالمی رائے عامہ کو سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے اور ہندوستان کی سیکولر جمہوری روایات کی پاسداری اور حمایت کے لئے موثر ہمہ گیر اور جامع حکمت عملی تشکیل دی جانی چاہیے۔

اس ضمن میں صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ان تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے جو ہندوستان کے رسائل و جرائد میں بائیں بازو کے دانشوروں اور اہل قلم کی شائع ہورہی ہیں۔ ان روشن خیال اہل فکر و دانش کا تعلق مختلف فرقوں سے ہے۔ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری جنرل اور مشہور ترقی پسند نقاد و دانشور ڈاکٹر قمر رئیس کی زیر ادارت شائع ہونے والے سہ ماہی جریدہ "نیا سفر" کے مندرجات سے ہندوستان میں فسطائیت کے حقیقی خطرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس۔ "آخر دسمبر ۱۹۹۲ء میں جب اس کا اداریہ قلم بند کرنے کا وقت آیا تو محسوس ہوا جیسے ذہن سے ادب اور اس کے مسائل کی آگہی کے سارے خیمے اکھڑ چکے ہیں۔ ادب کی وہ اقدار عالیہ جن سے میرے وجود کی تہذیب ہوئی اپنی معنویت کا سفینہ لے کر کسی انجان سفر پر چپکے سے نکل چکی ہیں اور میں نیم وحشی ہوگیا ہوں۔ ۶ دسمبر سے اب تک اس ملک میں غارت گری بربریت اور بے دریغ ہلاکت کی جو گرم ہوائیں چلیں، انہوں نے ذہن کو صرف ایک نقطہ ایک سوال پر مرکوز کردیا ہے۔ کیا یہ عظیم ملک مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ منافرت کی آگ میں جل کر بھسم ہوجائے گا یا زندہ رہے گا۔ ۶ دسمبر کو ملک کی شفاف پیشانی پر جو داغ لگا ہے اسے گنگ جمن کا سارا پانی بھی شاید دھو نہیں سکے گا۔ اس سانحہ کے بعد ایک نئے ہندوستان نے جنم لیا ہے جس کے خط و خال روشن ہوتے جارہے ہیں۔ یہ صرف ایک مسجد کا انہدام نہیں ہے۔ اس وحشیانہ عمل نے مشترکہ تہذیب، متحدہ قومیت اور سیکولر جمہوری نظام کے اس قلعہ کی بنیادیں ہلادی ہیں۔ اس میں دراڑیں ڈال دی ہیں جس کے سایہ میں ہم امن اور سلامتی سے بیٹھے اکیسویں صدی میں ایک جدید ہندوستان کی تعمیر کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ سارے خواب اب ظلمت پرستی کی دھند میں تحلیل ہوتے نظر آتے ہیں۔"

ڈاکٹر قمر رئیس کی اس تحریر کا حرف حرف صورت حال کی سنگینی کی شہادت دے رہا ہے۔ گذشتہ سال کے اوائل میں ہندوستان کے ایک اور معتبر ترقی پسند شاعر اور دانشور مرحوم غلام ربانی تاباں نے ہمیں دوران گفتگو ٦ دسمبر ۱۹۹۲ء کے ہونے والے المیہ کی پیشگوئی کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ بابری مسجد آج کے حالات میں سیکولرزم کی علامت ہے۔ اس طرح اس کا انہدام گویا سیکولرزم کے انہدام پر منتج ہوگا۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ایسا نہیں کہ سیکولرزم پر یقین رکھنے والے ہندوستان میں اقلیت میں ہیں بلکہ بقول ان کے بھاری اکثریت سیکولرزم پر یقین رکھنے والوں کی ہے۔ سیکولرزم دشمن طاقتیں منظم ہونے کے باعث مؤثر ہیں اور سیکولرزم دوست طاقتیں غیر منظم ہونے کے باعث غیر مؤثر ہیں اگر سیکولرزم پر یقین رکھنے والوں نے بنیاد پرستوں کی جارحیت کا مؤثر جواب نہیں دیا تو جیسا کہ اب تک ہوا ہے فسطائی طاقتیں پیش رفت کرتی چلی جائیں گی اور معاشرہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جائے گا اور یہ تاریکیاں ہندوستان کی فضاؤں سے نکل کر کرہ ارض کے ایک بڑے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی۔ اس کا احساس اہل دانش نہ کرپائے اور بروقت اس کے سدِباب کے لئے آمادہ جہاد نہ ہوئے تو جو المیہ ظہور پذیر ہونے والا ہے وہ اپنا دائرہ عمل مکمل کرلے گا۔ صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود یہ رائے قائم کرلینا کہ ہندوستان میں سیکولرزم، روشن خیالی اور خرد افروزی کا مستقبل تاریک ہوچکا ہے۔ قنوطی رویہ کا اظہار ہے اور ظلمت پرستی کے سامنے سپر ڈال دینے کے مترادف ہے۔"

یہ ایسا چیلنج ہے جس نے پورے ملک کے ہر زبان، ہر مذہب، ہر علاقہ کے باضمیر روشن خیال اور سیکولر ذہن کے دانشوروں، ادیبوں، فنکاروں، صحافیوں اور نوجوانوں کو جھنجوڑ دیا ہے۔ ملک میں ایک نئی نظریاتی جنگ کا آغاز ہوگیا ہے۔ ایک طرف سماجی انصاف، مساوات، آزادی فکر و اظہار اور انسان دوستی کی اعلیٰ اقدار پر قائم جمہوری نظریہ حیات ہے اور دوسری جانب ہندو احیاء پرستی اور موہوم ہندو تہذیب پر قائم ایک TOTALITARIAN نظام حیات کی بالادستی کا تصور ہے جو فسطائی طاقتوں کی طرح تاریخ اور تہذیب کے سارے مظاہر کو مسخ کرکے پیش کررہا ہے۔ اس نظام میں کسی دوسرے مذہب، نسل، تہذیب اور نظریہ حیات کے پنپنے اور زندہ رہنے کی گنجائش ہی نہیں۔ اس لئے اس میں آزادی فکر و اظہار کے حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نظریاتی جنگ میں صرف مسلمانوں کو نہیں، جمہوری نظام کو عزیز رکھنے والی ساری طاقتوں، ساری جماعتوں کو شریک ہونا ہے کہ اس نظریاتی آویزش کا احساس عام ہورہا ہے۔ سیکولر اور بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں سے قطع نظر جنہوں نے بنیاد پرستی کا مقابلہ کرنے کے لئے پروگرام اور حکمت عملیاں بنائی ہیں، ملک کی مختلف ادبی تہذیبی تعلیمی اور سیکولر مزاج کی مذہبی تنظیموں نے بھی فسطائی طاقتوں کے مقابلہ میں سیکولر جمہوری نظام کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان مذہبی تنظیموں میں بھارتیہ آریہ پرتی ندھی سبھا (صدر سوامی اگنی ویش) اور اسلامی مرکز (صدر مولانا وحید الدین خان) شامل ہیں۔

ہندوستان میں بنیاد پرستی اور احیاء پرستی کے پس منظر میں نظریاتی آویزش کے حوالہ سے پاکستان کے دانشوروں اور اہل قلم کی ذمہ داری اور فرائض یکساں ہیں۔ ہمارے ملک میں روشن خیالی اور خرد افروزی کے خلاف برسرپیکار طاقتیں دراصل بنیاد پرستی اور راسخ العقیدگی کی طاقتیں ہیں اور ان کی سرگرمیوں سے ہندوستان میں ہندو بنیاد پرستی کو براہِ راست تقویت پہنچتی رہی ہے۔ ہمارے یہاں کے رجعت پرست حلقے بڑے تواتر اور استقامت سے سیکولرزم کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ ہندوستان اگر سیکولر ریاست نہ رہا اور وہاں سیکولرزم کے انہدام کا المیہ ایک حقیقت بن گیا تو ہندوستان میں مسلم آبادی کا کیا بنے گا اور ان کی حیثیت کیا رہے گی۔ بنیاد پرستی اور راسخ العقیدگی کہیں بھی ہو اور کسی مذہب اور عقیدہ کے حوالہ سے، اس کی نوعیت ایک جیسی ہوگی۔ آپ اگر ہندوستان میں ہندو بنیاد پرستی کی مذمت کرنے چلے ہیں تو آپ کو اپنے گریبان میں بھی جھانکنا چاہئے۔ فارسی کا مقولہ ہے کہ ہرچہ برائے خود رانہ پسندی، برائے دیگراں مپسند، آپ اپنے معاشرے میں عقیدت کی بنیاد پر عدم مساوات کی حکمت عملی پر عمل پیرا رہ کر دوسرے معاشرے میں اپنے لئے مساوات کا خود کو حق دار جاننا کہاں کی منطق ٹھہرے گی۔ ہمارے یہاں ایک مکتبہ فکر بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ روشن خیالی اور خرد افروزی کی بیخ کنی میں مصروف ہے اور اپنے معاشرہ کو توہمات، اندھی تقلید اور راسخ العقیدگی کی تاریکیوں میں دھکیلنے کے درپے ہے۔ سیکولرزم کے سلسلہ میں گمراہ کن پروپیگنڈہ اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اگرچہ سیکولرزم نہ تو لادینیت و دہریت سے عبارت ہے اور نہ ہی محض مذاہب کو فراخ دلی سے گوارا کرلینا اور ایک اعتدال پسندانہ رواداری برتنا ہے۔ سیکولرزم ایک سائنٹفک اصطلاح ہے جو انسانی سماجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ انقلاب اور جمہوریت کے تصورات کے ساتھ پروان چڑھی ہے۔ سیاسی اعتبار سے سیکولرزم سے مراد مذہبی امور میں ریاست و حکومت کی عدم مداخلت اور غیر جانب داری ہے تاکہ مملکت میں رہنے والی تمام آبادی کو مساویانہ حیثیت اور مقام حاصل ہو اور کسی تفریق و تمیز کے بغیر سب برابر کے شہری ہوں،

اور مساویانہ حقوق اور منصب کے حقدار ہوں۔ لہٰذا ہم اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو مساویانہ حیثیت اور حقوق حاصل ہوں تو ہمیں اپنے ہاں کی اقلیتوں کو وہی حیثیت اور مقام دینے کی تدبیر کرنی پڑے گی۔ جس کے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے طالب ہیں۔۔ہم اپنے ہم قبیلہ سے تعلق رکھنے والوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں گے اور ہندوستان میں بنیاد پرستی اور مذہبی احیاء پرستی کے خلاف نظریاتی جنگ میں اپنے کردار اور عمل سے غافل نہیں ہوں گے اور انہیں اپنے معاشرہ میں بنیاد پرستی اور راسخ العقیدگی کے مقابلہ میں روشن خیالی اور خرد افروزی کے فروغ کے لئے اپنا زور قلم صرف کرنا ہوگا اور معروف جدوجہد رہنا ہوگا۔

بدل دردے کزاں شیریں شمائل داشتم گفتم
گزشتم از سر خود ہرچہ در دل داشتم گفتم

"طلوع افکار" فروری ۱۹۹۳ء

جسٹس محمد منیر

جسٹس ایم آر کیانی

مُسلمان

ایک غیر مُسلم مملکت میں

۱۹۵۳ء میں جب مُلک کے جید علماء سے کہا گیا کہ پاکستان میں غیر مُسلموں کے ساتھ اگر امتیازی سلوک روا رکھا جائے اور اس کے جواب میں غیر مسلم مملکتیں اپنی مُسلمان اقلیت کے ساتھ یہی امتیازی سلوک روا رکھیں، تو کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ متین بیچ اِس مسئلے کے۔؟

مشہور زمانہ جسٹس منیر کمیشن رپورٹ سے ایک اقتباس

جس نظریے کی بنا پر پاکستان میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھنے کی خواہش کی جاتی ہے۔ اس کے بعض نتائج ان مسلمانوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے جو غیر مسلم حکمرانوں کے ماتحت ممالک میں آباد ہیں۔ ہم نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے سوال کیا کہ آیا ایک مسلمان ایک غیر مسلم مملکت کی وفادار رعایا ہو سکتا ہے؟ ان کا جواب ذیل میں درج ہے:

س: کیا آپ کی رائے میں ایک مسلمان ایک کافر حکومت کے احکام کی تعمیل کا پابند ہو سکتا ہے؟

ج: یہ ممکن نہیں ... کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار ہو۔

س: کیا چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنی مملکت کے وفادار شہری ہوں؟

ج: جی نہیں۔

یہ جواب اس نظریے کے بالکل مطابق ہے جو ہمارے سامنے پر زور طریق پر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر پاکستان کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے دستور کی بنیاد مذہب پر رکھے تو یہی حق ان ملکوں کو بھی دینا ہوگا جن میں مسلمان کافی بڑی اقلیتوں پر مشتمل ہیں یا جو کسی ایسے ملک میں غالب اکثریت رکھتے ہیں جن میں حاکمیت کسی غیر مسلم قوم کو حاصل ہے۔ لہٰذا ہم نے مختلف علماء سے یہ سوال کیا کہ اگر پاکستان میں غیر مسلموں سے بحیثیت شہریت کے معاملات میں مسلموں سے مختلف سلوک کیا جائے تو کیا علما کو اس امر پر کوئی اعتراض ہوگا کہ دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ روا رکھا جائے۔ اس سوال کے جوابات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری

صدر جمعیت العلمائے پاکستان

س: کیا آپ ہندوؤں کا جو ہندوستان میں اکثریت رکھتے ہیں، یہ حق تسلیم کریں گے کہ وہ اپنے ہاں ہندو دھرم کے ماتحت مملکت قائم کر لیں؟

ج: جی ہاں۔

س: اگر اس نظام حکومت میں منو شاستر کے ماتحت مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ تو کیا آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟

ج: جی نہیں۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

س: اگر ہم پاکستان میں اس شکل کی اسلامی حکومت قائم کر لیں تو کیا آپ ہندوؤں کو اجازت دیں گے کہ وہ اپنے دستور کی بنیاد اپنے مذہب پر رکھیں؟

ج: یقیناً مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے اور انہیں حکومت میں حصہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دیئے جائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی ہندوستان میں صورت حالات یہی ہے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

س: ہندوستان میں کتنے کروڑ مسلمان آباد ہیں؟

ج: چار کروڑ۔

س: کیا آپ کو اس امر پر اعتراض ہو گا کہ ان پر منو کے قوانین نافذ کئے جائیں جن کے تحت انہیں کوئی شہری حق حاصل نہ ہو گا اور ان سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے گا؟

ج: میں پاکستان میں ہوں اور ان کو مشورہ نہیں دے سکتا۔

میاں طفیل محمد
جماعت اسلامی

س: دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کس قدر ہے؟

ج: پچاس کروڑ۔

س: اگر آپ کے قول کے مطابق مسلمانان عالم کی کل آبادی پچاس کروڑ ہے اور پاکستان، سعودی عرب، یمن، انڈونیشیا، مصر، ایران، شام، لبنان، شرق اردن، ترکی اور عراق کے مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ نہیں، تو کیا آپ کے نظریئے کا یہ نتیجہ نہ ہو گا کہ تیس کروڑ مسلمانان عالم محض لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے والے بن جائیں گے؟

ج: میرے نظریئے کا اثر ان کی حیثیت پر نہ ہونا چاہئے۔

س: کیا اس حالت میں بھی کہ ان سے مذہبی بنا پر غیر مساوی سلوک کیا جائے اور معمولی حقوق شہریت سے بھی محروم کر دیا جائے؟

ج: جی ہاں۔

اس گواہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم حکومت اپنے ملک کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو اسامیاں پیش بھی کرے تو ان کا فرض ہو گا کہ ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔

غازی سراج الدین منیر

س: کیا آپ پاکستان میں اسلامی مملکت کا قیام چاہتے ہیں؟

ج: یقیناً۔

س: اگر ہمسایہ ملک اپنے سیاسی نظام کو اپنے مذہب پر مبنی قرار دے تو اس پر آپ کا ردعمل کیا ہو گا؟

ج: اگر وہ چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔

س: کیا آپ ان کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ تمام مسلمانان ہند کو شودر اور ملیچھ قرار دے دیں اور انہیں کسی قسم کا شہری حق نہ دیں؟

ج: ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ ایسی حرکت سے پہلے ہی ان کی سیاسی حاکمیت ختم کر دی جائے۔ ہم ہندوستان کے مقابلے میں بہت طاقتور ہیں۔ ہم ضرور اتنے مضبوط ہوں گے کہ ہندوستان کو ایسا کرنے سے روک دیں۔

س: کیا تبلیغ اسلام مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں شامل ہے؟

ج: جی ہاں۔

س: کیا مسلمانان ہند کا بھی یہ فرض ہے کہ علی الاعلان اپنے مذہب کی تبلیغ کریں؟

ج: ان کو اس کا حق حاصل ہونا چاہئے۔

س: اگر ہندوستانی مملکت مذہبی بنیاد پر قائم کر دی جائے اور وہ اپنے مسلم باشندوں کو تبلیغ مذہب کے حق سے محروم کر دے تو کیا ہو گا؟

ج: اگر ہندوستان کوئی ایسا قانون وضع کرے گا، تو چونکہ میں "تحریک توسیع" پر ایمان رکھتا ہوں، اس لئے ہندوستان پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لوں گا۔

گویا مذہبی وجوہ کی بنا پر امتیازی سلوک کی بہم مساوات کا یہ جواب ہے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری

س: کیا آپ چار کروڑ مسلمانان ہند کے لئے بھی وہی نظریہ پسند کریں گے جو آپ پاکستان کے مسلمانوں کے لئے پیش کر رہے ہیں؟

ج: وہ نظریہ اختیار کرنے کے بعد تو وہ ایک مدت کے لئے ہندوستان میں نہ رہ سکیں گے۔

س: کیا مسلمان کا نظریہ ہر مقام پر اور ہر وقت میں برقرار رہتا ہے؟

ج: جی نہیں۔

س: پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانان ہند بھی وہی نظریہ اختیار نہ کریں جو آپ کا ہے؟

ج: اس کا جواب انہی کو دینا چاہئے۔

ہمارے سامنے جس نظریئے کی حمایت کی گئی ہے، اس کو اگر ہندوستان کے مسلمان اختیار کر لیں تو وہ مملکت کے سرکاری عہدوں سے کلیتاً محروم ہو جائیں گے اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ان کا یہی حشر ہو گا جہاں غیر مسلم حکومتیں قائم ہیں۔ مسلمان ہر جگہ دائمی طور پر مشتبہ ہو جائیں گے اور فوج میں بھرتی نہ کئے جائیں گے۔ کیونکہ اس نظریئے کے مطابق کسی مسلم ملک اور کسی غیر مسلم ملک کے درمیان جنگ ہونے کی صورت

میں غیر مسلم ملک کے مسلم سپاہیوں کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو مسلم ملک کا ساتھ دیں، یا اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں۔ ہم نے اس مسئلے پر دو عالموں سے سوالات کئے، جن کے جوابات درج ذیل ہیں۔

مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری
صدر جمعیت العلمائے پاکستان

س: ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں مسلمانان ہند کا فرض کیا ہوگا؟

ج: ان کا فرض ظاہر ہے کہ انہیں ہمارا ساتھ دینا چاہئے اور ہندوستان کی جانب سے ہمارے خلاف نہ لڑنا چاہئے۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

س: ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی حالت میں مسلمانان ہند کا فرض کیا ہوگا؟

ج: ان کا فرض ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف نہ لڑیں اور نہ کوئی ایسا فعل کریں جو پاکستان کی سلامتی کے لئے مضر ہو۔ ■

"روشن خیال" (۴) ا

ایودھیا کے بعد کیا؟

سید حامد

۶ دسمبر کو جو قیامت برپا ہوئی اس نے ہندوستان کو ہلا ڈالا اور مسلمانوں کے سکون، ان کی سلامتی اور ان کے حقوق کو تہس نہس کر دیا۔ مسلمانوں کو اپنی اوقات معلوم ہو گئی۔ وہ سوچنے لگے کیا اپنے وطن میں باعزت کے ساتھ رہ سکیں گے۔ کیا یہاں ہم آزادی کا سانس لے سکیں گے۔ کیا ہمیں عبادت کی اجازت ہوگی۔ کیا ہمارے مذہب، ثقافت اور روایات بالآخر محفوظ رہ سکیں گی یا جس طرح ان کی مسجد منہدم کی گئی ہے اسی طرح وہ سب کچھ جو انھیں عزیز ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں مسمار کر دیا جائے گا۔ کیا تعداد کو قانون پر بالادستی حاصل ہو گئی ہے؟ کیا اکثریت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اقلیت کو روندتی چلی جائے۔ آئین کو بالائے طاق رکھے، قانون کی دھجیاں بکھیر دے، عدالت عالیہ کی حکم عدولی برملا اور علی الاعلان کرے۔ کیا ہندوستان کے ہر باشندے کو ہندوتت (ہندوتا) کے آگے سربسجود ہونا پڑے گا۔ کیا اس ملک میں حکومت جمہور کی نہیں ہے، اکثریت کی ہے اور اقلیتیں اکثریت کی رعایا ہیں اور ان کے رحم و کرم پر یہاں زندگی گزار رہی ہیں۔ کیا رواداری کی پرچار ایک سراب ہے؟ کیا سیکولرزم کا دعوا ایک فریب ہے۔ کیا ہندوستان ایک دھارمک ریاست ہے جہاں ہندو دھرم کو فضیلت حاصل ہے اور باقی سب دھرم ریاست کے دھرم کے تابع فرمان ہیں۔ کیا مساوات کے یہ سارے دعوے باطل ہیں؟ کیا جمہوریت کا ایوان دھم سے گر گیا ہے؟

دیا اسیروں تمھاری قبا میں پائے کوب
تو کہتا ہے کہ آزادی کی ہے تیری ہری

بابری مسجد کیا شہید ہوئی، مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے، پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جگن ناتھ آزاد کہنے لگے "ہم آپ کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے"۔ مسلمان سرنگوں ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب سر اٹھا کر کیسے چلیں گے۔ وہ خدا کے گھر کی حفاظت نہ کر سکے، وہ نامراد اب کس لیے جئیں گے۔ ان کے سینے گھاؤ کھلے ہو گئے ہیں۔ جن سے رہا نہیں گیا وہ کفنی باندھ کر سڑکوں پر آگئے اور نہ معلوم کتنوں نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ جن میں نکلنے کا یارا نہ تھا، وہ گھر بیٹھے ہی سسک رہے ہیں، خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ مسجد کو روئیں کہ شہیدوں کو، شہید دونوں ہی ہوئے۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

لوگ کہیں گے کہ مسلمان تنہا نہیں ہیں، وہ بے یار و مددگار نہیں ہیں، ان کے ہم وطن ان کے ساتھ ہیں۔ یہ شکست مسلمانوں کی، ان کے مذہب کی شکست نہیں ہے۔ یہ شکست اعلیٰ انسانی قدروں کی شکست ہے، جمہوریت اور سیکولرزم اور مساوات اور انصاف کی شکست ہے۔ بی جے پی، وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس کا ہندوستان پر کوئی اجارہ نہیں۔ سیاسی پارٹیوں کو دیکھیے تو بھاجپا کے علاوہ ساری پارٹیاں کھل کے اتیاچار کے خلاف اٹھی ہیں، وہ مظلوم اقلیت کا ساتھ دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ انھیں فکر ہے کہیں ہندوستان جمہوری اور سیکولر قدروں کو ترک نہ کر دے۔ یہاں دھرم ودھ کا بول بالا نہ ہو جائے، ایسی مذہبی ریاست وجود میں نہ آ جائے۔ زخم خوردہ مسلمان جو خاک چاٹ رہے ہیں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بھاجپا کو چھوڑ کر سارا ہندوستان ان کا ہمدرد و غمگسار

سابق وائس چانسلر، اے ایم یو۔ علی گڑھ۔ —— بلاک اے، ہمدرد نگر، نزد تغلق آباد، نئی دہلی۔

ہے اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ لیکن وہ ایک بات بھول رہے ہیں بھاجپا کے پاس "کارڈ" ہے، منصوبہ ہے، پروگرام ہے اور یہ جذبہ ہے کہ سارے ہندوستان کو ہندو رنگ میں رنگ دیا جائے اور جو یہ رنگ قبول کرنے سے انکار کرے اُسے نکال باہر کیا جائے۔ اب یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آر ایس ایس اور بی جے پی کا اثر شہروں تک محدود ہے اور دیہات انتہا پسندی کے زہر سے پاک ہیں۔ یہ زہر تو ہندوستان بھر میں پھیل گیا ہے ایک بڑی کثیر تعداد کی رگِ جاں میں پیوست ہو گیا ہے۔ اکثریت کے بیشتر افراد چاہے وہ شہر میں رہتے ہوں چاہے دیہات میں، وہی سوچتے ہیں جو بھاجپا چاہتی ہے۔ یاتراؤں نے اور سادھوؤں نے پورے ملک کی فضا کو مسموم کر دیا ہے۔ راجستھان اور جنوبی ہند کی ریاستیں فرقہ پرستی سے پاک تھیں۔ آر ایس ایس کی کوششوں کی بدولت اکثر جگہ فرقہ پرستی کا چلن وہاں بھی ہو گیا ہے۔ دوسری سیاسی پارٹیوں نے جہاں تک تنظیم، توسیع اور تبلیغ کا تعلق ہے بھاجپا کو ایک عرصے سے واک اوور دے رکھا ہے مسلمانوں کو دوسری پارٹیوں کے مثبت ردِ عمل کی پذیرائی ضرور کرنی چاہیے لیکن ایک پل کے لیے بھی یہ سوچنا مہلک ہوگا کہ یہ پارٹیاں مل کر بھی بی جے پی کا مقابلہ کر سکتی ہیں یا یہ آڑے وقت میں مسلمانوں کا دفاع یا ان کی دستگیری کے لیے کمر کس پائیں گی۔

بی جے پی کو ہندوؤں کی اکثریت زبان سے یا دل سے اپنا ترجمان مانتی ہے۔ ساری پارٹیاں سالوں سے یہ دیکھ رہی تھیں کہ بھاجپا اور اس کی ہم رنگ جماعتیں روشنی کو لپیٹا اور ذہنوں کو مسموم کر رہی ہیں۔ شاکھاؤں، یاتراؤں، تحریروں، تقریروں اور کیسٹوں کے ذریعے مسلمان بھی یہ دیکھ رہے تھے لیکن نہ ان سیاسی پارٹیوں نے اور نہ خود مسلمانوں نے ہندو انتہا پسندی کی روک تھام کا کوئی سر و سامان کیا۔ زہر بھرے پروپیگنڈے اور نفرت بھرے دروغ کا جواب دینے، اس کا ازالہ کرنے کی کوئی کوشش بھی کسی نے نہیں کی جمہوریت آزادیِ رائے، سیکولرزم، رواداری اور احترام عقاید و مذاہب کے خلاف ہندو عوام کی عدالت میں فیصلہ یک طرفہ کر دیا گیا۔

بنی نوعِ انسان نے جب سے اینٹیں ایجاد کیں اور شہر بسائے اینٹیں آبادی کے ہی کام آتی رہیں۔ بربادی کے کام کبھی نہیں آئیں۔ لیکن وشو ہندو پریشد اور بھاجپا نے اینٹوں کے طریقِ استعمال کو بالکل الٹ دیا۔ شیلانیاس یعنی بظاہر رام مندر کے تعمیر کے لیے ہندوستان بھر سے پوجی ہوئی اینٹوں کو ایودھیا میں جمع کیا گیا۔ یہ ساری تیاریاں بابری مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور اسے منہدم کرنے کے لیے تھیں۔

صفائی کے طور پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ "یہ سب کچھ بی جے پی کے ارادوں اور منصوبے کے خلاف اچانک عمل میں آگیا دیکھیے کلیان سنگھ نے فوراً استعفیٰ دے دیا اور بی جے پی کے سب سے بڑے رہنما شری اڈوانی ایوان میں حزبِ مخالف کی لیڈری سے مستعفی ہو گئے!" مگر ایسے ان دکھاوٹی استعفوں کی اہمیت ہی کیا ہے۔ یہ تو کام کو انجام دینے کے بعد کمر کھول دینے کا سا انداز ہے۔ ابھی رات گئے دوردرشن میں اس مسئلے پر گفتگو کے دوران ڈاکٹر حبیب سنگھ نے جو ہندی کے ایک ممتاز مصنف اور مبصر ہیں، پینل کے ایک دوسرے رکن سے کہا کہ "پچھتاوے اور پشیمانی کی حکایت کو زیادہ نہ بڑھائیے۔ اگر یہ صاحبان واقعی پشیماں ہیں تو انہیں اجتماعی طور پر اس کا اظہار کرنا چاہیے اور مسلمانوں سے معافی مانگنی چاہیے۔ آپریشن بلیو اسٹار کے بعد اگر سکھوں سے معافی مانگ لی جاتی تو پنجاب کی کیفیت کچھ بالکل مختلف ہوتی۔ بھاجپا کی منفعل قیادت مسجد کو اسی جگہ پر بنانے کی ذمہ داری کیوں نہیں لیتی۔" ڈاکٹر حبیب سنگھ کی بات سے یہ اندازہ لگائیے کہ ہندوستان میں اقلیتیں خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہیں، باوجود اس کے کہ یہ گوتم بدھ اور گاندھی کا ملک ہے اور اہنسا پالن کی پرمپرا ہے۔ ہندوؤں کو اور اربابِ اقتدار کو ٹھنڈے دل کے ساتھ اس صورتِ حالات پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ اپنی پیٹھ ہم ہندوستانی ایک عرصے سے ٹھونکتے چلے آئے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے گریبان میں منہ ڈالنے اور دل کو ٹٹولنے کا۔ رواداری کی روایت کا ذکر کر کے (جو اب متروک ہو چکی ہے) ہم خود کو دھوکا دے سکتے ہیں دوسروں کو مطمئن نہیں کر سکتے ان کی نگاہ میں تو یہ زخموں پر نمک پاشی کا عمل ہے۔

ہندوؤں کی انتہا پسند جماعتوں کے بعد اس شرمناک حادثے اس راکشسی عمل کی ذمہ داری سرکار پر جاتی ہے۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالیے جو شخص فیصلہ نہ کر سکے، جو وعدوں پر ٹالتا رہے، کیا سماج میں اس کی کوئی ساکھ بن پاتی ہے؟ لوگ اُسے ڈھلمل یقین، کمزور اور بے ریڑھ کا سمجھتے ہیں۔ خواہ ایسا شخص کتنا ہی عالم فاضل، ودوان ہو کوئی اُسے گردانتا ہی نہیں، نہ کسی اجتماعی کام میں اسے شریک کرتا ہے۔ جب افراد کا یہ حال ہو تو کیا ایسی حکومت کی ذرہ برابر بھی ساکھ ہوگی جو ٹال مٹول کرتی رہے۔ فیصلے سے جی چرائے اور یہ سوچا کرے کہ وقت خود مسائل کو حل کر دے گا۔ ایودھیا کے سلسلے میں ہماری حکومت نے یہی کیا۔ شخصی اور اجتماعی مذاکرات کا جال بچھا دیا گیا۔ گویا مذاکرات سے لوگ تھک جائیں گے تو اپنے موقف میں نرمی لے آئیں گے یا اُسے سرے سے ترک ہی کر دیں گے۔ اس طرح یہ سمسیا حل ہو جائے گی۔ ہمارے اربابِ اختیار کو یہ چھوٹی سی بات بھی نہیں معلوم کہ حکومتیں محکم نیتوں اور جرأت مندانہ اقدامات اور دلیر قیادت سے چلا کرتی ہیں 'لٹکا' اور معاملات کو گمنامی میں ڈالنے سے نہیں چلتیں۔ ہندوستان

جیسا عظیم اور وسیع اور گوناگوں اور پیچیدہ ملک تقاضا کرتا ہے۔ ایک بڑا ذہن اور ایک بات پیش دل اور ایک جنبش رفتہ آمادہ نقطۂ نظر کا۔ گھوڑا سوار کو پہچانتا ہے۔ بھاجپا نے اندازہ لگایا تھا کہ سوار میں کتنا دم ہے۔ اس کے گھٹنوں میں کتنی گرفت ہے۔ چنانچہ اولین فرصت میں اس نے اسے دے پٹکا اور اس کے ماتھے پر ناتوانی اور بے عملی کا ٹھپہ لگا دیا۔

ہمارے اکابرین اور دانش ور مشورہ دینے کے لیے جاتے تھے اور حکمتِ عملی کے قصیدے پڑھ کر چلے آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی تک ہم بادشاہوں اور مہاراجاؤں کے دور میں ہیں اور اس ملک کو جمہوریت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ خود کانگریس کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں بھی لوگ صدر کا رخ دیکھتے ہیں۔ برملا اختلافِ رائے کی جہاں بغاوت سے تعبیر کی جاتی ہو وہاں مسئلے کے بیشتر رخ ڈھکے چھپے رہتے ہیں۔ ان پہ سے پردہ اٹھانا جسارتِ بیجا ہے اور اس کا مرتکب گردن زدنی۔ عافیت اسی میں ہے کہ اپنی رائے کو سربراہ کی رائے کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرو۔ وہ بھی خوش تم بھی خوش۔

ایودھیا کانڈ پر جو بیانات نکلے ان میں سب سے درد بھرا بیان صدرِ جمہوریہ کا تھا۔ سارے اختلافات اور سیاسی مصالح سے بالاتر۔ لگتا تھا کہ دل پر چوٹ لگی ہے۔ ہر لفظ میں درد کی کراہ تھی۔ اتفاق ہے کہ دوسرا قابلِ ذکر و احترام بیان نائب صدر کا تھا جو انھوں نے راجیہ سبھا میں دیا۔ انھوں نے کہا کہ

"آزادی کے بعد ملک میں دو بڑے سانحے ہوئے
ایک گاندھی جی کی شہادت اور دوسرا بابری مسجد کا شہید
ہونا۔"

گاندھی جی کی شہادت نے نفرت اور ظلمت کی امنڈتی ہوئی فوجوں کو شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا تھا۔ کیا بابری مسجد کی شہادت کا بھی کچھ ایسا ہی اثر ہوگا؟ رجائیت کہتی ہے ہاں۔ قنوطیت کہتی ہے نہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ خیال پوری قوم کو ہے یا چند لیڈروں اور دانش وروں کو۔ فتح اور فرقہ پرستی کے جشن جو کئی جگہ منائے گئے قیاس یہ کہتا ہے کہ جن شہروں میں ردِ عمل نے ہنسا کی شکل اختیار کی وہاں اس کا تنفر آناً فاناً تو ختم نہ ہوا ہوگا لیکن قیاس ہی کیوں کیا جائے۔ یہ بات کم دکھ کی نہیں کہ ایک وطن کے اندر مختلف فرقوں میں جبکہ کم از کم دو سو انسان خاک و خون میں تڑپتے نظر آرہے ہیں۔ ان کے گھروں میں ماتم کی صفیں بچھی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ خاندانوں کے سربراہ تھے یا ان کے چشم و چراغ۔ ان کے گھر اجڑ گئے اور بے چراغ ہو گئے۔ نفرت اور عداوت کا جو بیج بھاجپا، وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس نے بویا تھا اس کی فصل ہم سب کاٹ رہے ہیں

اور نہ جانے کب تک کاٹتے رہیں گے۔

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ ابھی دور درشن نے بتایا کہ حکومت نے جھٹ سے توبہ کرلی اور اہم فیصلے کرلیے۔ مسجد اسی جگہ پر پھر بنائی جائے گی۔ مجرموں کو سزا ملے گی۔ فرقہ پرست پارٹیوں پر قدغن لگے گی۔ مندر کی تعمیر کے بارے میں فیصلہ جلد کیا جائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ نفاذ کتنی جلد اور کس طرح ہوتا ہے۔

یہ تو سب تمہید ہی تمہید تھی۔ بات جو کہنے کی تھی وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اس بڑے سانحے سے عبرت کے تازیانے کا کام لیں۔ اس موقع پر بلکہ گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے ان کی قیادت نے ہوش و گوش اور صبر و ضبط سے کام لیا ہے لیکن کچھ نے اب بھی نہیں دکھایا۔ جب تک کہ وہ شہر شہر جا کر مسلمانوں کو نظم و نسق کا سبق نہیں دیتی۔ انھیں یہ نہیں بھولنا کہ اچانک مشتعل ہوجانے سے کام نہیں چلتا، نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ ہمیں تعمیر اور تنظیم ہی کے لیے خود کو وقف کردینا چاہیے۔ تعلیم کی طرف سے جو غفلت ہم نے برتی ہے وہ ہمیں بہت مہنگی پڑی ہے۔ جب تک کہ ہماری قیادت مسلمانوں کو یہ نہیں سمجھاتی کہ ان کی بقا بیک وقت مقابلہ اور تعاون، خود نگہداری اور خوش ہمسائگی میں ہے وہ اپنے فرض کو انجام نہیں دے گی۔ ہمیں ہندوستان کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز کرنا ہے۔ شکوے شکایت بہت ہوچکے۔ شکوہ کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمیں نباہ باہم کے انداز سیکھنے چاہییں اور یہ بات منوا لینی چاہیے کہ ملک کی پیش رفت اور فلاح میں ہم بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ ہندوستان کی بھلائی چاہنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں۔ ہم اس کے دست و بازو ہیں۔ ہم سے ہندوستان کی طاقت ہے۔ ہندوستان کے لیے ہم سرمایۂ بصیرت ہیں۔ ہندوستان ہم سے دست نظرانداز کرتا ہے۔ اس کی اقدار کو ہم نے استوار کیا ہے۔ ہماری نگاہ ملک کے ماضی پر نہیں اس کے مستقبل پر ہے۔ ہم ترقی کی شاہراہ پر اہلِ وطن کے ساتھ شانہ بشانہ چل رہے ہیں۔ یہاں کی خوش حالی اور خوش اندیشی میں ہمارا حصہ ہے۔" یہ ساری باتیں جب تک ہم عمل سے ثابت نہ کردیں اور اہلِ وطن سے اپنے بارے میں منوا نہ لیں اہمیت نہیں رکھتیں۔

ہمیں اپنے اہلِ وطن کے ساتھ بیٹھ کر بہت سی باتوں کی وضاحت بہت سے شبہات کا ازالہ کرنا چاہیے۔ ہم اکثریت سے کیا چاہتے ہیں۔ وہ ہم سے کیا توقع رکھتی ہے۔ ہماری خواہش اور اس کی توقع کس طرح پوری ہوگی؟ اس کی تکمیل کے لیے عملی اقدامات کیا ہوں گے۔ روزمرہ کے جھگڑے دور کرکے اب ہمیں دوسروں کے ساتھ مل کر ایک روشن مستقبل کی تشکیل کرنی چاہیے۔ خود

ہمارے اندر کیا کمیاں ہیں، کیا کمزوریاں اور وطن اور اہلِ وطن کے تئیں کیا بے مہریاں ہیں۔ ہمیں ان کا احتساب کرنا ہوگا، انھیں تسلیم کرنا ہوگا تاکہ ہم اپنے نقطۂ نظر اور رویے کو نئے خوابوں اور نئے مشترک عزائم کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ ایودھیا کے بہت بڑے سانحے نے ملک کو ہلا ڈالا ہے۔ یہ ہمارے ہوش و گوش پر منحصر ہے کہ ہم اس زبردست تخریب سے ایک بڑی تعمیر کا سر و سامان کر سکیں۔ پہلا قدم تو یہی ہے کہ مل بیٹھنا، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا، اس کی رعایت کرنا، باہمی داد و ستد سے ایک قابلِ عمل رابطہ، رشتہ اور ہمکاری کو وجود میں لانا ہے۔ اپنی سمت فکر میں انقلاب آفریں تبدیلی کرنی چاہیے۔ مسلمان بچوں کو نئے ڈھنگ سے اٹھانا چاہیے۔ انھیں مذہب، انسانیت اور وطن دوستی اور مسئولیت کے سبق پڑھانے چاہییں، ہزار جتن کرکے انھیں جہالت سے چھٹکارا دلانا سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ جمہوریت کی بنیاد انصاف پر رکھی جاتی ہے۔ ہم سب کو ساری عقلی اور قانونی موشگافیوں سے اوپر اٹھ کر اپنی صورت حالات، اپنی کیفیت پر نظرثانی کرنی چاہیے۔ کیا ہم گزشتہ ۴۵ سال کی مدت میں ایک منصفانہ اور مساوات پر مبنی سماج کو وجود میں لا سکے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا ہمارے یہاں اونچی ذاتوں کا تسلط ہنوز قائم ہے؟ کیا آئین کا منشا اور حکومت کی بہت سی فلاحی اسکیمیں ملازمین حکومت کی بے بہری کا شکار ہو جاتی ہیں؟ کیا اس کا کوئی علاج نہیں؟ کیا وہ خلیج جو سرکار کے قول و فعل کے درمیان خندۂ دنداں نما بنی ہوئی ہے اسی طرح چوڑی ہوتی چلی جائے گی۔ کیا یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ ترقی یافتوں اور پسماندوں کو مقابلے کے میدان میں ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے تاکہ اول الذکر کی حرکت، تسلسل اور ان کی پیش آمد انھیں پسماندوں سے اور زیادہ آگے کر دے۔ کیا یہ سب کچھ کرکے ملک کا ضمیر مطمئن ہو سکتا ہے کہ مقابلے کی آزادی اور روزگار کے مواقع ہر ہندوستانی شہری کی دسترس میں ہیں؟ ایسا مقابلہ انصاف پر نہیں، انصاف دشمنی پر مبنی ہے۔ نابرابروں کے درمیان مقابلہ کیسا؟ منڈل کمیشن کی سفارشات منظور کی گئیں تاکہ پسماندوں کے لیے کچھ تلافیٔ مافات ہو سکے تو ایک ہنگامہ اور توڑ پھوڑ کا ایک مشن بپا ہو گیا۔ مسلمان پیچھے رہ گئے ہیں۔ اپنے ملک کے انتظام میں ان کا عمل دخل برائے نام ہے۔ پسپائی کی رفتار زور پکڑ رہی ہے۔ انھیں معیار بستہ ریزرویشن دینے ہوں گے تاکہ ترقی کی دوڑ میں وہ بھی حصہ لے سکیں۔ اس حادثے کے بعد اگر عادلانہ سماج قائم نہ ہوا اور اقلیتوں اور کمزوروں کی دستگیری نہ کی گئی تو عداوت، نفرت اور نفاق اسی طرح بنے رہیں گے بلکہ زور پکڑتے رہیں گے۔

یاد رکھیے اگر قوم، نظام اور انتظامیہ کے انصاف پر کسی ایک فرقے یا جماعت کو بھی اعتماد نہ ہوا تو فتنہ و فساد برابر سر اٹھاتے رہیں گے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انصاف کے بغیر کسی نظام کو ثبات نہیں ہوتی۔ انصاف کرنا اور اسے ثابت بھی کرنا حکومت اور معاشرے دونوں کا فرض ہے۔ ساری جماعتوں کو مل بیٹھ کر طے کرنا چاہیے کہ انصاف کو مسند پر کس طرح بٹھایا جائے گا، ہزار سالہ اور آزادی کے بعد کی ناانصافیوں کو دور کیوں کر کیا جائے گا۔ اکثریتی جماعت بے تاب ہوتے اپنے گرد طواف کرنے اور دوسروں کے جذبات اور ضروریات کو نظرانداز کرنے کے بجائے اقلیتوں کی تالیفِ قلب کس طرح کرے گی؟

تعلیم کا نصاب کسی قوم کی تشکیل اور اس کے نقطۂ نظر اور سمتِ سفر کے تعین میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے نفرت اور تنگ نظری اور بے بصری سے پاک ہو جانا چاہیے۔ اسے اس طرح ڈھالا جائے کہ اعلا اخلاقی اقدار بچپن سے طلبا کے ذہن نشین ہو جائیں اور وہ عالمگیر انسانیت کے مفادات و مصالح، عزائم اور منصوبوں سے روشناس ہو جائیں۔

ان سب امور کو نئی روشنی میں دیکھنا ہوگا ورنہ عداوت کا سارا کاروبار ہمارے پاؤں کی بیڑی بن جائے گا اور نصاب اور گھروں اور جلسوں اور اخباروں کے صفحوں میں بوئے ہوئے نفرت اور دشمنی کے بیج تباہی کے برگ و بار لائیں گے۔

یہ مضمون کل مکمل نہیں ہو پایا۔ آج یعنی ۸ دسمبر (۹۲ء) کی خبروں نے امید کی اس مشعل کو بجھا دیا جو تخریب کی راکھ سے تعمیر کو اٹھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں نے مندروں کو جلانا شروع کر دیا اور ہندوؤں پر حملے بھی ہونے لگے۔ لندن میں ایک مندر کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اب یہ آگ برصغیر کے تینوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ شری اڈوانی، شری جوشی اور شری سنگھل بھی آج گرفتار کر لیے گئے۔ پوچھے گئے سوال کا جواب شری اڈوانی نے جس انداز سے دیا اس میں پشیمانی ذرّہ بھر بھی نہ تھی بلکہ سرکشی کے تیور نمایاں تھے۔ انھوں نے ساری خرابی کا ذمہ دار سرکار کو ٹھہرایا۔

سرکار نے کل جو فیصلے کیے تھے شاید وہ انھیں عمل میں نہ لا سکے۔ مسجد کی تعمیر تو اب دشوار نظر آتی ہے۔ آج کی خبر یہ ہے کہ کارسیوکوں نے میدانِ کارزار چھوڑنے سے پہلے مسجد کی جگہ چبوترہ بنا کر اس پر مورتی استھاپت کر دی تھی۔ پیرا ملٹری فورسز کے بعض جوانوں نے اس چبوترے کو سجا دیا اور مورتی کی پوجا کی۔ اب مورتی کو وہاں سے کون ہٹائے گا؟

لوگ پوچھ رہے ہیں کہ کارسیوکوں کو اس کام کی مہلت دی ہی کیوں گئی۔ انھیں مرکزی حکومت کی نیت پر شبہ ہے۔ انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اربابِ اختیار کی کمزوری اور فیصلہ

ہونے میں تاخیر اور کوتاہی کا ہے۔ ہماری تردد و پیش اور تذبذب کا شکار مرکزی حکومت ابھی یہ سوچ رہی ہے کہ مسجد کس ادارے کے ذریعے بنوائی جائے۔ جب تک وہ کسی فیصلے کو پہنچے گی ملک میں ایک بڑی مہم چلا جا اور وشو ہندو پریشد مسجد کی تعمیر کے خلاف خروج کر دیں گی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بابری مسجد کے شہید ہونے کا جو ردعمل ہوا اور ہندوؤں کی جس طرح بے عزتی کی گئی یا بے عزتی کی کوشش ہوئی اور کئی مندر نذر آتش کیے گئے اس نے معاملے کو اور الجھا دیا ہے اور اس وقت عام بدگمانی اور باہمی عداوت کے ماحول میں اس گتھی کو سلجھانا ممکن نظر نہیں آتا۔

اس مضمون میں مسلم قیادت کے ہوش و گوش کی تعریف کی گئی تھی کہ اس نے عوام کو ضبط کی تلقین کی۔ اب ایسا لگتا ہے کہ عوام تک یا تو یہ پیغام پہنچا ہی نہیں یا وہ تنگ آ کر جنگ پر آمادہ ہو گئے ہیں اور اب وہ اپنے رہنماؤں کی بات نہیں سنیں گے۔ یہ بات پُرخطر ہے۔ اچھا ہوتا اگر مسلم رہنما دوردرشن اور آکاش وانی پر مسلم عوام سے مخاطب ہوئے ہوتے اور انہیں ضبط کی تاکید کرتے۔ یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلم رہنما عوام سے کٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اور عوام کے درمیان وہ زندہ رابطہ ہے ہی نہیں جو خدمت اور خیر اندیشی اور فلاحی اور ارتقائی کاموں کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ رابطہ قائم نہ ہوا تو پھر عوام انتشار سے دوچار رہیں گے۔ تنظیم کے کام میں تاخیر بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حالات اب کیا کروٹ لیں گے۔ ایسے میں منظم، متحد اور باخبر اور متحرک رہنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

آگ ٹھنڈی جب ہی ہو گی جب انتقام کے چکر کو توڑا جائے۔ ہمارے مسلم رہنماؤں کو پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرنی چاہیے کہ "خدارا" اس بنا پر کہ ہندوستان میں بابری مسجد شہید کر دی گئی ہے اپنے یہاں نہ مندروں کو نقصان پہنچائیے نہ ایسے بے گناہ ہندو شہریوں پر حملے کیجیے۔ ان معصوم انسانوں کا کیا قصور ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ اس طرح بدلہ لیں گے تو ہندوستان میں اس وقت جو ہمدردی مظلوم مسلمانوں کے ساتھ عام طور پر پیدا ہوئی ہے اسے عداوت میں بدلتے دیر نہیں لگے گی۔ اپنے ملک کے ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کیجیے۔ اگر بی بی سی نیوز سروس سے درخواست کی جائے تو شاید وہ خوشی سے ہمارے دو ایک معروف مسلم رہنماؤں کو پاکستان اور بنگلہ دیش اور انگلستان کے مسلمانوں سے خطاب کرنے کا موقع دے دے۔

اس مضمون کے آخر میں راقم سطور اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرے گا۔ اس نے آج سے تقریباً سال بھر پہلے تک مسلم قیادت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "ہم ان کے رہنماؤں کے ساتھ بات کریں اور ان سے پوچھیں کہ وہ مسلمانوں سے چاہتے کیا ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح مفاہمت کے باب وا ہو جائیں"۔ لیکن اب پتہ چلا ہے کہ اس کا مشورہ خوش فہمی پر مبنی اور غلط تھا۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے دوردرشن پر اہل ہند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بی جے پی اور وشو ہندو پریشد نے ملک کو دھوکا دیا ہے اس کے ساتھ عہد شکنی کی ہے۔ جو جماعت اپنے قول سے پھر جائے جس کے نزدیک حصول مقصد کے لیے ہر طرح کے ذرائع کا استعمال کرنا جائز ہو، جو نہ اپنے پیمان کا پاس کرے نہ عدالت کے احکام کی تعمیل۔ بظاہر اس سے بات کر کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ فسطائی طریق کار کی ایک نشانی ہے۔ فسطائی طاقتیں جمہوری روایات اور اخلاقی اقدار کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ وہ کبھی اپنے مقصد کی راہ میں ایک پل کے لیے بھی حائل نہیں ہونے دیتیں۔ بجاپا نے طے کر لیا ہے کہ وہ ہندوستان میں ہندو راج استھاپت کرے گی۔ ایسا کرنے کے لیے وہ کبھی رکے گی نہیں۔ انصاف کے تقاضے اور جمہوریت کے آداب اس کے سدراہ نہیں بن پائیں گے۔ جس پارٹی کا سیاسی فلسفہ کدورت، عداوت اور تنگ نظری سے عبارت ہو، وہ رواداری اور انصاف کی بات سنے گی ہی کیوں؟ لیکن ہم پھر بھی اتنا کہیں گے کہ موقع پڑے تو اس سے گفتگو ضرور کی جا سکتی ہے۔ اس کے عہد و پیمان پر اعتبار کیے بغیر۔ ممکن ہے کہ خود اس کے مصالح اسے کسی وقت ہماری بات پر غور کرنے کے لیے مجبور کریں۔ حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں، لائحہ عمل اور نقطۂ نظر ابھی مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ضرورت ہے عزم و احتیاط اور نظم و ضبط کی، عوام سے روابط استوار کرنے کی، انہیں اشتعال کے خلاف آگاہ کرنے کی، انہیں خاموشی، سنجیدگی اور صلح کوشی کے ساتھ اپنی اپنی بستیوں میں دفاع کے لیے تیاری کی۔ اتنا ہی اہم ہے سیکولر اور انصاف پسند سیاسی پارٹیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے قدرتی یار و مددگار، ہمدرد ساری اقلیتیں، درج فہرست ذاتیں، قبیلے اور دوسرے پسماندہ اور کمزور طبقات ہیں۔ ان کے ساتھ عہد وفا باندھنا چاہیے۔ الغرض ہمارے رہنماؤں کو نئے پس منظر میں ان سارے مسائل پر غور کرنا اور مسلمانوں کی حفاظت کرنا، ملک کے استحکام اور فلاح و ترقی کی کوشش کرنا ہوگا۔

بہرحال مسلمانوں کو ضعیفی کے جرم اور بدنظمی کے گناہ کی سزا مل گئی۔ وہ ملنا ہی تھی اور غافل رہیں وہ اپنے مفادات اور مصالح سے اور جھگڑتے رہیں وہ اسی طرح بے مصرف اور نااہم باتوں پر اور بے خبر رہیں وہ بدخواہوں کی چالوں اور ارادوں سے۔

مسلمانوں کے خیرخواہ ان کی تالیفِ قلب کے لیے اور اربابِ اختیار کھسیانا پن مٹانے اور عالمی رسوائی کے داغ کو دھونے کے لیے اعلان کر رہے ہیں کہ بابری مسجد نئے سرے سے تعمیر کرائی جائے گی۔ یہ کوئی بھی نہیں بتاتا کہاں اور کب اور کس وضع پر۔ تعمیرِ نو کا مفہوم تو یہ ہوا کہ جس جگہ اسے توڑا گیا ٹھیک وہیں بنائی جائے گی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا مرکزی حکومت کی کچھ اجال نے اس جگہ جو چبوترہ بنوا دیا اور جو مورتی وہاں رکھوا دی۔ کیا اس کا ارادہ ایک کو تڑوانے اور دوسری کو ہٹوانے کا ہے۔ کیا اس بے ریڑھ حکومت میں اتنا دم ہے کہ وہ ایسا کر سکے۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ سرکار کے پھیپھڑوں میں آکسیجن بھر دی گئی اور اس نے یہ فیصلہ کر بھی لیا تو بھی کیا اس طرح ملک گیر فتنہ و فساد کا ایک نیا دروازہ نہ کھل جائے گا؟ کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے بھی سنائی دیے کہ انہدام کے اثرات کو مٹانے کے لیے اور سابقہ کیفیت کو بحال کرنے کے لیے مسجد اسی جگہ پر بنے گی اور جب وہ بن جائے گی تو اس میں مورتی اسی طرح سے رکھ دی جائے گی جیسے وہ انہدام سے پہلے رکھی ہوئی تھی۔ سبحان اللہ! قیامتِ رفتہ کو آواز دینے کی اس سے انوکھی مثال عمل درکنار تخیل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ مسلمان ایک بل سے کتنی بار ڈسا جائے گا۔ اگر ایسا کیا گیا تو بھارت اس طویل اور الم ناک جھگڑے کا ری پلے دیکھے گا جس کی نمائش کی ذمے دار ایک بار پھر بھارت سرکار ہوگی۔ تکنیکی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو "ری پلے" میں کیا مضائقہ ہے۔ ریہرسل تو پہلے ہی (۵ دسمبر کو قریب ہی ایک جگہ پر) کارسیوکوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کیا تھا اور بھارت سرکار کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ لوگ اب بھی اس کی سلامتیِ ہوش و حواس کی بات کرتے ہیں۔ حکومت کا ایوان ایک ستون پر کھڑا ہے اور یہاں یہ ستون سرے سے غائب۔

ایک تجویز یہ بھی سننے میں آرہی ہے کہ مسجد قریب ہی کسی دوسری جگہ بنا دی جائے۔ تنگ باشی کی یہ نئی ترکیب نکالی گئی۔ کیا اس پرانی تجویز کو مسلمان اب اس لیے قبول کرلیں گے کہ اس اثنا میں وہ خاک و خون اور دھواں و آتش سے گزر چکے ہیں:

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

ہمدردوں اور بے دردوں سے مسلمان یہی کہیں گے کہ خدارا اب ان کے زخموں کو نہ کریدیں، مسجد بنانا چاہیں بنائیں، نہ بنانا چاہیں نہ بنائیں۔ بنانا چاہیں تو جس جگہ بنانا چاہیں بنا ڈالیں۔ مسلمان بھر پائے انھیں اب اس قضیہ میں نہ الجھائیں۔ ان کے زخموں کو نہ کریدیں۔ ہماری جمہوریت میں اقلیت ہونا سب سے بڑا پاپ ہے۔ اس پاپ کی سزا انھیں کب تک دی جائے گی، سزا کی بھی تو کوئی میعاد ہوتی ہے۔ جس عداوت اور نفرت کے چہرے سے نقاب اس تزک و احتشام کے ساتھ اٹھا دیا گیا اب وہ سات پردوں کے پیچھے چلی جائے تو بھی نگاہوں کو دھوکا نہ دے سکے گی۔ وہ کروڑوں کدورت پیشہ دل جنھیں گھٹا ٹوپ اندھیروں نے گھیر لیا ہے روشنی کی کرنوں کو آئندہ برداشت کیسے کر سکیں گے۔ بابری مسجد کی شہادت سے مظلوموں کے دل ٹوٹ گئے۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ کیونکہ دل زندہ ہو تو حوصلہ اور اعتماد کا انحصار ہوتا ہے۔ ہمارے آنسو نہ بجھ جاتے۔ جہاں دل ٹوٹے ہیں وہاں آنکھیں کھل جاتیں! وہ دوست اور دشمن، عارضی اور دائمی، حقیقی اور سیاسی میں فرق کرنے لگے۔

آپ نے دیکھا جہاں ایک کے علاوہ ساری سیاسی پارٹیاں مسجد کی حفاظت کے حق میں تھیں اور زیادہ تر اہلِ علم و دانش ان کے ہم نوا تھے۔ وہاں پھر بھی مسجد محفوظ نہ رہ سکی۔ اس سے نتیجہ کیا نکلا۔ یہ پارٹیاں اور یہ اہلِ دانش عوام کی اکثریت کے ترجمان نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو یہ سانحہ نہ ہوتا۔ ہمیں ہندو عوام کے پاس جانا پڑے گا۔ ابھی نہیں کہ اس وقت اس کا غلط مفہوم نکالا جائے گا۔ جب نفرت کی آگ ٹھنڈی ہونے لگے تو ہمیں ان کے سامنے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کرکے رکھنا ہوگا۔ فاصلے سے بدگمانیاں دن دونی رات چوگنی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ کیوں نہ ہم عہد کرلیں کہ ہم فاصلے کو حائل نہ ہونے دیں گے لیکن "ہم" سے مراد کیا ہے۔ ہماری نمائندگی کون انجام دے گا۔ ہماری طرف سے عہد کون کرے گا، جہاں تنظیم نہ ہو، اتحاد نہ ہو، اعتماد نہ ہو وہاں ترجمانی کون کرسکتا ہے۔ وہاں اہلِ وطن ہماری بات کیوں سننے لگے جنھیں وہ حقارت سے دیکھتے ہیں ان کی بات کو وہ وزن کیوں دینے لگے۔

بہرحال اگر ہمیں زندہ رہنا ہے، عزتِ نفس کے ساتھ، سر اٹھا کر، سینہ تان کر، بالادستی کے ساتھ تو ہمیں اپنا گھر پہلے درست کرنا پڑے گا۔ جس گھر سے آئے دن جھگڑے، مار پیٹ

اور الزام و دشنام کی صدائیں آتی ہوں۔ ہمسایے اس گھر کے مکینوں کو منہ نہیں لگاتے۔ اب ہم سے یہ اطمینان چھین لیا گیا ہے کہ سیکولر جمہوریت میں اُن تمام حادثوں سے قطع نظر ہم امن و چین سے رہ پائیں گے۔ اب تو ہمیں نگرانی، چوکسی اور نگہبانی کا طریقہ اپنانا پڑے گا۔ غیر محفوظ گھات میں ہو تو ایک لمحے کی غفلت گھاتک بن جاتی ہے۔ ہم کسی کو غیر نہیں سمجھتے تاوقتیکہ وہ اپنے برتاؤ سے یہ ثابت نہ کر دے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ایک ادارہ بھی ہم ڈھنگ سے نہیں چلا پاتے۔ ہمارے اداروں اور انجمنوں میں خانہ جنگی کا سا سماں رہتا ہے۔ ہم کو مسلمانوں کے حقوق اور ان کے فرائض کا احساس ہے لیکن اسی وقت تک جب تک ہم خود کو مستثنیٰ کر دیں۔ ہم اپنی ذات کو ملت کے مفاد سے بالاتر نہیں بالاتر سمجھتے ہیں۔ مسلکوں کی لڑائیاں ہم میں ہوتی ہیں، عیب اور بہتان کا کاروبار ہمارے ہاتھوں فروغ پاتا ہے۔ جہالت ہماری ترقی کی راہ بن گئی ہے۔ وقت ضائع کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر ہم ترقی کریں تو کیوں کر۔

وقت آگیا ہے کہ ہمارے بڑے مل بیٹھیں اور باہمی مشورے کے بعد سمتِ نظر اور سمتِ سفر دونوں متعین کر دیں۔ اقلیت کی صورتِ حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ اکثریت سے بہت زیادہ محنت کر کے مہارت، فضیلت اور امتیاز حاصل کرے۔ ہندوستان میں جہاں اکثریت اقلیتوں اور پسماندوں کے استحصال کو ایک فنِ لطیف کی طرح برتتی چلی آئی ہے، اس بات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اکثریت کے ایک طبقے نے اس وقت کھل کر جو حملہ ہم پر کیا ہے اس میں سے ہم اسے یہ جتلانا مقصود بھی ہو، ہمیں خطرے کا پہلی بار پیہم احساس ہو جائے اور ہم اس کے لیے ڈھال وضع کر لیں۔

اس اثنا میں ہمارے وزیر اعظم نے اپنے اعلان کے ایفا کی کوشش کی ہے۔ پارٹیوں پر جو قدغن لگائی ہے، اس میں سے نکلنے کے لیے چور دروازے بہت ہیں، خصوصاً ایسی پارٹیوں کے لیے جو تنظیم کی لڑی میں پروئی ہوئی ہوں اور ایسی حکومت کے زیرِ سایہ جو خوش خرام اور نرم لگام اور کمزور ہو۔ یہ بات البتہ انوکھی ہے کہ جب کوئی تادیبی کارروائی کی جاتی ہے تو مسلمانوں کو ان کا حق حصہ امید سے کچھ زیادہ ہی ملتا ہے چنانچہ ہندوؤں کی تین پارٹیوں کو ممنوع قرار دیا گیا تو مسلمانوں کی دو پارٹیوں کو بھی زیرِ قدغن لے آئی۔ اسلامک سیوک سنگھ کو بند کرنے کا تو جواز تھا لیکن جماعت اسلامی نے کیا قصور کیا تھا۔ تعمیرِ اخلاق، رہنمائی اور راحت رسانی کے علاوہ یہ بیچارے کرتے ہی کیا ہیں۔ آخر اڑیسہ میں سائیکلون آیا تو جماعت نے بغیر امتیازِ مذہب راحت رسانی کا کام بڑی جاں فشانی اور سلیقے سے انجام دیا جس کا اعتراف متعلقہ حکام نے بھی کیا۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ایک پاکستانی اور ایک کشمیری انجمن کے ہم نام ہیں اور ان انجمنوں کا طرزِ عمل جارحانہ رہا ہے۔ یہ فیصلہ نظرثانی کا مستحق ہے۔

جو کام فوراً انجام دینا ہے وہ ہے ریلیف یا راحت رسانی کا کام۔ یہ کام بھی تنظیم چاہتا ہے۔ پھر مظلوموں کی فریاد سننا، ان کی بات اہلِ اقتدار تک پہنچانا، ان کی دادرسی کرنا، ان کے زخموں پر پھاہے رکھنا۔ پولیس اور آرمڈ پولیس کی زیادتیوں کو دستاویزی روپ میں پیش کرنا۔ اب کے تو فسادات ملک گیر ہو گئے ورنہ کچھ شہر ایسے ہیں جو ہر وقت فساد آمادہ رہتے ہیں۔ وہاں بلوؤں سے نبرد آزما ہونے کے لیے منصوبے تیار رہنے چاہییں۔ اگر فسادات ہمارا مقدر بن گئے ہیں تو ہمیں اپنے مقدر کا پاس رکھنا چاہیے۔ ہمت اور تنظیم کے ساتھ مقسوم کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ دوستی اور محبت کا ہاتھ ہم ضرور بڑھائیں لیکن ہر بار احتیاط کے ساتھ، اعتماد کے ساتھ اور طاقت کے ساتھ۔ رفاقت، دوستی، سخاوت، فراخ دلی بجا اور برحق، لیکن سپر اندازی، نیاز مندی، سرنگونی بے جا اور باطل۔ مظلوموں کی مدد اس طرح کیجیے کہ جو لوگ آگے آجائیں وہ زیادہ پا جائیں اور جن لوگوں کی غیرت اور تامل انھیں آگے نہ بڑھنے دے وہ محروم رہ جائیں۔ ریلیف یا راحت رسانی کے کام میں جو مجلس ماتم بپا کیا جا رہا ہے بڑھنے کا سا سماں نہ ہونا چاہیے ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یہ بھی نہ ہو کہ بعض ظلم رسیدوں پر بیک وقت کئی امدادی انجمنوں کی نظرِ التفات پڑے اور دوسروں تک کوئی پہنچنے نہ پائے۔ مناسب ڈھنگ تو یہ ہوگا کہ ہر آفت زدہ شہر میں تقسیم کا کام صرف ایک ایجنسی یا ادارہ کرے۔ یہ اعلان کرنا اس کی اخلاقی اور ضابطے کی ذمہ داری ہوگی کہ ان اداروں، انجمنوں یا ایجنسیوں کے ناموں کا شہر کے اچھے یا کھلے میں اعلان کر دے جنھوں نے وہاں کے لیے روپیا اور اشیاء فراہم کی ہیں اور فراہمی کی مقدار بھی کھول کر بیان کر دی جائے۔ مسلمان جن میں غیرتِ ملی اور انسانی ہمدردی زندہ ہے ایسے موقعوں پر دل کھول کر مدد کرتے ہیں۔ جب تک برباد شدہ لوگ نئے سرے سے آباد نہیں ہوتے ان کے لیے کھانے بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں بھی تامل اور احتیاط ضروری ہے تاکہ رزق ضائع نہ ہو۔

امداد کی رقوم کا ایک اچھا مصرف بازآبادکاری ہے

مکان پھر سے بنائے جائیں۔ مکانوں اور دکانوں میں سامانِ رہائش اور سامانِ تجارت پہنچایا جائے۔ زخمیوں کا علاج اور بیواؤں اور یتیموں کے لیے پرورش کا مستقل انتظام، یہ سب خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ ان کے لیے معقول اقدامات ضروری ہیں۔ یتیم بچوں کی تعلیم کو راحت رسانی کے کام میں ترجیح دینی چاہیے۔

اگر ایک محلے میں ہندو اور مسلمان دونوں مجروح ہوئے ہیں تو ہماری ریلیف پارٹیوں کو امداد کرتے ہوئے مذہب کی بنا پر کوئی امتیاز نہ کرنا چاہیے۔ ہمارے دل انسانیت اور انصاف کا جو خون ہوا ہے، اس پر دکھے ہیں۔ علاوہ بریں ہمیں جلے ہوئے مکانوں کی راکھ سے ایک ایسی عمارت کو تعمیر کرنا ہے جو بھید بھاؤ سے بالاتر ہو۔

تازہ ترین اطلاعات بتا رہی ہیں کہ شہید صرف بابری مسجد کو نہیں کیا گیا۔ دیپ آشیش مکرجی نے ۶؍ دسمبر کو جو کچھ دیکھا اس کی رپورٹ انھوں نے ایودھیا سے روانہ کی۔ اس کا ترجمہ قومی آواز نے ۱۵؍ دسمبر کے شمارے میں شائع کیا ہے اس کو پڑھ کر آنکھیں اور کھل گئیں۔ ایودھیا کی دوسری مسجدیں بھی نذرِ آتش کر دی گئیں اور چن چن کر مسلمانوں کے مکان جس کی آبادی پانچ ہزار تھی جلا دیے گئے۔ ترلیتی بلکہ سادھوی اوما بھارتی نے اس وقت جو تقریر کی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آتش زنی اور قتل و غارت گری کی یہ ساری کارروائی سوچے سمجھے منصوبے کے تابع تھی۔ کیا ایودھیا کی دوسری مسجدیں بھی، جن کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے، رام جنم بھومی۔ مندروں کو توڑ کر بنائی گئی تھیں؟ اسی رپورٹ میں

> "ہم کو عدم تشدد پر پوری طرح عمل کرنا چاہیے لیکن بے بسی کے ساتھ نہیں۔ علی برادران نے جو وفادار سپاہیوں کے فرض کے بارے میں بتلایا ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور قید خانے کی دعوت دینا چاہیے۔ ہم کو یہ نہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے بہترین آدمیوں کے بغیر تحریک جاری نہیں رہ سکتی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم سوراج کے قابل نہیں ہیں اور نہ خلافت کے اور پنجاب کے ساتھ جو مظالم ہوئے ہیں ان کا مداوا کر سکتے ہیں۔"
>
> مہاتما گاندھی

ایک اور حادثہ کا ذکر بھی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بھاجپا اقتدار میں آگئی، اگر اس نے زمامِ اقتدار ہاتھوں میں لے لی تو وہ مسلمانوں سے کیا مطالبہ کرے گی، کیا چاہے گی۔ بھاجپا کا رکن بن جانا اس کے سیاسی مسلک کا اتباع کرنا یا اس کی قصیدہ سرائی کرنا کافی نہیں ہوگا ——

اس کی مانگ صرف یہ ہوگی کہ اپنی شناخت بھول جاؤ، اپنے مذہب کو ترک کر دو اور ہندوتوا کے رنگ میں خود کو رنگ لو۔ ورنہ تم پر جو بیتے گی اس کے ذمہ دار تم ہی ہوگے۔ قارئین حسن حیدر پر جو بیتی اس سے اندازہ لگائیں۔ دیپ آشیش لکھتے ہیں:

> "یہ حسن حیدر بھی ایودھیا میں بڑی آراضی کے مالکوں میں شامل ہیں، ہندوؤں سے ان کے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی آراضیوں پر بہت سے بے گھر ہندوؤں کو آباد کیا ہے۔ ایک شخص نے یہ بھی بتایا کہ مسٹر حسن حیدر بھارتیہ جنتا پارٹی ایودھیا کے صدر بھی تھے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہیں کسی بھی طرح کا تحفظ حاصل کرنے سے (انھوں نے) انکار کر دیا تھا لیکن آج صبح کارسیوکوں کے ایک جتھے نے ان کے گھر میں گھس کر لاٹھیوں سے ان کی پٹائی کر کے اس حال کو پہنچا دیا... حاجی محبوب نے اپنے ہی علاقے کے چھ افراد کے نام بتائے جنھیں ۶؍ دسمبر کی شام کو **تباہ اور تاراج کرنے والے ہجوموں نے ہلاک کر دیا تھا۔"**

ایک سو آدمیوں نے تھانے میں پناہ لی تھی۔۔۔ ہر چند کہ ایودھیا کے مسلمانوں کے تعلقات مقامی ہندوؤں سے بہت اچھے تھے۔ مسلمانوں کے مکانوں کی نشاندہی تو مقامی ہندوؤں نے ہی کی ہوگی۔

آج (۱۶؍ دسمبر) کی اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرکزی سرکار نے اب مضبوط قدم اٹھانے کی ٹھان لی ہے۔ تینوں بچی ہوئی ریاستوں کی بھاجپائی حکومتوں کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ سیکولر پارٹیوں اور خود کانگریس کے سیکولر عناصر کا دباؤ اکارت نہیں ہوا۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ سیکولر عناصر کی مدد کریں اور سارے صحت مند اقدامات میں حکومت کا ساتھ دیں۔ تھوڑی دیر کے لیے

ہم بھول جائیں کہ حکومت نے کیا نہیں کیا۔ اس وقت دھیان صرف اس طرف دیں کہ سرکار کیا کرنے جا رہی ہے۔ اس کا ہاتھ بٹائیں۔ اس نے جو غلطیاں کیں اس کی مذمت نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہمارے روشن خیال ہندو بھائیوں نے کر لی۔ اب وہ بعد از خرابی بسیار راہ راست پر آگئی ہے۔ ہمیں اس کی منزل کو آسان کرنا چاہیے۔ اس گئی گزری حالت میں بھی ہندوستان میں ایسے ہندو نظر آتے ہیں جو بھیڑ بھاڑ سے بہت اوپر اٹھ کر انسان دوستی، مسلمان پسندی اور وطن پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

انھیں جزائے خیر دے اور ان کے ہاتھوں اور ارادوں کو مضبوط کرے۔ اسٹیٹسمین میں حال ہی میں دو لڑکیوں وندنا دیکشت اور پونم کا ۱۲ دسمبر کا خط اڈیٹر کے نام چھپا ہے

اڈیٹر نے سرخی دی ہے کہ

"ہندوستان کے مستقبل کی آواز سنیے"

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل کے بعض بچے اور بچیاں تعصب کے زہر سے بفضلہ تعالیٰ محفوظ ہیں۔ وہ ایک ایسے بھارت کے خواب دیکھ رہے ہیں جو نفرت اور عداوت سے پاک ہو۔ نئی نسل کے ایسے نونہالوں سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں لیکن ہمیں بھول کر بھی مستقبل کی طرف سے مطمئن نہ ہونا چاہیے ہندوستان اگر بے تعصب اور روشن خیال اور سلامت رو اور انسان دوست رہتا ہے تو اس میں فائدہ سب سے زیادہ مسلمانوں کا ہے۔ اسی لیے ایسے بھارت کی تعمیر میں ان کا یوگ دان بھی سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔

"تہذیب الاخلاق" فروری ۹۳ء

مولانا محمد رئیس ندوی

ہندو مذہب کے اصول، مصلحین کے اقدامات اور تاریخی شواہد سے

اجودھیا میں

رام مندر کے وجود کی تردید

ایک مشہور ہندو محقق چیدانند داس گپتا نے کہا:

" ویدوں اور دسرتھ جاتکا میں لکھا ہے کہ شری رام چندر جی اور ان کے باپ مہاراجہ دسرتھ بنارس کے راجہ تھے۔ شری رام چندر، سیتا اور لچھمن کے قصے جس بالمیکی رامائن میں مذکور ہیں اس میں مہاتما بدھ (بدھ مذہب کے بانی) کا ذکر ہے، اس زمانہ میں کوشل سلطنت کی راجدھانی کا نام ایودھیا نہیں بلکہ سروستی تھا جو ایودھیا سے مختلف دوسرا شہر تھا اور بالمیکی رامائن میں اس سلطنت کا نام کوشل بتلایا گیا ہے جس پر شری رام چندر جی اور ان کے باپ دسرتھ راج کرتے تھے۔"

(ملخص از السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا مورخہ ۱۵ ارتا ۲۱ رجون ۱۹۸۶ء وہندوستان کا شاندار ماضی از اے، ایل باشم ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ء ص ۶۷/۶۸ و بابری مسجد تاریخی پس منظر از سید صباح الدین ۱۹۸۶ء اعظم گڈھ ص ۱۵۴ تا ص ۱۵۶)

ایک دوسرے ہندو محقق ڈاکٹر آر، ایل شکلا لکھتے ہیں کہ:

" شری رام چندر اور سیتا و لچھمن کی پوری کہانی جس رامائن بالمیکی میں مذکور ہے وہ شروع میں چھ ہزار اشلوک پر مشتمل تھی پھر بذریعہ الحاق و اضافہ بعد میں ایک زمانہ کے بعد اسے بارہ ہزار اشلوک پر مشتمل بنایا گیا پھر اس میں بتدریج ترقی ہوتے ہوتے چوبیس ۲۴ ہزار اشلوک ہو گئے، رامائن والی کوشل سلطنت کی راجدھانی سرجو ندی کے ساحل سے ساڑھے تیرہ میل دور واقع تھی جب کہ موجودہ ایودھیا سرجو کے بالکل ساحل پر ہے۔ رامائن میں مذکور ہے کہ سرجو ندی پچھم کی جانب بہتی ہے جب کہ آج کل یہ ندی مشرق کی جانب بہتی ہے۔" (ایشنگ سنواد ماہ نومبر ۱۹۸۴ء ص ۱۲/۱۳ و رام کی نگری سچ یا جھوٹ از ڈاکٹر آر، ایل شکلا و بابری مسجد ایودھیا حقائق اور افسانے از مولانا حبیب الرحمن قاسمی ص ۱۴/۱۵)

ایک تیسرے ہندو محقق ڈاکٹر ایس، آر پٹیل ضلع منتری ارجک سنگھ وارانسی نے لکھا کہ:

" موجودہ اجودھیا کو رام چندر جی کا جنم استھان اور دار السلطنت کہنا بالکل افسانوی اور من گھڑت

بات ہے بلکہ رام اور ان سے متعلق ایودھیا کی کہانی بھی افسانوی وفرضی ہے۔" (روزنامہ سونتر بھارت وارانسی بابت ۳۰ ردسمبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۶ بعنوان چھٹی تپری رام کی سیتا کو چنوتی)

ایک چوتھے ہندو لیڈر پنڈت لوک پتی ترپاٹھی بنارس نے کہا کہ:

"شری رام چندر جی کے زمانہ والا ایودھیا دریائے سرجو و گھاگھرا میں ڈوب کر بہت زمانہ پہلے ختم ہو گیا تھا موجودہ ایودھیا اودھ کے نوابوں کا آباد کردہ ہے۔" (بابری مسجد از صباح الدین صفحہ ۳/۴ مقدمہ)

جس ایودھیا میں بابری مسجد موجود ہے اسی ایودھیا کے ایک مندر دنت کنٹھ مندر کو بابر شاہ نے پانچ سو بیگھہ زمین بطور عطیہ دے رکھی ہے اس کے کاغذات اب بھی اس مندر کے مہنت کے پاس موجود ہیں۔ (ہفت روزہ نئی دنیا دہلی ۲۵ رنومبر تا یکم دسمبر ۱۹۸۶ء)۔

فسانہ عبرت نامی کتاب مصنفہ رجب علی سرور میں مذکور ہے کہ بابری مسجد ۹۲۳ھ میں باہتمام سید میر عاشق بنی (۲۳) اس کا مطلب یہ ہوا کہ تخت دہلی پر بابری قبضہ سے دو سال پہلے یہ مسجد شاہ سکندر کے دورِ حکومت میں بنی تھی بلکہ ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ سید میر عاشق نے ۹۲۳ھ میں صرف تجدید تعمیر کی تھی ورنہ اس سے پہلے بھی یہ مسجد موجود تھی جس پر تفصیلی بحث ہماری زیر تصنیف کتاب میں ملے گی۔

اس زمانے میں ہندوستان پر سکندر لودھی بن بہلول لودھی سلطان عادل نظام خاں کی حکومت تھی۔ وہ ۹۰۶ھ میں سادہلی کے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا اور ۹۲۳ھ تک حکمراں رہا وہ بابر سے کہیں زیادہ دیندار و اولوالعزم اور بہادر و وسیع اختیارات والا بادشاہ تھا اس کے زمانے میں جلال شاہ و موسی عاشقان موجود تھے آخر ان دونوں حضرات کو ایودھیا کا رام مندر توڑنا اور اس کی جگہ مسجد کی تعمیر کرانا اگر مقصود تھا تو انہوں نے اس دیندار و اولوالعزم بادشاہ سکندر لودھی سے کہہ کر یہ کام کیوں نہیں کرالیا؟ اور ہندوستان میں بابر کے فاتح بن کر آنے کا انتظار کرتے رہے؟ بلکہ سکندر لودھی سے بھی پہلے کسی مسلم حکمراں کے ذریعہ یہ کام کرالینا چاہئے تھا۔

اور البتہ انگریزوں کی پلاننگ کے مطابق ۱۸۵۵ء میں ان لوگوں نے بابری مسجد کے علاوہ ایودھیا کی بعض مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کر دینے والی اپنی شرانگیز مہم اور نہایت غیر معتدل نیز فتنہ و شورش کے زمانہ میں جولائی اگست ۱۸۵۵ء میں بابری مسجد کی بھی بے حرمتی کی پھر بعد میں ترقی کر کے مزید شرارت کی، مسجد کے اندر و باہر شیطنت کا مظاہرہ کیا اور انتہائی درجہ کی بدعنوانی کرتے ہوئے بابری مسجد سے باہر ایک معمولی اونچائی والا چبوترہ اکیس فٹ لمبا اور سترہ فٹ چوڑا بنا کر اس پر صرف ایک بالشت لمبا اور چوڑا و اونچا مندر نصب کر کے پوجا پاٹ شروع کر دی اس شرانگیزی و شرارت کے خلاف اس شرانگیزی کو شرارت ابھارنے والے انگریزوں ہی کی عدالت میں مجبور و مقہور و مغلوب مسلمانان ایودھیا ہی کی طرف سے ۳۰ رنومبر ۱۸۵۸ء کو بابری مسجد کے امام و خطیب مولانا محمد اصغر صاحب نے چارہ جوئی کے لئے اسی طرح سے درخواست دی، جس طرح اگست ۱۹۴۷ء میں انگریزی اقتدار کے بعد ہندو اقتدار بنام کانگریسی اقتدار قائم ہونے کے بعد سے مسلمان اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے خلاف ناکام چارہ جوئی کے لئے کانگریسی حکومت اور اس کی قائم کردہ عدالتوں کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں مگر نہ انھیں انگریزی دور میں داد مل سکی نہ کانگریسی دور

بیں ہی۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً۔ ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو انگریزی سرکار کی بارگاہ میں بابری مسجد کے امام و خطیب مولانا محمد اصغر صاحب نے جو درخواست تحریر کی تھی اس کا حاصل معنی یہ ہے کہ:

" انگریزی حکومت کے ایک سرکاری ملازم بیگ سنگھ نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر بابری مسجد کے اندر منبر و محراب کے پاس سوا گز کا ایک چبوترہ بنا کر اس پر بت نصب کر دیا اور چبوترہ کے پاس ہی ایک گڈھا کھود کر آگ جلا کر اس میں ہون اور پوجا پاٹ شروع کر دیا، مسجد سے باہر والے میدان میں جس مقام کو ہندو لوگ رام جنم بھومی کہتے ہیں وہ زمین صدہا سال سے خالی پڑی تھی اس پر بلوہ کے بعد (یعنی جولائی ۱۸۵۵ء والے بلوہ جو بابری مسجد کے علاوہ بعض دوسری مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کرنے کے لئے ہندوؤں کی طرف سے انگریزی سازش کے مطابق کیا گیا تھا)۔ ایودھیا کے تھانے دار نبی غلام (یہ نام کا مسلمان آج کے زمانے کے سکندر بخت نائب صدر بھاجپا دعباس نقوی جیسا تھا) کی سازش سے اس خالی میدان میں ہندوؤں نے راتوں رات ایک بالشت اونچائی والا جو چبوترہ رام جنم استھان یا رام جنم بھومی کے نام سے تیار کیا تھا اس وقت مسلمانوں کی دادطلبی پر انگریز سرکار نے تھانے دار نبی غلام کو معطل اور مہنتوں پر جرمانہ عائد کیا تھا، اسی طرح مسجد کے اندر والے ہندوؤں کے بنائے ہوئے اس چبوترہ و بت کے معاملہ میں کوتوال شہر مرتضیٰ خان سے موقع کو معائنہ کروا کے چبوترہ کو کھود کر پھینکوائے اور ہندوؤں پر وہاں پوجا کرنے کی پابندی لگائے اور مسجد سے باہر والے چبوترہ کو ہندو لوگ جو بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اس پر کارروائی کرے "

اس مقدمہ کی سماعت پہلی بار انگریزی سرکار کی عدالت میں ۱۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کو ہوئی تھی، فیصلے کی تفصیل واضح نہیں البتہ اتنی بات واضح ہے کہ مسجد کے اندر و باہر والے چبوترے بحکم سرکار کھود کر پھینک دیئے گئے تھے۔ مگر مسلمانوں کی طرف سے یکم نومبر ۱۸۶۰ء کو پھر اس وقت بابری مسجد کے امام و خطیب میر رجب علی کو انصاف و دادطلب کرنے کیلئے انگریزی سرکار والی عدالت میں درخواست دینی پڑی، اس دادطلبی والی درخواست کا حاصل معنی یہ ہے کہ:

" مدعی علیہ اقبال سنگھ نے بابری مسجد کے پاس بیس دن پہلے زبردستی ایک نیا چبوترہ بنالیا ہے اور روز بروز اس میں اضافہ بھی کرتا ہے اور منع کرنے سے باز نہیں آتا، اس نے مسجد کے قریب ایک جھنڈا بھی برائے فساد نصب کر دیا تھا جسے بحکم کوتوال اکھاڑ دیا گیا، اسی طرح آج سے ڈیڑھ سال پہلے یعنی مئی ۱۸۵۹ء میں ہری داس مہنت بابری مسجد سے متصل بابری مسجد کی خالی زمین پر اپنا مکان بنانا چاہا تھا مگر سرکاری مداخلت سے اسے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی، مگر مدعا علیہ سرکاری کارروائی کے باوجود شرارت سے باز نہیں آتا ہے بوقت اذان مسجد کے پاس سنکھ بجاتا ہے ہماری درخواست ہے کہ اس نئے چبوترہ کو بھی اکھاڑ پھینکا جائے اور سنکھ بجانے پر پابندی لگائی جائے۔"

اس درخواست کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان ایودھیا کی طرف سے ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء والی درخواست کے جواب میں انگریز حکومت کی سرکاری و عدالتی کارروائی کے نتیجہ میں بابری مسجد کے اندر و باہر شرپسند ہندوؤں کے ذریعہ بنائے گئے چبوترے اور دوسرے نشانات اگرچہ کھود کر پھینک دیئے گئے تھے اور ہری داس مہنت کی طرف سے تعمیر کی کوشش کو ناکام کر دیا گیا تھا مگر انگریزی حکومت کی منصوبہ بند سازش کے مطابق مندر کے اندر تو نہیں مگر باہر دوبارہ پھر اکتوبر ۱۸۶۰ء میں نیا چبوترہ ہندوؤں نے بنالیا۔

مسلمانوں کی طرف سے دی گئی اس درخواست پر انگریزی سرکار والی عدالت نے معاملہ کی تحقیقات کرکے رپورٹ پیش کرنے کا حکم جاری کیا اس پر عمل کرتے ہوئے سرکاری طور پر جو رپورٹ تیار کی گئی وہ انگریزی سازش و شرارت کا آئینہ دار ہے، اس رپورٹ کا حاصل یہ ہے کہ:

"اس جگہ کوئی نیا چبوترہ نہیں بنا ہے اور وہاں ایک جھونپڑی چار مہینہ پہلے بنی ہے جس میں مدعا علیہ اقبال سنگھ رہتا ہے، اقبال سنگھ کو فہمائش کر دی گئی ہے کہ کوئی جدید تعمیری کام نہ کرے نہ چبوترہ بڑھائے نہ بنائے ورنہ اسے وہاں سے ہٹا دیا جائے گا اور اس کی کٹیا کو بھی وہاں نہیں رہنے دیا جائے گا۔"

یہ رپورٹ ۱۹ر دسمبر ۱۸۸۰ء کو پیش ہوئی اس رپورٹ سے صاف عیاں ہے کہ رپورٹ تیار کرنے میں انگریزی و ہندو سازش کا پورا دخل ہے، مسلمانوں کی درخواست میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ۱۸۵۵ء میں ہندوؤں کی شورش کے بعد جو چبوترہ بابری مسجد کے باہر بابری مسجد کے پاس بنا لیا گیا تھا وہ ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۸ء والے سرکاری حکم کے مطابق کھود کر ختم کر دیا گیا تھا جس کے بعد دوبارہ سرکاری حکم کے خلاف پھر ۱۰ر اکتوبر کو بابری مسجد کے باہر بابری مسجد کے پاس ہندوؤں کی طرف سے نیا چبوترہ بنا لیا گیا ہے مگر تیار شدہ رپورٹ میں اس حقیقت کو حسب عادت نہیں حسب سازش (جو انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد سے اب تک بھارتی عدالتوں اور سرکاروں کا بھی شیوہ وشعار ہے) نظر انداز کرکے لکھ دیا گیا کہ یہاں کوئی نیا چبوترہ نہیں بنا ہے بلکہ جس چبوترہ کو مسلمانوں کی طرف سے دی گئی درخواست میں نیا چبوترہ کہا گیا ہے وہ پرانے زمانہ سے موجود و برقرار ہے اس طرح مسلمانوں کی حقیقت بیانی کی تکذیب دیدہ و دانستہ کی گئی جیسا کہ آج کل بھی مسلمانوں کے عام معاملہ خصوصاً بابری مسجد کے سلسلے میں انگریزوں کی روحانی شاگرد بھارتی سرکاروں اور عدالتوں اور ان کے کارکنوں کا شیوہ وشعار ہے اور کاروبار بھی۔ مسلمانوں کی طرف سے دی گئی درخواست میں اگرچہ وہاں کسی جھونپڑی (کٹیا) کی موجودگی کا کوئی ذکر نہیں تھا مگر رپورٹروں نے انگریزی سازش کے مطابق رپورٹ میں ظاہر کیا کہ وہاں اقبال سنگھ مدعا علیہ کے رہنے کے لئے بطور مسکن ایک کٹیا موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کٹیا مسلمانوں کی اس درخواست کے بعد رپورٹ تیار کرنے کا حکم صادر کرنے کے وقت بنائی گئی جس کی بابت رپورٹ میں حسب سازش وحسب عادت کہہ دیا گیا کہ یہ کٹیا چار مہینے پہلے سے بنی ہوئی ہے۔

جعل سازی و عیاری و انگریزی سازش والی اس رپورٹ کے بعد مسلمانوں کی مذکورہ درخواست پر انگریز کی سرکاری عدالت کی طرف سے جو کارروائی ہوئی وہ جن الفاظ میں سرکاری و عدالتی طور پر لکھی گئی اس کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

"مسلمانوں کی درخواست مذکورہ اور اس سلسلے میں مطلوبہ رپورٹ پر غور کرکے یہ حکم صادر کیا جا رہا ہے کہ تھانیدار سے تحریری طور پر دریافت کیا جائے کہ مدعی علیہ نے چار مہینہ پہلے جو کٹیا وہاں بنائی ہے اس کے لئے اس نے سرکاری اجازت لی تھی یا نہیں؟ اگر بلا سرکاری اجازت یہ کٹیا بنائی گئی ہے تو اسے اکھڑوا کر پھینک دیں۔"

انگریزی عدالت کے اس حکم نامہ میں چبوترہ سے متعلق کوئی بھی حکم نہیں صادر کیا گیا لہٰذا وہ جبراً و قہراً برقرار رکھا گیا اور نئے دن مسلمان انگریزوں کی سازش سے ہندوؤں کی کھڑی کردہ پریشانیوں کے شکار ہوتے رہے جس کی تفصیل ہماری زیر تصنیف کتاب میں ہے۔ انگریزوں کی سازش سے ہندوؤں کے تعمیر کردہ اس چبوترہ کو جنم استھان قرار دیا جا رہا اس

باہر کے اس پاس کوئی ہندو عمارت نہیں تھی تاآنکہ انگریزی سازش ہی کے مطابق ایودھیا کے مہنت رگھوبیر داس کے ذریعہ ۲۹ر جنوری ۱۸۸۵ء کو سرکاری عدالت میں اس مضمون کی درخواست دلائی گئی کہ اس چبوترہ پر کوئی عمارت نہ ہونے کے باعث سردی وگرمی وبرسات میں پجاریوں اور یاتریوں کو اذیت ہوتی ہے اس لئے اس چبوترہ پر مندر کی تعمیر کی اجازت دی جائے۔ (مسلم انڈیا اردو مئی ۱۹۸۶ء)

انگریزی حکومت وعدالت اندرونی طور پر ہندؤں سے سارے اقدامات کرانے کے باوجود اس بات پر راضی نہیں ہوئی کہ اس چبوترہ پر ہندؤں کو مندر بنانے کی اجازت دے اس مقدمہ کو فیصل کرنے کے لئے انگریزی حکومت کی طرف سے ایک ہندو جج ہری کشن مقرر کئے گئے تھے جنہوں نے کہا کہ جنم استھان کہے جانے والا چبوترہ چونکہ بابری مسجد کے پاس واقع ہے اس لئے اس چبوترہ پر مندر بننے سے ہندو مسلم فساد کا خطرہ ہے لہذا اس پر مندر بنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

الغرض اسی طرح کے بکھیڑے انگریزی حکومت کے خاتمہ تک چلتے رہے جن کی کسی قدر تفصیل ہماری زیر تصنیف کتاب میں ہے یہاں تک کہ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ملک ہندوستان انگریزوں سے آزاد ہوا، مگر یہ ملک دو حصوں پاکستان وبھارت میں منقسم ہوگیا، بھارت پر کہنے کو سیکولر وجمہوری سرکار کی حکومت رہی مگر حقیقت میں اس پر ایسے غیر جمہوری وغیر سیکولر حکمرانوں کی گرفت مضبوط رہی جو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف بے پناہ جذبات رکھتے ہیں چنانچہ آزاد ہونے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی سیکڑوں مسجدوں کو تباہ وبرباد کرایا گیا اور بہت ساری مساجد کو مندروں میں تبدیل کیا گیا اور لاکھوں مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کے سبب ہلاک کیا گیا ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے خصوصا پولیس وفوج کے محکموں کے دروازے بند کئے گئے اور ان کی معیشت تباہ کی گئی ان کی زبان وتہذیب کو مٹانے اور بدلنے کی کوشش مسلسل جاری ہے، پھر ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید کرنے کے بعد مسلمانوں کا قتل عام، لوٹ کھسوٹ معیشت و مقامات کو تباہ، بہت سارے مسلمانوں اور ان کے مکانات کو نذر آتش کیا گیا اور اب اعلان کیا جارہا ہے کہ دہلی کی جامع مسجد کاشی (بنارس) کی مسجد گیان واپی و متھرا کی عیدگاہ اور ہزاروں دوسری مساجد کو بھی تباہ کرکے ان کی جگہ پر مندر تعمیر کئے جائیں گے اور سیکولر حکومت نہایت اطمینان سے ہمیشہ یہ ٹیپ کا بند سناتی ہے کہ ہم پوری طرح مسلمانوں ان کی عبادت گاہوں اور دوسرے امور کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ حدیث نبوی میں ہے کہ حکمراں طبقہ کا جھوٹ بولنا سب سے زیادہ مذموم ہے مگر مسلمانوں اور ان کی قیمتی چیزوں کے دعوئ تحفظ کرنے والا انگریز کا جانشین ہندوستانی حکومت کا حکمراں طبقہ بہت ہی زیادہ جھوٹ بولتا ہے اور موجودہ ہندوستانی وزیر اعظم کے بارے میں سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ نے علی الاعلان کہا کہ اس سے بڑا جھوٹا وفریب کار ہم نے کبھی اور کہیں نہ سنا اور نہ دیکھا۔

(۶ر دسمبر کے بعد والے عام اخبارات میں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے) باخبر لوگ مثلاً سابق وزیر اعلیٰ اترپردیش مسٹر ملائم سنگھ یادو اور ان جیسے لوگ بابری مسجد کی شہادت سے پہلے علی الاعلان کہہ رہے تھے کہ بابری مسجد کے خلاف اترپردیش بھاجپا سرکار اور مرکزی کانگریسی سرکار میں سانٹھ گانٹھ اور عہد ومعاہدہ ہو چکا ہے مگر دوسری طرف مرکزی سرکار جھوٹ بولتے ہوئے یہ راگ الاپ رہی تھی کہ بہر قیمت بابری مسجد کی حفاظت کی جائے گی۔ اترپردیش کی ریاستی سرکار ومرکزی سرکار نے یہ ڈھونگ بھی رچایا کہ سپریم کورٹ کے ذریعہ ریاستی حکومت سے

بابری مسجد کے تحفظ کا حلف نامہ محض شعبدہ بازی اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے داخل کیا گیا اور کام اس کے برعکس کیا، پھر مسجد منہدم ہونے پر اسی طرح کی شعبدہ بازی کرتے ہوئے کہہ دیا گیا کہ اتر پردیش کی بھاجپا سرکار نے دشواش گھات کیا لیکن مرکزی حکومت نے جو دشواش گھات پوری دنیا کے ساتھ کیا اسے یہ حکومت اپنی سادہ لوحی کہتی پھرتی ہے، پھر اسی طرح کا ایک وعدہ حکومت نے بابری مسجد کی نئی تعمیر کے سلسلے میں کیا اور پوری دنیا کو دھوکہ دے دیا۔ اس مسجد کی تعمیر کے بجائے اب وہاں مندر تعمیر کرنے کی کھلم کھلا سازش ہو رہی ہے اور مسجد کی موقوفہ املاک کو اپنے تصرف میں لے لیا گیا ہے۔

افسوس اس طرح کی سیکولر حکومت سے زیادہ مسلمانوں پر ہے کہ پینتالیس سالوں کی مدت میں روز بروز معاملہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے مگر وہ اسلامی اصول کے مطابق متحد ہو کر صورت حال سے نپٹنے کے لئے کسی قسم کی بات نہیں سوچتے اپنی تباہی و بربادی پر صرف بے معنی قسم کی چیخ و پکار، آہ و فغاں، نعرہ بازی، اشک ریزی کرتے ہیں۔ جو کام پوری امت کو متحد ہو کر کرنا ہے اس سے سبھی لوگ غافل ہیں۔

اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔

اللہ تعالیٰ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔

(آمین)

"محدث" جنوری/فروری ۱۹۹۳ء

بابری مسجد کا انہدام

فسادات اور ہندوستانی مسلمان

اصغر علی انجنیئر

۶ دسمبر کو ہونے والا بابری مسجد کے انہدام کا واقعہ ۔ ہم نرم سے نرم الفاظ استعمال کریں تو بھی —— بڑی سنگین نوعیت کا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے۔ جو ہمارے ملک کی سیکولر سیاست کے دامن پر بدنما داغ ہے اور اس کے لیے بی۔ جے۔ پی۔ وی۔ ایچ۔ پی۔ بجرنگ دل وغیرہ تو ذمے دار ہے ہی، ملک کی حکمراں پارٹی کانگریس بھی ذمے دار ہے۔ یہ محض بابری مسجد کا انہدام نہیں ہمارے تمام آدرشوں اور خوابوں کا انہدام ہے۔ مہاتما گاندھی، نہرو، مولانا حسین احمد مدنی اور ابوالکلام آزاد کے اصولوں کا انہدام ہے۔

اگر بابری مسجد کا انہدام سیکولر سیاست کے نام پر بدنما داغ ہے تو اس کے فوراً بعد ہونے والے فسادات اور مسلمانوں کا قتلِ عام، اس کے منھ پر زوردار تھپڑ ۔ نہ صرف —— یہ کہ نرسمہاراؤ حکومت بابری مسجد کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی بلکہ یہ ہندستان کے شہریوں کی بھی حفاظت نہ کر سکی۔ اتنا ہی نہیں زیادہ تر یہ قتلِ عام بھی پولیس کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ فرقہ پرست ہندوؤں کا کام پولیس خود کر رہی ہے۔ اور وہ بھی بڑی صلاحیت کے ساتھ۔ بمبئی میں ہی پولیس کے ہاتھوں کم از کم ۱۵۰ سے زیادہ لوگ مارے گئے، ہزاروں مارے گئے اور کروڑوں کی مالیت کا سامان نذرِ آتش ہوا یا لوٹ لیا گیا۔ (یہ مضمون آخر دسمبر میں لکھا گیا۔ ادارہ)

سورت، جو جنوبی گجرات کا صنعتی شہر ہے، پہلے کبھی فسادات سے آشنا نہ تھا لیکن اس مرتبہ اس شہر میں بھی بربریت کی انتہا ہو گئی۔ ۸۴ افراد کو زندہ نذرِ آتش کر دیا گیا، ۲۲ افراد کو ٹرین سے اتار کر قتل کر دیا گیا اور کئی عورتوں سے زنا کر کے اس کی فلم بنانے کی کوشش کی گئی۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو کر ہجرت پر مجبور ہوئے وہ الگ، اس کے علاوہ مہاراشٹر، گجرات، یوپی، بہار، مغربی بنگال، راجستھان، مدھیہ پردیش، کرناٹک، آندھرا پردیش، آسام،

اڑیسہ وغیرہ میں بھی جگہ جگہ فسادات ہوئے اور کُل مرنے والوں کی تعداد ۱۲۰۰ سے زائد ہوگئی۔ اور یہ تو سرکاری اعداد و شمار ہیں۔

اور ہمیں یہ بھی ذہن نشین کرنا ہے کہ نہ تو یہ پہلا ملک گیر فساد ہے نہ آخری یہ تو ہمارے ملک کا دستور ہی بن گیا ہے۔ پہلے تو ہم اسے باقاعدہ فرقہ وارانہ فسادات کہہ سکتے تھے۔ اب اس کی نوعیت بتدریج بدلتی جارہی ہے۔ ان فسادات میں اب ہندوؤں کا کم اور پولیس کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ عام طور پر اب اموات قانون کے رکھوالوں کے ہاتھ ہی ہوتی ہیں۔ میرٹھ کے ۱۹۸۷ء کے فسادات کے بعد یہ رجحان۔ جو پہلے سے موجود تھا۔ زیادہ زور پکڑ چکا ہے۔ میرٹھ کے فسادات میں یہ رجحان اتنا شدید ہوا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل ۔۔ جو کہ انہی واقعات کی تحقیقی رپورٹ شائع کرتی ہے جس میں حکومت اور اس کی ایجنسیاں شامل ہیں ۔۔ نے بھی میرٹھ کے واقعات پر رپورٹ شائع کی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات کا کیسے مقابلہ کیا جائے اور ہندستانی مسلمانوں، ان کے لیڈروں اور دانشوروں کا کیا رویہ ہو؟ کیا حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ اب مایوسی کے سوا کچھ نہیں؟ یا یہ کہ مسلم نوجوان مسلح ہو کر میدان میں آجائیں اور ملک کے ہر کونے کو پنجاب اور کشمیر بنادیں؟ ہمارے خیال میں یہ انتہا پسندانہ اور شدید ردِ عمل ہے۔ جس کے اثرات نہ صرف ملک کے لیے بلکہ خود مسلمانوں کے لیے بے حد سنگین ثابت ہوں گے۔ محض مایوسی انھیں بے عملی کی طرف اور سپردگی کی طرف لے جائے گی اور ہتھیار اٹھانے والی بات ان کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگی۔ جو نوجوان ہتھیار اٹھانے کی بات کرتے ہیں وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور یہ بات قابلِ عمل ہے بھی یا نہیں۔

ہم اس بات پر کچھ اور روشنی ڈالنا چاہیں گے۔ ہماری جنگ آزادی کے دوران بھی یہ رجحان پایا جاتا تھا۔ کچھ نوجوانوں۔ جنھیں ہم آزادی کی تاریخ میں دہشت پسند یا انتہا پسند کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔۔ کا یہ خیال تھا کہ انگریزوں سے مسلح جنگ کر کے ہی ہم آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں نے عدم تشدد کا فلسفہ اپنایا اور کہا کہ عوام میں بیداری پیدا کر کے اور عوامی تحریک چلا کر ہی ہم انگریزوں کو آزادی دینے پر مجبور کر سکتے ہیں اور مہاتما گاندھی نے عوام میں زبردست بیداری کی لہر پیدا کی اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ عوامی بیداری کا آخر انگریزوں پر

استنادبادہ پڑا کہ ۱۹۴۷ء میں انگریز ملک کو آزاد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مسلح نوجوانوں کا رول آزادیٔ ہند کی تحریک میں ہرگز مرکزی حیثیت نہیں رکھتا۔ مرکزی حیثیت عوامی تحریک کی ہی ہے۔

اس سوال کے علاوہ کہ تشدد ان معاملات میں کتنا کارگر ہوتا ہے، دوسرے اخلاقی نوعیت کے بھی سوال ہیں جو تشدد کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ بندوق اٹھاتے وقت اس کی سمت دشمن کی طرف ہوتی ہے لیکن بہت جلد اس کی سمت اپنوں کی طرف ہو جاتی ہے۔ پنجاب اور کشمیر کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مسلح گروہ اختلاف رائے کو بالکل برداشت نہیں کر پاتے اور بہت جلد ان افراد کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیتے ہیں جو ان سے ذرا سا بھی اختلاف رکھتے ہوں۔ نفسیاتی طور پر بندوق اٹھانے والے کے ذہن پر ہمیشہ شک۔ اور خوف کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اسے ہر مخالف دشمن یا دشمن کا ایجنٹ نظر آنے لگتا ہے۔ وہ مخالفت اور دشمنی میں فرق کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ کشمیر اور پنجاب میں معمولی معمولی اختلافات پر اپنوں ہی پر گولی چلا دینے کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مسلح انتہا پسندوں نے اپنوں ہی کو زیادہ نشانا بنایا ہے۔ چنانچہ پنجاب میں ہندوؤں کے مقابلے میں سکھ اور کشمیر میں فوجیوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان ہی زیادہ مارے گئے ہیں۔ اعداد و شمار اس کے شاہد ہیں۔

پھر پنجاب اور کشمیر میں سکھ اور مسلمانوں کا جماؤ ہے' اکثریت ہے۔ ان علاقوں کی سرحدیں پاکستان سے ملی ہوئی ہیں اور پاکستان انتہا پسندوں کو تربیت بھی دے رہا ہے اور اسلحہ بھی۔ یہ سب کچھ ملک کے دوسرے حصوں میں ناممکن ہے۔ دیگر کشمیریوں اور پنجابی سکھوں کی اپنی نسلی' لسانی اور علاقائی شناخت بھی ہے جو ملک کے دیگر حصوں میں مسلمانوں کی نہیں ہے۔ پنجاب اور کشمیر میں یہ علاقائی شناخت مذہب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ حالانکہ اس سے انکار نہیں کہ اس میں مذہب کا بھی اپنا رول ہے۔ ایسے حالات میں ملک کے دوسرے حصوں میں اسلحہ اٹھانا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پولیس بڑی حد تک ہندو فرقہ واریت سے متاثر ہو چکی ہے۔ اگر مسلمان پتھر پھینکتا ہے تو اس کا جواب گولیوں سے دیتی ہے۔ اور اس کا خمیازہ اکثر بے گناہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بعض وقت تو پُرامن مسلمانوں پر وہ ظلم ہوتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ پھر یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر مسلم نوجوان ہتھیار اٹھالیں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ معاملے کا ہرگز حل نہیں ہو سکتا۔

ملک میں پڑھا لکھا ہندو فرقہ واریت کے اثر میں بڑھتی ہوئی تعداد میں آتا جا رہا ہے۔ وہ یوں بھی کچھ بی جے پی کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے اور کچھ خود اپنے ہی تعصبات کی وجہ سے مسلمانوں کو مذہبی طور پر جنونی، غیر رواداراور تشدد پسند سمجھتا ہے اور تمام تر فسادات کا ذمے دار اُسے ہی قرار دیتا ہے۔ آج اس تاثر کو ختم کرنے اور اس کے خلاف جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر خدانہ کرے کچھ نوجوانوں نے ہتھیار اٹھا لیے تو مسلمانوں کے خلاف اس قسم کے خیالات اور تاثرات میں انتہا درجے کی شدت پیدا ہوگی اور ہندو فرقہ پرستوں کے تشدد کو ہر اعتبار سے جواز حاصل ہو جائے گا۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ انھیں کسی طرح ایسا جواز حاصل نہ ہو۔

یہ بھی قطعاً غلط خیال ہے کہ اسلام مسلمانوں کو ہر معاملے میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام کی پہلی تعلیم رحم، دردمندی، ہمدردی، عدل، احسان، مساوات اور اخوت کی ہے۔ ان تعلیمات پر بنیادی زور ہے۔ ہم مسلمان اپنا ہر کام اس اللہ کے نام سے شروع کرتے ہیں جو رحیم اور رحمان ہے۔ وہ عادل اور محسن ہے اور ہمیں حسن کلام (موعظتہ الحسنہ) اور حکمت سے کام لینے کی ہدایت بار بار کرتا ہے۔ اسلحہ اٹھانے کا ہر مرحلہ آخری مرحلہ ہے اور اسلحہ اسلحہ کے جواب میں ہی اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا کہ آج چونکہ کچھ پولیس والے مسلمانوں پر گولی چلاتے ہیں تو اب بندوق اٹھانے کا وقت آگیا ہے، حقائق پر دھول ڈالنا ہے۔

اس بات کا ہم نے مضمون کے شروع میں ہی اقرار کیا ہے کہ کچھ پولیس والے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ہر پولیس والا مسلمانوں کا کھلا دشمن ہے۔ یہ رجحان بے شک بڑھ رہا ہے لیکن اگر کچھ مسلم نوجوانوں نے بندوق اٹھالی تو یہ رجحان بڑھے گا، کم نہیں ہوگا۔ ہماری کوشش اس رجحان کو کم کرنے کی ہونی چاہیے۔ ایسے سنگین حالات میں بھی بمبئی میں کئی مثالیں اور شہادتیں ایسی ملی ہیں کہ پولیس نے مسلمانوں کی مدد کی اور فسادات کی آگ کو مستعدی سے بجھایا۔ خصوصاً پولیس کے اعلیٰ افسروں میں فرقہ واریت کا اثر نچلے افسروں اور کانسٹبلوں سے بہت کم ہے۔ ہمیں پولیس کے اعلیٰ افسروں کی زیادہ سے زیادہ مدد لینے کی ضرورت ہے۔ انھیں بھی فرقہ پرستی کی گود میں دھکیلنا نہیں ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہندستان مسلمانوں کے لیے دارالامن رہا ہے یا نہیں اور یہ کہ ہونے اور نہ ہونے کی کسوٹی کیا ہو؟ کیا ہم آج ہندستان کو دارالامن کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

اس کی اصل کسوٹی یہ ہوگی کہ ہمارا سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریہ کیا ہے۔ آج بھی دستورِ ہند کے مطابق ہندستان ایک سیکولر ملک ہے اور یہاں تمام مذاہب کو برابر کا تحفظ اور آزادی حاصل ہے۔ اس دستوری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا نہ دستورِ ہند میں تبدیلی کی کوئی لہر پیدا ہوئی ہے۔ دراصل بی جے پی کے علاوہ تمام سیاسی جماعتیں دستور کی بنیادی حیثیت کو تسلیم کرتی ہیں اور سیکولرزم کو بنیادی فلسفہ قرار دیتی ہیں۔ آج بی۔ جے۔ پی ہی ایک واحد جماعت ہے جو سیکولرزم کی مخالفت پر آمادہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آج سیکولرزم کے آدرش پر عمل میں کمی آئی ہے اور ایک طبقہ اسے محض اقلیتوں کی خوشنودی کا فلسفہ قرار دے رہا ہے لیکن یہ محض اور رجحانوں میں ایک رجحان ہے۔ اس رجحان کے خلاف لڑنے اور جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ آج ہمیں کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے یہ رجحان اور مضبوط ہو جائے۔ نہ ہی ہمیں اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ اب ہندوستان مسلمانوں کے لیے دارالامن نہیں رہا۔ اور ہتھیار اسی صورت میں اٹھائے جا سکتے ہیں جب ہندستان دارالحرب میں تبدیل ہو جائے اور یہ دارالحرب میں اسی وقت بدل سکتا ہے جب یہاں کے حکمراں سیکولرزم کے نظریے کو ترک کر دیں اور مسلمانوں کی آزادی سیاسی اعلامیے کے ذریعے سلب کر کے انھیں دشمن قرار دے دیں۔ ایسا تو اب تک کوئی رجحان بھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ پولیس کا ایک طبقہ متعصبانہ رویہ اختیار کرتا ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہندستان مسلمانوں کے لیے دارالامن نہیں رہا۔ مسلح فوجیں اور سی۔ آر۔ پی۔ ایف وغیرہ آج بھی مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہیں اور مسلمان فسادات کے دوران فوجی دستوں کا استقبال کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ سی آر پی ایف کے رویے سے بھی بہت خوش نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف ہمیں مایوس ہونے کی بھی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ مایوسی انسان کو بے عمل بناتی ہے اور حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ختم کر دیتی ہے۔ ہر تحریک کا بانی مایوسی کی مذمت کرتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی مایوسی کو مذموم قرار دیا ہے۔ قوموں کو اکثر بحرانی دور سے گذرنا پڑتا ہے اور ہر بحرانی مرحلہ قوموں کے امتحان کا مرحلہ ہوتا ہے۔ مسلمان اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں کئی سخت مراحل سے گذرے ہیں اور اکثر کامیابی سے گذرے ہیں استقلال سے مشکلات پر قابو پایا ہے اس لیے آج کے تاریک حالات میں بھی ہمیں امید کے قمقمے روشن رکھنا ہوں

گے اور اپنے روشن مستقبل کے لیے جدوجہد جاری رکھنا ہوگی۔ جسمانی جدوجہد اور ذہنی اجتہادات ہی زندگی کی ضمانت ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۱۰ کروڑ ہے۔ یہ تعداد کئی ملکوں کی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ کوئی ملک اتنی بڑی آبادی کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر ہرگز ہرگز آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اس ملک میں سیکولر طاقتیں کچھ حد تک کمزور ضرور ہوئی ہیں لیکن نابود ہرگز نہیں ہوئیں اور جمہوری ملک کی بقا کی ضمانت ہی سیکولرزم کا آدرش ہے اور ہندستان جیسے کثیر مذہبی اور کثیر تہذیبی ملک میں سیکولرزم ہی جمہوریت کی بقا کی ضمانت ہے اور اقلیتوں کے روشن مستقبل کی بھی۔ بی جے پی ملک کو فاشزم کی جانب لے جانا چاہتی ہے۔ جواہر لال نہرو نے برسوں پہلے یہ کہا تھا کہ ہندستان میں فاشزم فرقہ واریت کی صورت میں ہی آئے گا اور انھوں نے اپنے آخری دنوں میں یہ بھی کہا تھا کہ ملک کے اتحاد کا سب سے بڑا دشمن فرقہ واریت ہے خارجی حملہ نہیں۔ پنڈت جی کی یہ باتیں آج حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔

اس لیے آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم سیکولر طاقتوں کو مضبوط بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اس کے لیے محض جذبات سے نہیں بڑے صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔ حق اور صبر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صبر مایوسی اور بے عملی والا صبر نہیں بلکہ سچائی اور جدوجہد والا صبر۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بہت دانش مندی سے اپنی بقا اور خوشحالی کے لیے صحیح حکمتِ عملی تیار کریں۔ ہم اس ملک میں صدیوں سے رہتے چلے آئے ہیں اور اس ملک کے عوام رواداری اور امن پرستی کے حامل رہے ہیں۔ آج بھی وہ امن چاہتے ہیں۔ فسادات نہیں۔ فسادات مفاد پرست کراتے ہیں اور وہی اس کا فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ صوفیائے کرام کا ہندستانی عوام نے ہمیشہ احترام کیا ہے اور آج بھی کرتے ہیں۔ بابا فرید۔ خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیاء اور کبیر آج بھی نہایت احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں اور عوام بلا تفریق مذہب و ملت آج بھی ان کی درگاہوں پر اپنا شیش جھکاتے ہیں۔ اسی طرح سنت تکارام وٹھوبا اور دیگر سنت جو ہندو ذات پات کے نظام سے اوپر اٹھ کر انسانی مساوات کے گیت گاتے تھے عوام کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ ہمیں ان روایتوں کو مضبوط بنانا ہے اور مشترکہ تہذیب کو زندہ رکھنا ہے تاکہ عوام کا اتحاد مضبوط ہو اور فرقہ وارانہ نفرت کا توڑ ہو۔

آج جدید دور میں مذہب کا استعمال جتنا اہلِ سیاست کر رہے ہیں شاید خود مذہبی پیشوا دل

نے نہیں کیا ہوگا۔ فرقہ واریت بھی مذہب کے اسی سیاسی استحصال کا نتیجہ ہے۔ بی۔ جے۔ پی نے ہندو مذہب کا استحصال کرنے میں تمام حدوں کو پار کر دیا ہے۔ بی۔ جے۔ پی آج جدید ہندستان میں مذہب کا اتنا جارحانہ استحصال اس لیے کر رہی ہے کہ اسے ایک طرف ذات پات کی تفریق بھی قائم رکھنا ہے تاکہ اوپری ذاتوں کے ہاتھ میں اقتدار رہے اور دوسری طرف ذات پات کے ماورا جاکر تمام ہندوؤں میں اتحاد کا ڈھونگ بھی رچایا جا سکے اور ان کے ووٹ حاصل کیے جا سکیں۔ یہ کام نہایت مشکل ہے اور مذہبی جارحیت کے ذریعے یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رام جنم بھومی کا مسئلہ مذہبی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔

بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ جدید دور میں مذہبی بنیاد پرستی اتنی جارحانہ صورت کیوں اختیار کر رہی ہے۔ ماہرین سماجیات کے لیے اس کا سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ صارفیت اور جدیدیت ایک جانب اور مغرب زدگی دوسری جانب انفرادی مذہبی اور تہذیبی روایتوں اور تشخصوں کو ختم کر کے بڑے شہروں میں پوری شدت سے بیگانگی کا جذبہ پیدا کر رہی ہیں۔ جس سے آخر کار مذہبی اور تہذیبی بنیاد پرستی زور پکڑتی ہے جس کا استحصال اہلِ سیاست اپنے مفادات کے لیے کرتے ہیں۔ بیگانگی کا احساس (FEELING OF ALIENATION) جتنا شدید ہوتا ہے مذہبی بنیاد پرستی بھی اتنی ہی شدت اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور جسے اہلِ سیاست اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جدید ہندستان میں بی جے پی کی کامیابی کی بھی ایک وجہ یہی ہے اور خصوصاً پڑھے لکھے متوسط شہری طبقوں میں۔

مسلم لیڈر بھی مسلم عوام کے مذہبی جذبات اور ساتھ ساتھ اقلیت میں ہونے کے احساس کا پوری شدت کے ساتھ استحصال کر رہے ہیں۔ مسلم دانشوروں کو خصوصاً اس طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ آج کے موقع پرست مسلم لیڈروں کو نہ مذہبی اقدار کا پاس ہے نہ مسلم عوام کے جان و مال کے تحفظ کا خیال ہے۔ ورنہ وہ بابری مسجد کے مسئلے کو بہت محتاط اور حکیمانہ طریقے سے استعمال کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلم لیڈرشپ نے نہ تو کوئی سوچی بھی حکمت عملی بنائی نہ کہیں سیاسی توازن کا ہی خیال رکھا بلکہ ان لیڈروں کے مختلف دھڑے ایک دوسرے کے مقابلے میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا بے رحمانہ استحصال کرتے رہے اور اب بھی یہی رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس سے ہندو فرقہ پرستی کو جارحانہ رویہ اختیار کرنے کے لیے جواز مہیا ہو رہا ہے۔ آج مسلمانوں کو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد

اور ذاکر حسین جیسی عالمانہ، باوقار اور محتاط رویہ رکھنے والی لیڈرشپ کی سخت ضرورت ہے۔ اگر آج ایسی باوقار اور محتاط لیڈرشپ ہوتی تو بابری مسجد کے انہدام پر مسلمانوں کا رویہ محتاط ہوتا۔

احتجاج کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ بمبئی کی حد تک یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا احتجاج غیر محتاط تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سماج دشمن عناصر اس کی اگوائی کر رہے تھے ورنہ نہ ہندوؤں کی دکانیں لوٹی جاتیں نہ مندروں پر حملہ ہوتا۔ کچھ مندروں کو آگ لگانے کی بھی کوشش کی گئی اور کہیں کہیں مورتیاں بھی توڑی گئیں۔ اگر مولانا آزاد جیسے قدآور لوگ ہوتے تو مسلمانوں کا احتجاج نہایت باوقار ہوتا اور ایسے احتجاج کا حکومت پر زیادہ اثر پڑتا اور پولیس کو اس طرح جارحانہ رویہ اختیار کرنے کا بھی موقع نہ ملتا اور بے گناہ مسلمانوں کی جانیں بھی ضائع نہ ہوتیں۔

اس نازک مرحلے سے گزرنے کے لیے مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ سیکولر اور امن پسند طاقتوں کا ساتھ دیں اور اپنے لیڈروں کو جارحانہ رویہ اختیار کرنے سے باز رکھیں۔ ایک طرف بی۔ جے۔ پی کے زیر اثر کچھ نام نہاد ہندو سنت رام للا کے درشن پر مصر ہیں جس کی اجازت عدالت نے دے دی ہے تو دوسری طرف بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے لیڈر وہاں جا کر نماز ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے تو دونوں طرف سے فرقہ وارانہ جارحیت کو ہوا ملے گی اور ہندو فرقہ پرستی کو نیا جواز۔ زخموں کو مندمل کرنے کے لیے بابری مسجد کی تعمیر ضروری لگتی ہے لیکن اس پر زور دینے سے پہلے ہمیں نتائج پر بھی اچھی طرح غور کر لینا ہوگا۔ یہ معاملہ ہمیں ہندستان کی سیکولر طاقتوں کے حوالے کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مسلمانوں کی زندگی کے تحفظ اور بابری مسجد کی از سر نو تعمیر کی مانگ کے درمیان توازن پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ ہمارے محتاط رویے سے سیکولر طاقتیں بھی مضبوط ہوں گی اور ہندو فرقہ پرستی کو بھی وہ جواز نہ مل سکے گا جس کی اُسے ہندو متوسط طبقے میں اپنی جارحانہ مہم کو مضبوط بنانے کے لیے تلاش ہے۔ مسلم عوام اپنے تشخص کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کا بھی تحفظ چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی ان کے امن پسندانہ جذبات کی نمائندگی کرتی ہے یا محض اپنے مفاد کی؟ (جاری)

"نیا ادبی سفر" جنوری۔ مارچ ۹۳ء

بابری مسجد/حادثہ

رد عمل مسلمانوں میں ہو رہا تھا' ان کو غصہ آ رہا تھا' ان کے اندر پیدا شدہ اس رد عمل اور غصہ کو صحیح رخ مسلم قیادت دے سکتی تھی' لیکن افسوس کہ ابو الکلام آزاد' اور حفظ الرحمان سیوہاروی کی وفات کے بعد ملی قیادت ختم ہو گئی اور ان کا کوئی جانشین پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر فریدی تھوڑی مدت کے لئے سامنے آئے لیکن قضا و قدر کے ہاتھوں نے انہیں بھی ہم سے چھین لیا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

بابری مسجد رابطہ کمیٹی اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے نام سے بابری مسجد کے تحفظ کے لئے جو شخصیتیں منظر عام پر آئیں' لگتا ہے کہ ان کے سامنے شہرت و ناموری اور اقتدار و کرسی کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔ یہ حوصلہ ہارے ہوئے جذباتی اور ابن الوقت افراد تھے جنہوں نے بیک وقت بزدلی اور جذباتیت' بے خبری اور بے دانشی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا' نوشتہ دیوار کو پڑھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی اور جب بابری مسجد ان کے سر کی دونوں آنکھوں کے سامنے گرا دی گئی تو اب یہ اس کے جنازہ میں کفن چوری کی نیت سے بر شریک ہونے کی کوشش کر رہے ہیں' اور ملت کے جسم سے بچے بچائے خون کو بھی نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ پورے ملک میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے' ان کی جائیدادیں' فیکٹریاں اور ان کے تجارتی مراکز جلائے جا رہے ہیں یہ ہندو مسلم فسادات نہیں ہیں بلکہ یہ ایک طرح کا پولیس ایکشن ہے جو کرفیو لگنے کے بعد دکھ 'دود سے چور' بابری مسجد کے حادثہ کے نتیجہ میں حواس باختہ مسلمان مظلوموں کے ساتھ پولیس کے درندے انجام دے رہے ہیں اور کانگریس کی حکومت ان کی کھلا پشت پناہی کر رہی ہے۔ مسٹر نرسمہا راؤ کی حکومت نے بی جے پی کی حکومت سے بابری مسجد شہید کرا کے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں' ایک طرف تو بابری مسجد گروا کر انتہا پسند ہندوؤں کے ووٹ اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی ہے' دوسری جانب چار صوبوں میں بی جے پی کی حکومت ختم کر کے انتخابات میں ہاری ہوئی بازی جیتی ہے' تیسری جانب انتہا پسند تنظیموں پر پابندی عائد کر کے اپنی انتظامیہ اور پولیس کے ذریعہ مسلمانوں کے قتل عام کا کام تسلسل کے ساتھ کر کے وہ اکثریت کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہے کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے آر' ایس' ایس' بجرنگ دل' وشو ہندو پریشد اور شیو سینا کی ضرورت نہیں' ہماری حکومت یہ کارنامہ ان سے بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے اور بمبئی' احمد آباد' سورت' بنگلور' بھوپال' دہلی اور کانپور وغیرہ اس کے گواہ ہیں' انتہا پسند تنظیموں کے ساتھ "جماعت اسلامی" جیسی دستور اور حکومت کی وفادار مسلم تنظیم پر پابندی لگا کر نرسمہا راؤ صاحب نے اپنی حکومت کی پیشانی پر "محل گنتری" کی مہر ثبت کر دی ہے' مسلمانوں کو یہ بات ہر حال میں واضح کر دینی چاہئے کہ بی جے پی کی حکومتوں کا خاتمہ اور بعض تنظیموں پر پابندی ایک سیاسی عمل ہے مسلمانوں کے مفادات کا اس سے کوئی تعلق نہیں' وہ صرف انصاف کے طالب ہیں انہیں کسی حکومت یا کسی تنظیم سے نہ کوئی محبت ہے نہ عداوت وہ اس سلسلہ میں بالکل غیر جانبدار ہیں۔ (ع، ح، ر)

سریندر موہن

یہ ہندوستان کی لازوال سیکولر روایات اور اقدار ہی ہیں کہ جب جنونی اور متعصب لوگوں نے اجودھیا کی بابری مسجد کو منہدم کر کے انتہائی قابل مذمت جرم کا ارتکاب کیا تو ماسوا بھارتیہ جنتا پارٹی اور شیو سینا کے تمام سیاسی جماعتوں، زندگی کے ہر ایک میدان سے تعلق رکھنے والے صاحب بصیرت حضرات اور عام لوگوں نے بلا امتیاز مذہبی عقائد اس واقعہ کی مذمت میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہیں لیا گاندھی جی کے المناک قتل کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں مکمل طور پر الگ تھلگ ہو گئی ہیں۔ اسی شرمناک قومی جرم کے احساس نے بی آر ایس ایس، بی جے پی کے چوٹی کے رہنماؤں کو بھی اظہار تاسف پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ رسمی طور پر ہی سہی اعتدال پسند قائدین جیسے اٹل بہاری نے خود کو اس شرمناک حرکت سے لاتعلق بتانے کی ہمت جتا پائی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اتر پردیش کی بی جے پی حکومت عدالت کے احکامات اور مرکزی حکومت کو دی گئی یقین دہانی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے بابری مسجد کو مسمار کرنے کی سازش میں شریک رہی وشو ہندو پریشد کے نیتاؤں نے سپریم کورٹ میں حلفی بیان داخل کیا تھا کہ اجودھیا میں اس نوعیت کے کسی بھی ناخوش گوار واقعہ کو رونما نہیں ہونے دیا جائے گا لیکن انہوں نے اپنی عہد شکنی کے ذریعہ قدیم ہند و تہذیب اور ثقافت کی شاندار روایات کو رسوا کردیا لیکن ستم ظریفی ہے کہ یہ سارا کارنامہ بھگوان رام کے نام پر انجام دیا گیا۔ شاید یہ قائدین بھگوان رام کے خاندان یعنی رگھو کل کے مشہور قول "جان جائے پر وچن نہ جائے" کو فراموش کر چکے ہیں۔ پریشد نے اس مقدس قول سے صریح روگردانی کرتے ہوئے یہ بتادیا کہ اس کے وعدے کبھی ایفاء نہیں ہو سکتے ہیں اور اس کا خمیازہ دوسروں کو اپنی زندگیوں سے چکانا پڑے گا۔

تاہم پوری قوم کو جس امر نے ششدر اور مایوس کردیا تھا۔ وہ وزیر اعظم اور مرکزی وزیر داخلہ کا اس مسئلے کے سلسلے میں انتہائی عامیانہ رویہ تھا۔ مسٹر نرسمہا راؤ نے یوم آزادی کے موقع پر لال قلعے کی فصیل سے قوم کو مخاطب کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ بابری مسجد کا تحفظ ہر قیمت پر کیا جائے گا۔ انہوں نے اس عہد و پیمان کا اعادہ پارلیمنٹ کے علاوہ قومی یک جہتی کونسل میں بھی کیا تھا۔ اسی طرح مرکزی وزیر داخلہ تقریباً روزانہ ریاستی وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بارہا یقین دلا چکے تھے کہ کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لئے مرکزی حکومت نے ایک ہنگامی منصوبہ (contin gemncy plan) تیار کرلیا ہے، لیکن ان کی یہ یقین دہانی صرف بیان بازی تک ہی محدود رہی چنانچہ مرکزی حکومت کی مکمل بے عملی اور کوتاہی نے ساری قوم کا سر شرم سے جھکا دیا اور ملک کو بین الاقوامی سطح پر رسوا کردیا وزیر اعظم کے استعفا کے پرزور مطالبہ کے پیچھے یہی محرک کار فرما تھا۔ اگر مسٹر نرسمہا راؤ ان واقعات کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے مستعفی ہو جاتے تو وہ گاندھیائی جراءت کا قابل تقلید نمونہ ہوتا اور اس اقدام سے عالمی برادری میں ہندوستان کی ساکھ اور وقار بحال ہو جاتا۔ اسی طرح اقلیتی فرقے کے نوجوانوں کے بپھرے ہوئے جذبات کو بھی بڑی حد تک ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا۔

اجودھیا میں عبادت گاہ کی بے حرمتی کے بعد اس حیرک شر سے اقلیتی فرقے کی بیخ کنی کے لئے ان پر منظم اور منصوبہ بند حملے کئے گئے۔ یہاں اقلیتی فرقہ کے خلاف جس بربریت کا مظاہرہ کیا گیا وہ اسی دوپہر میں محافظوں کے ساتھ رونما واقعات سے بھی زیادہ قابل مذمت تھے۔ اس سیاہ اتوار کو اجودھیا میں تشدد کا جو ننگا ناچ کھیلا گیا اسے فرقہ پرست تنظیموں کا کوئی بھی نیتا نہیں روک سکا اور اس کے بعد ملک کے طول و عرض میں جو کچھ بھی رونما ہوا ماضی میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ملک میں جہاں جہاں بھی بپھرے ہوئے مسلمانوں نے اکٹھا ہو کر اور کچھ مقامات پر ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے غم وغصہ کا اظہار کرنے کی کوشش کی تو سیکورٹی فورسیز اور پولیس ان پر بری طرح ٹوٹ پڑی۔ تشدد کے ابتدائی چند دنوں کے دوران ہونے والی زیادہ تر ہلاکتیں پولیس ایکشن کا نتیجہ تھیں، یہ وہ بے گناہ مسلم نوجوان تھے جو اسلام سے اپنی گہری وابستگی اور وفاداری کو ظاہر کرنا چاہتے تھے جنہیں پولیس نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ اگرچہ کہ سارے ملک میں یہ عمومی تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے ہیں مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وردی میں ملبوس لوگوں نے بڑی بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ اقلیتی فرقہ کو اپنے غیض و غضب کا نشانہ بنایا۔

بہرحال جب کچھ علاقوں میں تشدد پھوٹ پڑا تو ایک قابل غور نکتہ دیکھنے میں آیا کہ فسادیوں میں دلت اور پس ماندہ ذاتوں کے لوگ شامل نہیں تھے گو کچھ ایسی مثالیں ہو سکتی ہیں جہاں ان طبقات کے لوگ فسادات میں ملوث رہے ہوں مگر آگرہ اور میرٹھ ڈویژنوں کے سارے دیہی علاقے پرامن رہے۔ دوسری طرف بہار نے یہ ثابت کردیا کہ اگر مضبوط قوت ارادی ہو تو فرقہ وارانہ تشدد کو برپا ہونے سے روکا جاسکتا ہے۔ ریاستی حکومت بھی اس معاملہ میں پوری طرح چوکس رہی۔ اسی لئے تشدد کے چند واقعات سے قطع نظر ریاست میں عام طور پر امن وامان قائم رہا۔

بلاشبہ یہ رجحان پروان چڑھ سکتا ہے۔ ہندوؤں کو کمزور اور چھوٹے طبقات کی جان و مال کی سلامتی کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لینا چاہئے اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام کرنا چاہئے۔ صرف اسی صورت میں وہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں مندروں کی بے حرمتی اور ہندوؤں پر ہوئے حملوں کی مذمت کرنے کے مجاز ہوں گے۔ ہمیں ان دونوں ملکوں میں رونما ہوئے واقعات کی کڑی مذمت کرتے وقت وہاں کی حزب اختلاف کی جماعتوں کے انداز فکر اور رویہ کو نوٹ کرنا چاہئے اسی طرح وہاں کی حکومتوں کی اس یقین دہانی کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے جو انہوں نے تباہ شدہ مندروں کی سرکاری صرفہ پر تعمیر نو اور مرمت کے ارے میں کرائی ہے۔

مسلم قائدین نے ایک مرتبہ پھر مسجد کی سلامتی کو لاحق خطرات اور انتہائی اشتعال انگیزی کے باوجود صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ حتی کہ مسجد کو مسمار کرنے کے بعد بھی مسلم قیادت نے اپنے فرقہ کو صبرو ضبط سے کام لینے کی تلقین کی۔ اسی طرح مسلم عوام نے بھی مرکزی حکومت کو واضح الفاظ میں یہ جتا دیا تھا کہ مسئلہ اجودھیا کے حل کے سلسلہ میں اس کی حکمت عملی اور طریقہ کار پر مسلمانوں کو ذرہ برابر اعتماد نہیں رہا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے اکثریت یا اکثریتی فرقہ کے ساتھ تصادم کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ تاہم اس حقیقت سے منہ نہیں موڑا جاسکتا ہے کہ نا انصافی اور مظلومی کے احساس نے نوجوان طبقہ کے جذبات کو مغلوب کردیا تھا۔ چنانچہ ان کا رد عمل فطری ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ان کے ذہنوں پر دغا بازی اور ذلیل کئے جانے کا احساس غالب ہے۔

تمام محب وطن اور ذی ہوش ہندوستانیوں نے اس سانحہ سے لاحق خطرات کو بھانپ لیا ہے۔ ملک پہلے ہی بلیو اسٹار آپریشن کے سانحہ سے گزر چکا ہے' جب حکومت نے ایک انتہائی غلط فیصلہ کرکے سکھوں کے مقدس ترین مقام 'گولڈن ٹمپل پر فوج کشی کا حکم دے دیا تھا۔ اس غلط مہم جوئی کی بڑی بھاری قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ٹھیک اسی موقع پر یا بعد میں ارباب اقتدار سکھ فرقے کے سامنے نادم ہوکر معافی مانگتے مگر اقتدار کے نشہ میں چور ہمارے حکمرانوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ہمارا ملک پھر اسی طرح کے پرآشوب حالات اور سانحہ کو برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا خیر سگالی کا جذبہ رکھنے والے تمام افراد' چاہے وہ کسی بھی مذہب' عقیدہ یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں کا یہ لازمی فریضہ ہے کہ وہ مسلم عوام کے مجروح جذبات اور احساسات پر مرہم رکھنے کی بھرپور کوشش کریں۔ اسی طرح مسلم قیادت کو اپنے فرقہ کے اندر کچھ گروپوں کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے کا اہم فریضہ انجام دینا ہوگا۔ اس کوشش میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنا دست تعاون بڑھانا ہوگا۔

حالات رفتہ رفتہ معمول پر آرہے ہیں' مگر ذہن بری طرح مضطرب اور متاثر ہیں فی الحال اولین ضرورت بڑے پیمانے پر راحتی کاموں کی ہے۔ دوم یہ کہ دونوں فرقوں کے درمیان برسا برس سے قائم اخوت اور بھائی چارے کے تعلقات کو جن لوگوں نے نقصان پہنچایا ہے انہیں قرار واقعی سزائیں دی جائیں۔ مگر امن و آشتی کی بحالی انتقامی رویہ کے ذریعہ ممکن نہیں۔ ہمارے عوام ہندو اور مسلمان دونوں ہی جرمن اور فرانسیسی قوموں سے کم بالغ نظر نہیں ہیں' جرمن اور یہودی' اور یہودی اور فلسطینی یہ تمام قومیں ایک دوسرے کے خلاف ایک طویل مدت تک برسرپیکار رہی ہیں۔ ان میں ظالم اور مظلوم قومیں بھی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ قومیں اپنے نئے اور پرانے اختلافات کو دوستانہ ماحول میں حل کرنے کے لئے کوشاں ہیں تاہم اس کے لئے درگزر اور فراموش کردینے کی پالیسی اختیار کرنا پہلی شرط ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ماضی میں ان کی قومیتیں مختلف تھیں اور آج بھی ہیں' مگر ہمارا معاملہ ان کے بالکل برعکس ہے ہم ہندوستانی ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں' جو ایک قابل فخر قوم کا حصہ ہیں جن کی تاریخ مشترکہ فن تعمیر' ادب' اور دوسرے میدانوں میں شاندار کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ مزید برآں برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لئے تمام فرقوں نے مشترکہ جدوجہد کی ہے علاوہ اس کے ہمارے ملک نے ہمیشہ مغربی ایشیا میں اپنے پڑوسیوں کے خلاف سامراجیت کی ہر سازش کی مخالفت کی ہے بلاشبہ بابری مسجد کی مسماری بھی سامراجیوں کی پھوٹ ڈالو سازش کا نتیجہ ہے۔

اخلاق حسین قاسمی

مسلمانوں کی تباہی کی
اصل ذمہ داری علماء اور اکابرین پر ہے جو نہ صرف مل کر بیٹھنے

میں ناکام رہے بلکہ مسلمانوں کو صحیح سمت دینے کی اسلامی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام رہے۔ متنازعہ جگہ پر نماز پڑھنے کی دھمکی ——— یہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کا وعدہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھرے بازاروں میں قتل اور گردن کٹوائیں۔

حکومت اپنے اعلانات میں قطعی طور پر سنجیدہ نہیں ہے۔ مولانا [illegible] نے کہا کہ مسجد مسلمانوں کی ہے۔ مورتیاں رکھنے سے شہادہ مسجد کے حکم سے خارج نہیں ہوئی بلکہ اگر ۵۰۰ برس تک بھی وہاں مورتیاں رہتی ہیں تو وہ زمین مسجد ہی رہے گی۔

——— اگر سپریم کورٹ یہ فیصلہ دیتی ہے کہ وہاں پہلے مندر تھا تو ہم مسجد کے دعوے سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہیں ———

مسجد کی تعمیر نو کا معاملہ حکومت پر چھوڑ دینا چاہئے اگر مسجد تعمیر نہیں ہوتی ہے تو مسلمان حکومت اور عدلیہ سے جواب طلب کریں گے ——— بابری مسجد تحریک سے وابستہ کمیٹیاں فوراً توڑ دینی چاہئے کیونکہ یہ کمیٹیاں خود مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہیں ——— مسلمانوں کی طرف سے ہندو عوام کو چیلنج کرنا شرعاً غلط ہے۔

——— جو لوگ جوشیلے نعرے اور زہریلی تقریریں کر رہے ہیں وہ دراصل اپنے ضمیر کی گندگی چھپا رہے ہیں انہوں نے وارننگ دی کہ کوئی تحریک، آندولن، مظاہرہ مسلمانوں کی ہلاکت کا پیش خیمہ ہوگا۔

جناب سید حامد صاحب

بابری مسجد، رام جنم بھومی کے قضیے نے باہمی [illegible]، خوش ہمسائگی اور حسن معاشرت کو برباد کر دیا پچھلے چند دنوں میں نگاہیں بدل گئیں، دل بدل گئے، طور طریقے بدل گئے۔ ہندوستان کی اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت کے درمیان ایک گہری کھائی کدورت، نفرت اور عداوت کی کھد گئی اب ملک کے سامنے درپیش ایک ہی سوال ہے اس کھائی کو پاٹا جائے یا اسے چوڑا ہونے دیا جائے؟ وزیر اعظم نے اپنی کمزوری کی تلافی، مسلمانوں کی اشک شوئی اور دنیا کو دکھانے کے لئے شاید بغیر کچھ سوچے سمجھے یہ اعلان کر دیا کہ بابری مسجد از سر نو تعمیر کی جائے گی یعنی جس جگہ پر وہ کھڑی تھی اسی جگہ پر وہ پھر سے بحال کی جائے گی بعض مسلمان رہنماؤں نے مطالبہ کرنا شروع کر دیا ہے کہ وعدہ وفا کیجئے اور وزیر اعظم اقلیت کے گھاؤ پر مرہم رکھئے "مسجد کو از سر نو تعمیر کیجئے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان اقلیت پر اکثریت نے بہت بڑا ظلم کیا ہے ان کی مسجد اعلانیہ طور پر [illegible]

کے اظہار کے لئے جو لوگ سڑکوں پر نکل آئے انہیں امن و امان کے محافظوں نے گولیوں سے بھون ڈالا اور اکثریت کے انتہا پسندوں نے ان کی بستیوں پر یورش کر دی۔ ہم لوگ سوچنے لگے تھے کہ گاندھی جی کے [illegible] قتل کی طرح بابری مسجد کی شہادت بھی نفرت اور عداوت کو پسپا کر دے گی، ان کی جگہ ندامت لے لے گی اور تلافی مافات کی کوشش کی جائے گی۔ ہوا اس بار اس کے برعکس اکثریت نے انفعال کے بجائے تفاخر اکڑ کا طریقہ اختیار کیا اور اب دن بہ دن یہ رخ پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔

یہاں یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ بھاجپا اور شیو سینا کو چھوڑ کر ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے بابری مسجد کو توڑے جانے کی سخت مذمت کی۔ سارے سیکولر عناصر ہندو بنیاد پرستوں اور [illegible] کے خلاف صف آرا ہو گئے گھنگھور گھٹا میں یہ ایک نورانی لکیر ہے۔ ایسے عناصر کی روشن خیالی اور انصاف پسندی کو اگر داد نہ دی گئی تو یہ کفران نعمت ہوگا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ہندوستان کی روشن خیالی اور ترقی پر آمادہ پارٹیوں اور جماعتوں کے قریب آئیں اور ان کے ساتھ اپنے روابط کو استوار کریں۔ ہم سب کو مل کر اکثریتی بلکہ [illegible] کا مقابلہ کرنا ہے۔ ان کے علاوہ ہمیں کمزور طبقات اور [illegible] ذاتوں اور قبیلوں سے ربط و ضبط بڑھانا چاہئے تاکہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے ظلم اور استحصال کے طویل سلسلہ کا خاتمہ کیا جا سکے۔

یہ سب کچھ صحیح ہے اور ہمیں اپنے نقطہ نظر میں اس عنوان کی ترمیم کرنی ہے لیکن روشن خیالوں، پسماندوں اور کمزوروں سے رشتہ جوڑتے وقت ہمارے دل میں ذرا دیر کے لئے بھی یہ خیال نہ آنا چاہئے کہ سیکولر عناصر ملک کی اکثریت کے ترجمان ہیں جن لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور جنہوں نے اپنے کان زمین سے لگا رکھے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مسجد کے انہدام سے ہندوؤں کی اکثریت مطمئن ہے، وہ سمجھتی ہے کہ بالآخر غلامی کی نشانی مٹا دی گئی، اور اگر اس وقت پانچ چھ ماہ کے اندر عام چناؤ ہو جائیں تو بھاجپا اور زیادہ تعداد میں واپس آئے گی۔ پشیمانی کا احساس جلد ہی کافور ہو گیا، اس وقت ہندو جارحیت اپنے نقطہ عروج پر ہے۔

ایسی صورت میں مسلمانوں کو طے یہ کرنا ہے کہ آیا وہ بابری مسجد کی تعمیر نو کا سرکار سے مطالبہ کریں ایسا کرنے سے پہلے انہیں سوچ لینا چاہئے کہ اس مطالبے کے مضمرات کیا ہیں قارئین واقف ہوں گے کہ سرکار کے تغافل آمیز تساہل نے کار سیوکوں کو چھوٹ دے دی کہ مسجد کی جگہ پر چبوترہ بنا کر وہاں مورتیاں رکھ دیں۔ اب اسے وہ مندر کا نام دے رہے ہیں اس

طرح کار سیوکوں نے ریاستی سرکار کی نظر التفات اور مرکزی حکومت کی نگاہ تغافل کے سایہ میں دو کام کرڈالے' ایک تو انہوں نے بابری مسجد مسمار کردی' دوسرے ننی مندر (چھوٹا سا شوالہ) بنا دیا۔ اب اگر مسجد وہاں بنتی ہے تو پہلے اس چبوترہ کو توڑنا' اور مورتی کو ہٹانا پڑے گا اگر سرکار نے ایسا کیا تو ملک بھر میں ایک زبردست ہنگامہ برپا ہوگا کہ سرکار مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے مندر توڑ رہی ہے سارا نزلہ مسلمانوں پر گرے گا اور وہ بے دریغ تہ تیغ کئے جائیں گے اور اس "فکار خیز" میں امن کی حفاظت کرنے والے دستے پہلے کی طرح حملہ آوروں کا ہاتھ بٹائیں گے یا کم ازکم نظر دوسری طرف کرلیں گے۔ سوچئے کیا ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں پر جو ابھی اپنے مرنے والوں کا شمار کر رہے ہیں' زخمیوں کو گن رہے ہیں اور خود اپنے زخم چاٹ رہے ہیں' ایک دوسری قیامت گزر جائے کوئی مانگ اس سے زیادہ ناعاقبت اندیشی اور خود آزاری کی نہیں ہوسکتی اس دوسری قیامت سے۔ جان و مال' عزت اور آبرو کا جو نقصان ہوگا وہ تو ہوگا ہی' ہندوؤں کے دلوں میں ہماری طرف سے کدورت اور بڑھ جائے گی جو آئندہ زندگی کے ہر مرحلہ اور ترقی کے ہر منصوبہ میں ہمارے خلاف جائے گی اجودھیا میں مسجد کے انہدام کو تماشائی بن کر جس طرح پولیس اور سی آر پی ایف نے دیکھا' اسے مد نظر رکھتے ہوئے کیا ہم امید کرسکتے ہیں کہ وہ نوخیز مندر کو مسمار کرنے پر راضی ہوجائیں گے اگر مطالبہ کرنے کا مقصد محترم وزیر اعظم کو ان کے گھر تک پہچانا ہے تو اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے ان کی صلاحیتیں الم نشرح ہو چکی ہیں در گھر تک پہنچانے کی یہ ورزش ہماری تسکین کا باعث ہو یا نہ ہو مہنگی ہمیں بہت پڑے گی یاد رکھئے کہ اس ملک میں جب کبھی ہنگامہ ہوگا یا امن ٹوٹے گا تو اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہی پہنچے گا۔

بابری مسجد اپنی اصلی جگہ پر تو بننے سے رہی اور بفرض محال وہاں بن بھی گئی تو ایک قیامت کبری بپا ہوجائے گی اور مسلمانوں پر عرصہ حیات اور تنگ ہوجائے گا۔ تو کیا وہ دوسری جگہ بنے؟ اس طرح بننے سے کیا حاصل ہوگا۔ یہ تجویز تو مسلمانوں نے کئی سال ہوئے رد کردی تھی۔ یہ سوچنا خام خیالی ہے کہ فسادات نے ان کی ریڑھ اس حد تک توڑ دی ہے کہ اب وہ اس بات کے لئے راضی ہوجائیں گے جسے وہ جائز نہیں سمجھتے۔ امید ہے کہ ہمارے اہل اقتدار اور ہمارے اہل وطن اس طرح کا بھاؤ دے کر ہمارے زخموں پر نمک پاشی نہیں کریں گے۔

بابری مسجد کو تعداد کے نشہ میں اکثریت کے انتہا پسندوں نے زمین بوس کردیا' ریاستی حکومت نے سازش میں شرکت کی اور مرکزی حکومت نے آنکھیں بند کرلیں بہرحال ایک فیصلہ ہوگیا اس میں کوئی تبدیلی بھی اب نہیں ہوسکتی مسلمانوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مسجد کی مسماری کو روکتے اور اتنی طاقت اب بھی نہیں ہے کہ وہ چبوترہ توڑ کر اور مورتی ہٹا کر وہاں مسجد بنالیں۔ ان پر مذہب کی رو سے اب کوئی الزام عائد نہیں ہوتا لہٰذا انہیں اب اس مسئلہ میں ہرگز دخل نہیں دینا چاہئے' نہ اس کے بارے میں کوئی مانگ سرکار سے کرنی چاہئے۔ اس وقت غیرت اور مصلحت دونوں کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ صبر و شکر کرکے بیٹھ جائیں ملک جو چاہے فیصلہ کرے ان کا جہاں تک تعلق ہے بابری مسجد شہید ہوچکی۔ عدالتی کاروائی کو بھی اب کالعدم ہونا چاہئے کیونکہ اس سے بھی تلخی بڑھے گی اور ملک کی اکثریت کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے جو غبار بھرآگیا ہے وہ اور گھنا ہوجائے گا اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے مسلمانوں کو صبر کرنا چاہئے وہ صبر و صلواۃ کے ذریعہ اللہ کی نصرت کے طلبگار رہیں گے۔ اب ہرگز نہ ان سے مواخذہ ہوگا' نہ ان کے علماء سے کہ مسجد کو تم نے مسمار کیوں ہونے دیا اگر اب وہ ضد یا اصرار کرتے ہیں کہ مسجد اسی جگہ پر بنے جہاں وہ پہلے کھڑی تھی تو قرائن کہتے ہیں کہ ان سے اور ان کے رہنماؤں سے روز حشر باز پرس ضرور ہوگی کہ تم نے ایسا رخ کیوں اختیار کیا۔ جس کو اختیار کرنے کے لئے تم دین کی طرف سے پابند نہیں تھے اور جس کے اختیار کرنے سے قوی احتمال اس بات کا تھا کہ ایک بار پھر ہزاروں مسلمان مارے جائیں اور لاکھوں بے گھر ہوجائیں اور جو بچ جائیں ان پر اور ان کی اولاد پر ایک مدت تک عرصہ حیات تنگ رہے ہم سب کو سوچ رکھنا چاہئے کہ ایسے تباہ کن رخ کو اختیار کرنے کے لئے ہمارے پاس روز حشر جواب کیا ہوگا جو لوگ عوام کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے بنے ہیں کیا انہیں زیب دیتا ہے کہ مسلمانوں کو تباہی کی بھٹی میں جھونک دیں اور آخر کیوں۔ بابری مسجد کی تعمیر نو ہو مسجد اسی جگہ پر رہے اس پر اصرار کرنا در اصل ملی خود کشی کے مترادف ہے اور خود کشی حرام ہے' انفرادی خود کشی حرام ہے اجتماعی خود کشی نہ صرف حرام ہے بلکہ سب سے بڑا جرم ہے کیا ہماری آنکھیں اب بھی نہ کھلیں گی' کیا ہم مسلمانوں کو اس راستہ پر ڈال دیں گے جس میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے' تباہی ہی تباہی ہے اور جس میں ہلاکت کے سوا کچھ نہیں؟

جن لوگوں بابری مسجد کے سلسلہ میں کمیٹیاں قائم کیں' یا اس ضمن میں مسلمانوں کی نمائندگی' مذاکرات اور ملاقاتوں میں کی انہیں اپنی اخلاقی ذمہ داری کو مد نظر رکھتے ہوئے عزت اور غیرت کے ساتھ کنارہ کش ہو جانا چاہئے تھوڑی، دیر کے لئے مان لیجئے کہ انہوں نے مسلمانوں کو گمراہ نہیں کیا' تو

ہی خود کو فریب ضرور دیا رہنما کے لئے یہ دونوں صورتیں شرمناک ہیں نازیبا ہیں ناموزوں ہیں۔

روشن خیال ہندو جو ہمارے ہمدرد ہیں اور کچھ سیاسی پارٹیاں مسلمانوں سے کہیں گی کہ مسجد کو سابق بابری مسجد سے کچھ فاصلہ پر بن جانے کے لئے رضامندی دے دو ہمیں چاہئے کہ ان کے اخلاص کا اعتراف کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیں کہ ہم زخم خوردہ ہیں ہمارے زخموں کو اب نہ کریدئے ہمیں متنازعہ مسجد بحث میں اب نہ الجھائیے ہم پر بڑے مظالم ہوئے ہیں ہم نے بہت نقصان اٹھائے ہیں آپ جو چاہے کیجئے چاہے تو مسجد بنائیے یا نہ بنائیے چاہے کہیں بنائیے ہم سے کوئی سروکار نہیں ہم صبر کرکے بیٹھ گئے ہم بھر پائے ہیں اب نہ چھیڑئے ہم نے جمہوریت بھی دیکھ لی ہم نے سیکولرزم کو بھی آزما لیا ہمیں حکومت کے انصاف اور اس کے کس بل کا بھی اندازہ ہوگیا۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

حمیت، غیرت اور مصلحت سب کا یہی تقاضہ ہے حزم اور احتیاط بھی یہی کہتی ہے دانش اور دوراندیشی بھی یہی راہ دکھاتی ہے ان سطور کے پایان میں یہ نامہ سیاہ بارگاہ رب العزت میں گڑگڑا کر دعا کرتا ہے کہ پروردگار ہمیں سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور اس راہ پر قدم رکھنے سے روک دے جو لاریب ہلاکت اور تباہی کی راہ ہے ہم بڑے نازک موڑ پر کھڑے ہوئے ہیں ہمیں روشنی عطا کر کہ ہم صحیح راستہ اختیار کرسکیں۔

۲— آگے کی طرف دیکھئے۔

۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد سے کوئی ہندوستانی مسلمان چین سے نہیں سوبا۔ کچھ سے رہا نہیں گیا، وہ گھر سے نکل آئے اور جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ باقی کڑھتے رہے، کھولتے رہے، ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے بعد اگر دادرسی کی امید نہ ہو تو انسان اور کیا کرسکتا ہے؟ اور یہ ظلم و ستم تو ایسا تھا جس میں اکثریت کے علاوہ حکومت کا تغافل اور اس کی جفا بھی شامل تھی لیکن مسلمانوں کا حوصلہ ٹوٹا نہیں ہے۔ بہت سے نوجوانوں کی آنکھوں میں انتقام کی آگ ہے لیکن انتقام سے کچھ حاصل نہیں ہوتا؟ اس کی آگ جنگل کی آگ کی طرح ہوتی ہے کہ سارے جنگل کو جلا کر دم لیتی ہے پھر کچھ نہیں بچتا۔ دین حق "والکاظمین الغیظ و العافین عن الناس" یعنی غصہ کو ضبط کرنے والوں اور انسانوں کو معاف کردینے والوں کو اچھی نظر سے دیکھتا ہے اور مصیبت کے اوقات میں صبر و صلوٰۃ کی تلقین کرتا ہے۔ آئندہ مسلمانوں کے ساتھ خدانخواستہ پھر اس قسم کا کوئی حادثہ ہوا تو اگر وہ ضبط کریں

گے تو قرآن کریم کے تحت ایسا کریں گے۔ اپنے رہنماؤں سے تو وہ نالاں ہیں کہ انہوں نے سوائے نصیحت کے کیا دھرا کچھ نہیں اور انہیں کٹوا دیا، نہ ان کی تنظیم کی طرف دھیان دیا، نہ ان کے دفاع کا انتظام کیا، نہ کبھی ان کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے جتن کئے۔ انہوں نے اس قضیہ کے سایہ میں خود اپنی اہمیت بڑھائی، در میرو وزیر و سلطان تک رسائی حاصل کی، دراصل ارباب اقتدار نے ہی انہیں یک قلم مسلمانوں کا لیڈر بنا دیا ورنہ ان میں کون تھا جو مسلمانوں کی رہنمائی کرسکتا، ان میں سے کون خود غرضی سے اوپر اٹھ پایا، ملت کا درد ان میں سے کس نے محسوس کیا، ان میں سے سوجھ بوجھ کس کے پاس تھی۔ فیصلوں اور اقدامات کے نتائج آگے چل کر کیا ہوں گے، اس کو سوچنے کی صلاحیت کس میں تھی؟ بابری مسجد کے دردناک اور بھیانک انہدام سے ہمارا نقصان ہی نقصان ہوا لیکن اس ملک گیر شر میں دو چھوٹے سے پہلو بھلائی کے بھی تھے، ایک تو یہ کہ ملک کو اور ہمیں اپنے خطرات کا پہلی بار صحیح اندازہ ہوا، دوسرے مسلمانوں کو خود غرض بے اکل اور جاہ کن قیادت سے چھٹکارا مل گیا، سوئے اتفاق سے اگر چھٹکارا نہ بھی ملے تو بھی یہ قیادت اپنے اصلی قد تک تو سمٹ آئی۔

اب ہمیں اس بحث میں نہ پڑنا چاہئے کہ وہ غلطیاں کون سی تھیں اور کس کس کی تھیں جنہوں نے بالآخر اس شرمناک کرتوت کی شکل اختیار کرلی۔ ہمیں بغیر ذرا دیر کے لئے دل چھوٹا کئے یا، مایوسی کو ذہن میں راہ دیئے، حسب ذیل کام کرنے چاہئیں۔

(۱) جہاں جہاں ممکن ہو ہمیں مل بیٹھ کر یہ اعلان کرنا چاہئے کہ مسلمانوں کے ساتھ ناکردہ گناہ، بہت بڑا ظلم ہوا ہے اور وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ایک عداوت پیشہ اور نفرت خو طبقہ کے علاوہ حکومت وقت کو اس اتیاچار کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ حکومت کا پہلا اور بنیادی فرض ہے، شہریوں کی جان و مال اور ان کے دھرم کی حفاظت ہماری ایک ریاستی حکومت نے اس فرض کو پاؤں تلے روند ڈالا اور مرکزی حکومت نے اس فرض کی ادائیگی سے بکمال استغناء اور بہ تغافل الیل سبکدوشی حاصل کرلی۔

(۲) یہ بات بھی واضح کردی جائے کہ مسلمان جانتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ جس زمین پر بابری مسجد کچھ اوپر ساڑھے چار سو سال تک کھڑی رہی وہ زمین ان کی ہے اور اس ملک میں اگر انصاف کا چلن بحال ہوا تو وہ زمین ان کو مل کر رہے گی، لیکن ان کے نزدیک اب صحیح لائحہ عمل یہی ہے کہ وہ خود اب اس مسجد کے سلسلہ میں کوئی مطالبہ نہ کریں۔ اب یہ مسئلہ انہوں نے ملک کے ضمیر کے حوالہ کردیا ہے یہ اس کی

آزمائش ہے۔ خود مسلمان اب کوئی مطالبہ کر کے رجعت پسند اور عداوت پرست جماعتوں کو فروغ دینے اور مزید قوت پہنچانے سے احتراز کریں گے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ قضیہ اگر پھر گرمی پکڑ گیا تو انسانوں کی سلامتی اور ملک کی سالمیت کو زبردست نقصان پہنچے گا اور ہمارا وطن عزیز صدیوں پیچھے چلا جائے گا۔ جنگل کے قانون کی پیروی بھاجپا اور ہندو پریشد کو مبارک ہو، مسلمان ہوتا بھی ایسا نہ کرنا چاہیں گے۔ کم از کم ان میں سے وہ لوگ جو ٹھنڈا مزاج اور ہوش پر گوش رکھتے ہیں۔

(۳) رمضان کا مبارک مہینہ سر پر آگیا ہے اور عید آنے والی ہے رمضان بھر ہمیں اپنے شہیدوں کی مغفرت کی اور مسلمانوں اور ہندوستان کی سلامتی کی دعائیں مانگنی چاہئیں اور عید کو ہم صرف اس حد تک منائیں جس حد تک مذہب ہمیں تاکید کرتا ہے یعنی فطرہ ادا کریں اور عید کی نماز پڑھیں کوئی جشن اس روز نہ منائیں، نہ خوشی کا اظہار کریں، یہ بڑی بے شرمی اور بے غیرتی ہوگی اگر ہم نے اس بار عید کو تہوار کے طور منایا۔ عید الفطر کے علاوہ عید الاضحی پر بھی ہماری روش یہی رہنی چاہئے تاکہ ہمارے اہل وطن کو معلوم تو ہو کہ خدا کے گھر کو مسمار کئے جانے اور اس کے بعد بے شمار مسلمانوں کے شہید اور ہزاروں گھروں کے برباد ہونے کا گھاؤ آسانی سے بھر نہیں پائے گا۔ ان دونوں تہواروں کے موقع پر اوسطاً ہم جتنا روپیہ صرف کرتے ہیں وہ امداد یا ریلیف اور بازآبادکاری کے لئے صرف کیا جائے، بلکہ اس خرچ کی رقم سے آگے بڑھ کر ہم آفت زدوں کی امداد کے لئے وسائل فراہم کریں۔ اس طرح دو کام ہو جائیں گے۔ (۱) ہم باوقار اور بے خطر طریقہ سے احتجاج کر پائیں گے (۲) تنظیم اور ترتیب کے ساتھ آفت رسیدوں کی مدد ہو سکے گی۔

(۴) چونکہ فرقہ وارانہ فسادات ہندوستانی مسلمانوں کے مقدر میں لکھ دئے گئے ہیں انھیں چاہئے کہ ان سے نبٹنے کا منصوبہ بنائیں اس کے اہم اجزاء یہ ہوں کہ تناؤ یا تعلقات میں باقاعدگی کی پہلی آہٹ پر شہر کے باعزت مسلمان وہاں کے باعزت ہندوؤں کے ساتھ بیٹھیں اور سر جوڑ کر اور قدم اٹھا کر تناؤ اور کھنچاؤ کو دور کریں اور اپنے اپنے ہم مذہبوں کو سمجھائیں اور اتحاد کی برکت اور پھوٹ کے خطرات سے آگاہ کریں، اور مقامی انتظامیہ کو بھی ہوا کے رخ سے مطلع کردیں اور اس سے تقاضہ کریں کہ تناؤ کو ٹکراؤ بننے سے روکے۔

(۵) اپنے محلوں اور گھروں میں "پہلے دفاع" کے (یعنی جب تک کہ پولیس آتی ہے) انتظام ضرور کرلیں۔ حفاظت خود اختیاری ہر شہری کا نہ صرف حق بلکہ فرض ہے۔ اس ضمن میں بھی مقامی ارباب انتظام سے رابطہ کارآمد ہوگا۔ ہر شہر میں ایسے لوگوں کی موجودگی مفید ہوگی جن کی پہنچ سینئر افسروں تک ہو۔ اس پہنچ کے لئے اہتمام کرنا ہوگا۔ دور رہیں گے تو نقصان صرف ہمارا ہوگا۔

(۶) ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ بالقصد اکثریت کے ساتھ اپنے تعلقات کو خوشگوار بنائیں کیونکہ حکومت کی زمام در اصل اس کے ہاتھ میں ہے، اکثریت کے ایکار نہ چاہیں تو حکومت کی ساری پالیسیاں دھری کی دھری رہ جائیں، ان پر عمل نام کو نہ ہو، جیساکہ ان احکام کے سلسلے میں ہمیں تجربہ ہوتا چلا آیا ہے۔

(۷) دوسری اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ اور تعلقات ایسے ہونے چاہیں کہ ان کا گوشہ خاطر ہماری طرف رہے۔

(۸) ہندوستان کے روشن خیال افراد اور ترقی پسند جماعتوں نے مسجد کو گرانے پر سخت سرزنش کی ہے۔ وہ سوچتی ہیں کہ مذکورہ تنازعہ در اصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جھگڑا نہیں ہے بلکہ یہ جدال ہے سیکولر اور کٹر پنتھی طاقتوں کے درمیان۔ ان جماعتوں اور افراد اور پریس کو ہمیں انصاف پسندی، حسن ارتباط اور حکمت عملی سے اپنے قریب رکھنا چاہئے۔ یہاں تک جو کچھ اقدامات فوری حیثیت رکھتے ہیں ہمیں دور رس قدم بھی اٹھانے چاہئیں۔

(۹) ہماری کمزوری، بے بسی، گمراہی اور استحصال آمادگی ان پڑھ ہونے کی وجہ سے ہے ہمیں سب سے پہلی ترجیح رفع جہالت اور ہم خواندگی کو دینی چاہئے۔ ہماری بے توجہی نے ملک کی شرح خواندگی کو نیچا کر رکھا ہے اور اس کی ترقی کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں ہم اپنا منصوبہ کیوں نہ بنائیں کہ دس سال کے اندر مسلمان ناخواندگی سے نجات پا جائیں۔ اس کے لئے محنت اور ایثار بڑی مقدار میں درکار ہوں گے، لیکن زندہ رہنا ہے اور غیرت کے ساتھ تو یہ کرنا ہوگا۔

(۱۰) بچوں کو تعلیم اس طرح سے دی جائے کہ ان کا نقطہ نظر وطن دوستی انسانیت نوازی، روشن خیالی اور عقلیت کا ہو اور وہ آگے بڑھ کر اپنے ملک کے لئے سرمایہ افتخار بن سکیں۔

(۱۱) بعض جانبدار مؤرخوں نے تاریخ کے اوراق کو سیاہ کیا ہے اس کی باقاعدہ طور پر مورخین ہی کی طرف سے تردید کی جائے تاکہ ننھے دماغوں سے باہمی بدگمانیاں دور ہوں۔

(۱۲) اردو زبان کے ساتھ جیسا برتاؤ اس ملک میں کیا گیا ہے اس کی مثال کسی دوسرے جمہوری ملک میں نہیں ملے گی۔ ایسے وقت میں جب ملک کا ضمیر مسلمانوں کی طرف سے بیدار ہوا ہے اردو کا مقدمہ [illegible]ں کے اجلاس میں پیش کر کے داد رسی حاصل کرنی چا[illegible]ی پریس کو بہرحال اپنی طرف رکھنا

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مسلمان سب قوموں سے زیادہ روزگار کو ترستے رہتے ہیں۔ جہاں انہیں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے سو سرکاری ملازمتیں ملنی چاہئے تھیں وہاں انہیں صرف سولہ ملتی ہیں۔ آبادی میں ان کا تناسب ۱۱ فیصد ہے اور ملازمتوں میں تقریباً دو فیصد۔ اپنی صنعت اور تجارت کو چلانے کے لئے بھی انہیں طرح طرح کی دشواریاں ہوتی ہیں۔ ہم فریاد کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو نوکریاں نہیں ملتیں جواب ملتا ہے مقابلہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، مقابلہ میں بیٹھو، صلاحیت ثابت کرو، نوکری حاصل کرو۔

سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

جواب دینے والے کتنے بے حس اور بے درد ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ نابرابریوں میں مقابلہ کرانا یا ان میں سے کمزور فریق کے ساتھ بڑی ناانصافی اور بڑا ظلم ہے۔

ہمیں سرکار کو بتانا چاہئے کہ امن کی عمارت صرف انصاف کی بنیاد پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ ملازمتوں میں ناانصافی سے روزگار تو ہاتھ سے جاتا ہی ہے، حوصلہ بھی ٹوٹتا ہے اور بعد میں ہمارے ساتھ انصاف کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ایک معینہ مدت (فرض کیجئے ۲۰ سال) تک مسلمانوں کے لئے ملازمتوں میں تحفظ یا ریزرویشن ہونا چاہئے، تاکہ وہ ترقی یافتہ اکثریت اور دوسرے فرقوں کے برابر آجائیں اور اس کے بعد اپنی قوت بازو سے ملازمتیں اور روزگار کھلا مقابلہ کرکے حاصل کریں۔

(۴) مسلمانوں کے متعلق ان کے وطنی بھائیوں کے دلوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور غلط تصورات پھیلے ہوئے ہیں۔ انہیں دور کرنے کے لئے اول تو مسلمان بچوں کو اپنے دین اور اسلام کی تاریخ سے معقول واقفیت بہم پہنچانی چاہئے۔ تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر کھینچ سکیں اس کا اہتمام خود مسلمانوں کو اپنے گھروں یا اپنے اسکولوں میں کرنا ہوگا۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات اسلام کی شبیہ کو ٹھیک سے پیش کرنے کے لئے یہ ہوگی کہ ہمارے بچوں کو شروع سے یہ سمجھایا جائے کہ اسلام صرف عقیدہ اور عبادات کا نام نہیں ہے، یہ دونوں تو ذریعہ ہیں شخصیت کو بنانے اور کردار کو ڈھالنے کا۔ اگر ان کے اطوار و کردار سے راستی، رحم، پاک بازی، حلیمیت اور [illegible] ظاہر نہیں ہوتی تو وہ مسلمان نام کے ہیں۔ دراصل اسلام کے نام پر ایک تہمت ہیں۔ اسلام سہل بھی ہے اور سخت گیر بھی۔ یہ اپنے ماننے والوں کو، بشرطیکہ انہیں صحیح تعلیم دی جائے خیر و فلاح کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے اور

خیر کا یہ وصف بھی ہے کہ وہ صاحب خیر تک محدود نہیں رہتا، اپنے قرب و جوار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اپنے جسمانی اور ذہنی دفاع کی ہمیں ضرور تیاریاں کرنی چاہئیں، لیکن یہ احتیاط رکھئے کہ ہمارا نقطہ نظر اور زندگی اور حوادث و افکار کے تئیں ہمارا رخ دفاعی اور منفی ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اقدامی مثبت اور آگے بڑھانے والا ہو۔

(۵) سیاست میں جو برائیاں گھس گئی ہیں ان کا خمیازہ بھارت بھگت رہا ہے لیکن کسی چیز کو صرف اس بنا پر ترک نہیں کرسکتے کہ اس میں خرابیاں داخل ہو گئی ہیں۔ ہمیں سیاسی چالوں کو بیک وقت دیانت داری اور ہوشیاری سے کھیلنے کا ہنر سیکھنا چاہئے۔ ہمیں ایسے امیدواروں کے چنے جانے میں معاون ہونا پڑے گا جو سیکولر ذہن اور فراخ دل رکھتے ہوں اور جو دوسرے ملکی مسائل کے علاوہ مسلمانوں کی ترجمانی جرأت اور تمیزی اور موثر انداز میں کرسکیں۔ خود غرض نمائندوں سے اولین فرصت میں نجات پانے میں ہی ہمارے لئے عافیت ہے۔ اگر ہم نے آئندہ انتخابات سے پہلے ایک بیدار رائے عامہ نہ بنائی اور نیتا اچھے اور لائق امیدواروں کو نہ چنا تو ہم وہیں کے وہیں رہ جائیں گے اور ہماری بات کوئی نہیں سنے گا۔ یہاں بیداری کے علاوہ تنظیم درکار ہوگی۔ سیاست میں جاگیرداری کا خاتمہ ریاستوں میں زمینداری کے خاتمے سے کم اہم نہیں ہے۔ نمائندوں کا کام چالے یا دوسرے چھوٹے بڑے کام کرانا نہیں ہے۔ ان کا اصلی کام یہ ہے کہ حکومت کو صحیح مشورہ اور رائے دہندوں اور ان کے احساسات کے بارے میں صحیح اطلاعات دیں اور جرأت کے ساتھ ان کے حقوق کا مطالبہ کریں۔ یہ عہد تو ہمیں اپنے امیدواروں سے لینا پڑے گا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی و اقتصادی پیش رفت اور ان کی سلامتی کے لئے باخبر اور بااثر آواز اٹھائیں گے جہاں تک سلامتی کی بات ہے کچھ عرصے سے یہ رجحان زور پکڑ رہا ہے کہ پولیس اور دوسری حفاظتی فورسیز فسادات کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف تعصب برتنے لگی ہیں۔ بھاگلپور، میرٹھ، سیتا مڑھی اور [illegible] شہروں کے اثر سے اور اجودھیا تنازع کے سلسلے میں یہ خطرناک رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کے خلاف مرکزی سرکار نے اقلیتوں کی خاطر شاید کچھ آوازیں اٹھائی ہیں لیکن ان فورسیز کے ساتھ اپنے ربط اور اپنے تعلقات کو استوار خود ہمیں کرنا ہوگا۔ زندگی میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی کو برا کہتے رہئے تو وہ برا بن جاتا ہے، کسی سے مخالفت یا عداوت کرتے رہئے تو وہ واقعی مخالفت اور دشمنی اختیار کرلیتا ہے یا ان کی لے کو تیز تر کردیتا ہے۔ ہمیں اس مسئلے پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ یہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ خالص تہہ تہہ اراکین حکومت کے ہاتھ سے نکل کر پولیس کے

ہاتھ میں جاری ہے۔ حالات معمول سے ہٹ جائیں تو طاقت بہت بڑھ جاتی ہے' پولیس کے عدم بیراور پولیس دشمنی دونوں پر خطر ہوگئی ہیں اور یوں تو ہمیں دانش اور نرم استدلال کے ساتھ اپنے وطن کے اکثریتی فرقہ کو متواز کوشش کے ذریعے اپنے تئیں خوش گمان بناتا ہے۔ ان کے آگے جھکنا تو ہرگز نہیں لیکن ان سے دوستی اور خوش ہمسائگی کا ہاتھ ملانا ہے۔

مولانا وحید الدین خاں

ٹھیک اسی قسم کا واقعہ دوبارہ ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو اجودھیا میں پیش آیا ہے۔ بعض اسباب نے ہندو انتہا پسندی کو دوبارہ موقع دیا۔ وہ ازسرنو اٹھ کھڑی ہوئی اس بار اس انتہا پسندانہ تحریک کا مرکز اجودھیا تھا۔ اور عام طور پر اس نے بابری مسجد رام جنم بھومی تحریک کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

یہ تحریک ابتداً ۱۹۸۶ میں شروع ہوئی۔ جذباتی ہنگاموں کے درمیان وہ بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شدید ترین مرحلہ میں پہنچ گئی۔ اس کا آخری نقطہ عروج ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء تھا جبکہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پرشد کی قیادت میں ایک لاکھ سے زیادہ انتہا پسند ہندو اجودھیا میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے ۴۶۵ سالہ بابری مسجد پر یلغار کردی اور چند گھنٹہ کے اندر اس کو ڈھاکر زمین کے برابر کردیا۔

یہ بلا شبہ جدید ہندوستانی تاریخ کا سیاہ ترین واقعہ تھا۔ عبادت خانہ کسی سماج میں آخری قابل احترام چیز سمجھا جاتا ہے۔ عبادت خانہ کو گرانا گویا تمام انسانی قدروں کو ڈھا دینا ہے۔

یہ فعل پارلیمنٹ کے فیصلہ کے خلاف تھا۔ یہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف تھا۔ یہ نیشنل انٹریگریشن کونسل کی تجاویز کے خلاف تھا۔ انڈیا کی تمام بہترین روایات کے خلاف تھا۔ وہ عالمی رائے عامہ کے خلاف تھا۔ یہ اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر کے خلاف تھا۔ حتی کہ یہ خود متعلقہ انتہا پسند لیڈروں کے اپنے بیان کے خلاف تھا۔ غرض کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی وصول نہیں جس کی تائید اس اقدام کو حاصل ہو

تمام سنجیدہ طبقوں نے بجا طور پر اس واقعہ کو ملک کے لئے انتہائی افسوسناک اور سیاہ واقعہ قرار دیا ہے بلا شبہ یہ اتنا زیادہ المناک واقعہ ہے کہ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ مگر دوسرے تمام حادثات کی طرح' اس حادثہ میں بھی یقیناً ایک مثبت پہلو موجود ہے۔ اس تاریکی میں بھی روشنی کا ایک امکان جھلک رہا ہے۔

یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ یہاں امکانات کی مقدار' ہمیشہ مسائل سے زیادہ ہوتی ہے۔ ظلم کا کوئی بھی واقعہ اس پر قادر نہیں کہ وہ تمام امکانات کو مٹادے۔ کسی بھی تاریکی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ امید کے تمام چراغوں کو بے نور کردے۔

فطرت کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ یہاں۔ ظلم اپنی آخری انتہا کو پہنچ کر ندامت بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سماج میں انتہا پسندی کی تحریک صرف ایک بار اٹھتی ہے۔ اور ایک بار جب وہ اپنے آخری انجام تک پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کو دہرانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد فاشزم اٹلی میں دہرائی نہ جاسکی۔ اور اسی طرح نازی ازم کو دوبارہ جرمنی میں فروغ حاصل نہ ہوسکا۔

بابری مسجد کا اس طرح ظالمانہ طور پر ڈھایا جانا ہندو انتہا پسندی کے آخری انجام کا ظاہر ہوتا ہے۔ بابری مسجد کا انہدام دراصل ہندو انتہا پسندی کا انہدام ہے۔ اب انشاءاللہ اس ملک میں نیا احساس جاگے گا اور کم از کم دو نسل تک اس طرح کے کسی منفی واقعہ کو پھر دوہرانا ممکن نہ ہوگا۔

بابری مسجد کے انہدام نے تخریب پسند طاقتوں کو پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔ اب یقین ہے کہ اس ملک میں سنجیدہ ذہن کے لوگوں کا غلبہ ہوگا۔ زندگی کی تعمیر کے مواقع کھل جائیں گے جو انتہا پسندوں کی منفی کاروائیوں کی وجہ سے بند ہوگئے تھے۔ ۱۹۹۲ء کا خاتمہ اس ملک میں مذہبی تشدد پسندی کا خاتمہ ہے اور اسی کے ساتھ امن اور رواداری اور باہمی احترام کے نئے دور کا آغاز بھی۔

۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کے واقعہ کے بعد ہندو صاحبان کی طرف سے جو ردّ عمل سامنے آیا وہ بہت امید افزا ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت نے کھل کر مسجد کو ڈھانے کی مذمت کی۔ اس کے بارے میں اخبارات کی رپورٹیں' ان کے ادارتی نوٹ اور ان میں چھپنے والے خطوط بتاتے ہیں کہ ہندو ذہن کو اس واقعہ سے بہت سخت جھٹکا لگا ہے۔

بظاہر حالات تقریباً یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ہندو انتہاپسندی کی سخت حوصلہ شکنی ہوگی اور ایک عرصہ تک کے لئے وہ خود ہندوؤں کے درمیان بے زمین ہوکر رہ جائے گی جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے' ان کے لئے اب بہترین روش یہ ہے کہ وہ ماضی کی طرف نہ دیکھیں' وہ صرف مستقبل کی طرف دیکھیں۔ ۶ر دسمبر کے بعد پیش آنی والی صورت حال کو وہ اپنے لئے تعمیرو استحکام کے وقفہ کے طور پر استعمال کریں۔

داخلی تعمیر کے پہلو سے اس ملک میں مسلمانوں کے لئے کرنے کے بہت کام ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے اندر دینی اور اخلاقی بیداری لانا ہے۔ انھیں اسلام کا پیغام دوسروں تک

بچانے کے لئے محنت کرتا ہے۔ مسلم نسلوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بناتا ہے۔ انہیں تجارت اور صنعت میں آگے بڑھاتا ہے۔ انہیں اپنے موجودہ ملی اور اسلامی اداروں کو ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔ انہیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے وغیرہ۔ اس قسم کے بہت سے تعمیری کام ہیں جن کو انجام دینا ابھی باقی ہے۔ اب پہلی ضرورت یہ ہے کہ موجودہ وقت کو ان کاموں کی تکمیل میں استعمال کیا جائے۔ اگر بالفرض کہیں کوئی ناخوشگوار بات پیش آئے تب بھی اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تعمیری جدو جہد کو جاری رکھا جائے۔

پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی

جس مقام پر بابری مسجد واقع تھی وہاں مورتیوں کی دوبارہ تنصیب یوپی میں گورنر راج کے نفاذ کے بعد ہوئی مسٹر نرسمہا راؤ نے بابری مسجد کے انہدام کے فوری رد عمل کے طور پر اعلان کیا تھا کہ مسجد اپنے سابق مقام پر دوبارہ تعمیر ہوگی لیکن وہ آہستہ آہستہ اپنے اس موقف سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ان کارکنوں کی گرفتاری جن کا تعلق راشٹریہ سویم سیوک سنگھ سے تھا مسٹر اٹل بہاری باجپائی کے محض چوبیس گھنٹے کے برت کے بعد روک دی گئی منہدم شدہ مسجد کے مقام پر رکھی گئی رام للہ کی مورتیوں کے درشن کا مسئلہ ہائی کورٹ کی بنچ کے سامنے ہونے کے باوجود اس کی اجازت دے دی گئی وزیر اعظم یا وزیر داخلہ یا وزیر تعلیم کی اس توجیہہ کو کون مان سکتا ہے کہ اس اجازت کا تعلق مرکزی حکومت سے نہیں ہے بلکہ یہ فیصلہ فیض آباد کے مقامی حکام نے کیا ہے اتنے اہم مسئلہ پر اتنی معمولی حیثیت کے سرکاری ملازمین بغیر اقتدار اعلیٰ کے مشورے کے خود اپنی صوابدید پر کیسے اقدام کرسکتے تھے! یہ سب باتیں واضح طور پر اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ مرکزی سرکار فرقہ پرست طاقتوں کے دباؤ کے سامنے یکسر لاچار و بے بس ہے۔

دوسری طرف بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور اس طرح کی دوسری جماعتیں اپنی معنویت بالکل کھو چکی ہیں اور اب ان کے وجود کا کوئی جواز نہیں ہے وہ جب نئی بنائی مسجد کی حفاظت کرنے سے قاصر رہیں تو اب ان سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ حکومت کو بابری مسجد کی اس کے سابق مقام پر دوبارہ تعمیر کے لئے مجبور کرسکیں گی۔ ان کے بعض لیڈروں کے اس طرح کے بیانات کو مسئلہ یو این او میں اٹھایا جائے گا اسے سلجھانے کے بجائے اور زیادہ الجھا دیں گے۔

اب ہمارے مطالبے صرف دو ہونے چاہئیں اور اپنے ان مطالبوں پر ہمیں شدت سے اصرار کرنا چاہئے کہ وہ لوگ جو اس فریب دہی کے مرتکب ہوئے ہیں اور اب بھی ہو رہے ہیں اپنے عہدوں اور مناصب سے دستبردار ہوں اور دوسرے بابری مسجد کو بہر صورت اپنی سابق جگہ پر تعمیر کیا جائے ۶ دسمبر کے واقعہ ہائلہ نے قانونی اور اخلاقی صورت حال یکسر تبدیل کردی ہے اب مسلمانوں کی کسی تنظیم کو اس معاملے میں موجودہ ارباب اقتدار کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہئے۔

"التوعیہ" جنوری ۱۹۹۳ء

معذرت کا ایک لفظ بھی نہیں

ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری اندرجیت گپتا سے بشاکھا ڈے سرکار کا انٹرویو

سوال: بی جے پی نے جب حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی تو وہ پارلیمنٹ میں بالکل الگ تھلگ پڑ گئی تھی۔ کیا بی جے پی کی یہ پوزیشن آئندہ کے سیاسی تال میل کا اشارہ ہے؟

جواب: یہ درست ہے کہ بی جے پی دفاعی موقف اختیار کرنے پر مجبور تھی اور سب ہی اس پر حملہ کر رہے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اٹل بہاری باجپائی بھی اپنی کوئی گفتار نہیں دکھا سکے۔ میں انہیں الزام بھی نہیں دیتا۔ ان کا کام بہت مشکل تھا۔ مگر الگ تھلگ پڑ جانے کی اصطلاح ایک سستی اصطلاح ہے۔ پارلیمنٹ کی چار دیواری میں وہ الگ تھلگ پڑ گئی ہوگی مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کے باہر ہندو جذبات سے بھی کٹ گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ملک میں جو کچھ ہوا اس کے سنگین اور شدید مضمرات ہوں گے۔ ان واقعات سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفسیاتی تقسیم بہت بڑھ گئی ہے۔ اسے بھرنے میں کافی وقت لگے گا۔ برسوں سے ہندوؤں کے ذہنوں میں جو زہر بھرا گیا ہے اس کی وجہ سے ان لوگوں کو شدید مشکلات سے دوچار ہونا ہوگا جو بی جے پی سے لڑنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے اپنی لوک سبھا کی تقریر میں کہا ہے، یہ ایک سیاسی لڑائی ہے۔ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جس سے محض انتظامی (ایڈمنسٹریٹو) اقدامات کے ذریعہ نمٹا جا سکتا ہے۔ سیاسی اور نظریاتی جدوجہد ایک طویل جدوجہد ہے۔ قطعی اس نقطہ نظر سے میں نہیں سمجھتا کہ بی جے پی "الگ تھلگ" پڑ گئی ہے۔ شاونی اور زہریلا مسلم دشمن پرچار برسوں سے کیا گیا ہے اور جس سے لوگوں کے ذہن آلودہ ہوئے ہیں اسے اتنی آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: ایک مکتب فکر کا خیال ہے کہ مشترکہ محاذ کے ذریعہ بی جے پی کا موثر ڈھنگ سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ خاص طور سے ایسی حالت میں جبکہ ہر ایک چناؤ کی اصطلاح میں بات کرتا ہے۔

جواب: دیکھئے میں کہوں گا کہ یہ پسندیدہ بات ہے۔ میں چناؤ کے تعلق سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایک وسیع ترین مخالف فرقہ پرستی پلیٹ فارم تیار کرنا ضروری ہے۔ اس کے لئے ہمیں بعض مخصوص اقدامات کرنے ہوں گے۔ ہم مختلف مہمیں شروع کرنے، نچلی سطح پر عوام تک جانے کی بات کر رہے ہیں۔ اس کے لئے جلسے، جلوس، پدیاترائیں، امن مارچ، سیمینار وغیرہ منظم کئے جائیں۔ یہ اپنی جگہ اہم ہیں مگر یہ نظریاتی تعصب کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں ہوں گے۔ وہ پارٹیاں جو دوسری کو تو کچھ ہوا اس کی مخالف ہیں اور اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہیں انہیں کسی نہ کسی طرح کا پلیٹ فارم تیار کرنا ہوگا۔ ہمیں عوام کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ ہندو مت کے نام پر جو کچھ کیا گیا وہ دراصل ہندو مت پر بھی حملہ ہے۔

سوال: کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کانگریس سے بھی ہاتھ ملائیں گے؟

جواب: اب تک کانگریس نے اس مسئلہ کی سنجیدگی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ ہم نے کہا کہ سب سے بڑی اور پرانی پارٹی کی حیثیت سے کانگریس کو اپنی بنیادوں کو منظم اور سرگرم کرنا چاہئے۔ اگر ہمارے [illegible] دیکھیں گے کہ کانگریس بھی عوامی سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہی ہے تو ان کا خیر مقدم [illegible] اور کانگریس کے ساتھ مخالف فرقہ پرستی مہم میں شریک ہوں گے۔ مگر اب تک کچھ ایسا نظر نہیں آتا۔ صرف ایک [illegible] اچھی اچھی باتیں کہیں کہ ہمیں مل کر کام کرنا چاہئے مگر اس کے بعد سے خاموشی ہے۔ کیسی سیاسی [illegible] ہے؟ انہیں دوسری پارٹیوں سے رابطہ قائم کرنا چاہئے اور [illegible] مہم شروع کرنی چاہئے۔

سوال: نیشنل فرنٹ (قومی مورچہ) کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا وہ کانگریس کی سرگرمی میں ایسی مہم میں شریک ہوگا؟

جواب: دیکھئے، ہماری طرف سے بھی بعض مسائل ہیں۔ مثال کے طور پر تیلگو دیشم کہتی ہے کہ آندھرا پردیش میں اس کی اصل لڑائی کانگریس سے ہے اس لئے وہ کانگریس کے ساتھ مشترکہ محاذ میں شرکت کے بارے میں زیادہ دلچسپی نہیں دکھاتی۔ بلاشبہ ہم انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سوال: کیا بایاں محاذ کانگریس اور نیشنل فرنٹ کے درمیان پل کا فرض انجام دے گا؟

جواب: چند دنوں قبل ایک میٹنگ میں وی پی سنگھ نے دو ٹوک لفظوں میں کہا کہ حالانکہ ہم وزیر اعظم کے استعفے کی مانگ کر رہے ہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ فی الوقت یہ ترجیحی ترتیب نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اصل لڑائی تو فرقہ پرستوں سے لڑنی ہے مگر اخبارات میں یہ باتیں چھپتی ہی نہیں ہیں مگر وی پی سنگھ جو کہتے ہیں وہ اپنی پارٹی کے تمام لوگوں کی طرف سے نہیں کہتے۔ مثال کے طور پر ان کی پارٹی میں عدم اعتماد کی تحریک پر ووٹ کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ ایک دو لوگ کہہ رہے ہیں کہ بی جے پی کی تحریک عدم اعتماد کی حمایت کی جائے۔ ان کے لیڈروں کے مختلف خیالات ہیں اور آئندہ ہونے والے دوروں کے بارے میں [illegible] ان کے انداز فکر کو متاثر کرتی ہے۔

سوال: پارلیمنٹ میں اپنی تقریر میں آپ نے وزیر اعظم کی سادہ

ری کا حوالہ دیا کیا واقعی وہ اتنے سادہ لوح ہیں؟ اور اگر واقعی ایسا ہے تو کیا انہیں حکومت کی سربراہی کرتے رہنا چاہیے؟

جواب: میں سادہ لوح سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر میں نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ مجھے وہ اتنے سادہ لوح بھی نہیں لگتے۔ میں کہتا ہوں کہ نرسمہا راؤ بحران سے نمٹنے میں بری طرح سے ناکام رہے ہیں۔ ان کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی جانی چاہیے۔ بدترین بات یہ ہے کہ ان کی زبان سے معذرت کا ایک لفظ تک ادا نہیں ہوا۔ انہوں نے سب کو یقین دلایا تھا کہ اس ڈھانچے کی حفاظت کی جائے گی مگر وہ حفاظت نہیں کر سکے۔ کیا اس کے لئے انہیں کم سے کم معذرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے؟ ایسے لمحات میں خود کو جائز ٹھہرانے کا موقف درست نہیں ہے۔ اگر وہ ایک ایسے وزیر اعظم کی حیثیت سے یاد رکھے جانا چاہتے ہیں جو راست گو اور ایماندار تھا تو انہیں ایسا (معذرت تک ادا نہ کرنے والا) موقف نہیں اپنانا چاہیے۔

ایک لحاظ سے وہ سادہ لوح ہیں کیونکہ انہوں نے یقین کیا کہ کلیان سنگھ ڈھانچے کی حفاظت کے لئے مرکزی فورسز استعمال کریں گے۔ یہ بالکل مہمل بات تھی۔ بی جے پی کا پورا [illegible] ہی الگ تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہوا اس کے لئے نرسمہا راؤ بھی ذمہ دار ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے خود گدی چھوڑ دیتے۔

سوال: بائیں بازو کی پارٹیاں ان کے استعفے پر اصرار کیوں نہیں کر رہی ہیں؟

جواب: اس وقت ان کے استعفے کا مطالبہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ کوئی یکرخی حکومت ضروری ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی بھی حکومت نہ رہے۔ ہاں آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وزیر اعظم کو بدلا جائے۔ مگر یہ تو حکمران پارٹی کا کام ہے۔ اسے طے کرنا ہوگا کہ وہ انہیں بدلنا چاہتی ہے یا نہیں۔ صاف ہے کہ وہ (حکمران پارٹی) ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی یا وہ اس کے موڈ میں نہیں ہے۔ پھر شور مچانے سے کیا فائدہ ہے کہ "وہ استعفیٰ دیں، استعفیٰ دیں" جبکہ آپ کو پتہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔

سوال: حکمت عملی کے نقطہ نظر سے کیا بی جے پی لیڈروں کی گرفتاری اور ان کی ریاستی حکومتوں کی برطرفی مناسب تھی؟

جواب: گرفتاریاں ناگزیر تھیں۔ ان لیڈروں نے اپنی کارروائیوں سے اسے ناگزیر بنا دیا تھا۔ کوئی کتنا بھی بڑا لیڈر کیوں نہ ہو قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ مگر میرے خیال میں حکومتوں کی برطرفی جلد بازی میں کی گئی۔ چیف منسٹر کہلاتے رہے تھے کہ ان کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ ایک ایسی تنظیم کا فرد حکومت کا سربراہ نہیں ہو سکتا جس پر پابندی عائد کی گئی ہو مگر ہمارے ملک میں ایک دستور بھی ہے۔ مرکز کو مناسب حد تک انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اس کو یہ ثابت کرنا تھا کہ کس طرح ریاستی حکومتیں دستوری ہدایات کی خلاف ورزی کر رہی ہیں اور مرکز کے احکامات کو نافذ کرنے سے انکار کر رہی ہیں۔ ایسا نہ کرنے کی وجہ سے بعض لوگ سمجھیں گے کہ انہیں صرف اس لئے برطرف کیا گیا کہ وہ بی جے پی کی حکومتیں تھیں۔ میرے خیال سے کسی حد تک بدحواسی میں اٹھایا گیا قدم ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں اب ایودھیا مسئلہ کو کس طرح حل کیا جانا چاہیے؟

جواب: مسجد کی ازسرنو تعمیر کا مسئلہ ہے جس کا اعلان وزیر اعظم نے اس کے مضمرات پر غور کئے بغیر کیا ہے۔ میری رائے میں مسلمانوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہوگا کہ وہ اصرار کریں کہ مسجد اسی جگہ تعمیر کی جائے۔ اس وقت جو [illegible] ہے اسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے مزید مشکلات پیدا ہوں گی۔ مسلمان ہی سب سے زیادہ مصیبت سے دوچار ہوں گے۔ ہم مسلم لیڈروں کو قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ جو کچھ ہم سے تعمیر ہوگا وہ [illegible] مسجد تو نہیں ہو سکتی [illegible] تو صرف ایک [illegible] مسجد تعمیر ہو سکتی ہے [illegible] ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ کچھ فاصلہ [illegible] کر مسجد اور [illegible] کی تعمیر ہو۔ جس جگہ مسجد تھی اسے شہیدوں کی یادگار یا ایسی ہی کوئی یادگار بنایا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا ایودھیا کے واقعات بائیں بازو کی ناکامی کو بھی اجاگر نہیں کرتے؟ ایسا لگتا ہے کہ پورے ایودھیا معاملہ میں بائیں بازو کا کوئی کردار ہی نہیں تھا......

جواب: دیکھئے آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آپ کا کوئی کردار ہی نہیں تھا مگر آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی ناکام ہوئے۔ اتر پردیش کبھی بھی ہمارا گڑھ نہیں تھا۔ میں مانتا ہوں کہ بائیں بازو کی طاقتیں کسی بھی ریاست میں اتنی طاقتور نہیں ہیں کہ عوام کے شعور کو متاثر کر سکیں۔ ملک سے منصوبہ بند طریقے سے نظریاتی جدوجہد کے ذریعہ حاصل کرنا ہوگا۔ بائیں بازو کی مہم بھی جستہ جستہ ہی رہی ہے۔ ہمیں ابھی کچھ نتائج اخذ کرنے ہوں گے۔ ہم نے اب تک اس پر غور نہیں کیا ہے۔ ہم اس پر غور کرنے والے ہیں، تب ہم کو واضح طور پر پتہ چلے گا کہ ہماری ناکامیاں کیا ہیں، ان کی وجوہات کیا ہیں اور انہیں دور کرنے کے لئے کیا کرنا ہوگا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

انتشار مارچ ۹۳ء (بشکریہ سنڈے آبزرور)

انہدام کا ریہرسل پہلے سے

شمیم فیضی، ایڈیٹر حیات، اجے بھون، کوٹلہ مارگ، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

پوری قوم کا سر شرم سے جھک گیا ہے۔ نہ صرف ایک سیکولر جمہوری ملک بلکہ مہذب معاشرہ کی حیثیت سے بھی ہندستان کو وقار مٹی میں مل گیا ہے۔ قانون کی حکمرانی کے اصول، عدلیہ کے احکامات اور دستور ہند کو پیروں تلے روندنے والے فسطائی درندوں نے صرف بابری مسجد نہیں ڈھائی ہے بلکہ انہوں نے ملک کے سیکولر جمہوری تانے بانے کو بھی آگ لگا دی ہے۔

سب سے زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ یہ ہولناک جرم کرنے کے بعد سنگھ پریوار اظہار ندامت کے بجائے اس سنگین جرم کیلئے بےبنیاد، بےتکے دلائل پیش کر رہا ہے۔ ایک طرف یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ جوش و خروش میں کارسیوک بے قابو ہو گئے تھے تو دوسری طرف اسی تھیوری کا پرچار کیا جا رہا ہے کہ قیادت نے کنٹرول کھو دیا تھا۔ مگر اخبارات میں جو حقائق شائع ہوئے ہیں ان سے واضح ہے کہ "سیاہ اتوار" کے واقعات نہ صرف منظم اور منصوبہ بند تھے بلکہ ان کی پہلے سے ریہرسل بھی کی گئی تھی۔ نہ صرف مسجد پر ہتھوڑے برسانے والے اس سے واقف تھے بلکہ قائدین بھی پوری طرح سے سازش میں ملوث تھے۔ شیوسینا کے ممبر لوک سبھا موریشور ساوے نے کہا ہے کہ مسجد منہدم کرنے کا منصوبہ بہت پہلے بنایا گیا تھا اور اس کی ساری تفصیلات سے لال کرشن اڈوانی کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔

یہ سازش تین مرحلہ والی سازش تھی: مسجد منہدم کرنا، اخبار نویسوں کو ہندستانی تاریخ کے اس گھناؤنے جرم کی تاریخ لکھنے سے روکنا اور فیض آباد ایودھیا میں اقلیتی فرقہ کا قتل عام کرنا۔

اتر پردیش حکومت نے سپریم کورٹ سے تحریری وعدہ کیا کہ ایودھیا میں صرف علامتی کار سیوا ہوگی جس کا مطلب "بھجن کیرتن" ہے۔ نہ تو کوئی تعمیری سرگرمی ہوگی اور نہ ہی مسجد کے ڈھانچہ کو ہاتھ لگایا

تین گھنٹے بعد ایک بھی گنبد باقی نہ رہا

جائے گا مگر اس کے ساتھ ہی سنگھ پریوار کے لیڈروں نے مذہبی جنون بھڑکانے کی مہم شروع کردی۔ سنگھ کے ڈھنڈورچی آرگنائزر (۱۳ دسمبر ۱۹۹۲ء) نے لکھا ہے۔

" اس حکمت عملی (اترپردیش حکومت کی جانب سے سپریم کورٹ سے جھوٹے وعدے کی حکمت عملی) سے صفوں کے ارکان میں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو اور سنگھ پریوار کے دشمن اس کا غلط استعمال نہ کر پائیں، اس لئے ایل کے اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی کو کہا گیا کہ وہ رتھ یاترا شروع کردیں۔ متذکرہ ان دو شخصیات سے یاترا شروع کرنے کا مطلب یہ تھا کہ متعلقہ حلقوں کو پتہ چل جائے کہ پارٹی (بی جے پی) ٹکراؤ کو وسعت دینا چاہتی ہے۔"

ان دونوں یاتراؤں کے دوران بی جے پی کے "ذمہ دار" لیڈروں نے کھلم کھلا عدالت عالیہ کے احکامات کی خلاف ورزی کی اپیل کی۔ اشوک سنگھل نے کہا کہ "عدالتی فیصلوں کا اطلاق افراد پر ہوتا ہے کارسیوکوں پر نہیں۔" لال کرشن اڈوانی نے کہا کہ کارسیوا "کدال اور اینٹ سے ہوگی۔"

۵ دسمبر کو ہی یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ دوسرے دن ایودھیا میں کوئی "انتہائی ڈرامائی اقدام" کیا جائے گا۔ سنت پرتیہ گوپال داس کا نے تو اخبار نویسوں سے یہ بھی کہہ دیا کہ مسجد پر حملہ ہوگا مگر حملے کے لئے یہ دلیل دی کہ یہ حملہ "مسلم لیگی، کمیونسٹ اور وی پی سنگھ کے لوگ کریں گے۔"

روزنامہ "پائنیر" کے فوٹوگرافر پروین جین نے ۸ دسمبر کے شمارے میں لکھا ہے۔

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد اچانک منہدم کی گئی تو پھر اسی بات کو سنئے۔ ہفتہ (۵ دسمبر) کے دن بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک ممبر پارلیمنٹ نے مجھے اتوار کے پروگرام کے بارے میں پیشگی وارننگ دی تھی۔

"وہ مسکراتے ہوئے مجھے اس جگہ لے گئے جہاں کچھ کارسیوک ۴۶۵ برس پرانی مسجد کو گرانے کی ریہرسل کر رہے تھے۔ کارسیوک رسی اور لوہے کے تاروں کی مدد سے ایک بڑی چٹان کو کھینچ رہے تھے۔ دوسرے دن کے واقعات نے ثابت کردیا کہ مسجد کو اسی طرح گرایا گیا جس طرح کی ریہرسل ایک دن پہلے کی گئی تھی۔

مسجد کے پاس ہی ایک کنکریٹ کا چبوترا تیار کیا گیا تھا کارسیوک اسی کی سمت دوڑنے کی ریہرسل کر رہے تھے۔ یہ اتوار کو مسجد پر دھاوا بولنے کی ریہرسل تھی۔

ایسی ہی "جھوٹی کارسیوا" اور ریہرسل کا حوالہ اسٹیٹسمین کے نامہ نگار سنجے کاؤ نے بھی اپنی رپورٹ میں دیا ہے جو ۴ اور ۵ دسمبر کے شمارے میں شائع ہوئی (ان کی رپورٹ ہم من وعن اسی شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔

سنجے کاؤ نے اپنی رپورٹ میں سازش کے تیسرے حصے کی بھی نشان دہی کردی ہے۔ انہوں نے ایک کارسیوک کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایودھیا اور فیض آباد کے تمام مسلمانوں کے گھروں کی نشان دہی کرلی گئی ہے۔ "پیٹریاٹ" کے نامہ نگار ومن کرپال نے ۸ دسمبر کو جو رپورٹ فیض آباد/ایودھیا کے مسلمانوں کی تباہی پر بھیجی ہے اس سے سنجے کاؤ کی رپورٹ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

مسجد کو منہدم کرنے کی سازش پر ٹائمز آف انڈیا کے نامہ نگار سائیل داس گپتا نے لکھا ہے

"ڈھانچہ کو ماہرین نے توڑا ہے۔ ہتھوڑے، کدال اور رسیاں مسجد کو منہدم کرنے کے لئے استعمال کی گئیں۔ انتہائی چالاکی سے مرکزی فورسز کے راستہ کو بند کیا گیا (سڑکوں پر ڈرم پھیلاکر، جلتے ہوئے ٹائر پھینک دیئے گئے) پوری کارروائی انتہائی منظم ڈھنگ سے کی گئی۔ منہدم کرنے کی کارروائی میں کبھی بھی دو ہزار سے زیادہ کارسیوک شامل نہیں ہوئے۔ باقی کارسیوک رام کتھا کنج میں لیڈروں کی تقریریں سن رہے تھے۔"

"انشاء" مارچ ۱۹۹۳ء

کارسیوکوں کے اعترافات

وہ گئے، انہوں نے ڈھا دیا، وہ واپس آ گئے۔ آندھرا پردیش سے جانے والے ہزاروں کارسیوکوں کا موڈ ایودھیا سے واپس آنے کے بعد حصولیابی کی مسرت اور خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ ان کے اندر تاسف کا احساس بالکل نہیں تھا۔ ایسے بہت سے کارسیوکوں سے میری مختصر سی ملاقات کے بعد ایک معنی خیز نکتہ میرے ذہن میں یہ ابھر آیا کہ ایودھیا میں یہ پوری کارروائی پہلے سے منصوبہ بند تھی اور اس کی بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اشتراک نے پہلے سے اچھی طرح مشق کر لی تھی۔ انہوں نے ڈھانچہ کے ساتھ جو کچھ کیا اس سے میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ فرقہ پرست اشتراک ان کے ذہنوں کو تیار کرنے میں کتنی حد تک کامیاب ہو گیا کہ بدترین جرم کو بھی وہ جائز قرار دے رہے تھے اور مذہب کے نام پر اس کا دفاع کر رہے تھے۔

محبوب نگر کے ایک کارسیوک نے فرقہ پرست کٹر ذہن کے عام انداز فکر کی علامت بن کر کہا: "ہم نے وہ کام چھ گھنٹے میں کر دیا جس کو وہ (بی جے پی وغیرہ) اتنے برسوں میں نہیں کر پائے۔ ہم بات چیت اور عدالتوں پر کبھی یقین نہیں رکھتے تھے۔ ہندوؤں کی بالاتری قائم کرنے کا یہی واحد راستہ ہے!"

جب ان سے پوچھا گیا کہ اس ردعمل اور اثرات سے کیا وہ واقف ہیں تو اس کا جواب اور بھی زیادہ شرمناک تھا۔ "اب ملک نے دیکھ لیا ہے کہ ہم کیا کرنے کے اہل ہیں۔ ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ کیا ہوتا ہے، ہماری منزل صاف ہے۔ چند ہزار لوگ مارے جائیں گے۔ لیکن یہ کوئی بڑی قیمت نہیں ہے!"

کچھ کارسیوک اس "فخر و ناموری" میں نہائے ہوئے تھے اور اس ذیشان خیر مقدم پر سرور تھے جو بی جے پی آر ایس ایس کے کارکن ایودھیا سے واپس آنے پر اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے وقت کر رہے تھے۔ وہ ایودھیا کے واقعے کے بارے میں دوسروں کے ساتھ اپنی مسرتوں اور اپنے تجربوں کو بانٹنے کے لئے تیار تھے حالانکہ ان میں کچھ اپنے ناموں کو بتلانے میں جھجک رہے تھے لیکن ان میں سے کچھ اپنی ذاتی تفصیلات دینے کے لئے تیار تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی جو بالائی تعلیم یافتہ پرتوں سے تعلق رکھتے تھے وہ اپنے ناموں کا انکشاف کرنے میں جھجک رہے تھے اور اپنے پیشوں کو نہیں بتا رہے تھے۔

رگوما ریڈی دوسروں سے زیادہ تفصیلات دینے کے لئے تیار تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ ان کے آگے بڑھتے ہوئے کارکنوں کو مخفی کارروائی کی تفصیلات پیشگی دے دی گئی تھیں اور ان کو بتا دیا گیا تھا کہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھیں۔

اس نے تسلیم کیا کہ مسجد کا مسمار کیا جانا پہلے سے منصوبہ بند تھا اور ہر چیز اس دن کے لئے تیار رکھی گئی تھی۔ ان کو صاف ہدایات تھیں کہ کام کو کس طرح کیا جائے گا۔

اس کے کہنے کے مطابق کارسیوکوں کے ایک حصہ کو پولس کی گھیرابندی کو توڑنا ہوگا اور پولس کو جم کر لڑائیوں میں مصروف کیا جائیگا اور دوسرا حصہ مسجد پر دھاوا بولے گا۔ موخرالذکر حصہ کو ڈھانچہ کو منہدم کرنے کے اوزار دیئے گئے تھے اور ان کو ایودھیا میں پیشگی لایا گیا تھا اور بڑی تعداد میں اکٹھا کر لیا گیا تھا۔

ان سے دریافت کیا گیا کہ انہوں نے مسجد کو اس طرح ڈھانے کا راستہ کیوں اختیار کیا جب کہ وہ ڈائنامائیٹ کے ذریعہ اس کو اڑا سکتے تھے؟ "وہ بزدلانہ فعل ہوتا۔ ایسا سوچا گیا تھا لیکن اس کو ترک کر دیا گیا۔ ہم اس کو اپنے ہاتھوں سے ہٹا دینا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے جذبات اور طاقت کا اظہار کر دیں" اس نے بتایا۔

تمام کارسیوک کلیان سنگھ کی پولس کے بارے میں ہر اچھی بات کہہ رہے تھے۔ کھم کے راجندر نے کہا "انہوں نے ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ انہوں نے تو ہم پر لاٹھیاں تک نہیں اٹھائیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے رہنماؤں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ حکومت کے افسران نے پولس افسروں کو احکامات جاری کر دیئے ہیں کہ چاہے کچھ بھی ہو انہیں چھونا نہیں!"

ایک کارسیوک نے جو ایسٹ گوداوری کا تھا تسلیم کیا کہ بجرنگ دل نے اس مقصد کے لئے خودکشی کرنے والے دستے تیار کر لئے ہیں: دوسروں نے ہمیں بتایا کہ وہ دستے مرنے کے لئے تیار ہیں اور ان کی زندگیوں کا بیمہ کرا دیا گیا تھا۔ اس پورے واقعہ کے دوران جب وہ مسجد کو برباد کر رہے تھے تو جو تنظیمیں کہ بنا اس کی رہنمائی کر رہے تھے وہ کارسیوکوں سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ پرجوش اپیلیں کر رہے تھے کہ

> "آپ پھر بیہودہ سوالات کر رہے ہیں۔ لگتا ہے ایودھیا میں اخبار نویسوں کی جس طرح ہم نے پٹائی کی، اس سے آپ لوگوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا ہے۔"

بھرے ڈھانے کا کام وہ ڈسپلن کے ساتھ کریں تاکہ جانکنوں کو نظر انداز کیا جاسکے لیکن پھر بھی تین لوگ مارے گئے لیکن اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہ قربانی ہم نے رام کی خاطر کی ہے۔" اسی شہر کے ایک اور کارسیوک نے کہا جو پیشے سے وکیل ہیں۔

تنڈور کے ہنومنت ریڈی نے بجرنگ دل کی بھرپور تعریف کی: "انہوں نے ہمیں ہر چیز فراہم کرائی تھی یہاں تک کہ وہ بنیادی اوزار بھی ہمیں جو ہوئے تھے جیسے ہم کام بڑھا رہے تھے انہوں نے ہاتھوں میں پہنیں لوہے کی سلاخیں اور ڈھانے کے لئے دوسرے اوزار دے رہے تھے۔"

عادل آباد ضلع کے سنیش نے کہا کہ جیسے ہی مسجد ڈھانے کا کام مکمل کرلیا گیا تو وہاں کے کشیار نے ان سے کہا کہ وہ جگہ نہ چھوڑیں کیونکہ فریضہ ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ اسی دن دو گھنٹے کے بعد آدھی رات کو عارضی مندر کی تکمیل ہوگئی تھی۔

علور کے ایک کارسیوک نے فخریہ اعلان کیا کہ وہ ایودھیا صرف ایک مقصد سے گئے تھے کسی بھی قیمت پر مسجد کو ڈھانا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کی تصدیق کردی کہ جیسا قبل از وقت طے کیا جا چکا تھا وزیر اعظم کے گاؤں ونکا راکے سربراہ اس کو منہدم کرنے والے دستے کی اگلی قطار میں رکھا گیا تھا اور اس کو ڈھانے والے اوزار دے دیئے گئے تھے۔ ایک کلو میٹر تک ایک قطار میں سمنٹ کی بوریاں اور اینٹیں مندر کی تعمیر کے لئے رکھ دی گئی تھیں۔ تمام ہی کارسیوکوں نے یہ تسلیم کیا کہ ان کی بہت اچھی دیکھ بھال ہوئی اور کسی کو بھی بے آرامی کا کسی طرح بھی سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غذا بھاری مقدار میں موجود تھی۔ آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے ذرائع کے کہنے کے مطابق وافر مقدار میں اتنی غذا اسٹور کرلی گئی تھی کہ ہفتوں تک کام چل سکتی تھی۔ ہدایت ابھی بینڈ ایڈ کٹس اور دوسری سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔

"ہمارے لیڈروں نے ہمیں بتادیا تھا کہ اترپردیش حکومت نے پولس کو ہدایت کردی ہے کہ کارسیوک ایودھیا میں چاہے جو کریں، ان کے خلاف کسی بھی حالت میں طاقت کا استعمال نہ کیا جائے۔"

جب یہ دریافت کیا گیا کہ کس نے یہ انتظامات کئے تھے تو محبوب نگر کے ایک کارسیوک نے فخر کے ساتھ جواب دیا: "کون کرتا، اترپردیش میں ہماری حکومت نے کیا تھا۔"

اس سے بھی زیادہ دلچسپ بیانات بی جے پی، آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے چوٹی کے لیڈروں کے تو فریقین کے بارے میں انہوں نے بیانات دیئے جنہوں نے اس پوری کارروائی کو چلایا تھا۔ کرنول انجینئرنگ کالج کے ایک طالب علم نے کہا کہ "جب تک مسجد کا پہلا گنبد گرتا، اڈوانی اور ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی خاموش رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ہماری ہمت افزائی کرنی شروع کردی تھی۔ سادھوی رتمبرا اس پورے عرصہ میں اشتعال انگیز تقریریں کرتی رہی تھی اور چلا رہی تھی "ایک دھکا اور دو بابری ڈھانچہ توڑ دو۔"

کارسیوکوں نے اس پر اپنی خوشی کو چھپایا نہیں کہ جو سلوک کارسیوکوں نے صحافیوں کے ساتھ کیا تھا: "ایک دن پہلے ہی ہمارے رہنماؤں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ صحافیوں کے ساتھ کیا سلوک کریں کیونکہ وہ ہمارے خلاف متعصبانہ پرچار چلا رہے ہیں اور ہم نے وہی کیا جس کے وہ حقدار تھے۔ ان کو اپنے ستاروں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ وہ زندہ رہے۔"

کارسیوک اس پر بڑی تلخی محسوس کر رہے تھے کہ شیو سینا کے آقا ساری شان و عظمت چرانے کی کوشش کر رہے ہیں یہ دعویٰ کرکے کہ مسجد کو شیوسینکوں نے ڈھایا ہے: "یہ بالکل جھوٹ ہے۔ گو مہاراشٹر کا دستہ سب سے بڑا تھا لیکن ہم بھی پیچھے نہیں رہے تھے۔ آندھرا سے تقریباً ۴۰ ہزار کارسیوک گئے تھے لیکن آپریشن کی اگوائی بجرنگ دل نے کی تھی اور اس کے سرگرم کارکنوں نے اسی کی تکمیل کی تھی۔" یہی اس پر فخریہ حیدرآباد کے ایک نوجوان نے کہا۔

مسمار کرنے کے ردعمل اور اثرات کے بارے میں وہ کیا سوچتے تھے؟ ان میں سے کسی نے بھی ہندوؤں کی طرف سے مخالف ردعمل کی توقع کا اظہار نہیں کیا۔ "حقیقتاً اس سے ہمیں تقویت ملے گی اور آئندہ انتخابات میں ہم بڑا ہاتھ مارلیں گے۔ ہندو تمام ہی کھل کر اپنی تعریف کا اظہار نہیں کریں گے لیکن اپنے دلوں میں اس کا وہ خیر مقدم کریں گے۔"

اس طور پر کارسیوکوں کے اندر تاسف کا کوئی احساس نہیں ہے۔ وہ اینٹھے ہوئے ہیں اور پرامید ہیں۔ ان کو توقع ہے کہ ہندوؤں میں ابال آجائے گا اگر مسجد اسی جگہ پر پھر سے تعمیر کی جائے گی۔

اس نامہ نگار نے آخری سوال کیا: "آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" سب سے مل کر ڈرا دینے والا جواب دیا: "اسی وجہ سے پہلے صحافیوں کو مارا ہے پھر بھی آپ لوگ سبق نہیں سیکھے۔"

— "انشاء" مارچ ۱۹۹۳ء

احمد سعید ملیح آبادی کے ۴۲ اداریوں میں سے ایک

۱۔ کوئی بابر نہیں آئے گا

ہندوؤں کے ایک دھارمک لیڈر جگت گرو شنکر آچاریہ سوامی سواروپانند جی نے موودی اودم کے مقام پر دیو مندر کے "پران پرتشٹھا" مہوتسو میں اعلان کیا کہ اگر مسلمانوں کو بابری مسجد واپس چاہیے تو وہ انھیں صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب وہ دوبارہ بابر کو دعوت دے کر بلائیں۔ — تب احمد سعید صاحب نے مذکورہ عنوان کے تحت درج ذیل اداریہ مضمون قلمبند کیا۔

"سوامی جی کی خدمت میں جواباً عرض ہے کہ بابری مسجد کو حاصل کرنے کے لئے کوئی بابر سمرقند و بخارا یا کابل سے ہندوستان نہیں آئے گا۔ پانچ سو برس قبل جب بابر اپنے وطن ازبکستان میں فوجی مہموں میں مسلسل ناکامیوں کے بعد طالع آزمائی کے لئے ۱۵۲۶ء میں ہندوستان آیا تھا تو اس نے بھارت کے ہندوؤں پر حملہ نہیں کیا تھا۔ بابر کا حملہ ابراہیم لودھی کی پٹھان حکومت پر تھا جسے پانی پت کے میدان میں شکست دے کر وہ ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے مد مقابل ہندو نہیں، پٹھان حکمراں تھے جو مسلمان تھے۔ اور بابر کے چار سالہ دورِ حکومت کے بعد اس کی کابل واپسی پر جب اس کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا تو اُسے ہندوؤں نے نہیں، شیر شاہ سوری نے رگیدا تھا۔ بابر نے ہندوستان کی سلطنت ہندوؤں سے نہیں چھینی تھی، افغانوں سے چھینی تھی لہٰذا اس کا حملہ بھارت نہیں، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں پر تھا۔

"بابر نے ایودھیا میں رام جنم استھان مندر ڈھا کر اس جگہ بابری مسجد بنائی" اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ صرف کھوکھلا دعویٰ اور دھاندلی ہے لیکن پانچ سو برس پرانی بابری مسجد جسے بابر کے عہد میں اس کے ایک گورنر میر باقی نے تعمیر کرکے اپنے بادشاہ بابر کے نام سے موسوم کیا تھا، اس پر آزاد اور سوتنتر بھارت میں ہندوؤں نے جبر و استبداد سے قبضہ کر لیا ہے۔ اس کی شہادت اور ثبوت کے لئے کسی تاریخ یا دستاویز کی ضرورت نہیں۔ یہ داستان آج کی اور واردات تازہ ہے جس کی کہانی بابری مسجد کے مینار و گنبد، زبانِ خاموش سے زمانے کو سنا رہے ہیں۔ رام جنم استھان مندر ڈھانے کا کلنک بابر کے ماتھے پر نہیں لگا۔ مگر افسوس کچھ جنونی لوگوں نے ہندو دھرم کو کیسا بدنام و رسوا کیا۔ اوپر سے ایک دھارمک پیشوا کا ترجمہ ہو کر آئے اکڑنا اور خم ٹھونک کر چیلنج کرنا کہ بابری مسجد لینا ہے تو بلاؤ کسی بابر کو جو بھارت پر حملہ کرکے اُسے فتح کرے اور بابری مسجد جسے رام جنم بھومی مندر بنا لیا گیا ہے، پھر سے ڈھا کر اُس پر ہی مسجد اُٹھائے۔ چھی چھی! کیسی گھٹیا بات اور کیسے اوچھے وچار!!

"جگت گرو سوامی جی کو ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اگر ان کے بلاوے اور آواز دینے پر سچ مچ کوئی بابر آ کر بھارت میں بجاند پڑے تو تاریخ اپنے کو ایک بار پھر دوہرائے گی۔ جب اصلی بابر آیا تھا تو ہندوؤں نے اس کا مقابلہ نہیں کیا تھا، پٹھانوں نے اس کے سامنے سینہ تانا تھا اور یہ مسلمان تھے۔ سوامی جی کی للکار سن کر خلا سے کوئی نقلی بابر بھارت میں دھم سے کود ہی پڑا تو اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بار پھر مسلمان اٹھیں گے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ بھارت پر اب تک پاکستان تین بار حملہ کر چکا ہے۔ ہر حملے کے وقت ہندو، مسلمان اور سکھ عیسائی کندھے سے کندھا ملا کر بھارت کی رکھشا کرنے اور دشمن سے لوہا لینے میدانِ جنگ میں جاتے رہے ہیں۔ اور سب کا خون ایک ساتھ مورچوں اور دمدموں پر بہتا رہا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہندو فوجی کے خون کی دھارا، مسلمان فوجی کے خون کی دھارا سے الگ بہی ہو۔ نہ اُن کی دھاراؤں کو شناخت کرکے الگ کیا جا سکا۔

"کیا سوامی جی کو معلوم ہے کہ سیالکوٹ سیکٹر میں شکر گڑھ، پاکستان کا بہت ہی مضبوط اور ناقابلِ تسخیر قلعہ رہا ہے۔ ہر جنگ میں اُسے فتح کرنے کے لئے بھارت کے ویروں کو اپنے لاشوں کی سیڑھی بنانا پڑی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شکر گڑھ کا مورچہ کسی طرح فتح نہیں ہو رہا تھا۔ انڈین آرمی نے کئی یلغاریں کیں مگر پاکستان کے جاں بازوں نے پسپا کر دیا۔ تب فیلڈ کمانڈروں نے مختلف یونٹوں سے مسلمان فوجیوں کو جمع کرکے شکر گڑھ کے

مورچے پر آگے بڑھایا۔ دونوں جانب سے اس زور سے "نعرۂ تکبیر" بلند ہوا کہ توپوں کی گرج اور ٹینکوں کی دھمک اُس کے آگے ماند پڑ گئی۔ دونوں ہی نے اپنے اللہ کو آواز دی۔ بھارت کے مسلم جوانوں کا نعرۂ تکبیر زیادہ زوردار اور بھاری تھا۔ شکر گڑھ کا مورچہ ان کے سامنے ریت کے قلعے کی طرح بکھر گیا۔ اللہ نے فتح و نصرت بھارت کی طرف بھیجی کیونکہ بھارت حق پر تھا، پاکستان حملہ آور تھا۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، نہ ان کا ساتھ دیتا ہے۔ فوجی تاریخ کے اس ہوشش رُبا کارنامے کا ذکر اُس وقت کے وزیر دفاع بابو جگ جیون رام نے ۱۹۷۱ء تقریروں میں جا بجا کر کے مسلمانوں کو شاباشی دی تھی۔ ۱۹۷۶ء میں کلکتے کے راج بھون میں ایک گفتگو کے موقع پر جب ہم نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو اس واقعہ کی یاد دلائی تو انھوں نے بھی تصدیق کی اور ہماری بات سے اتفاق کیا کہ مادرِ وطن کی حفاظت میں مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے تو وہ کسی بھی دشمن کے دانت کھٹے کر سکتے ہیں۔ مر مٹیں گے مگر نہ اپنے وطن عزیز پر آنچ آنے دیں گے، نہ اپنے اسلاف کے نام کو بٹہ لگنے دیں گے۔

اور ابھی چند روز پہلے کی بات ہے۔ سرحد پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے اور دشمن کے ٹڈی دل پر تول رہے تھے تو اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے انڈین آرمی ایڈوانس مورچوں پر بڑھی۔ اُس وقت انڈین آرمی میں کتنے ہی بریگیڈیر عثمان اور ٹینک شکن ویر عبدالحمید سر سے کفن باندھے تیار کھڑے تھے جن کی ماؤں اور بیویوں نے اپنے پیاروں کو یہ کہہ کر رخصت کیا تھا کہ پیٹھ دکھا کر منہ پر کالک نہ لگانا، جامِ شہادت پی کر خون سے لال وردی پہنے سرخرو آنا۔ سوامی جی سے ہم پوچھتے ہیں کہ یہ مسلمان جوان جب سرحدوں پر وطن عزیز کا دفاع کرنے کے لئے اپنا آخری قطرہ خون بہاتے ہیں اور اُن کے جسموں کے چیتھڑے مشین گن کی گولیوں اور بموں سے اُڑتے ہیں تو کیا وہ صرف اپنی مسجدیں بچانے جاتے ہیں؟ کیا وہ بھارت کے مندروں اور گرجوں کی حفاظت کے لئے اپنی جان نہیں دیتے؟ اور کیا اسی طرح ہمارے ہندو اور سکھ دیر جوان اپنے مندر اور گردوارے بچانے میدانِ جنگ میں جاتے ہیں؟ نہیں، یہ سب بھارت ماتا کے سپوت اس دیش کے ایک ایک درخت اور کنکر پتھر کی حفاظت کے لئے اپنی عزیز جان نچھاور کر دیتے ہیں۔

"کیا ہمارے جوان اسی لئے اپنی جان دیتے ہیں کہ اُن کے پیچھے کچھ جنونی لوگ اور اُن کو بہکانے والے مذہب کے ٹھیکیدار مندر، مسجد، گردوارے اور گرجے کو برباد کریں؟ اس جذبۂ ایثار و سرفروشی کی تمنا کو وہ لوگ کیا خاک سمجھیں گے جو دوسروں کی محنت پر پلتے اور مفت کی دودھ ملائی کھاتے ہیں۔ یہ سب بھارت کے اندرونی دشمن ہیں۔ اُن کے لئے تو ایک بابری مسجد کے نام پر کسی بابر کا آجانا ایک کھیل ہوا مگر بھارت کے جانبازوں کے لئے تو ایک قیامت سے کم نہیں۔ سوامی جی کو یہ کہہ کر ہم مایوس کئے دیتے ہیں کہ کوئی بابر باہر سے حملہ کرنے اور بابری مسجد واپس لینے نہیں آئے گا۔ سوامی جی بھلے ہی کسی بابر کو آواز دیتے رہیں مگر مسلمان کسی بابر کو نہیں بُلائیں گے اور کوئی ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھے گا تو اس کی آنکھ نکال لیں گے۔ وطن کی محبت ہم جانتے ہیں۔ سوامی جی کیا جانیں جن کے من میں محبت کی جگہ نفرت کی بھٹی جل رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ بابری مسجد کو واپس لینے کوئی بابر باہر سے نہیں آسکتا۔ اسی بھارت سے ایک دن کوئی رام اُٹھے گا اور نئے راون کو مار کر اپنی ایودھیا میں انصاف کا بول بالا کرے گا۔"

(۱۰ فروری ۱۹۹۳ء)

کشمیر کے مندروں کے ڈھانے کا سفید جھوٹ

انڈیا ٹوڈے کی تحقیقاتی رپورٹ

"اجودھیا سے متعلق شہری حقوق اور آزادی کی تنظیموں کی خاموشی کو دیکھئے! کیوں؟ اس لئے کہ یہ معاملہ ہندو مذہب سے متعلق ہے اگر یہ مسلمانوں کے مذہب سے متعلق ہوتا تو ان تنظیموں کا ردعمل مختلف ہوتا۔ وہ تمام سیاسی پارٹیاں جو مسجد کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں انھوں نے کشمیر میں توڑے جانے والے ۵۵ مندروں کے سلسلہ میں ایک لفظ تنقید کا نہیں کہا۔ کوئی اس بارے میں بات نہیں کرتا۔ یہ دوہرے معیار کیوں؟"

(ایل کے ایڈوانی فروری ۱۹۹۱ء)

اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد منہدم کرے جانے کے چند روز بعد

ایل کے ایڈوانی کا بیان

"جب کشمیر میں ہم مندروں کی بے حرمتی کی جارہی تھی تب کوئی آواز نہیں اٹھی۔ یہ دوہرے معیار کیوں؟"

"کشمیر میں سیکڑوں مندروں کو تباہ کر دیا کسی نے انگلی نہیں اٹھائی کیا ہندوؤں کے جذبات نہیں ہیں؟" (بی جے پی کے جنرل سکریٹری کیدار ناتھ ساہنی کا بیان ۳۰ جنوری ۱۹۹۳ء)

"کشمیر میں ۱۹۸۶ء میں ۴۴ مندروں کو نقصان پہنچایا گیا۔"

(جموں میں واقع بی جے پی کے دفتر کا بیان)

دو برس قبل ایک سینئر آر ایس ایس لیڈر نے معروف صحافی بی جی ورگیز کو ۶۲ مندروں کی فہرست دی تھی جن کے متعلق آر ایس ایس کا دعوی یہ تھا کہ انہیں ۱۹۹۰ء میں کشمیری جنگجوؤں نے تباہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔۔۔

جھوٹ، جھوٹ اور صرف جھوٹ۔۔۔۔۔۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہندوتو کی چیمپئن طاقتوں نے مندر مسجد معاملہ میں دروغ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ مذہب کے توے پر روٹیاں سینکنے والوں نے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے لئے جھوٹ کو شعار بنا رکھا ہے۔ سب سے پہلے معروف انگریزی صحافی اور انڈین ایکسپریس کے سابق ایڈیٹر بی جارج ورگیز نے کشمیر میں مندر توڑے جانے کے آر ایس ایس لیڈروں کے جھوٹ کی پول کھولی۔ ورگیز نے ۱۰ مئی اور ۱۱ جون کو انڈین ایکسپریس میں دو مضامین اس



سلسلہ میں لکھے جن میں ایک کا عنوان "کہاں ہیں کشمیر میں توڑے گئے مندر" اور دوسرے کا عنوان تھا "بی جے پی کشمیر میں مندروں کے توڑنے کے پروپیگنڈے کی حقیقت"۔

بی جے پی کا جھوٹ سفید سے سفید تر ہوتا چلا گیا ہندوتو کے چیمپئن جس لیڈر کو دیکھئے مندروں کی تعداد کے متعلق الگ ہی راگ الاپ رہا ہے۔ جیسا مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے ستر جھوٹ بولنے پڑتے ہیں لو آر ایس ایس اور ان کے ہم نوا اب بھی کر رہے ہیں معروف انگریزی جریدے انڈیا ٹوڈے کے ۲۸ فروری ۱۹۹۳ء کے شمارے میں اس کے نمائندے ہریندر باویجہ نے کشمیر میں مندروں کے توڑے جانے کے بی جے پی کے طومار باندھنے کی حقیقت بیان کی ہے۔ باویجہ کی قیادت میں انڈیا ٹوڈے کی تحقیقاتی ٹیم نے بی جے پی کے ذریعہ فراہم کردہ فہرست میں درج ۲۳ مندروں کا دورہ کیا وہاں کے پجاریوں سے باتیں کیں، ۲۳ مندروں کی حفاظت پر مامور بی ایس ایف کے جوانوں سے تصدیق کی تو فوٹو اتارے وہاں آس پاس کے رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں سے پوچھ تاچھ کی تو بہت چلا کر بی جے پی کا پروپیگنڈہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ بی جے پی کے بڑے بڑے لیڈر کہتے پھر رہے ہیں کہ اننت ناگ ضلع کے گاؤں دیال گام کے مندر کو پتھراؤ کر کے بری طرح نقصان پہنچایا گیا تھا اور دیال گام کے اکلوتے خاندان کے پنڈت سربراہ اور

ان مندروں کی فہرست جنکے متعلق غلط پروپیگنڈہ کیا گیا

مندر کا نام	بی جے پی کا پروپیگنڈہ	حقیقت کیا ہے
دشنامی اکھاڑا (سرینگر)	پوری طرح جلا دیا گیا	محفوظ
گنپت یار مندر (سرینگر)	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
رگھوناتھ مندر (سرینگر)	جلا دیا گیا	اس وقت معمولی آتشزنی ہوئی جب [illegible]
شو مندر (جواہر نگر، سرینگر)	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
بنہامہ مندر (سرینگر)	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
شو مندر (باربرشاہ، سرینگر)	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
جے دیوی مندر (بج بہاڑہ)	بے حرمتی کی گئی	محفوظ
وجیشور مندر (بج بہاڑہ)	توڑا گیا نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
شو مندر (بج بہاڑہ)	توڑا گیا نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
رگھوناتھ مندر (اننت ناگ)	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
گوتم ناگ مندر (اننت ناگ)	توڑ دیا گیا	محفوظ
دیال گام مندر (اننت ناگ)	پتھراؤ میں شدید نقصان پہنچا	محفوظ
کھوجن لارکی پورہ اننت ناگ کے تین مندر	پوری طرح جلا دئے گئے	۱۹۹۰ء میں نقصان پہنچایا گیا تھا [illegible]
واسیوہ مندر (اننت ناگ)	۱۹۹۰ء میں نقصان پہنچایا گیا [illegible]	
شیل پتری مندر (بارہ مولہ)	نقصان پہنچایا گیا	۱۹۹۰ء میں نقصان پہنچا گیا
بھیروں ناتھ مندر (بارہ مولہ)	نقصان پہنچایا گیا	۱۹۹۰ء میں نقصان پہنچایا گیا
بھیروں مندر	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
روپا بھوانی مندر وسکور گندربل	جلا دیا گیا	محفوظ
کھیر بھوانی مندر گندربل	راکٹ سے نقصان پہنچا	محفوظ
شو مندر گندربل	جلا دیا گیا	محفوظ
مٹن مندر اننت ناگ	لوٹ کر جلا دیا گیا	محفوظ

مندر کے پجاری بیشور ناتھ گیتا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اس مندر کو آج تک کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ یہ کہہ کر بیشور ناتھ نے مندر کا دروازہ کھول کر دکھایا کہ وہ صحیح اور سالم ہے۔ بیشور ناتھ نے بتایا کہ ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۱ء کے عرصے میں جب جنگجو یانہ سرگرمیوں میں اضافہ ہوا تو گاؤں کے کئی پنڈت خاندان نقل مکانی کر گئے۔ مگر وہ نہیں گئے اور گاؤں کے مسلمانوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ یہیں رہیں اور مندر میں پوجا پاٹ کرتے رہیں۔ باویجہ کی رپورٹ کے مطابق بنیادی حقیقت یہ ہے کہ بارہ مولہ کے شیل پتر اور بھیروں مندر کو چھوڑ کر وہ تمام مندر پوری طرح محفوظ ہیں۔ جن کے متعلق بی جے پی آر ایس ایس اور اس کے چیلے چانٹے کہتے پھر رہے ہیں کہ انہیں جلا دیا گیا انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا اور ان کی بے حرمتی کی گئی۔

بی جی ورگیز کا اپنے ایک مضمون میں کہنا ہے کہ کشمیر کے کمشنر نے اننت ناگ بارہ مولہ اور سری نگر کے ڈپٹی کمشنروں سے تحقیقات کرائی انھوں نے پجاریوں اور مندر کے درشن کے لئے آنے والوں سے بات چیت کر کے رپورٹ دی جن مندروں کی فہرست میں تباہ شدہ اور خاکستر بتایا گیا ہے نہ وہ تباہ ہوئے ہیں نہ انہیں جلایا گیا ہے نہ ویسا نقصان ہوا ہے جیسا کہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ ورگیز کے مطابق وہ خود

ایک سرکاری گائیڈ کے ہمراہ سری نگر گئے اور کئی مندر دیکھے ان میں دو تو کشمیر کے بہت اہم اور معروف مندر ہیں گنپت یار مندر جسے آر ایس ایس کی فہرست میں "گرا دیا گیا،، بتایا گیا ہے اور دوسرا دشنامی اکھاڑہ جہاں سے امرناتھ مندر کی یاترا شروع ہوتی ہے اسے بھی اس کے دھرم شالہ کے ساتھ جلا دیا گیا بتایا جاتا ہے۔ جب کہ پجاریوں، پنڈ وسیوں اور درشن کرنے والوں کو کچھ پتہ نہیں۔ ڈسی آر پی الیف کی ان چوکیوں کے جوانوں کو معلوم ہے متعلق کچھ معلوم ہے جو مندر کے احاطہ میں قائم ہے البتہ لوگوں کا کہنا ہے کہ سی آر پی الیف کی چوکیوں پر حملوں کے دوران مندروں کی دیواروں پر گولیاں ضرور لگی تھیں۔ حملے چوکیوں پر کئے گئے تھے نشانہ مندر نہیں تھے۔ گنپت یار مندر کے پجاری موہن لال کہتے ہیں کہ دو سو برس قدیم اس ہنومان مندر میں آج تک پوجا پاٹ جاری ہے۔

درگیٹر اور پاور جیبہ کے ذریعہ اپنی قلعی کھلتی دیکھنے کے بعد بی جے پی والے اب سابق وزیر مملکت داخلہ ایم ایم جیکب کے بیان کی آڑ لے رہے ہیں۔ جو انھوں نے پارلیمنٹ میں دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا ۸۹ ۱۹ء اور ۱۹۹۱ء کے درمیان ۳۰۸ عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا گیا اب بی جے پی والوں کی ذہنیت ملاحظہ فرمائی جائے کہ کہا جاتا ہے کہ ان ۳۰۸ عبادت گاہوں میں سے ۱۶، تو مسجدیں اور مسجدوں سے متعلق املاک ہیں اور یہ سب مسلم اکثریتی کشمیر میں تباہ کی گئی ہیں اور بقیہ ۲۲ دھرم شالا ئیں اور مندر ہیں۔ قلعی کھلتی دیکھ کر اڈوانی جیسے بی جے پی کے لیڈر بغلیں جھانک رہے ہیں۔ کشمیر میں متاثر ہونے والے مندروں کی بی جے پی کے ذریعہ بتائی گئی تعداد بھی بالکل غلط ہے۔ کشمیر کے مندروں کا دورہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مندر تو صحیح سلامت ہیں مگر بی جے پی کے جھوٹ کی عمارت ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی ہے۔ مگر بی جے پی کو شرم نہ آئے گی۔ ملائم سنگھ یادو کے زمانہ میں بابری مسجد کو توڑنے کی کوشش کے دوران پولس فائرنگ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد بھی بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی۔ اور یہ سب لوگ بعد میں زندہ و سلامت پائے گئے تھے۔

ایل کے اڈوانی بی جے پی کے ایسے لیڈر ہیں جو کشمیر میں مندر توڑے جانے کا پروپیگنڈہ کرنے میں پیش پیش ہیں میگزین "انڈیا ٹوڈے،، کے نمائندے نے کشمیر کا دورہ کرنے کے بعد ان سے فون پر رابطہ قائم کیا گفتگو کچھ اس طرح ہوئی۔

سوال:۔ جب آپ مندر توڑے جانے کی بات کرتے ہیں تو وہ واقعات کس عرصہ میں رونما ہوئے تھے۔

ایل کے اڈوانی:۔ ۱۹۸۶ء میں انہدام اس وقت شروع ہوا تھا جب جی ایم شاہ وزیر اعلیٰ تھے اس سال سب سے زیادہ مندروں کو نقصان پہنچایا گیا تھا اور انہیں تباہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۹ سے ۱۹۹۱ء کے عرصہ میں بھی بہت سے مندر متاثر ہوئے تھے۔

سوال:۔ کیا آپ کے پاس کوئی فہرست ہے؟

ایل کے اڈوانی:۔ میرے پاس کوئی فہرست نہیں ہے لیکن بڑی تعداد میں مندر توڑے گئے۔

سوال:۔ بی جے پی کے مختلف لوگ مختلف تعداد بیان کر رہے ہیں؟

ایل کے اڈوانی:۔ دیکھئے میں قیاس آرائی نہیں کروں گا۔

سوال:۔ لیکن یہ بہت سنگین الزام ہے؟

ایل کے اڈوانی:۔ جیسا کہ میں نے کہا میں قیاس آرائی نہیں کروں گا کیوں کہ میڈیا کا لہجہ کچھ اس طرح کا ہے جیسے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سابق وزیر مملکت داخلہ ایم ایم جیکب نے خود پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ کشمیر میں ۳۰۸ عبادت گاہیں متاثر ہوگئیں۔ اپنے کچھ بیانوں میں میں نے ۴۰ مندروں کی بات کہی۔

سوال:۔ اگر کوئی کشمیر جائے اور چیک کرنے کے بعد معلوم ہو کہ ۴۰ میں سے کسی مندر کو نقصان نہیں پہنچا پھر آپ کا کیا موقف ہوگا؟

ایل کے اڈوانی:۔ کیا یہ تعداد کے کم اور زیادہ ہونے کا معاملہ ہے؟ میری شکایت دوہرے معیار کی ہے۔ ایک ڈھانچہ (بابری مسجد) کو گرائے جانے پر ہونے والے رد عمل کو دیکھئے۔

سوال:۔ لیکن۔

ایل کے اڈوانی:۔ میرے پاس اب زیادہ کچھ کہنے کے لئے نہیں ہے میں اس قسم کی بات چیت جاری نہیں رکھ سکتا۔

"دین دنیا" مارچ ۱۹۹۳ء

مسٹر اڈوانی کے نام ایک خط

ایک خط جو دو خطوط کا مجموعہ ہے، پہلے خط میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے اور مذہبی، نسلی، لسانی اور تاریخی تعصبات کے نام پر ایک دوسرے کا خون بہاتے ہوئے "عوام" معصوم ہیں، "سرمایہ داروں" کے بہکاوے میں آگئے ہیں جبکہ دوسرا اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑی ہوئی دو ہندوستانی لڑکیوں کا مسٹر اڈوانی کے نام کھلا خط ہے جو ہندوستانی ہفت روزہ "اسٹیٹسمین" میں شائع ہوا

مدیر کے نام لندن سے آنے والی یہ تحریر حرف بحرف شائع کی جا رہی ہے

پیاری زاہدہ!

آج نہیں بلکہ ابھی "روشن خیال" طاہرہ تنہائی میں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ ہر شمارہ پہلے شمارے پر سبقت لے جاتا ہے بلکہ اس بار آپ کے اداریے "زشت خیال" نے مجھے مجبور کر دیا۔ پہلے تو میں آپ کی زبان، آپ کے لہجے، تاریخی اور سیاسی شعور سے متاثر ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ کے پس منظر کو فراموش کر کے ہم تاریک راہوں میں کھو جاتے ہیں اور اپنی حال سے بھٹک جاتے ہیں۔ آپ نے جس طرح تاریخ کے اوراق سے انسان کے مظالم اور اس کی چند کڑیوں کو نکال کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سے دل لرز جاتا ہے اور ہم شرم سے سر جھکا لیتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں جو خطرے ہیں، جن کا خوف ہے، جن خدشات کا سیلاب آپ کے دل میں امڈ رہا ہے شاید اسی نے "زاہدہ حیا" کے پردے گرا دیئے ہیں۔ ورنہ آپ یہ سوال کبھی نہ کرتیں کہ "کیا ہم اسے صادق ہو چکے ہیں کہ ایک جانب کے عوام کے لئے دوسری جانب کے عوام کا خون جائز قرار دے دیں۔ اکیسویں صدی کے اختتام پر یہ وہ بنیادی سوال ہے جو وقت نے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ ہم جو عوام میں سے ہیں، جنھوں نے ہمیشہ عوام کی اخلاقی عظمت کے قصیدے تصنیف کئے ہیں، ہم اس سوال کے مقابل ہیں اور جواب کو نہیں پاتیں۔"

آپ "بیدار ذہن دانشور" طبقہ ہر گروہ کے ہاتھ "خون آلود" دیکھ رہی ہیں۔ زاہدہ آپ اس خط کے جواز کے لئے میں اپنے گروہ سے حالی صاحب کا شعر دہراؤں گی۔

"کہیے صاحب! مجھے اس تیغ زنی میں سوائے رنج کچھ ورنہ مرے دل میں سما ہوتا ہے"

ہمارے اور تمہارے ہم خیال دوستوں کے دل میں بھی یک درد اٹھا ہے۔ ہم نے بھی تنہائیوں میں آنسو بہائے ہیں لیکن ہم اس درد اس اذیت کو اپنے اوپر طاری ہو جانے دیں تو ہم ہی نہیں ہمارا سارا گروہ جو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے اس اندھیرے میں بھٹک جائے گا۔ ہار مان لے گا۔ ہم اپنے آدرشوں کا گلا گھونٹ دیں گے۔

ہمارے سامنے ۔ سب سے بڑا گروہ تو ساری دنیا کی عورتوں کا ہے۔ جس میں ہم دونوں بھی شامل ہیں۔ ہماری تعداد نصف سے زیادہ ہے۔ ہم نے تو "سروں کے مینار" نہیں بنائے۔ ہم نے "مال غنیمت نہیں سمیٹا" ہمارے ہی کانوں اور گلے کے زیور نوچے گئے۔ ہماری ہی کوکھ اجاڑی گئی۔ ہم نے ہی آنسو بہائے۔ ہماری ہی بے حرمتی ہوئی اور ہو رہی ہے۔ زاہدہ! ہمارا دامن کیسے داغدار ہے؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ظلم نہیں کر سکتے لیکن قانون بھی "امکان" پر کسی کو مجرم قرار نہیں دے سکتا۔ اب تک تو اس گروہ کا

دامن داغدار نہیں ہے۔ اگر عورتیں ذرہ گروہ گناہوں کی ذمہ داری لے لیں تو ان کے بوجھ سے وہ دب جائیں گی۔ ہم پر ان "بدکر" سیاست دانوں اور حکمرانوں کے مظالم کی ذمہ داری نہیں ہے۔

آپ نے لکھا ہے "پہلے شہادت گہ ہوتے تھے اب گردا مسجد و مندر اور گرجا و معبد مقتل ہیں" یہ الفاظ زاہدہ حنا کے نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے جو نیند میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں۔ یہ ان کا اشارہ ان "کیسری" رنگ کے لباس میں جلوس گرانے پر حاصل کئے گئے "عوام" سے ہے جن کو آمادہ کر کے ہمیشہ آگے بڑھا جاتا ہے کیونکہ ان کی جانوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ان کو اسی لئے جاہل رکھا جاتا ہے کہ جب اور جس طرح کی ضرورت ہو انہیں استعمال کیا جائے۔ ان کو مذہب کا وہی نشہ پلایا جاتا ہے جسے مارکس نے "عوام کی افیون" کہا ہے۔ انہیں کے لئے Lumpen Proletariat کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

سیکولرازم یا مذہبی رواداری کے تحفظ کے جوش میں ہم ان سرمایہ دار طاقتوں کو فراموش نہیں کر سکتے جو مذہبی تعصب کو بھڑکا کر اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ بابری مسجد کے فسادات کا ایک یہ بھی رخ تھا کہ وہ بستیاں جہاں غریب مسلمان رہ رہے تھے اس لئے بھی جلائی گئیں کہ انہیں حاصل کر کے اس زمین پر اونچے متوسط طبقے اور امیروں کے لئے فلیٹ اور شاندار مکانات بنا کر ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ اور بھی سرمایہ جمع کر سکے۔ یہ ملتے ہیں۔ میرے سامنے ان "عوام" کی فراخدلی اور قربانیوں کی وہ مثالیں بھی ہیں جو ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان عوام میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں۔

طیش میں آپ ان "روشن خیال" نوجوانوں اور بچوں کو بھی بھول جاتی ہیں جن کے دامن بے داغ ہیں اور جن کے ہاتھ پاک ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ یہ ہمیشہ ہی معصوم اور بے گناہ رہیں گے لیکن ان کے مستقبل کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ہم انہیں تاریخ کے جھمیلے نہیں دے سکتے لیکن "روشن خیالی" تو دے سکتے ہیں۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ اور اونچے آدرش تو دے سکتے ہیں۔ آج جب ہم بیسویں صدی کے اختتام پر کھڑے ہیں ہم اپنے آپ سے اور ان سے یہی عہد کر سکتے ہیں کہ ان کے آدرشوں کی لو بجھنے نہیں دیں گے۔ کچھ اسی قسم کی دو آدرش والی لڑکیوں کے خط کا ترجمہ آپ کو "روشن خیال" میں شائع کرنے کے لئے بھیج رہی ہوں۔

بابری مسجد کے واقعے کے بعد ۱۲ دسمبر کو Statesman اخبار کے ایڈیٹر سی آر ایرانی کے خط کے ساتھ ساتھ یہ خط شائع کیا گیا۔ میرا خیال ہے مسٹر ایرانی اور اندرجیت گپتا (جن کا انٹرویو آپ نے شائع کیا ہے) اسی گروہ کے ساتھ ہیں جس کی قیادت ستیہ جیت رے، ٹیگور اور فیض احمد فیض نے کی ہے وہ خود بھی تو کر گئے ہیں۔

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
فیض

Statesman Weekly
19. 12. 1992

۱۲ دسمبر کی صبح ایک کھلا خط جو مسٹر اڈوانی کے نام ہے ایک کم عمر خاتون میرے مکان پر آکر دے گئیں۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر نہیں کی لیکن میرا فون نمبر لے گئیں۔ یہ خط طالب علموں کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ان کے دل کی آواز ہے ہم اسے بغیر کسی ترمیم و اضافے کے شائع کر رہے ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ ہمارے قارئین کا پہلا خط ہے جو "اسٹیٹسمین" کے پہلے صفحے پر شائع کیا جا رہا ہے۔

مسٹر اڈوانی! یہ ہندوستان کے مستقبل کی آواز ہے

ان لڑکیوں کے خط کے متن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

سی۔ آر۔ ایرانی۔

ڈیر مسٹر اڈوانی

...... شکریہ آپ کی اور آپ کے رفقا کی مہربانی سے آج کوئی بھی ہندو اپنا سر اونچا کر کے نہیں کھڑا ہو سکتا کیونکہ آپ نے ہندو مذہب کی روح کو ہی برباد کر دیا ...... مسٹر اڈوانی جب آپ نے گھنٹوں میں جلوس کے متعصب لوگوں کو بابری مسجد کے گنبد پر کھڑے ہوئے دیکھا تو آپ کو کیا محسوس ہوا۔ خوشی؟ فتح؟ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ "ہندوستان" نے محسوس کیا۔ شرم، بے عزتی اور انتہائی بے آبروئی ...... بھگوان کے لئے بتایئے تو سہی کہ ۴۰۰ برس پرانی تاریخی عمارت ڈھا کر آپ کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟ کیا آپ کے بیمار ذہن کے لئے یہ کوئی مذاق تھا کہ آپ نے اس ملک میں امن اور صلح پسندی سے زندگی گزارنے کی صدیوں پرانی روایات کی "علامت" کو فرقہ پرستی اور شر کے عفریت کا نوالہ بنا دیا۔ کیا کبھی ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ہمسائے میں اپنے مندروں اور مسجدوں میں عبادت نہیں کی؟ کیا ان دونوں کو اس طرح جدا کرنا ضروری تھا؟ ...... اگر وہ رام کی پیدائش کی جگہ بھی تھی، اگر ایک ہزار سال پہلے وہاں کوئی مندر بھی تھا اور خود ایودھیا کے باسیوں نے اس معاملے کو درگزر کیا تو آپ کیوں نہیں کر سکتے تھے؟۔ آپ کے ہندو ازم کے نعرے سے گندی سیاست کی بو آتی ہے۔ ...... کیا آپ ان سینکڑوں ہندوستانیوں، پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں کی اخلاقی ذمہ داری لے سکتے ہیں جو مارے جا رہے ہیں یا بستیوں میں بھوکے مر

رہے ہیں۔ آپ کا یہ عمل قتل عام کے برابر
سے کم نہیں تھا

آپ نے کس کے لئے مسجد کو گرایا؟ ایک عام ہندوستانی کے لئے نہیں جس میں ہندو مسلمان دونوں ہی شامل ہیں اور جو امن و آشتی سے رہ رہے ہیں۔ ان ۸۰۰ ملین ہندوستانیوں کو آپ کون سی اخلاقی قدریں دیں گے؟۔ یقیناً امن و صلح پسندی کی قدریں نہیں جن کا حامل ہندو مذہب ہے۔ آپ کی کم نظری اور تعصبات سے ہمیں گھن آتی ہے طالب علموں کے لئے آپ کو موقف برداشت دشوار ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم ایسے ملک کے شہری ہیں جس کا آئین جمہوریت، سوشلزم اور مذہبی رواداری کا حامل ہے۔ جی ہاں۔ مذہبی رواداری! جس پر ہماری قوم کا بھی انحصار ہے۔ ہمارے آئین کی توہین کر کے آپ نے ہمارے ملک کے ہر باعزت شہری کی شخصیت کو چور کیا ہے

آپ کہتے ہیں کشمیر میں ۵۰ مندر گرائے گئے مگر ہمارا دور سیاست داں ہونے کے آپ کشمیر اور ایودھیا کے سیاسی حالات میں فرق نہیں دیکھ سکے

یہ وہ زمانہ ہے جب ہم اکیسویں صدی کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے ہمیں پچاس سال پیچھے کر دیا۔ ہمارا ملک طرح طرح کے مسائل کا سامنا کر رہا ہے۔ یہ " وقت ہے جب ہر شہری کو ملک کے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے توجہ دینا ہے۔ آپ نے یہ گستاخی کی کہ نفرت آمیز مذہبی تعصبات کو ملک کی سیاست میں شامل کر دیا اور آپ خود کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ ہندو کہتے ہیں۔

آپ نے یہ جرأت کیسے کی کہ اب جا کے لئے ہمارے مستقبل کو برباد کر دیا۔ ہم ہندوستان کا مستقبل ہیں۔ ہم بابری مسجد کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کو کیا حق تھا کہ ہمارے مستقبل کے خوابوں کو برباد کر دیں؟۔ آپ کو کس نے اجازت دی تھی؟۔ کس نے حق دیا تھا کہ ان کروڑوں روشن خیال نوجوانوں کے آدرشوں کو چکنا چور کر دیں جو ہندوستان کی تقدیر کے معمار ہیں۔

کیا آپ ہمیں جواب دے سکتے ہیں؟۔

ورشا نائک

پونم بانگ

زاہد! میرا خیال ہے اس خط پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ ہندوستان کے روشن خیال اور نوجوان طبقے کے جذبات اور ان کی ذہنی رواداری کا آئینہ ہے۔

آپ کی

محمودہ ...

• •

"روشن خیال" (۴)

راجیو سکسینہ

رام جنم بھومی اور تلسی داس

بیا ممکن نہ تھا کہ رام مندر ڈھا کر بابری مسجد بنائی گئی ہوتی اور "رامائن" لکھنے والے تلسی داس، مغلِ اعظم جلال الدین اکبر سے اِس ظلم پر اِحتجاج نہ کرتے؟

رام مندر کی بات کرنے والے اس مسئلے کو اقتدار پر قبضے کی سیڑھی بنائے ہوئے ہیں؟

مسلمان کوی سنت تلسی داس نے ہی رام کی داستان کو مقبول کیا۔ ہر سال دسہرے پر گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے میں رام لیلا ہوتی ہے تو اس کا سہرا بجا طور پر سنت تلسی داس کے سر بندھتا ہے۔

خاندان میں کوئی تقریب ہو تو رام کتھا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ایک طرح سے سنت تلسی داس کی تخلیق رام چرت مانس کو ہندو گھرانوں میں وہی مقام حاصل ہو گیا ہے جو قرآن شریف کو مسلمانوں اور بائبل کو عیسائیوں میں حاصل

رام چرت مانس کو اتنی زبردست مقبولیت حاصل ہوئی کہ سنت تلسی داس کی دیگر تخلیقات پس پردہ چلی گئیں۔ آج سنت تلسی داس کو صرف ایک مذہبی شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کی دیگر تخلیقات ونے پتریکا، کوتاولی، دوہاولی اور گیتاولی کے موضوعات، رام چرت مانس کے موضوع سے قطعی مختلف ہیں۔ کسی میں انہوں نے بنارس میں وبا کے پھیلنے اور

زبردست بیروزگاری کا شکوہ کیا ہے تو کسی میں خود گٹھیا کے مرض سے پیدا ہونے والے کرب کا اظہار کیا ہے۔ ایک نظم تو ان برہمنوں کے حملہ پر ہے، جنہوں نے سنت تلسی داس کے متعلق فتویٰ دے دیا تھا کہ وہ برہمن نہیں، بلکہ نچلی ذات کے ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کی زیادہ تر نظموں پر رام سے عقیدت کا رنگ غالب ہے۔ تمام ادبی ماہرین مانتے ہیں کہ اپنی دیگر نظموں میں جس طرح سے سنت تلسی داس نے عصری موضوعات کو اپنایا ہے، اس کے پیش نظر ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ رام مندر کے انہدام پر کوئی نظم نہ لکھتے۔ اگر واقعی کوئی رام مندر منہدم کیا گیا ہوتا۔ کیونکہ رام مندر کا انہدام ان کے لئے گٹھیا کے مرض کے درد سے زیادہ کربناک ہوتا۔

تلسی داس نے رام مندر کے انہدام کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تو اس کا دفاع "تلسی داس" کے ایک "ہمدرد" نے اس دلیل کے ساتھ کیا ہے:

"بھگوان رام کے مندر کا انہدام، ان کے لئے (سنت تلسی داس کے لئے) یادگار واقعہ نہیں، بلکہ ایک برے خواب کی طرح رہا ہوگا، جسے انہوں نے اپنی یادداشت سے خارج کر دیا ہوگا۔" تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ بنارس میں وبا کا پھیلنا اور گٹھیا کے درد سے کراہنا "یادگار واقعات" تھے، جن پر نظمیں لکھی جا سکتی ہیں؟ اور کیا کاشی کے برہمنوں کا ہتک آمیز رویہ اس عظیم شاعر کے لئے "یادگار واقعہ" تھا؟ رام مندر کا اگر واقعی انہدام ہوتا اور وہ "برا خواب" ہوتا تو اس کے مقابلہ میں یہ تو بہت چھوٹے موٹے واقعات ہیں۔ یہ ایسا سنگین جرم ہوتا جسے سنت تلسی داس کبھی فراموش نہیں کر پاتے، اس کے مجرموں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔

دراصل سنت تلسی داس کی جانب سے صفائی پیش کرنے والوں میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دیں کہ سنت تلسی داس، مغلوں کے مظالم سے ڈر گئے تھے، اس لئے

انھوں نے اس واقعہ پر کوئی نظم نہیں کہی۔ ویسے ہم یاد دلادیں کہ بھکتی فرقوں کے سنت صوفی بنیادی طور پر باغی ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے اصولوں کے اظہار پر اصرار کرتے تھے اور اس کے لئے جان دینے کو بھی تیار رہتے تھے۔ اسی بے باکی اور بے خوفی کی وجہ سے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔

جب اکبر دہلی میں تخت نشین ہوئے۔ اس وقت تک ایک عظیم سنت اور شاعر کی حیثیت سے تلسی داس مقبول ہو چکے تھے۔ اکبر انھیں اپنے نورتنوں میں شامل ہونے کی دعوت دیتے رہے۔ اکبر نے انھیں اپنے درباریوں میں شامل کرنے کی باقاعدہ پیش کش کی تو دوسرے تمام خوددار سنتوں کی طرح سنت تلسی داس نے بھی یہ پیش کش ٹھکرادی اور جواب میں ایک دوہا لکھ کر بھیج دیا کہ جب میں بھگوان رام کے دربار میں شامل ہو گیا تو پھر کسی انسان کے دربار میں منصب دار کیسے بن سکتا ہوں۔ اکبر اعظم اگر اس ہتک کو برداشت کر سکے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک عوامی مقبولیت کے حامل سنت نے یہ ہتک کی تھی۔

ایک غلط فہمی یہ پھیلائی جا رہی ہے کہ بابری مسجد کے باہر مگر اس کے احاطہ میں ہی تعمیر رام چبوترہ کی تعمیر، سنت تلسی داس کی خواہش پر، اکبر کے حکم سے کی گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اکبر کے دربار میں سنت تلسی داس کی بہت عزت تھی، مگر ان کے دور میں یہ چبوترہ تعمیر نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چبوترہ ۱۸۵۷ء کے دور میں تعمیر ہوا، اور تازہ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اس چبوترے کی تعمیر پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے قائدین مولوی امیر علی اور سنت رام چرن داس نے، اپنے فوجیوں کی سہولت کے لئے کرا دی تھی۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ اکبر کے دربار میں سنت تلسی داس کی بڑی عزت تھی۔ درباریوں میں سے ایک عبدالرحیم خانخاناں، سنت تلسی داس کے گہرے دوست تھے۔ خانخاناں خود ایک بڑے شاعر تھے۔ وہ اودھ کے کسانوں میں بہت مقبول تھے۔ آج بھی عام کسان، عام دیہاتی ان کے دوہوں کو محاوروں اور کہاوتوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض دوہے، خانخاناں اور تلسی داس کی مشترکہ تخلیق ہیں۔ ایک مصرع ایک دوست کا ہے تو دوسرا، دوسرے دوست کا۔

اکبر اعظم کے وزیر خزانہ ٹوڈرمل، بھی سنت تلسی داس کی بہت عزت کرتے تھے۔ انھوں نے بنارس میں ہنومان مندر کی تعمیر کے لئے تلسی داس کو زمین دان کی تھی۔

یہ بالکل سچ ہے کہ اگر تلسی داس نے اکبر سے شکایت کی ہوتی کہ ان کے دادا، بابر نے کسی رام مندر کو توڑ کر اپنے نام سے مسجد تعمیر کروائی ہے تو اکبر اس مسجد کو توڑ کر اس کی جگہ پھر سے مندر کی تعمیر کا حکم دیتے۔ کیونکہ ایسی علامت خود بابر کی پالیسی سے انحراف کی علامت ہوتی۔ بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو وصیت کی تھی کہ وہ رعایا، جو مسلمان نہیں ہے، کے مذہب اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام کرے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ ٹوڈرمل نے جو زمین تلسی داس کو دان کی تھی اس پر سنت تلسی داس نے رام مندر نہیں بلکہ ہنومان مندر ہی تعمیر کروایا۔ ایودھیا میں ہنومان گڑھی کے بارے میں بھی ایسی ہی روایت ہے۔ مندر کے موجودہ مہنت نے راقم الحروف کو بتایا کہ ہنومان گڑھی میں مندر کی تعمیر ۱۷۵۵ء میں نواب منصور علی نے کروائی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ اسی جگہ پہلے ایک مسجد تھی، جو نواب صفدر جنگ کے دور تک کھنڈر ہو گئی تھی۔ نواب کو مغل بادشاہ نے دہلی طلب کر لیا تھا۔ جب وہ اپنی راجدھانی فیض آباد چھوڑنے لگے تو انھوں نے نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے دیوان ٹیک رائے کو سونپ دی۔ اس وقت اس کھنڈر میں ایک صوفی سنت کا بسیرا تھا۔ گوسائیں پنتھ کے ایک ہندو سنت نے ان سے پناہ مانگی۔ صوفی سنت نے پناہ دے دی۔ کچھ عرصہ بعد صوفی سنت چل بسے۔ گوسائیں نے دیوان ٹیک رائے سے درخواست کی کہ وہ زمین انھیں مندر کی تعمیر کے لئے دے دی جائے۔ گوسائیں نے بھی اس وقت کے رواج کے مطابق ہنومان مندر ہی بنوایا۔ اسی دوران بیراگی پنتھ کے سادھوؤں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ایک گوسائیں ہنومان مندر بنوا رہا ہے، جب کہ یہ صرف بیراگیوں کا حق ہے۔ بیراگیوں نے حملہ کر کے اس قلعہ نما زمین پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں نواب منصور علی کی مدد سے بیراگیوں نے قلعہ کی طرز کا مندر تعمیر کیا۔

یہ بات نوٹ کرنی چاہئے کہ شمالی ہندوستان میں رام مندر کی تعمیر کی نہیں، بلکہ ہنومان مندر کی تعمیر کی عام روایت ہے۔ ایودھیا میں کئی ہنومان مندر ہیں۔ رام مندروں میں ننھے رام یا بچے رام کی مورتیاں ہیں۔ مگر ہنومان مندروں میں کم سے کم قد آدم یا اس سے بڑی مورتیاں ہیں۔ عام طور سے انھیں ہی سنکٹ موچن کہا جاتا ہے اور ان سے ہی اکھاڑے منسوب ہوتے ہیں۔ جہاں نوجوان کسرت کرتے ہیں۔

سچائی تو یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں اصل بھگوان، شو ہیں۔ شمالی ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی گاؤں ہو، جس میں شو مندر نہ ہو۔ جب تلسی داس نے دیکھا کہ ایودھیا میں بھی شو کا ہی بول بالا ہے تو انھوں نے رام کے کردار کو مقبول کرنے کے لئے ایک ترکیب سوچی۔ رام چرت مانس میں شو اپنی پتنی پاروتی کو رام کتھا سناتے ہیں۔ اس طرح سے سنت تلسی داس نے شو کے ماننے والوں کی نظر میں بھی رام کو قابل عبادت بنا دیا۔

تلسی داس نے ادویت پنتھ (وحدانی فلسفہ کے ماننے والے) سمیت سبھی پنتھوں کے ماننے والوں کی عزت کی۔ ادویت وادی ہی سنت تلسی داس جیسے دویت وادی (دوہرے فلسفہ کے ماننے والے) کے نظریاتی مخالف

تھے۔ اگر واقعی رام مندر منہدم کیا گیا ہوتا تو تلسی داس کے دل میں بھی کسی حد تک نفرت یا غصہ ضرور ہوتا۔ مگر انھوں نے کہیں بھی اس کا اظہار نہیں کیا ہے۔

اس کے برخلاف انھوں نے اسلام کے تعلق سے احترام اور اپنائیت کا اظہار کیا ہے۔ جب کاشی کے برہمنوں نے تلسی داس کو جولاہا کہہ کر ان کا مذاق اڑایا، تو تلسی داس نے دوہے میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مجھے کسی بھی نیچی ذات سے وابستہ کردو۔ میں برا نہیں مانوں گا، کیونکہ نہ تو میرا کوئی بیٹا ہے، جسے کسی کی بیٹی سے بیاہ کر کسی کی ذات خراب کرنا ہے مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں بھوک لگے گی تو بھیک مانگ کر کھالوں گا اور رات مسجد میں سو جاؤں گا۔ تلسی داس جی کے لفظوں میں

دھوت کہو او دھوت کہو
راجپوت کہو جولاہا کہو کوئی
کاہو کی بیٹی سے بیٹا نہ بیاہو
کاہو کی جات بگڑے نہ کوئی
مانگ کے کھیبو مسیت میں سوئبو
لیبے کو ایک نہ دیبے کو دوئی

اگر اسلام سے انھیں ذرہ برابر نفرت ہوتی تو اپنے دور کے دوسرے بے گھروں کی طرح مسجد میں رات گزارنے کی بات وہ کبھی نہ کرتے۔ یاد رہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کو مندروں میں رات گزارنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ مگر فیصلہ پناہ مانگنے والے کی ذات کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ جب کہ مسجد میں کوئی بھی مسافر رات گزار سکتا تھا۔

اگر آج کچھ لیڈر تلسی داس کی وقعت کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور میں رام مندر کے انہدام کی بات نہ کہہ کر ان کا سیاسی لوزلر بننا پسند نہیں کیا۔ تلسی داس رام کے سچے بھگت تھے اور ان کی "آستھا" (عقیدہ) کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں تھی۔ جبکہ آج جو لوگ "آستھا" کی بات کر رہے ہیں وہ اسے اقتدار پر قبضہ کی سیڑھی بنانا چاہتے ہیں۔ ■

بابری مسجد تنازعہ — ایک تاریخی تجزیہ

پرویز حفیظ ۱۰۵/۳۵D کڑایا روڈ کلکتہ ۷۰۰۰۱۷

یکم فروری ۱۹۸۶ء کو بابری مسجد کے گیٹ کا تالا کھولنے کا حکم جاری کرتے وقت فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کے ایم پانڈے نے طنزیہ لہجہ میں کہا تھا۔

"گزشتہ ۳۵ برسوں سے ہندو محدود طور پر ہی سہی (اندر رکھی ہوئی) ان مورتیوں کی پوجا کر رہے ہیں تو آج اگر دروازے کے تالے کھول دیئے جائیں گے تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا"

۶ دسمبر ۹۲ء کو ایودھیا میں بابری مسجد کو زمین بوس کرنے کے بعد ہندو فسطائی طاقتوں نے جج پانڈے کے حکیمانہ فیصلہ کو بالکل جھٹلا کر رکھ دیا ہے۔ گزشتہ دو ماہ میں پورے ملک کی جو حالت ہوئی ہے وہ آسمان ٹوٹ پڑنے سے کیا کم ہے۔ اس واقعہ کے سو برس قبل ۱۸۸۵ء میں اجودھیا کے مہنتوں نے بابری مسجد کے مقابل بنے رام چبوترے پر ایک مندر تعمیر کرنے کے لئے عدالت سے اجازت مانگی تھی لیکن اس وقت کے جج نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا کہ اس سے خون خرابہ اور دنگے فساد کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اس انصاف پسند جج کا نام تھا پنڈت ہری کشن۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف تک بابری مسجد کسی تنازعہ کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ عیار برطانوی حکومت نے اودھ کو ہتھیانے کے لئے ہندو مسلم عوام میں نفرت کی خلیج پیدا کرنے کے لئے تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ اجودھیا ہندوؤں کے لئے عقیدت کا مقام رہا ہے اس لئے چند شر پسند برطانوی مورخین کے بہکاوے میں آکر بابری مسجد کے قریب واقع ہنومان گڑھی کے مہنتوں نے جنہیں بیراگی کہا جاتا تھا اچانک ۱۸۵۳ء میں بابری مسجد کی زمین کو رام جنم استھان کہنا شروع کر دیا اور یہ گمراہ کن پروپیگنڈہ شروع کیا گیا کہ بابر نے ایک عظیم رام مندر کو توڑ کر یہ مسجد بنوائی تھی۔ یہ بات بھی قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ اس وقت تک اسی مظلوم مسجد کو جامع مسجد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں حملہ کر کے ایک دن بیراگیوں نے مسجد پر قبضہ کر لیا۔ دریں اثنا ایک مہنت باغی ہو کر لکھنؤ جا پہنچا۔ اس نے وہاں جا کر اسلام قبول کر لیا اور یہ خبر پھیلا دی کہ ہندوؤں نے بابری مسجد کو مسمار کر دیا ہے۔ اس زمانے میں مولوی امیر علی نام کے ایک بزرگ لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ مہنت کی زبانی بابری مسجد کی بے حرمتی کی سن کر وہ جلال میں آگئے۔ انہوں نے جہاد کا اعلان کر دیا اور ہم اعوان افراد کے ہمراہ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے اجودھیا کوچ کر گئے۔ نواب واجد علی شاہ کو جب اس کی خبر ملی تو انہوں نے برطانوی ریزیڈنٹ سے مدد طلب کی۔ بالآخر کرنل بارلو کی قیادت میں برٹش فوج، رام پور کے راجہ رام پال اور نواب کے ملازم ٹھاکر سنگھ کے سپاہیوں نے شجاع گنج قصبہ کے پاس مولوی امیر علی اور ان کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔ کافی خون ریزی ہوئی۔ دونوں فریقوں کو کافی ہلاکتیں اٹھانا پڑیں۔ مولوی امیر علی کو بحالت نماز قتل کر دیا گیا اور ان کا سر نواب واجد علی شاہ کے دربار میں پیش کیا گیا۔ اپنی شہادت کے بعد مولوی علی کی مقبولیت بے حد بڑھ گئی۔ علاقہ اور دور دراز کے لوگ

ان کی عقیدت سے سرشار ہو گئے۔ ضلع بارہ بنکی کے رحیم گنج قصبہ میں ان کی یاد میں سالانہ عرس ہونے لگا عوام ان کی درگاہ کی زیارت کے لئے جوق در جوق آنے لگے۔

ادھر اجودھیا میں مسجد بدستور مہنتوں کے زیر قبضہ تھی۔ ۱۸۵۵ء میں ایک بار پھر مسلمانوں نے حملہ کر کے مسجد حاصل کر لی اور مہنتوں اور بیراگیوں کے قدم اکھاڑ دیئے لیکن پھر ایک دن بیراگیوں نے کئی ہزار ہندوؤں کے ساتھ مسجد پر یلغار کی مسلمانوں نے سخت مزاحمت کے بعد مسجد بچالی لیکن اس کوشش میں ۷۵ افراد شہید ہو گئے۔ ان شہدا کو اسی جگہ دفن کر دیا گیا جہاں انہوں نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ آج وہ مقام "گنج شہیداں" کہلاتا ہے۔

بار بار کے خوں ریز فسادات نے دونوں فرقوں کو پریشان کر رکھا تھا ادھر نواب واجد علی شاہ بھی ان واقعات سے عاجز ہو گئے تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے دانشمند بزرگوں نے سلطنت کے نمائندے اور برطانوی ریزیڈنٹ کے سامنے ایک میٹنگ میں فیصلہ کیا کہ دونوں فرقوں کے افراد وہاں عبادت کریں گے۔ مسجد بدستور مسلمانوں کی عبادت گاہ کے طور پر استعمال کی جائے گی اور ہندو بھائی مسجد کے سامنے والی زمین پر جسے وہ مقدس سمجھتے ہیں پوجا پاٹ کریں گے۔ تین سال بعد برطانوی حکومت نے مسجد اور ہندوؤں کے پوجا کے مقام کے درمیان آہنی باڑ لگادی اور ہندوؤں کو ایک چبوترہ بنانے کی اجازت دے دی۔ مسلمانوں کو مشرقی دروازے سے مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا اور اس کی بجائے شمالی دروازہ استعمال کرنے کو کہا گیا۔ اس طرح حالات قدرے پُرسکون ہوئے اور دونوں قوم کے لوگ اس متنازعہ فیہ جگہ میں برسوں تک پوجا پاٹ اور نماز ادا کرتے رہے۔ ایک بار ۱۹۳۴ء میں

"شاید دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہو گا جب ایک سیکولر جمہوری ملک کے ایک صوبہ کے وزیر اعلیٰ نے اپنی ذاتی نگہداشت میں کھڑے ہو کر ایک فرقہ کی عبادت گاہ کو جو ایک ملیش قیمت تاریخی سرمایہ بھی تھی جنونیوں کے ہاتھوں مسمار کروایا۔"

بھی مقامی ہندوؤں نے گئو کشی کے ایک واقعہ کو بہانہ بنا کر مسجد پر حملہ کر دیا تھا اور دو گنبد بھی ڈھائے گئے تھے لیکن برطانوی پولس نے نہ صرف یہ کہ اس امر کے بعد مجرموں کو گرفتار کر لیا تھا بلکہ اس کے بعد جرمانہ عائد کر کے خود برطانوی حکومت نے مسجد کی مرمت کروائی تھی۔

۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی ایک سرد رات میں چند افراد مسجد کے اندر داخل ہو کر مورتی نصب کرنے میں کامیاب ہو گئے اور دوسری صبح اجودھیا کے ہندوؤں نے یہ اعلان کر دیا کہ مسجد کے اندر بھگوان رام "پرکٹ" ہوتے ہیں۔ انصاف اور سچائی کا خون کرتے ہوئے ضلع مجسٹریٹ نے مسجد کے امام صاحب کو فوراً مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس پورے واقعہ کو اجودھیا تھانے میں سب انسپکٹر رام دوبے نے اس طرح F.I.R کی صورت میں درج کیا :

"ماتا پرشاد کے الفاظ میں (جو مسجد کی نگرانی پر تعینات تھا) جب میں صبح آٹھ بجے جنم بھومی پہنچا تو مجھے پتہ چلا کر پچاس ساٹھ افراد مسجد کے کمپاؤنڈ کے گیٹ کا تالہ توڑ کر سیڑھی کی مدد سے مسجد کی دیوار پھلانگ کر مسجد کے اندر داخل ہو گئے اور شری بھگوان کی مورتی مسجد کے اندر نصب کر دی اور زعفرانی رنگ سے اندرونی اور بیرونی دیواروں پر سیتا رام لکھ دیا۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود سپاہی ہنس راج نے انہیں وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا مگر وہ نہ مانے، ضلع انتظامیہ کے افسران دوسرے دن محلِ وقوع پر پہنچے۔ بعد ازاں پانچ چھ ہزار افراد نے جو بھجن گا رہے تھے اور مذہبی نعرے لگا رہے تھے مسجد کا محاصرہ کر لیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے لیکن ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا گیا۔ رام داس اور رام شکتی داس کی قیادت میں نامعلوم افراد نے رات کو چوری سے مسجد کے اندر داخل ہو کر اس کی بے حرمتی کی سرکاری ملازم اور کئی دوسرے

> "اب وقت آگیا ہے کہ ان جھوٹے سیکولرسٹ لیڈروں سے جنہوں نے آزادی کے بعد سے مسلمانوں کا محافظ ہونے کا دعویٰ کر کے پوری قوم کو اپنا یرغمال بنا رکھا ہے، آزادی حاصل کی جائے۔"

افراد اس بات کے گواہ ہیں۔"

اسی رپورٹ کی بنیاد پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے کے نائر نے وزیر اعلیٰ، چیف سکریٹری اور ہوم سکریٹری کو یہ پیغام بھیجا۔ "رات کے اندھیرے میں جب مسجد سنسان تھی چند ہندوؤں نے بابری مسجد میں داخل ہو کر وہاں ایک مورتی رکھ دی۔ ڈی ایم اور ایس پی موقعۂ واردات پر موجود ہیں۔ حالات قابو میں ہیں۔" چیف سکریٹری اور آئی جی نے مورتی کو فوراً ہٹانے کے احکامات صادر کئے لیکن ڈی ایم نائر نے نقضِ امن کا بہانہ بنا کر معاملہ ٹال دیا۔ اس نے علاقے کو "مخدوش" قرار دے کر وہاں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا۔ مسجد کے امام کو وہاں سے ہٹا کر مسجد میں تالے لگوا دیئے۔ کھلی جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے چار پجاریوں کو مسجد کے اندر داخل ہو کر مورتی کی آرتی کی اور آہنی باڑ کے پیچھے سے جھکتوں کو شری رام کے درشن کی اجازت بھی دے دی۔ جبکہ مسلمانوں کا داخلہ اس علاقے میں ممنوع قرار دیا گیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مجسٹریٹ نے ایک عدالتی حکم کے ذریعہ مسجد کو مسلمانوں کے حوالے نہ کر کے اسے ضبط کر لیا اور وہاں ایک ریسیور بٹھا دیا۔

اجودھیا کے پریشان حال مسلمانوں کے ایک وفد نے دلی جا کر وزیر اعظم نہرو سے ملاقات کی۔ پنڈت نہرو نے ایک سخت الفاظ پر مشتمل خط کے ذریعہ اتر پردیش سرکار کو کڑے اقدامات کر کے مورتی نکلوانے کا حکم دیا۔ نہرو جی نے بہ نفسِ نفیس اجودھیا جانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا لیکن وزیر اعلیٰ گووند ولبھ پنت نے انہیں طفل تسلی دے کر اجودھیا آنے سے روک دیا اور یہ یقین دہانی کرائی کہ یہ معمولی سا واقعہ وہ خود سنبھال لیں گے لیکن انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ دریں اثنا سازش کی ایک کڑی کے طور پر گوپال سنگھ وشارد نام کے ایک شخص نے عبادت کی آزادی کے نام پر ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء میں ایک سول سوٹ دائر کر دیا۔ سول جج نے فوراً احکامات جاری کئے نہ تو مسجد سے مورتیاں ہٹائی جائیں اور نہ ہی پوجا اور درشن میں کوئی مداخلت کی جائے۔ مسجد کو اس کے اصلی حقداروں کو واپس دینے کی بات بالکل جھلا دی گئی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء میں دیئے گئے ایک اور فیصلہ نے مسلمانوں کی حق تلفی کو مزید مستحکم کر دیا۔ "یہ ایک ناقابل تردید سچائی ہے کہ جس دن یہ مقدمہ دائر کیا گیا اس دن شری بھگوان کی مورتی وہاں موجود تھی۔"

اتر پردیش حکومت کی جانب سے ۲۴ اپریل ۱۹۵۰ء میں فیض آباد کے ضلع مجسٹریٹ نے سول جج کے سامنے جو رپورٹ پیش کی اس میں صاف صاف لکھا تھا۔ "اس مقدمہ میں ملوث جائیداد بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے اور کافی زمانے سے مسلمانوں کی عبادت گاہ کی حیثیت سے استعمال کی جا رہی تھی۔ اسے کبھی بھی شری رام چندر جی کے مندر کی طرح استعمال نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ شری رام چندر جی کی مورتیاں ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات کو چوری سے اور ناجائز طریقے سے اندر رکھ دی گئیں۔"

۱۹۵۱ء کے بعد سے بابری مسجد کے کیس کو سرد خانہ میں ڈال دیا گیا۔

قارئین بابری مسجد ایکشن کمیٹی سے تو واقف ہوں گے لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ۱۹۸۴ء میں رام جنم بھومی ایکشن کمیٹی نامی ایک تنظیم نے رام جنم بھومی کی بازیابی کے لئے ایک تحریک شروع کی۔ رتھ یاترائیں نکالی گئیں اور اندولن چلائے گئے۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں اس اندولن کی باگ ڈور وشو ہندو پریشد نے ہاتھ میں لے لی۔ وی ایچ پی کے لیڈروں نے یوپی کے کانگریسی وزیر اعلیٰ اور فیض آباد کے ڈی ایم سے خفیہ ملاقاتیں کیں اور انہیں ۸ مارچ ۱۹۸۶ء شیوراتری کے دن مسجد پر لگے تالے کھولنے کے لئے آمادہ کر لیا۔

عدالتی نظائر اور روایات کو بالائے طاق رکھ کر ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء میں فیض آباد کے ایک وکیل نے منصف مجسٹریٹ کے سامنے کھلے عام پوجا پر عائد کردہ پابندی ہٹانے کی درخواست رکھی۔ سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ شخص بابری مسجد کے متعلق کسی بھی مقدمہ میں کوئی فریق نہیں تھا۔ نہ ہی عدالت نے دوسرے فریق مسلمانوں کو اس کی پیشی رفت کی اطلاع دی۔ محمد ہاشم کو جو شروع سے تن تنہا اور بلا کسی ذاتی مقصد کے بابری

مسجد کے مقدمات کی پیروی میں پیش پیش رہے ہیں اس سازش کی بھنک ملی تو انہوں نے مسلمانوں کی شنوائی کے لئے ایک رٹ داخل کی جسے جج نے نہایت بے توجہی سے مسترد کر دیا۔ فیض آباد کے ضلع جج کے ایم پانڈے نے صرف ڈپٹی ایم اور ایس پی سے لا اینڈ آرڈر کی بابت دریافت کیا اور چند منٹوں میں بابری مسجد کے گیٹ پر لگے تالے کھلوانے کا حکم جاری کر دیا۔ اس فیصلے کے چند سطور کا مطالعہ جج کی ذہنیت کی غمازی کے لئے کافی ہے حالانکہ مسلمانوں کو صفائی اور شنوائی کا موقعہ نہیں دیا گیا پھر بھی آنریبل جج صاحب نے فرمایا۔ "تمام فریقین کے بیانات سننے کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دروازے کا تالا کھول کر زائرین اور بھگتوں کو اندر رکھی مورتیوں کی پوجا کی اجازت جاری کر دینے سے دوسرے فرقہ کے لوگ یعنی مسلمان کسی بھی حالت میں متاثر نہیں ہوں گے۔ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ یہ عمارت کورٹ کے قبضہ میں ہے اور ۱۹۵۰ اور ۱۹۵۱ کے عدالتی فیصلوں سے گزشتہ ۳۵ برسوں سے ہندوؤں کو یہاں پوجا کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ اگر گزشتہ ۳۵ برسوں سے ان مورتیوں کی محدود طور پر ہی سہی پوجا کی جاتی رہی ہے تو آج اگر گیٹ کا تالا کھول دیا جائے گا تو کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کو اس متنازعہ فیہ جگہ پر عبادت کی اجازت نہیں ہے بلکہ انہیں وہاں تک جانے کی بھی اجازت نہیں ہے"۔ اس فیصلہ نے گویا پنڈورا کا صندوق کھول دیا ہو۔ یکم فروری ۱۹۸۶ء سے آج تک ہندوستان اس فیصلہ کے نتائج سے نبرد آزما ہو سکا ہے۔ پے درپے اتنے واقعات رونما ہوئے کہ ملک کا امن و سکون لٹ گیا۔ ایک انتہا پسند جماعت بجرنگ دل کے نام سے تشکیل کی گئی جس نے تشدد کے راستے سے رام جنم بھومی کو مکت کرانے کا عہد کر لیا۔ ہندو فسطائی تنظیمیں بے پناہ طاقت ور ہوتی چلی گئیں اور حکومت

آنریبل جج نے فرمایا ...
"اگر گیٹ کا تالا کھول دیا جائے
تو کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑیگا"

ان کے سامنے مسلسل گھٹنے ٹیکتی رہی۔ سارے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کر کے بی جے پی اور اس کی پارٹنر پارٹیاں آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل وغیرہ نے دلی پر حکومت کا پلان مرتب کیا۔ ۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو متنازعہ فیہ جگہ پر شری رام مندر کی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد رکھوا کر ایک بار پھر حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کی۔ اس کے بعد عام انتخابات سے قبل ایل کے اڈوانی نے سومناتھ سے اجودھیا تک رتھ یاترا نکال کر اس پوری تحریک میں ایک نئی زندگی پھونک دی۔ حالانکہ بہار میں لالو پرشاد یادو جیسے نومشق وزیر اعلیٰ نے اڈوانی کی رتھ یاترا روک کر انہیں گرفتار کر لیا اور اترپردیش میں ملائم سنگھ یادو نے مسجد پر حملہ آور کارسیوکوں پر فائرنگ کروا کر انصاف اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا لیکن اس وقتی ناکامی سے تلملا کر ہندو فرقہ پرستوں نے ۱۹۹۰ء کے اواخر میں ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں کے خون سے بھارت کی دھرتی کو لال کر دیا۔ ۱۹۹۱ء کے الیکشن میں بھاجپا نے بھاری کامیابی حاصل کی۔ نہ صرف لوک سبھا میں اس نے سو سے زائد سیٹوں پر قبضہ کر لیا بلکہ یوپی سمیت وہ چار صوبوں میں برسر اقتدار آنے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ اترپردیش کابینہ کے تمام وزراء کو لے کر وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ دوسرے دن اجودھیا گئے اور وہاں رام للہ کے سامنے عہد کیا "رام للہ ہم آئے ہیں مندر یہیں بنائیں گے"۔

اب آپ ہی بتلایئے شری رام چندر جی کے سامنے کیا گیا عہد زیادہ اہم تھا یا وزیر اعظم نرسمہا راؤ، ہندوستانی پارلیامنٹ، قومی یکجہتی کمیٹی، سپریم کورٹ وغیرہ کو دیئے ہوئے عہد؟ اس لئے بھاجپا پر یہ الزام لگانا کہ اس نے عہد شکنی کی ہے وزیر اعظم راؤ کی حکمت عملی اور اپنی ذمہ داری ٹالنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اگر کسی نے عہد شکنی کی ہے تو وہ ہیں ہندوستان کے وزیر اعظم جنہوں نے یوم آزادی کے مبارک موقعہ پر گزشتہ سال لال قلعہ سے سارے ملک کو یہ وچن

دیا تھا کہ وہ بابری مسجد کی حفاظت ہر قیمت پر کریں گے انہوں نے اپنا وچن نہیں نبھایا۔ بی جے پی تو شروع سے کہہ رہی تھی کہ وہ مسجد توڑ کر دم لے گی۔

بہر حال ۶ دسمبر اتوار کو شاید دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہوگا جب ایک سیکولر جمہوری ملک کے ایک صوبہ کے وزیر اعلیٰ نے اپنی ذاتی نگہداشت میں کھڑے ہو کر ایک فرقہ کی عبادت گاہ کو جو ایک بیش قیمت تاریخی سرمایہ تھی، جنونیوں کے ہاتھوں مسمار کروا دیا۔ راؤ کی پولس نے فائرنگ تو ... لاٹھی چارج تک سے احتراز کیا اور جب اس شرمناک واقعہ پر احتجاج کرنے کے لیے سارے ملک کے مسلمان سڑکوں پر نکلے تو پولس نے نہایت دل کھول کر ان پر اپنی بندوقوں کے دہانے کھول دیئے۔ گزشتہ دو ماہ میں پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان مارے جا چکے ہیں اور ان کی اربوں کی جائیدادیں یا تو لوٹ لی گئیں یا نذر آتش کر دی گئیں۔

۶ دسمبر کو پولس اور مرکزی سیکوریٹی فورس کے ہزاروں افراد اور جوانوں کی موجودگی میں بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ یوپی حکومت کو برخواست کرنے کے ۳۶ گھنٹوں بعد تک مرکزی حکومت نے ملبے کے ارد گرد سے کارسیوکوں کو نہیں منتشر کروایا۔ مسجد کے مقام پر ایک عارضی مندر تعمیر کرنے کی مہلت فراہم کی گئی۔ بابری مسجد کے دوبارہ اسی مقام پر تعمیر کا وعدہ کیا گیا اور ہمیشہ کی طرح اس وعدے کی بھی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ ہندوؤں کو مورتی درشن کی اجازت دی گئی مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روک دیا گیا۔ زمانے کا منہ بند کرنے کیلئے آر ایس ایس، بجرنگ دل اور وی ایچ پی پر ایسی مضحکہ خیز پابندی عائد کی گئی کہ سارے ملک میں یہ تنظیمیں اور ان کے لیڈر کھلے عام اپنے کام میں مصروف ہیں اور پولس خاموش تماشائی ہے۔ اڈوانی، جوشی، سنگھل وغیرہ کو قید کرنے کے نام پر ایک نہایت پر تعیش گیسٹ ہاؤس میں قیام و طعام و آرام کا موقعہ فراہم کیا گیا۔ پورے ملک میں ہوئے فسادات میں

پنڈت نہرو اور مرد آہن مولانا آزاد نے بھی اس معاملہ میں تغافل برتا۔

اور خصوصاً بمبئی میں پولس نے نسلی تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے فسادیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے جان و مال پر حملے کئے۔ دس دنوں تک بمبئی جلتی رہی اور حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ شہر کو فوج کے حوالے نہیں کیا گیا۔ شیو سینا کے چیف بال ٹھاکرے گلا پھاڑ کر چلا رہے ہیں کہ ان کے کاڈرز (cadres) نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے لیکن نامرد حکومت کو یہ جرأت کہاں کہ شیو سینا پر پابندی عائد کرے اور بال ٹھاکرے کو گرفتار کرے۔

غرض یہ کہ حالات نہایت ناسازگار ہیں ایسے حالات میں دو راستے مسلمانوں کے لئے کھلے ہیں یا تو مایوس اور قنوطیت کا شکار ہو کر تشدد کی راہ اپنا لیں اور اس طرح اجتماعی خودکشی کریں کیونکہ نہ صرف یہ کہ دشمن کی تعداد ہم سے سات گنا زیادہ ہے بلکہ وہ زیادہ مسلح، زیادہ تیار اور زیادہ عیار بھی ہیں اور دوئم یہ کہ نام نہاد قانون کے محافظ اب کھل کر فرقہ پرستوں کے محافظ بن چکے ہیں اس لئے ٹکراؤ کے راستہ میں سوائے ہماری بربادی کے اور کوئی بات ممکن نہیں ہے۔ دوسرا راستہ جو میرے خیال میں صحیح راستہ ہے وہ یہ ہے کہ بابری مسجد کی چھ دسمبر کی شہادت کو ہم لوگ قوم کے لئے یوم نشاۃ ثانیہ بنا لیں اور ایک نئے جوش ایک ہی لگن اور ایک نئے حوصلے کے ساتھ تندہی سے قوم کی تعمیر میں مصروف عمل ہو جائیں۔ جاپان کی مثال سامنے رکھیں دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اپنی دانست میں جاپانی قوم کو نیست و نابود کر دیا تھا لیکن جاپانیوں نے اس ذلت کا بدلہ لینے کے لئے ایک ایسی حکمت عملی اپنائی اور ساری قوم نے دل و جان سے اسے کامیاب بنایا کہ آج سوئی سے لے کر آبدوز تک، کیلکولیٹر سے لے کر واشنگ مشین تک، معمولی کوارٹز گھڑیوں سے لے کر ٹویوٹا کاروں تک، ٹکنالوجی، کمپیوٹر اور سائنس کی دنیا میں جاپان سر فہرست پہنچ گیا ہے۔ امریکہ کو اپنی زوال

پذیر اقتصادیات کو درست کرنے کیلئے جاپان کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑ رہا ہے۔ قوموں کی تاریخ میں بابری مسجد کی شہادت جیسے المناک سانحے ظہور پذیر ہوتے آئے ہیں لیکن زندہ قوموں کی یہ پہچان ہے کہ وہ ایسے نامصائب حادثات سے شکست خوردہ نہیں ہوتی ہیں۔ آج ہندوستانی مسلمانوں کو بابری مسجد کی شہادت سے عبرت حاصل کرنا چاہئے۔ اپنے اچھے برے کی پہچان کرنا چاہئے۔ دوست دشمن کی شناخت کرنی چاہئے۔ صرف بی جے پی اور دیگر کھلی ہوئی فرقہ پرست قوتوں سے ہی ہوشیار رہنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اب وقت آگیا ہے کہ ان جھوٹے سیکولرسٹ لیڈروں سے بھی جنہوں نے آزادی کے بعد سے مسلمانوں کا محافظ ہونے کا دعویٰ کر کے پوری قوم کو اپنا یرغمال بنا رکھا ہے تا آزادی حاصل کی جائے۔ اگر کانگریس پارٹی سچ مچ مسلمانوں کی ہمدرد ہوتی تو ۱۹۴۹ء میں پنڈت نہرو جو نہایت مضبوط پوزیشن میں تھے بہ آسانی مسجد کے اندر سے مورتیوں کو نکلوا کر بابری مسجد مسلمانوں کے حوالے کر سکتے تھے لیکن انہوں نے نہ صرف ایک خط لکھ کر اپنا فرض پورا کر دیا۔ ابوالکلام آزاد جیسے مردِ آہن کانگریس میں موجود تھے انہوں نے بھی اس معاملے میں تغافل برتا۔ بابری مسجد کے تالے کھلنے کے بعد ۱۹۸۷ء میں دلی میں بوٹ کلب میں ایک بے معنی اور غیر ضروری ریلی کر کے چند گمنام مسلمانوں نے راتوں رات قومی سطح پر مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے جو شہرت اور کامیابی حاصل کی ان تمام موقع پرست، خود غرض، غیر ذمہ دار حضرات سے دست بستہ التجا ہے کہ وہ اب قوم پر رحم کریں اور جذباتی اور اشتعال انگیز بیانات سے قوم کو مزید فریب اور بربادی میں مبتلا نہ کریں۔

آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہم سچے مسلمان بن جائیں کیونکہ اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ اگر مسلمان گمراہی کے راستے پر چلیں گے تو ان پر ظالم حکمران مسلط کر دیئے جائیں گے۔ اپنا محاسبہ کر کے دیکھئے کیا ہمیں اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کی سزا تو نہیں مل رہی ہے! آج دین کا راستہ چھوڑ کر ہم نے بے دینی کو اپنا لیا ہے۔ آج تقویٰ سے گریز کر کے ہم نے بدکاری کو گلے لگا لیا ہے۔ ایک سچا مسلمان اور ایک اچھا ہندوستانی بن کر ہی ہم سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اپنی ترجیحات (PRIORITIES) درست کر لیں۔ ہمیں اپنے معاشرے سے تعلیمی اور معاشی پس ماندگی دور کرنا ہوگی۔ ایک طالب علم کا حصول علم بھی ایک جہاد ہے اور رسول صلعم کی حدیث ہے کہ ایک عالم یا دانشور کی روشنائی شہید کے لہو سے زیادہ متبرک ہے۔ ہمیں اپنا حال اور اپنا مستقبل خود بنانا ہوگا۔ اغیار سے سوائے کھوکھلی تسلیوں کے اور کسی چیز کی توقع رکھنا فضول ہے۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر پوری قوم جنگی پیمانے پر اپنی اصلاح میں جٹ جائے۔ یہی وقت کا تقاضہ ہے اور اس میں قوم کی نجات پوشیدہ ہے کیونکہ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

— "انشاء" مارچ ۱۹۹۳ء

حرفِ اوّل

ایک ذاتی وضاحت

اب کے "حرفِ اوّل" کا ابتدائی حصہ ایک ذاتی وضاحت کے لیے وقف کرنا پڑ رہا ہے۔ ان سطور میں میرے مخاطب میرے خیر خواہ، میرے بدخواہ، میرے دوست، میرے دشمن، میرا اثبات کرنے والے، میری نفی کرنے والے —— سبھی ہیں۔

بعض عناصر نے ادبی دنیا میں گزشتہ کئی برسوں سے، ایک مغالطے کو حقیقت کا رنگ دے کر عام کر رکھا ہے۔ مغالطہ یہ ہے کہ میں ایک ادبی گروہ یا کسی گروپ کا سربراہ ہوں۔ اس گروہ کو کبھی ندیم گروپ، کبھی قاسمی گروپ اور کبھی فنون گروپ کا نام دیا جاتا ہے اور اس مغالطے کو بڑے التزام کے ساتھ پاکستان، ہندوستان اور دوسرے براعظموں میں رہنے والے اُردو دان حلقوں میں پھیلایا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ بالمشافہ گفتگو میں، انٹرویوز میں اور مراسلت میں مجھ سے بار بار استفسار کیا جاتا ہے کہ یہ کس نوعیت کی کشیدگی ہے؟ اہلِ قلم کی ایک معقول تعداد اس دھینگا مشتی میں اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کر رہی ہے؟ اور میں ایک سینئر قلم کار کی حیثیت میں، اس افسوسناک صورتِ حال کو ختم کرنے کا اقدام کیوں نہیں کرتا؟

میرا کوئی گروپ نہیں ہے

میں اعلان کرتا ہوں کہ میرا یا میرے احباب کا یا میرے رسالے کا کوئی گروپ نہیں ہے۔ "فنون" کے مندرجات گواہ ہیں کہ گزشتہ تیس برسوں میں اس کا طرزِ عمل کاسموپولیٹن رہا ہے۔ "فنون" کو نظریاتی یا گروہی یا شخصی وابستگیوں سے بلند ہو کر مرتب کیا جاتا ہے۔ اس ادبی مجلّے کا ایک معیار مقرر ہے۔ اگر کوئی تحریر اس معیار پر پوری اُترتی ہے تو یہ معلوم کیے بغیر کہ اس کا مصنف کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے اور کس کا دوست یا دشمن ہے، اس معیاری نظم یا غزل یا افسانے یا مضمون کو درج کر دیا جاتا ہے۔

ہر زندہ انسان کی طرح میرا ایک حلقۂ احباب یقیناً ہے مگر میں ان احباب میں سے صد فی صد کے ساتھ نظریاتی طور سے متفق نہیں ہوں اور ہمارے روابط کی نوعیت محض شخصی ہے۔ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ان میں ایسے افراد بھی ہیں جو کبھی کبھار احتیاطاً یا کسی خوف کے زیرِ سایہ منافقت کی زد میں آ جاتے ہیں اور انسانی رشتوں میں منافقت سے بڑے گناہ کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرے ساتھ منافقت برتی جا رہی ہے مگر میں کسی کو ٹوکتا نہیں کہ کسی کا مزاج یا نفسیات بدلنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس صورت میں میں کوئی گروپ کیا بناؤں گا اور کیوں بناؤں گا۔ اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو میرا لفظ مجھے زندہ رکھے گا۔ اگر اس لفظ میں جان نہیں ہے تو میں کیوں کسی کو یاد رہوں گا۔ چنانچہ میری شخصیت کی کسوٹی وہ لفظ ہے جو میرے فن میں وارد ہوتا ہے۔

وقت سب سے بڑا منصف ہے

مجھے ہمیشہ اپنے کام سے کام رہا ہے۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ مجھ پر کون حملہ آور ہو رہا ہے اور کون میری نفی پر تلا ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ نفی اور اثبات کا فیصلہ مطبوعہ لفظ اور وقت کے سپرد ہوتا ہے چنانچہ میں نظمیں اور غزلیں اور کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ کبھی کبھار کوئی مضمون کوئی کالم لکھ لیتا ہوں۔ "فنون" مرتب کرتا ہوں اور اس رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے عبادت کی حد تک محنت کرتا ہوں۔ پھر عزت مندانہ معاش کی مصروفیت ہے۔ میرے پاس جماعت سازیوں اور حلقہ بندیوں کا وقت بھی نہیں ہے اور اتنا روپیہ بھی نہیں ہے کہ کسی فرد یا گروہ کو خرید سکوں۔ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف ہوں اور اس صورتِ حال سے انتہائی حد تک مطمئن ہوں۔ پھر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ زندگی کی مختصر مہلت کو کشیدگیوں اور دشمنیوں میں ضائع کرتا پھروں۔

میری روحانی آسودگی

کرۂ ارض پر سانس لینے والے ایک سیدھے سادے انسان کی حیثیت میں، جب میں اپنی زندگی کی ساڑھے چھہتر منزلیں طے کرنے کے بعد، پلٹ کر دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو مطمئن پاتا ہوں۔ کسی ذرا سے پچھتاوے کا سایہ بھی میرے ماضی کے منظر کو نہیں دھندلاتا۔ یہ سوچ کر ایک عجیب سی تسکین محسوس کرتا ہوں کہ میں اس میدانِ حیات میں زندگی کو فریب دینے کا مرتکب ہوا ہوں اور نہ میں نے کبھی اپنے ضمیر کو فریب دینے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً اس مدت میں بعض لغزشیں بھی ہیں، بعض کوتاہیاں بھی ہیں، بعض نادانیاں بھی ہیں، اور ان کا کوئی جواز بھی نہیں ہے مگر یہ عام انسانی فروگزاشتیں ہی ہیں بلکہ میرا موقف تو یہ ہے کہ اگر مجھ سے یہ فروگزاشتیں سرزد نہ ہوتیں تو بحیثیت انسان میری تکمیل ہی معرضِ خطر میں پڑ سکتی تھی۔ قدرت نے دیانت اور محبت کو میرے وجود میں خون کی طرح جاری و ساری رکھا ہے، سو میں ذہنی اور روحانی طور پر بحمد للہ ایک آسودہ شخص ہوں ـــــ بعض تشنۂ تکمیل آرزوؤں کے باوجود آسودہ، کہ آرزو کرنا انسان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے اور یہ الگ بات ہے کہ ہر آرزو کا پورا ہونا ضروری نہیں۔

میرا ترقی پسندی کا نظریہ

جب میں جوان ہوا تو میرا پہلا مسئلہ یہ تھا کہ میں جس ملک میں رہتا ہوں، اس پر ایک غیر ملکی سامراج کیوں مسلط ہے۔ اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ میرے آس پاس انسانوں کی اکثریت اپنی ابتدائی ضرورتیں بھی کیوں پوری نہیں کر سکتی اور وہ زندگی کی ہر آسائش سے محروم کیوں ہے۔ بیشتر انہی دو دکھوں نے میری شاعری اور نثر میں اظہار پایا۔ نہ میں نے برطانوی استعمار کو بخشا اور نہ اپنی انسانی برادری کی محرومیوں کو نظر انداز کیا۔ ساتھ ساتھ میں نے انسانوں کی باہمی محبتوں اور ان محبتوں کی گوناگوں کیفیتوں کے بھی گیت گائے کہ کوئی بڑے سے بڑا نظریہ بھی انہیں گزند پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میری ترقی پسندی نے بنیادی انسانی جذبات کی کبھی نفی نہیں کی کیونکہ یہ جذبے ہی تو انسان کو انسان بناتے ہیں۔

آزادی کے بعد بین الاقوامی دہشت گردی کے علاوہ خود اپنے بھائی بندوں کا ظلم و جبر میرا موضوعِ فن رہا۔ میں نے ویت نام فلسطین اور دیگر عالمی مسائل پر نظمیں لکھتے ہوئے، کشمیر کو کبھی فراموش نہ کیا۔ ایک عالمی شخصیت بننے کی بجائے میں نے اپنے پاکستانی تشخص پر اکتفا کی کہ پاکستان ہی میری پہچان ہے۔ پاکستان کی تاریخ بیشتر آمروں کی تاریخ ہے مگر کوئی بھی آمر مجھ سے اپنے حق میں ایک حرف بھی وصول نہ کر سکا۔ میں ان پر صاف اور غیر مبہم لفظوں میں بار بار واضح کرتا رہا کہ اہلِ قلم حکومتوں سے وفاداری کے قائل نہیں ہوتے بلکہ ہم تو صرف اپنے ملک اور اس میں رہنے بسنے والے کروڑوں کے وفادار ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ تم آزادیٔ اظہار کا ہزار گلا گھونٹو، ہم اہلِ قلم براہِ راست نہیں تو علامت یا استعارے کی زبان میں اپنا مافی الضمیر بہر صورت بیان کریں گے اور اپنے ہم وطنوں کے بہتر مستقبل کی خاطر ہر صعوبت برداشت کریں گے۔

یہ بھی واضح کر دوں کہ بعض ہم عصروں کی طرح میں نے انسانوں کو دوسرے درجے کی مخلوق کبھی نہیں سمجھا بلکہ میرے نزدیک تو

انسان ہر مخلوق سے اشرف اور افضل ہے۔ اسی طرح میں نے انسان کے بہرصورت مرجانے کے دکھ سے خوف زدہ ہو کر انسانی زندگی کو لایعنی اور بے معنی کبھی قرار نہیں دیا کیونکہ میرے نقطۂ نظر کے مطابق تو:

جہاں سے شاخ ٹوٹی ہے وہیں سے شاخ پھوٹی ہے

اور یہی تسلسلِ حیات بنی نوعِ انسان کی فنا کی نفی کرتا ہے۔

انسانی برادری کا ایک خود آگاہ فرد

آج میں نے سوچا کہ میرے بارے میں پھیلائی ہوئی اتنی بہت سی غلط فہمیوں کے ماحول میں، میں اپنے پیار کرنے والوں سے اپنا تعارف خود کیوں نہ کرادوں۔ اگر اس سلسلے میں مجھ سے کہیں کہیں تعلّی سرزد ہوئی ہے تو میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ تعلّی میرا میدان ہی نہیں ہے —— میں تو کرۂ ارض پر سانس لینے والی انسانی برادری کے کروڑوں اربوں افراد میں سے ایک خود آگاہ فرد ہوں اور بس —— اور اگر مجھ سے پیار کرنے والے مجھے عزت اور محبت کا مستحق سمجھتے ہیں تو یہ ان کی اپنی بڑائی ہے۔ رہے مجھ سے دشمنی رکھنے والے اور میری نفی کرنے والے، تو میں اُن کے حق میں دعا کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔

"فنون" جنوری-اپریل ۹۳ء

حرفِ اوّل

پچھلے دنوں تنقید کی ایک نہایت دلچسپ مثال سامنے آئی ہے۔ ایک خاصے معروف نقاد نے انگریزی زبان کے ایک ہفت روزے میں اکا دکا دوسرے ادبی رسائل کے ساتھ ہی "فنون" کو بھی ——— بلکہ "فنون" کو بطورِ خاص، رگید ڈالا ہے۔ ان کا نام لکھنے سے گریز کیا جا رہا ہے کیونکہ مقصد صرف تنقید کے ایک گمراہ کن رجحان کی نشان دہی ہے۔ ان کی تنقید کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ یا تو وہ "فنون" کو دل جمعی سے پڑھتے نہیں، اور اگر پڑھنے کی اذیت گوارا کرتے ہیں تو محض جستہ جستہ پڑھتے ہیں، اور اگر ہر شمارے کے سبھی مندرجات پڑھتے ہیں اور اس کے باوجود ناپسند فرماتے ہیں تو وہ یقیناً کسی خوفناک نفسیاتی کمپلکس میں مبتلا ہیں یا پھر کسی شدید عصبیت کے شکار ہیں۔ بصورتِ دیگر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ "فنون" پر بے جا الزامات کی بوچھار کر دیتے۔

"وفیات" پر اعتراض قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ چند برس پہلے ایک دریدہ دہن نے "فنون" کے "حرفِ اوّل" میں "وفیات" کے حوالے سے لکھا تھا کہ یہ رسالہ اپنی ہر اشاعت میں مرنے والوں کا قبرستان سجا بیٹھتا ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کا شدید ردِعمل ہوا تھا۔ مگر مرنے والے اہلِ قلم سے سمجھ میں نہ آنے والی اس پرخاش کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ انہی نقاد نے "فنون" کے ایک شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے وفیات کے حوالے سے فرمایا ہے کہ یہ رسالہ اس دوران میں مرنے والوں پر دو چار "ناگزیر" آنسو ٹپکانے کا عادی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرنے والوں کو یاد کرنے سے ان حضرات کو کیا اور کیوں اذیت ہوتی ہے جبکہ مرنا تو سبھی کو ہے۔ پھر "وفیات" تو ہماری تاریخِ ادب کا حصہ ہیں۔

"فنون" کے حصۂ غزل پر اعتراض انہی نقاد صاحب نے "فنون" میں غزلیات کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہنا بھی اپنی دیانت کے مطابق سمجھا ہے کہ ان بہت سی غزلوں کو دیکھ کر ایک صدی پہلے شائع ہونے والے وہ "گلدستے" یاد آ جاتے ہیں جن میں الم غلم غزلوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ کاش یہ نقاد "فنون" میں شائع ہونے والی غزلوں کے مطالعے کی زحمت بھی گوارا کر لیتے۔ تب (شاید) انھیں احساس ہوتا کہ یہ غزلیں اس ہر دلعزیز صنفِ شعر کے بدلے ہوئے اور بدلتے ہوئے رجحانات کی بلیغ ترجمان ہوتی ہیں۔ ان کے لفظ لفظ میں جدید حسیت اور روحِ عصر دھڑکتی ہے۔ یہ غزلیں نئے استعاروں کی تخلیق کر رہی ہیں اور عام استعمال کے الفاظ نئے مفاہیم سے آراستہ کر رہی ہیں۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ان نقاد صاحب کی طرح ہمارے بیشتر نقادوں نے لکیر کی فقیری کا منصب سنبھال رکھا ہے اور لکیر کا فقیر جب اس لکیر سے ذرا سا بھی ہٹے گا تو اسے چکر آنے لگیں گے۔ یہ اردو تنقید نگاری کی بدقسمتی ہے۔

"فنون" کے معیاروں پر اعتراض ان نقاد صاحب نے اس کے علاوہ بھی "فنون" پر پھبتیاں کسی ہیں۔ مثلاً کسی شمارے میں نہ اختر حسین جعفری کی نظم ان کو متوجہ کر سکی اور نہ وہ رشید ملک، احمد ہمدانی، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے عالمانہ مقالات کے بارے میں کچھ کہہ سکے۔ نہ "اختلافات" میں محمد ارشاد اور رشید ملک کی گفتگو انھیں متاثر کر سکی۔ نہ انھوں نے رضیہ فصیح احمد، رفعت مرتضیٰ، گلزار، نیلوفر اقبال اور عطیہ سید کے معیاری افسانوں کی کوئی رسید دی۔ انھیں صرف محمد منشا یاد کا افسانہ "ایک تھی فاختہ" یاد رہا اور وہ بھی "فنون" پر آوازہ کسنے کے لیے کہ جس طرح اس افسانے میں فاختائیں ہجرت کر جاتی ہیں، اسی طرح ادبی رسائل کی "فاختہ" بھی کہیں اڑ گئی ہے اور باقی کوا کہا رہ گیا ہے۔

حمدوں اور نعتوں کے الگ شعبے پر اعتراض نقاد صاحب کا ایک اور اعتراض یہ ہے کہ حمدوں اور نعتوں کو شروع میں الگ سے کیوں درج کیا جاتا ہے جبکہ اگر کوئی حمد یا نعت اچھی ہے تو اسے نظموں کے حصے میں شامل کرنا چاہیے۔ نعت کی صنف نے دورِ حاضر میں جو عروج حاصل کیا،

ہے اس کا بھی اور حمد اور نعت کے موضوعات کی انفرادیت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ انہیں الگ جگہ دی جائے۔ نقاد صاحب کا شبہ ہے کہ حمد و نعت کو الگ شعبہ مقرر کرنے کا مقصد حکومتِ وقت کو راضی رکھنا ہے اور اس شعبے کا آغاز جنرل ضیاء الحق کے دور میں ہوا تھا۔ نقاد صاحب پر یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے تو ۱۹۷۷ء میں پاکستان پر قبضہ کیا تھا اور "فنون" آرٹ ۱۹۶۳ء سے جاری ہے۔ اگر "فنون" کا اور دیگر ان معیاری ادبی رسائل کا جو حمد و نعت کو اپنے ہاں الگ جگہ دیتے ہیں، مقصد جنرل صاحب کو خوش کرنا ہوتا تو ان کی موت کے بعد تو یہ سلسلہ رک جانا چاہیے تھا۔ اور کیا خدا اور رسولؐ کے بارے میں گفتگو کو بھی اس سطح پر اتارا جا سکتا ہے؟

اعتراض ہی اعتراض

"فنون" پر ان صاحب نے جو دیگر الزامات لگائے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

- "فنون" نے محمد حسن عسکری کے خلاف مہم چلا رکھی ہے۔
- "فنون" اردو ادب کے جدید دور کے ہر اہم ادیب کو نظر انداز کرتا ہے
- اگر جدید ادب "فنون" میں راہ پا بھی لیتا ہے تو "محض شو پیس" کے طور پر۔
- "فنون" کی حالت دردناک ہے۔ یہ رسالہ بے وقری اور بے وقعتی کی گہرائیوں میں اترا جا رہا ہے۔
- "فنون" کے اس زوال کی وجہ مدیر کی کبر سنی بھی ہو سکتی ہے۔
- اس رسالے کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو رہا ہے۔
- آدھا شمارہ رطب و یابس سے بھرا ہے۔
- معمولی درجے کے اہلِ قلم کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔
- بیشتر مندرجات میں معاشرتی اور سیاسی حوالے سے زیچ کر چھپنے کی ذہنیت کارفرما ہے۔

اور یہ سب کچھ ان نقاد صاحب نے لکھا ہے جو حال ہی میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

"فنون" اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کیا عرض کر سکتا ہے کہ اگر جدید اردو تنقید کا یہی معیار ہے تو ہم سب کا اللہ والی!

"فنون" ستمبر۔ دسمبر ۹۲ء

۲۸۱

انسان ہر مخلوق سے اشرف اور افضل ہے۔ اسی طرح میں نے انسان کے بہرصورت مر جانے کے دکھ سے خوفزدہ ہو کر انسانی زندگی کو لایعنی اور بے معنی کبھی قرار نہیں دیا کیونکہ میرے نقطۂ نظر کے مطابق تو:

جہاں سے شاخ ٹوٹی ہے وہیں سے شاخ پھوٹی ہے

اور یہی تسلسلِ حیات بنی نوعِ انسان کی فنا کی نفی کرتا ہے۔

انسانی برادری کا ایک خود آگاہ فرد

آج میں نے سوچا کہ میرے بارے میں پھیلائی ہوئی آتی بہت سی غلط فہمیوں کے ماحول میں، میں اپنے پیار کرنے والوں سے اپنا تعارف خود کیوں نہ کرا دوں۔ اگر اس سلسلے میں مجھ سے کہیں کہیں تعلّی سرزد ہوئی ہے تو میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ تعلّی میرا میدان ہی نہیں ہے —— میں تو کرۂ ارض پر سانس لینے والی انسانی برادری کے کروڑوں اربوں افراد میں سے ایک خود آگاہ فرد ہوں اور بس —— اور اگر مجھ سے پیار کرنے والے مجھے عزت اور محبت کا مستحق سمجھتے ہیں تو یہ ان کی اپنی بڑائی ہے۔ رہے مجھ سے دشمنی رکھنے والے اور میری نفی کرنے والے، تو میں اُن کے حق میں دعا کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔

"فنون" جنوری۔ اپریل ۹۳ء

ایک بیراگی — انیس شاہ جیلانی

انیس شاہ جیلانی کا نام میں نے پہلے پہل آج سے بارہ تیرہ برس پیشتر سنا۔ اس نے حیرت شملوی کے خطوط پر مشتمل ایک پمفلٹ نما کتاب تالیف کی تھی (میں حیرت شملوی کو بھی نہیں جانتا تھا) اس کے کافی طویل دیباچے میں حیرت شملوی کی قلم رانی اور سخن سنجی کی بہت ستائش کی گئی تھی اور یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ اس عہد کا سب سے بڑا شاعر اور نثر نگار تھا اور اگر اس کی ساری غیر مطبوعہ تصانیف چھپ کر سامنے آجائیں تو دنیا محوِ حیرت ہو جائے گی۔ (انیس شاہ کے اصل الفاظ مجھے یاد نہیں) مجھے یہ تعریف و تحسین اس متوالے پجاری کی سی لگی جو اپنی دیوی کے اوصاف بڑھا چڑھا کر گاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں حیرت شملوی کی بیس سے زیادہ زیرِ طبع کتابوں کی فہرست تھی۔ یہ کتابیں غالباً اب تک نہیں چھپ سکیں۔ جب میں نے خط پڑھے تو میں ان کے اسلوبِ نگارش اور خیالات سے واقعی مرعوب سا ہو گیا' اور حیرت شملوی ادب کے میدان کا ایک چھپا ہوا رستم نکلا جسے نقادوں نے بے منصفی سے نظر انداز کیا ہے (شاید میں نے ہی "انکار" میں اس پر تبصرہ بھی کیا)

مگر انیس شاہ جیلانی کی شخصیت نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ حیرت شملوی کو پوچھنے والا میرا یہ ہم وطن یا ہم دیس کون ہے اور ایسا آدمی میری نگاہوں سے کیوں کر چھپا رہا' وہ یقیناً کوئی نایاب پرندہ (Bird) ہوگا ——— اس دریافت سے تین چار سال بعد میں اور ملاحی، شکاری اور گھوڑوں کا عاشق بھائی اس کی سرکاری جیپ میں صادق آباد وہاں کے میر زاہد حسین کے مشہور کتب خانے کو دیکھنے گئے۔ میر صاحب اس خطے کے بڑے زمینداروں میں سے ہیں' ایک پکے محبِ قوم' کٹر مسلم لیگی' قائدِ اعظم اور مادرِ ملت کی عقیدت اور محبت کا دم بھرنے والے اس قرۃ العین کے ناولوں سے نکلے ہوئے ایک کردار۔ بہاولپور کے خطے میں وہ یقیناً کتابوں کے سب سے بڑے جامع ہیں۔ اس جامہ زیب' نستعلیق ارسٹوکریٹ نے اب صادق آباد میں ایک وسیع و عریض محلسرائی تعمیر کا پروجیکٹ شروع کر رکھا ہے جو ان کی زندگی میں مکمل نہیں ہوگا۔ میر صاحب ابھی اپنی پرانی حویلی میں پڑے ہیں گو انھوں نے کتب خانے کا کچھ حصہ پندرہ سال سے زیرِ تعمیر محلسرا میں منتقل کر دیا ہے۔ یہی میر زاہد حسین ہمیں انیس شاہ جیلانی سے ملانے اور اس کا کتب خانہ دکھانے اپنی گاڑی میں محمد آباد لے گئے۔ صادق آباد سے محمد آباد کا قصبہ جو صادق آباد کی تحصیل میں ہے پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر ہے اور سڑک اناج کے کھیتوں' کچے کی چار دیواری میں گھرے آم کے باغوں' کھجور کے جھنڈوں کے پاس سے جاتی ہے مگر بہاولپور کے خطے کے دوسرے علاقوں کی طرح سنہری فضا میں صحرا یا روہی کی 'بو' ٹھہری ہے۔ کیونکہ اب سے پینتالیس پچاس برس پہلے جب یہاں نہریں نہیں آئی تھیں اور خال خال آبادی تھی' یہ سارا علاقہ چولستان کے لق و دق ریتلے ویرانے کا حصہ تھا' روہی جس کے گیت خواجہ غلام فرید نے گائے ہیں جس میں نازک نازک جٹیاں دن کو اپنے کچے گھروندوں میں چاٹیوں' میں دودھ بلوتی تھیں اور رات کو دلوں کا شکار کرتی تھیں۔ قدم قدم آبادی کے باوجود وہ 'روہی' کی بو اب تک یہاں سے نہیں گئی نہ کبھی جائے گی۔ یہ دنیا کی سب سے مست کر دینے والی بو ہے...... انیس شاہ جیلانی کا مسکن قصبے سے ایک کچھ اونچی کرسی پر ایک پختہ سرخ اینٹوں کی چھوٹی سی عمارت ہے۔ گھر کے بجائے دیہاتی لائبریری یا ڈسپنسری لگتی ہوئی۔ وہ ہمیں برآمدے میں ملا۔ گھیرے دار شلوار قمیص میں ایک خوش مزاج دبلے چھریرے بدن کا آدمی۔ میرے چہیتے سکاٹ لینڈ کے ناولسٹ رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی عکسی تصویروں سے وہ کافی مشابہت رکھتا تھا۔ وہی کتابی چہرہ' فراخ پیشانی' وہی ہونٹ کے کناروں سے نیچے آتی ہوئی ہلالی مونچھ کا اسٹائل۔ بالوں کے بیچ میں سیدھی مانگ' آنکھوں میں وہی' رومانی ترماہٹ' (روہی کی فضاؤں میں پروردہ سب مردوں عورتوں میں یہ رومانی ترماہٹ' پائی جاتی ہے) وہ مجھے اور میرے بھائی کو اس تپاک سے ملا جیسے ہم برسوں کے بچھڑے ہوں' وہ ہمیں اندر لے گیا۔ دالان نما وسطی کمرہ جھاڑا' بہارا' فرشایا ہوا۔ سامنے کی دیوار کے پاس معمولی صوفوں کی ترتیب' دائیں طرف داخل ہونے والے دروازے کے پاس ترشک پر ایک 'میز جی' جیسی مہاجنوں کی دکانوں پر ہوتی تھی اور جس پر حساب کتاب کے بہی کھاتے لکھتے تھے۔ میز جی پر ہمارے اسکول کی کلکی قلم' ایک بڑی صورت والی دوات' ایک رجسٹر سا

اس کے اوپر لکھا تھا اور اس نے بتایا یہ اس کے لکھنے کا گوشہ ہے اور ان دنوں وہ اپنا ہندوستان کا سفرنامہ لکھ رہا ہے۔ ہمیں ایک دو نوجوان لڑکے ملازم دیکھے۔ وہ یہاں ایک گوشہ گزیں کی طرح رہتا تھا۔ اپنی کتابوں اور اپنے لکھنے پڑھنے کے سامان کے ساتھ اس کی عورت کا (اگر اس کی کوئی عورت تھی) آس پاس کوئی نشان نہ تھا۔ ہم نے اس کا کتب خانہ دیکھا۔ اردو اور فارسی کی کتابیں اس کے عالم و فاضل مرحوم باپ مبارک شاہ صاحب کی اکٹھی کی ہوئیں۔ اس نے ہمیں حیرت شگوی کے مسودات اور ملفوظات کے انبار بھی دکھائے اور رئیس امروہوی مرحوم کے کاغذ کے پرزوں پر لکھے اشعار کا ذخیرہ بھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ پچھلے برس رئیس صاحب یہاں اس کے پاس مہینہ بھر مہمان رہے۔ وہ کاغذ کے پرزوں پر اشعار رباعیات لکھ لکھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینکتے رہتے تھے اور وہ ان سے نظر بچا کر ان تبرکات کو محفوظ کر لیتا تھا۔ وہ رئیس امروہوی کا ذکر بڑی والہانہ شیفتگی سے دیر تک کرتا رہا۔ انیس شاہ جیلانی مجھے ان خبطی لوگوں میں سے لگا جو ادب پر ٹپکے ہوتے ہیں اور ادیبوں یا کتابیں لکھنے والوں کو اس ذوق شوق سے جمع کرتے ہیں جیسے ٹکٹ جمع کرنے والے نادر ٹکٹوں کے .... اس نرم گفتار خوش ذوق شخص کی طبیعت لطافت اور ظرافت کے عنصر سے بنی تھی اور اس کی صحبت میں وقت گزرنے کا پتہ نہ چلا ..... پھر ہم وہاں سے چلے آئے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے خط لکھتا رہے گا۔ شاید اس نے ایک دو خط لکھے بھی جن کا جواب میں نے نہیں دیا۔

اس ملاقات کو آٹھ نو برس سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا ہے۔ میں اس کی کتاب کی پشت پر اس کے فوٹوگراف سے دیکھ سکتا ہوں کہ اس کی اسٹینو سوئین مونچھیں برف کی سی سفید ہو چکی ہیں۔ اسی طرح سر کے بال جو ماتھے سے بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ چہرے پر بھی پرچھائیں سی آگئی ہے۔ ہاں وہ رومانی آگ آنکھوں میں ابھی ہے (وہ میری طرح پیر فرتوت نہیں ہوا۔ نہ ہی بجھا ہوا) تقریباً نو برس کے بعد کوئی مہینے بھر ہوئے اس کا پہلا خط مجھے ملا۔ لفافے پر میرا بہاولپور کا پتہ درج تھا اور ظاہراً اس کے خیال میں میں ابھی تک بہاولپور ہی میں تھا۔ سرنامے میں مجھے بخدمت جناب ادیب شہیر لکھا تھا۔ میں خوب ہنسا۔ میں نے اپنے جواب میں اس خطاب پر احتجاج کیا اور اسے لکھا کہ میں ادیب شہیر کی قسم کی کوئی چیز نہیں اور اس لفظ سے مجھے نفرت ہے۔ مزید یہ کہ میں ادیب بھی نہیں صرف ادب پڑھنے والا ہوں۔ اس طرح ہمارے درمیان خط و کتابت جاری ہو گئی۔ میں نے اس کے رئیس امروہوی مرحوم پر لکھے ایک مضمون کی تعریف کی۔ اس نے لکھا کہ وہ رئیس پر ایک ہزار صفحات کی کتاب لکھ سکتا ہے۔ اس کے پاس اتنی یادیں محفوظ ہیں مگر اسے چھاپے گا کون ..... پھر ایک خط میں اس نے مجھے بتایا کہ اس نے ہندوستان کے سفرنامے والی کتاب کئی سال پہلے مکمل کر لی تھی لیکن اسے زیور طباعت سے آراستہ کرنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے لئے کسی شریف النفس پبلشر کی تلاش کروں۔ پھر اس کا آخری خط آیا۔ اس نے سرائیکی زبان میں ایک کتاب "مہاندرا ڈیکھنس" لکھی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ میں انگریزی میں اس پر تبصرہ کروں۔ میں نے اسے فوراً لکھا کہ میں سرائیکی ہوں مگر مجھے عبارت کو پڑھنے میں سخت دقت ہوتی ہے اور وہ کسی سرائیکی ادیب سے اس پر تبصرہ کرا کے مجھے بھیج دے ..... مگر چند روز بعد مہاندرا ڈیکھنس کا رجسٹرڈ پیکٹ آگیا۔ اس کے بعد اطلاع نامے کا ایک پوسٹ کارڈ ...... سو تبصرہ مجھے ہی کرنا ہوگا ہر حال میں۔

"مہاندرا ڈیکھنس" مکمل پڑھنے میں مجھے چند روز دن لگے ہیں کیونکہ سرائیکی خط پڑھنے کی مجھے مشق نہیں۔ اور ساری کی ساری مصنف کے اپنے خط میں لکھی ہوئی ہے (گو وہ نہایت خوش خط ہے)۔ مہاندرا سرائیکی میں بڑے یا عظیم شخص کو کہتے ہیں، ڈیکھنس نظر آنے والا ہے۔ میرے دوست انیس شاہ جیلانی کی یہ کتاب پاکستان کی چیدہ عظیم یا معتبر شخصیات کے قلمی خاکوں پر مشتمل ہے۔ یہ عظیم شخصیات کون ہیں؟ سابق گورنر جنرل غلام محمد، لیاقت علی خاں، فیض احمد فیض، مولانا مودودی، [illegible]، بھٹو، نظامی [illegible]، محمد علی جناح، نیز حسنت علی اعوان، رفیق ساحل، ڈاکٹر نبی بخش، حفیظ سرائیکی۔ یہاں میں کہ یہ خاکے انتہائی نوکیلے اور خوبصورت ہیں۔ وہ مصنف ملک و قوم سے محبت کرنے والا ایک دردمند نواز ادیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو مناصب پر فائز ہونے والے یا شہرت پانے والے لوگ ہی عظیم نہیں ہوتے۔ حسنت علی فقیر جیسے لوگ بھی عظیم ہوتے ہیں جو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنی زبان میں دل پر اثر کرنے والی شاعری کرتے ہیں جسے کبھی چھپنا نصیب نہ ہوگا۔ وہ مشہور نہیں ہیں۔ ان کے نام اور کام کو کوئی نہیں جانتا۔ اخباروں کے ناموں کی سرخی نہیں بناتے ...... لیکن کیا وہ ان لوگوں سے کم عظیم ہیں جو دنیا میں شور و غل مچاتے ہیں۔ مجھے شروع شروع کی جان کاوی کے باوجود ان خاکوں کو اپنی پیاری سرائیکی میں پڑھنے میں بڑا لطف حاصل ہوا۔ ہماری علاقائی زبانوں میں سرائیکی زبان سننے اور لکھنے میں سب سے میٹھی ہے۔ پنجابی، پشتو یا سندھی کے برعکس جو کھردری زبانیں ہیں۔ اور جن کے دامن میں کافی ادبی سرمایہ ہے۔ سرائیکی بولنے والے کے گلے میں ذرا بھی کھرکھراہٹ محسوس نہیں ہوتی گویا کہ شہد میں شکر کو حل کر رکھ دیا ہو ...... اور سرائیکی زبان

---

۱ مصنف: سید انیس شاہ جیلانی۔ قیمت ۵۰ روپے ضخیم کتاب۔ ناشر: سرائیکی ادبی اکیڈمی، محمد آباد، ضلع رحیم یار خاں

ن عظیم ادب بھی موجود ہے ——— خواجہ غلام فرید کی کافیاں، مولوی لطف علی کی مثنوی سیف الملوک۔

بخت علی فقیر، جو اب اسی برس کا ہو چلا ہے، پیشے کے لحاظ سے ایک قلعی گر تھا اور انیس شاہ نے خود اسے احمد پور لمہ میں گاؤں والوں کے برتن قلعی سے اجالتے دیکھا ہے۔ وہ تب عنفوانِ شباب میں تھا، پھر اس کو عشق کی ٹھوکر لگی اور وہ ایک سانولی سلونی کی محبت میں گھلنے لگا۔ اس خطے کے لوگ محبت کے لئے ہی بنے ہیں اور اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ اس خاتون کا نام شاید بخت بی بی تھا۔ وہ ایک قلعی گر سے ملکانا یا بیاہ کرنا نہیں چاہتی تھی، بخت علی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے دھندا چھوڑ دیا فقیر اور شاعر بن گیا۔

اس سرائیکی کے رابرٹ برنز کی ایک آتشیں رومنٹک کا آزاد اردو ترجمہ یہ ہے:

اے سانول (محبوب) لمحہ لمحہ تیری گمبھیر سیاہ آنکھیں مجھے مارے ڈالتی ہیں۔ یہ تیری قاتل آنکھیں بے دھڑک مجھ پر تیر چلاتی ہیں، نہ مرنے دیتی ہیں نہ جینے۔ ان میں سرمے کی تحریر کے بغیر بخت قتل ہو گیا۔ اس کا دل چھلنی چھلنی ہوا۔ سانول چہرہ نور سے تاباں تھا، آنکھیں نشیلی، بیچ میں سیاہ زلف لٹکتی ہے۔ بخت کا دل اس حسن پر کیوں نہ صدقے ہو، کیوں نہ تڑپے۔ عشق کے تھپیڑے تلوار کٹار کے وار سے زیادہ سخت، زیادہ بے رحم ہوتے ہیں ...... نہ ہی یار سے وصال ہوتا ہے اور نہ ہی موت مجھے ختم کرتی ہے۔ لمحہ لمحہ دل ڈوبتا جاتا ہے ...... بخت! کوئی ایسی تدبیر تیرے پلے آن پڑی ہے کہ اس دل کا تیرا درد نہیں مٹا۔

مگر ترجمے میں سرائیکی ادب کی وہ خاص کیفیت جو روہی کی سرزمین نے یہاں بسنے والوں کی طبیعت یا مزاج یا ان کی خوبصورت زبان میں پیدا کی ہے، نا مجھ کو مزہ نہیں دے سکتی ——— سرائیکی کا جادو، اس کی ناقابلِ یقین حلاوت ——— یہ ایسی چیزیں ہیں جو اسی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تھانڈر ، ڈیکھنس میں یہ قیمتی خاکے کے ساتھ اس شخصیت کا فوٹو ہے۔ فیض احمد فیض میر پور خاص کے ایک ۱۹۷۳ء میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں نظم پڑھ رہے ہیں۔ انیس شاہ نے اس میں شرکت کی تھی۔ سب سے دلچسپ تصویر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ہے۔ سکھر کے ایک فوٹوگرافر کی کھینچی ہوئی اور ان دنوں کی جب وہ صاحبِ اقتدار تھے۔ سفید سوٹ، سیاہ ٹائی پہنے وہ آنکھیں پھاڑے کھوئی میں کسی جگہ کھڑے ہیں اور ہمارے انیس شاہ جیلانی کا ماموں سید بہادر علی شاہ جیلانی سرائیکی پگڑ اور قبا میں، ان کی آنکھوں میں سرمے کی سلائی پھری ہے ——— تعظیم اور وجاہت کی علامت ——— کجل کی یہ دھار سرائیکی شاعری اور ادب میں بار بار آتی ہے ...... ہم سب روہی کے رہنے والے اس کجل کی دھار کے کشتہ ہیں، ہم پر رحم کھاؤ۔

تو یہ ہے انیس شاہ جیلانی کی دل لبھانے والی کتاب ایک قیمتی دستاویز۔ غالباً سرائیکی میں اپنی طرز کی پہلی اور واحد کتاب۔ اللہ اس دیوانے روہیلے کے وسائل اتنے وسیع کرے کہ وہ اپنے سب خواب پورے کر سکے۔ وہ ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا اور جیسا کہ انگریزی شاعر رابرٹ براؤننگ نے کہا ہے، عمر کا بہترین حصہ آگے آنے والا ہے:

The Best is yet to Be.

••

"فنون" ۳۷ ستمبر۔ دسمبر ۹۲ء

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ہیرو وازی، گوالیار ۔ ۴۷۴۰۱۰

من آنم کہ من دانم

اپنی بابت لکھتے ہوئے سب سے پیشتر یہ عرض کرنا ہے کہ میں صرف پانچویں جماعت تک اُردو کا طالب علم رہا۔ پرانے زمانے میں حروف کی شناسائی کے بعد مدارس کریما، بوستاں، گلستاں وغیرہ شروع کی جاتی تھیں۔ بریلی کے ڈی۔ بی۔ اے۔ وی اسکول میں پانچویں جماعت تک ہو بچے کے ساتھ ساتھ مکتب میں جو شام کو صرف ایک گھنٹہ کے لیے لگتا تھا، میں شامل ہونے تک جا ہو چکا تھا کہ پھر مجھے انگریزی تعلیمات کے لیے بھیج دیا گیا جہاں دو کلاسیکل زبانیں لینا لازمی تھا۔ میں نے سنسکرت اور فارسی کا انتخاب کیا۔ جو ایک ہم لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس پس منظر میں بچے کے ذہن کی پرداخت و پرورش ادبیات کے گہوارے میں خضر ساماں سے بھرپور ہوتی ہے۔ جہاں تک اُردو کا سوال ہے پانچویں جماعت تک ہی پڑھ سکا۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ابھی تک رہتا ہے۔ اُردو سے والہانہ کچھ کچھ عشق بہ تدریج ہوا شروع ہو گا تھی اور غالباً اُردو سے سب سے زیادہ دل لگاؤ اسی دور کے ماحول سے بھی عبارت تھا لیکن اس ماحول پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بریلی کا محلہ جہاں میں رہتا تھا مخلوط آبادی پر مشتمل تھا۔ بیشتر مکانات کو شستہ و سلیقہ (اور بشاش) اور مسلمانوں کے تھے۔ جو پڑوس میں رہتے تھے بیشتر گھرانے صاحب حال خاندان اور ہر مجموعی طور پر ہمارے اچھی نیک صاحب لوگ تھے۔ محلہ پورا ہی آباد تھا۔ اُردو اپنے پورے شباب پر تھی اور فضا بھی اسی سے معمور رہتی تھی۔ آئے دن شاعروں کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ ان دنوں سیکولر کی اصطلاح سے کوئی واقف

ہو سکتا تھا مگر ہندو مسلمانوں میں رواداری، وضعداری حسن سلوک سکہ رائج الوقت تھے۔

ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے ذکر سے ۱۹۲۱ء کی فضا یاد آتی ہے۔ وہ وقت جس نے تمام اختلافات کو شانہ بشانہ کر دیا تھا۔ ایک واقعے کا ذکر سیاق کا مطالبہ معلوم ہوتا ہے۔ بریلی کے محلہ کونوں میں ایک مندر ہے جس کا نام سیتارام مندر ہے۔ اس مندر کا دالان اور چبوترہ وسیع و کشادہ ہیں اور سیڑھیاں ہیں۔ اتنے ہوئے مندر کا صحن ہے جو اتنا وسیع و عریض ہے کہ تقریباً دس ہزار آدمی بآسانی بیٹھ سکتے ہیں۔ وہیں میں نے علی برادران (مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی)، بیرسٹر کی زبان سے، تقاریر سنیں۔ علماء اشرف و بخاری بڑے زور دار انداز سے تقریر کرتے تھے۔ جوش میں آکر ہاتھ میں پکڑی ہوئی تلوار نکال کر لہرانے لگے۔ ان کی تقریر بھی دہی سی۔

ایک اور بیٹھک کا ذکر غالباً غیر ضروری نہ ہوگا:

مولانا حسین احمد مدنی خطاب کرنے سے پہلے نعرۂ تکبیر بلند کرتے تھے اور حاضرین ہدایت کے مطابق اللہ اکبر بہت بلند آواز میں کہتے تھے۔ مندر کے صحن میں نعرۂ تکبیر کا بلند ہونا اور ہندو مسلمانوں کا اجتماعی طور پر باآواز بلند اللہ اکبر کہنا کس سلوک پر روشنی نہیں ڈالتا۔ ان تقاریر و خطابات کا مجموعی طور پر اثر یہ ہوا کہ اس سے وطن پرستی کا جذبہ ابھرا جو آج تک متزلزل نہیں ہوا۔

وطن پرستی کے محور پر گردش کرتی ہوئی ایک اور داستان پیش ہے جس کی بابت ایک معرکہ سا ہوا ہے ہے

وہ حقیقت جو اب فسانہ ہے —— یا
وہ فسانہ جو کل حقیقت تھا

۱۹۴۲ء میں بھارت چھوڑو تحریک ملک کے گوشہ گوشہ میں جوش و خروش سے چلائی جارہی تھی اور اس کی قیادت صرف نوجوان ہاتھوں میں تھی بالخصوص ان طلبا کے ہاتھوں میں جو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن تھے۔ البتہ کبھی کبھی جے پرکاش نرائن، اچیوت پٹوردھن اور ارونا آصف علی پر مشتمل زیر زمین قیادت سے بھی احکامات موصول ہو جاتے تھے مگر چونکہ تمام تر انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے اخبارات نے حکومت کی پالیسی کے خلاف بطور احتجاج اشاعت بند کردی تھی اور صرف حکومت نواز اخبارات ہی شائع ہوتے تھے لہٰذا پارٹی سے احکامات کا ملنا قریب قریب منقطع ہوگیا تھا۔ بریلی شہر میں تین چار حلقوں میں منقسم طلبا یہ تحریک کو چلا رہے تھے۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ بریلی کے محافظ خانہ کو جو ڈسٹرکٹ عدالت ہی کے احاطہ میں تھا کس نے نذر آتش کیا تھا؟ عدالت اور امپیریل بینک (جو آزادی کے بعد سے اسٹیٹ بینک ہوگیا ہے) کے بیچ کنٹونمنٹ کو جانے والی سڑک پر تین فوجی افسروں پر کس نے حملہ کیا تھا؟ دہلی سے مغل سرائے ہو کر کلکتہ جانے والی اس ٹرین کو جس میں انگریز سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ سوار تھا کس نے پٹری سے اتار کر گرا دیا تھا؟

مذکورہ بالا واقعات میں ہم تین نوجوان دوست شامل تھے: ہاشم العوث، اکرام حسین اور بشیر ربال مصرا۔ دل چاہتا ہے کہ پوری داستان پر روشنی ڈالوں ؎

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

ان واقعات کو بالتفصیل بیان کرنے کو جی چاہتا ہے مگر میں قلم پر گرفت رکھتے ہوئے اختصار سے ہی کام لوں گا۔ محافظ خانے پر رات کو تنہا سپاہی پہرا دیتا تھا۔ بشیر ربال مصرا نے راستہ بھول کر ادھر آنکلنے کی بات کرتے ہوئے اس سپاہی کو سگریٹ پیش کیا اور دوسرا خود سلگایا۔ ہمارے پاس خاصا لمبا رسہ تھا۔ اکرام نے پٹرول کو گیلن بھر سے لے کر اس رسے کو پٹرول میں تر کر لیا۔ دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر اکرام نے مجھ سے کہا کہ تم میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر روشن دان سے رسہ اندر ڈال دو۔ پٹرول میں تر رسہ اندر گرا دیا گیا، مگر گیلن میں پٹرول بچ رہا تھا۔ بقیہ پٹرول کو اکرام نے پاس کے کنوئیں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب اور مزا آئے گا۔"

رسے کا دوسرا سرا میرے ہاتھ میں تھا۔ سیٹی بجاتے ہوئے بشیر ربال مصرا کو اشارۃً کہا گیا کہ وہ سڑک پر چلے جائیں۔ اس کے بعد اکرام نے رسے کے سرے میں دیا سلائی لگائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا رسہ جلنے لگا اور محافظ خانے میں آگ لگ گئی۔ فائر بریگیڈ کا دستہ آیا اور اس نے کنوئیں میں پائپ ڈال کر آگ بجھانا شروع کیا مگر اس میں پٹرول بھی تھا لہٰذا فائر بریگیڈ نے آگ کے شعلوں کو مزید بلند کردیا۔ بریلی کے محافظ خانے میں لگی آگ کئی دنوں میں بجھائی جاسکی۔ غالباً پورے چار دنوں میں آگ پر قابو پایا جاسکا۔

اس واقعے کے پورے گیارہ دن بعد ایک اور واقعہ ہوگیا۔

ان دنوں دیسی ساخت کے پستول تک ہی رسائی ہو سکتی تھی۔ امپیریل بینک کے بائیں جانب سڑک کچہری روڈ سے کنٹونمنٹ کو جاتی تھی۔ اس سڑک پر ٹریفک بہت کم رہا کرتی تھی۔ سڑک قریب قریب سنسان تھی۔ ادھر ہم کنٹونمنٹ کے [illegible] کے ساتھیوں کو لینے جارہے تھے کہ تین فوجی افسر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ دو انگریز لیفٹیننٹ اور ایک ہندوستانی سکنڈ لیفٹیننٹ کوئی بھی [illegible] نہ تھی مگر اکرام نے دونوں انگریز افسروں کو گولی سے اڑا دیا۔ تیسرے ہندوستانی افسر نے مورچہ سنبھال لیا۔ ایک پیڑ کی آڑ سے اس نے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ہندوستانی افسر کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا مگر اکرام نے عمداً گریز کیا اور ہم تینوں پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے اس کی زد سے باہر ہو کر فرار ہو گئے۔

اسی نوعیت کی دوسری سرگرمیوں یعنی سیاسی نوعیت کی سرگرمیوں میں ہم تینوں دوست ہی کیا بے شمار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی حصہ لیتے ہوئے آزادی کے لیے جدوجہد میں مشغول رہے اور اس میں توجہ طلب وہ اشتراک عمل تھا جو بلا امتیاز مذہب و ملت سب کو ایک محاذ پر لے آیا تھا۔ پولیس کی گرفت میں آجانے پر اکثر نوجوان اپنا صحیح نام و پتہ بھی نہیں بتاتے تھے۔ حصول آزادی کے بعد میں نے اور میرے بے شمار دوستوں نے سیاسی مظلومین میں اپنا اندراج کرانا اہانت آمیز سمجھا کیونکہ ہم اپنی وطن پرستی کو اقتصادی مفادات سے بالاتر سمجھتے تھے اور ہنوز سمجھتے ہیں۔ ایسی کوئی پنشن وطن پرستی کو بازاری جنس بناتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اقدار سے وابستگی کردار سازی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ ۱۳ اگست ۱۹۹۲ء کی حشر آگیں رات کو لینڈ سلائڈ (Land slide) نے میرا گھر تباہ کر دیا اور میری شریک حیات (جو ڈاکٹر تھیں اور خاصی کامیاب سمجھی جاتی تھیں) مع تین بچوں (ایک بیٹا اور دو بیٹیاں) کے لقمۂ اجل ہو گئے۔ نتیجۃً میری زندگی کے سارے مقاصد ہی فنا ہو گئے، مگر بایں ہمہ میں نے پولیٹیکل پنشن کے لئے فارم اشت ارسال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حس وابستگی (Sense of Commitment) آجکل کی گرانی کے دور میں بھی حرز جاں رکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے مگر اصولوں کی پاسداری بھی کوئی چیز ہے ؎

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

(فانی بدایونی)

سیلِ شعور (Stream of Consciousness) نے کیا کچھ لکھوا دیا ہے۔ یہ بات سے ہٹ کر ادبیات سے متعلق جو ناقابلِ فراموش باتیں ذہن میں محفوظ ہیں وہ کم دلچسپ نہیں ہیں۔ کلہوک پور میں ہمارے گھر کے سامنے ہی ٹھاکر موتی سنگھ حسرت کا مکان تھا۔ پنڈت برج نرائن چکبست کو میں نے ٹھاکر صاحب کے یہاں دو دفعہ دیکھا۔ حسرت اور چکبست شکل و صورت میں بھی خاصی مشابہت رکھتے تھے۔ ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء کے دوران ایک بار دونوں کے مابین جو گفتگو ہو رہی تھی خاصی دلچسپ ہے۔

ٹھاکر صاحب کا بڑا لڑکا میرا دوست تھا۔ میں اس کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ چکبست کی نظم "رامائن کا ایک سین" شائع ہو چکی تھی جو درج ذیل شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام

ٹھاکر صاحب نے خاطر خواہ داد دیتے ہوئے مذکورہ شعر کو قدرے ترمیم سے پڑھتے ہوئے داد دی تھی یعنی یوں ؎

رخصت ہوا وہ باپ کو کرتا ہوا پرنام
راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام

چکبست زور سے ہنس پڑے اور ٹھاکر صاحب کے ادبیاتی ذوق ہی کی داد دینے لگے۔ "بالکل صحیح اصلاح فرمائی ہے حسرت صاحب آپ نے جبھی تو ہر کیف 'خدا' کا استعمال کیوں کرے گا۔ واہ حضرت! لفظ 'پرنام' کو بھی آپ نے صحیح معنوں میں استعمال کیا ہے خوب!" — اسی طرح چکبست نے جواب دیا تھا۔

استادی نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی (مرحوم) کا ذکر بھی کچھ بے محل نہ ہوگا۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ ہمارے تعلقات ۱۹۰۳ء سے ان کی رحلت تک کے عرصے کو محیط رہے۔ مرحوم دل و دماغ کی جملہ خوبیوں کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دبستانِ دانش و بینش تھے۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کیا تھا اور اس کالج کے گریجویٹ ہونے والے پہلے بیچ (Batch) میں شامل تھے۔ انگریزی اچھی لکھتے تھے اور انگریزی بولتے وقت "ٹھاٹ" سے بے تکان بولتے تھے۔ جب مجھے تک بندی کا شوق ہوا اور میں نے ان سے رجوع کیا اس وقت وہ بلیا میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ انھوں نے شرفِ تلمذ سے مجھے نوازنا منظور فرمایا جو میرے لیے موجبِ افتخار و تشفی ہے۔ سبکدوش ہو کر ریاست جموں و کشمیر میں دیوان ہو گئے اور وہاں سے واپس آ کر لکھنؤ ہی میں رہے۔ کشمیری محلہ میں استاد کا گھر۔ اس کا بھرپور نقشہ میرے تصور میں تازہ بنا رکھتا ہے۔

"یادوں کی برات" میں جوش ملیح آبادی نے جو کچھ لکھا ہے بالکل غلط ہے۔ اثر مرحوم اپنا کلام سنانے سے گریز بلکہ احتراز کیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء-۱۹۵۰ء کے دوران جب میں سوپنی (آسام) کے ڈگری کالج میں پرنسپل تھا۔ استاد کے گھر بھوپالی نوجوان پاکستان سے آیا ہوا ادیب بھی وہاں موجود تھا۔ سب کے بہم اصرار پر انھوں نے ایک غزل کے چند اشعار سنائے جن میں درج ذیل شعر سنانے کے فوراً بعد مجھ سے کہا کہ "انگریزی کے پروفیسر بہت پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور وہ بالعموم ماخذ کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔ بتاؤ رستوگی یہ خیال میں نے کہاں سے لیا ہے؟" شعر تھا ؎

ان پہ ہنسیے شوق سے جو اہلِ فریاد ہوں
ان سے ڈریے جو ستم پر مسکرا کر رہ گئے

اگر یہ بات پوچھی گئی ہوتی تو میرے تصور کو مہمیز کرنا ہوا۔ پھر میں نے شیکسپیئر کے معروف ڈرامے جولیس سیزر کا حوالہ دیا جہاں کیشیو سے متعلق سیزر نے کہا ہے کہ "یہ شخص ہنستا نہیں ہے خطرناک ہو سکتا ہے"۔ میں نے یہی بتا دیا۔ جس کو سن کر بہت خوش ہوئے۔

میری گزارشات میں اثر مرحوم کے "اثر" کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ ان کی دو تین ہدایات ذیل میں درج ہیں:

(۱) اگر کسی شعر میں خاص نکتہ پیش کیا گیا ہو مگر جانب اثر خود معلوم نہ ہوتا ہو جیسی چھ "زوالِ عزیزہ بروالِ رفیدہ" کی کیفیت سے اثر پذیر و سرشار نہ ہو تو استفہامیہ یا استعجابیہ کے ذریعہ اس کو دلکش بنایا جا سکتا ہے۔

(۲) شعر میں اگر ابہام ہو تو اس نوعیت کا ہو کہ اس کی "شنیدہ موسیقی" میں "ناشنیدہ موسیقی" کے رموز و خفی مشکلات کو اپنے جلو میں لاتا ہو اگر یہ خوبی نہ ہو تو ابہام، ابہام نہیں بلکہ اہمال ہے۔

(۳) تغزل بھی دشوار و مشکل تعریف ہے۔ اثر کو تقاضائے ادبیات سے گہری شناسائی ضروری ہے شعور شاعر کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اور بھی کار آمد رموز و نکات ہیں مگر یہ مضمون ان سب پر روشنی ڈالنے سے بہت طویل ہو جائے گا۔

سہیل عظیم آبادی مرحوم، جنھیں میں بھائی جان کہا کرتا تھا بڑی وضع قطع کے آدمی تھے۔ اگر وہ میری پرسکون زندگی نہ زلزلے اور وضعداری روایات سے نہ نوازتے تو میری ادبیاتی شگفتگی غالباً قدرے جانفزا نہ ہوتی۔ ایک مثال: تعارف میں خلوص و نوازش بنیادی عنصر ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ میں اپنی نوازش کو پیش کرنے کا

حوصلہ بھی بہت ضروری ہے۔ اقبال پر میری تنقید نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ برہمن زادہ (برہمن زاد میں ذم کا پہلو مضمر ہے) نہیں تھے

بھائی جان کو ایک خط میں جب اس کی بابت لکھا تو انھوں نے فرمایا کہ جرأت مندانہ طور پہ اس مسئلہ کو برائے بحث و مباحثہ پیش کروں۔ بھائی جان (قطع کلام معاف فرمائیں) مجھے روز خط لکھتے تھے لہٰذا ہفتہ میں ایک دن ایسا بھی ہوتا تھا کہ مجھے ان کے دو خط ملتے یعنی ایک وہ بھی جو اتوار کو لکھا جاتا۔ اتوار ہی کو لکھے گئے خط میں مضمون لکھنے کو کہا گیا تھا اور اس کی ایک کاپی بھی طلب فرمائی۔

"اقبال سے متعلق چار فیصلہ طلب امور" جو ہماری زبان کو دیا گیا تھا، اس کی ایک کاپی بھائی جان کو پوسٹ کردی گئی۔ بھائی جان نے "شیرازہ" کے کشمیری شمارے میں اس مضمون کا کشمیری زبان میں ترجمہ چھپوا دیا۔ کہا جاتا تھا کہ وادی میں اقبال کے خاندانی سلسلے ہنوز ہند میں مگر ایک بھی آگے نہ آیا۔

ملک پور شعر زار محلہ تھا جہاں اردو فارسی زبانوں کے ادبیات کا تذکرہ رہتا تھا۔ فانی بدایونی، [illegible] بدایونی، دل شاہجہاں پوری ایسی شخصیات سے میں ازحد متاثر ہوا۔ ایک نشست میں دل صاحب نے ایک شعر پڑھا جو ایک دم ازبر ہو گیا ؎

جاتے جاتے کس نظر سے اس نے دیکھا کیا کہوں
دل کے افسانے میں اک ٹکڑا نیا شامل ہوا

لفظ بکوا کو کیسی شعری وضاحت سے آراستہ کیا گیا ہے۔

تعلیمی اکتسابات میں چار مضامین (انگریزی، تاریخ، اقتصادیات فارسی) میں ماسٹرز ڈگریاں اور انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ نیز متعدد مضامین میں ڈپلومے وغیرہ شامل ہونے کی وجہ سے بے شمار شخصیات کا مجھ پر خاصا اثر پڑا۔

چوں کہ انگریزی زبان کا پروفیسر اور بعد کو پوسٹ گریجویٹ کالجوں کا پرنسپل ہو جانے کی وجہ سے میں ایسے علاقوں میں ہی رہا جہاں اردو اور ہندی زبانیں مروج نہیں ہیں لہٰذا انگریزی زبان ہی بولتا رہا ہوں۔ اگر ریڈیو، ٹی۔ وی ایسے ذرائع ابلاغ تک رسائی نہ ہوتی تو غالباً اردو سے بالکل ناآشنا ہو گیا ہوتا۔ آسام، میزورم، اروناچل وغیرہ علاقوں میں رہنے کی وجہ سے مجھ میں دروں بینی پیدا ہو گئی ہے

ہر کجا رفتیم سیر خلوت دل داشتیم
بتول آغوش فلک ہم روز با ایں خانہ بود

اب زندگی کی ۸۳ ویں خزاں سے دوچار ہوں۔

انگریزی میں سات اور اردو میں دو تصنیفات پیش کر چکا ہوں اور بے شمار سمیناروں میں شرکت کرتا رہا ہوں اور اب "ماضی" کی جانب محو سفر ہوں اور بس۔

□□

"نیا دور" مئی ۹۳ء

بیگم ثاقبہ رحیم الدّین ـــــ ایک تعارف

بیگم ثاقبہ رحیم الدین پاکستان کی ادبی دنیا میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ اور اپنے سماجی کاموں کی وجہ سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ آپ نے ادبی مضامین اور بچوں کے لئے کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا تعلق ایک معزز تعلیمی خاندان سے ہے۔ ان کے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین ہندوستان کے ماہر تعلیم اور صدر تھے۔ دوسرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین ۱۲ ادبی کتابوں کے مصنف تھے۔ اور انہیں غالب کی اُردو شاعری کا انگلش میں ترجمہ کرنے پر ساہتیہ اکیڈمی کے ادبی انعام سے نوازا گیا۔ آپ ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کی دختر ہیں۔ جو وفاقی وزیر تعلیم، وائس چانسلر کراچی اور ڈھاکہ یونیورسٹی بھی رہے۔ آپ کے والد ایک تعلیمی ادارے "جامعہ تعلیم ملی" سندھ کے بانی تھے۔ اور ۱۹۴۸ء سے اب تک اس کی ادارت کو رونق بخشی اور مسلسل خدمت کی۔ آج بھی یہ ملیر کراچی میں مستحکم بنیادوں پر علم کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ بیگم ثاقبہ رحیم الدین نے ۲۹ سال تک سپاہیوں کے خاندان کی بہبود کے لئے شب و روز اعزازی کام کیا۔ اسی طرح اعزازی خدمت تعلیم بالغاں اور بچوں کی صحت و بہبود کی تنظیموں میں انجام دیتی رہیں۔ چند سال تک اعزازی طور پر درس تدریس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ آپ نے ادبی تنظیم "قلم قبیلہ" اور بچوں کی تنظیم "پاکستان چلڈرن اکیڈمی" کی بنیاد ڈالی اور مندرجہ ذیل اداروں میں کام کیا۔

(ا) "قلم قبیلہ" ادبی تنظیم بانی اور تاحیات صدر۔ (ب) "پاکستان چلڈرن اکیڈمی" بانی اور تاحیات صدر۔ اکیڈمی کی پاکستان میں نو شاخیں ہیں۔ (ج) محروم سماعت ویلفیئر سوسائٹی کی صدر۔ (د) صوبائی گرل گائیڈ ایسوسی ایشن کی چیئرمین (بلوچستان)۔ (ر) محروم سماعت ایسوسی ایشن کوئٹہ بلوچستان کی چیئرمین (س) علمی و ادبی تنظیم "اقبال اکیڈمی" پاکستان لاہور کی ممبر۔ (ش) مصنفین کمیٹی پاکستان اور اشاعت کنندگان کمیٹی پاکستان کی صدر (ص) غریب بچوں کے ادارہ "گلہ" راولپنڈی کی سرپرست۔ (ض) صدر و رکن بچوں کے لئے "سرسید سکول" کی ممبر (ط) دختران تعلیم القرآن ہائی اسکول ایبٹ آباد کی سرپرست اعلیٰ۔ "یونیورسل گرلز کالج راولپنڈی" کی سرپرست۔

ذاتی تعلیم آپ ایف اے کی طالبہ تھیں کہ آپ کی شادی جنرل رحیم الدین خان سے ہو گئی۔ شادی کے بعد آپ نے تعلیم جاری رکھی۔ اور ایم اے اُردو فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ حال میں آپ اُردو ادب میں ڈاکٹریٹ کا ریسرچ مقالہ لکھ رہی ہیں۔

ادبی خدمات (ا) آپ نے دو جلدوں پر مشتمل "قلم قبیلہ" کے ادبی کام کو مرتب کیا۔ (ب) اکیڈمی کی طرف سے "ہم پاکستانی ہیں" کی دو جلدوں کو مرتب کیا۔ اور آپ درج ذیل کتب کی مصنفہ بھی ہیں۔ (۱) "صبح کا تارا" بچوں کے لئے کہانیوں کی کتاب۔ (۲) "پیام محبت و انسانیت" "سیرت امام" (۳) "محفل تنہائی" ادبی مضامین۔ (۴) "جاگو جاگو" بچوں کے لئے کہانیوں کی کتاب۔ (۵) "ماں تم چاند ستارہ" بچوں کے لئے کہانیوں کی کتاب۔ (۶) "تہذیب کے زخم" ادبی مضامین۔ زیر اشاعت (۷) "سونے کے ذرے" بچوں کے لئے کہانیاں۔ زیر تصنیف۔ (۸) "چندا آئی" بچوں کے لئے کہانیاں۔ زیر تصنیف۔ (۹) ادبی سہ ماہی رسالہ "قلم قبیلہ" کی نگران و مدیر اور (۱۰) بچوں کے لئے رسالہ "روشنی" کی نگران و مدیر اعلیٰ اور پبلشر ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی کتاب "جاگو جاگو" کا اکادمی ادبیات پاکستان سندھی، بلوچی، پشتو اور پنجابی میں ترجمہ کروا کر اشاعت کروا رہی ہے۔

بیگم ثاقبہ رحیم الدین کی طرف سے بچوں کی بہبود کے لئے خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی تنظیم یونیسف (UNICEF) نے آپ کو ۱۹۸۹ء میں سپیشل اعزاز بھی عطا کیا۔ بیگم رحیم الدین اپنے مضامین (ARTICLES) ذیل جگہوں پر پڑھتی رہی ہیں۔

(ا) اقبال کانفرنس لاہور۔ (ب) اقبال اکیڈمی لاہور۔ (ج) اسلامی کانفرنس برائے بین الاقوامی خواتین۔ اسلام آباد۔ (د) پاکستان ادبی تعلیم کانفرنس اسلام آباد (ر) پاکستان سیرت کانفرنس، اسلام آباد۔ وغیرہ وغیرہ۔ آپ کی بہت سی ادبی کاوشیں پہلے ہی ملک کے ذیل مشہور ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

فنون، اوراق، نگار، نیرنگ خیال، نقوش، افکار، ماہِ نو، محفل، ادبی مجلہ اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، دائرے، شب کس، ہم قلم، قومی زبان، ادبی مجلہ، قلم قبیلہ مجلہ ۔ آپ کی بچوں کیلئے کہانیاں درج ذیل مشہور بچوں کے رسائل میں پاکستان بھر میں عرصہ سے شائع ہو رہی ہیں۔
نونہال۔ ٹوٹ بٹوٹ۔ بچوں کا رسالہ۔ انکل سرگم۔ نئے چراغ۔ بچوں کا اخبار۔ چاند ستارے۔ مستقبل۔ آنکھ مچولی۔ پھول۔

بیگم رحیم الدین نے کبھی باقاعدہ بطور پیشہ کوئی ملازمت اختیار نہیں کی۔ آپ ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ آپ تخلیقی ادب کو زندگی کا اہم مقصد جانتے ہوئے ادبی خدمات میں مصروف رہی ہیں کہ" آپ نہ صرف پاکستانی بچوں بلکہ عالمی سطح پر بچوں کی دنیا میں مثبت تبدیلی لا کر ان کے روشن مستقبل کے لئے ہر دم کوشش کر رہی ہیں۔ ثاقبہ رحیم الدین کی اہم تصانیف ۱۹۹۲ء تک۔

(۱) "صبح کا تارا" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (۲) "پیغام محبت و انسانیت" سیرت نبوی پر مضامین۔ (۳) "محفل تنہائی" ادبی مضامین کا مجموعہ۔ (۴) "جاگو جاگو" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (۵) "کدستو چلے چلو" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (۶) "سورج ڈھلے" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (۷) "تہذیب کے زخم" ادبی مضامین کا مجموعہ۔ (زیر تصنیف ہے)۔ (۸) "نیند آئی" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (زیر تصنیف ہے)۔ (۹) منتخب ادبی تحریروں کا مجموعہ "قلم قبیلہ" جلد اول مرتب کیا۔ (۱۰) منتخب ادبی تحریروں کا مجموعہ "قلم قبیلہ" جلد دوم۔ مرتب کیا۔ (۱۱) "میں پاکستانی ہوں" بچوں کے لئے کہانیاں جلد اول مرتب کیا۔ (۱۲) "میں پاکستانی ہوں" بچوں کے لئے کہانیاں جلد دوم مرتب کیا۔ (۱۳) ادبی رسالہ "قلم قبیلہ" کی مدیر اور نگراں اور سرپرست۔ (۱۴) بچوں کا رسالہ "روشنی" کی مدیر اور نگراں اور سرپرست۔

(ملنے کا پتہ :- ۹ جامی روڈ۔ راولپنڈی)

(۱۵) ادبی ٹرسٹ "قلم قبیلہ" کی بانی، سرپرست اور تاحیات چیئرپرسن۔ (۱۶) بچوں کا ادارہ "پاکستان چلڈرنز اکیڈمی" کی بانی، سرپرست اور تاحیات چیئرپرسن۔

A ۔ کتاب "صبح کا تارا" — دوسرا شمارہ زیر اشاعت ہے۔
B ۔ کتاب پیغام محبت و انسانیت — دوسرا شمارہ شائع ہو چکا ہے۔
C ۔ "قلم قبیلہ" منتخب ادبی تحریروں کا مجموعہ جلد دوم — دوسرا شمارہ زیر اشاعت ہے۔
(اس لئے A، C نہیں بھیجی جا رہی ہیں)

العلم کراچی جنوری تا مارچ ۹۳ء

میراجی کے بارے میں ایک خط

عزیزم رشید امجد!

سلام بن رزاق نے آپ کا خط پہنچادیا تھا۔ انہیں دنوں مجھے آنکھ کا اپریشن کرنا پڑا اور لکھنا پڑھنا کچھ دنوں کے لئے معطل ہوگیا۔

میراجی کی شخصیت اور فن پر لکھنا تو لمبا کام ہے۔ کبھی کراچی یا اسلام آباد آیا تو ملنے اس موضوع پر باتیں کریں گے۔

وہ پارسی لڑکی جس کے بارے میں آپ جاننا چاہتے ہیں اس کا نام منی رباڈی ہے تھا۔ اس لڑکی سے میراجی کے عشق کو بہت اہمیت نہ دیجئے۔ ایسی اور بہت لڑکیاں ہیں۔ دو ایک دلی ریڈیو سٹیشن پر تھیں۔ مجھے ان کے نام یاد نہیں۔

میراجی بمبئی آنے کے بعد کچھ دن چار بنگلے میں بھی رہے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی کوٹھی نما عمارت تھی۔ کس کی تھی مجھے نہیں معلوم۔ اکثر ادیبوں اور شاعروں کو یہاں رہنے کا ٹھکانا مل جاتا تھا۔ کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، وشوامتر عادل اور کئی ادیب اور شاعر بمبئی آنے کے بعد وہیں رہے تھے۔ میراجی بھی کچھ دن وہاں رہے۔ کچھ دن دادر میں مہندر ناتھ کے پاس رہے اس کے بعد موہن سہگل کے پاس ماٹنگا منتقل ہوگئے تھے۔ موہن سہگل، وشوامتر عادل، منی رباڈی، اس کی بہن نرگس، جو فلموں میں شمی کے نام سے معروف ہوئی اور ان کے ساتھ اور بہت سے لڑکے لڑکیاں انڈین پیپلز تھیٹر سے وابستہ تھے۔ منی رباڈی موہن سہگل کی دوست تھیں۔ وہ آجکل فلموں کے لئے ڈریس ڈیزائنر کا کام کرتی ہیں۔

میں ان دنوں شالیمار پکچرس سے وابستہ تھا جو پونے میں تھی۔ جوش ملیح آبادی اور کرشن چندر بھی وہیں تھے۔ تقسیم ہند کے بعد کمپنی کے مالک ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد لاہور چلے گئے، کمپنی بند ہوگئی، میں بمبئی آگیا۔

میراجی سے میری ملاقات ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو پر ہوئی تھی۔ کچھ دن میں نے بھی وہاں کام کیا تھا۔ شام کو ہم دونوں کا اکثر ساتھ رہتا تھا۔ دلی میں لال قلعے کے سامنے جو بازار ہے وہاں ایک ریستوران تھا۔ وہاں بیٹھ کر ڈرافٹ بیر پیا کرتے تھے۔ وہ بیئر کے گلاس میں آنے کا گلاس ملا کرتا تھا۔

میں دلی سے میرٹھ چلا گیا۔ کچھ دن سپلائی کے محکمے میں کام کیا۔ پھر ایم۔ اے کرنے کے لئے علیگڈھ یونیورسٹی چلا

گیا۔ علیگڑھ سے پونے گیا تھا۔

میراجی بھی تلاش معاش میں بمبئی آئے۔ وہاں کوئی خاطر خواہ کام نہیں ملا تو میرے پاس پونے آ گئے اور میرے پونا چھوڑنے تک وہیں میرے پاس ہی رہے۔ کام وہاں بھی انہیں نہیں مل سکا۔ ۴۷ء؟ میں جب بمبئی آیا تو میراجی بھی آ گئے۔

موہن سہگل فلم ڈائرکٹر بن گئے اور وہ مکان چھوڑ گئے۔ وشوامتر عادل مدراس کی ایک فلم کمپنی سے متعلق ہو کر مدراس چلے گئے۔ بھابی نام کے ایک فلم جرنلسٹ میرے دوست تھے۔ لاہور جاتے وقت وہ اپنا فلیٹ مجھے دے گئے۔ وہ فلیٹ میں نے مدھوسودن اور میراجی کو دے دیا۔

کچھ مدت وہاں رہنے کے بعد میراجی بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا ان کی آنتوں میں زخم ہو گئے ہیں۔ یہ کثرت سے دیسی کچی شراب پینے کا نتیجہ تھا۔ مجھے باندرہ میں ایک مکان مل گیا تھا۔ میں انہیں اپنے پاس لے آیا۔ دو ڈاکٹر ان کا علاج کرتے رہے۔ ان میں ایک ہومیوپیتھ تھا۔ میراجی کا اصرار تھا انہیں ضرور بلایا جائے اس کے باوجود بھی کہ علاج برابر جاری رہا انہیں افاقہ نہیں ہوا اور ان کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ حوائج ضروری کے لئے پلنگ سے اٹھ کر پاخانے تک جاتے جاتے کپڑے خراب ہو جاتے تھے۔ فرش تک گندہ ہو جاتا تھا۔ مہترانی نے کچھ دن کام کرنے کے بعد انکار کر دیا۔ وہ کام میری بیوی کو کرنا پڑا۔

میری شادی انہیں دنوں ہوئی تھی۔ میری بیوی کم عمر بھی تھیں، سولہ سترہ کے قریب ان کی عمر تھی۔ میری اور ان کی عمر میں پندرہ سال کا فرق تھا۔ میرے گھر کے قریب بھابا اسپتال تھا۔ اس کے انچارج ڈاکٹر ملوے میرے دوست تھے۔ میراجی کی یہ حالت دیکھ کر انہوں نے مشورہ دیا میں انہیں اسپتال میں منتقل کر دوں۔ کھانا گھر سے بھجوا دیا کروں اس لئے کہ ساگودانہ یا اسی طرح کا بہت ہلکا کھانا ڈاکٹر نے ان کے لئے تجویز کیا تھا۔ چنانچہ انہیں بھابا اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ایک دو بار میں اسپتال جاتا تھا ڈاکٹر بھی آتے رہتے تھے۔

ایک روز ڈاکٹر ملوے نے آ کر شکایت کی میراجی پرہیز نہیں کرتے۔ برابر کے مریضوں سے مانگ کر دال چاول کھا لیتے ہیں۔

میں نے اسپتال جا کر انہیں بہت سمجھایا مگر میری بات کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور نہایت ڈھٹائی سے کہنے لگے "میں تو گھر میں رات کو باورچی خانے میں جا کر کھانا کھا لیتا تھا۔" تب مجھے احساس ہوا اتنے علاج کے باوجود بھی وہ کیوں ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں نے انہیں لالچ بھی دیا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو والدہ کے پاس لاہور بھجوا دوں گا مگر ان کی حالت گرتی ہی چلی گئی اور ایک روز ڈاکٹر نے۔

مجھے بتایا۔ ان کی ذہنی حالت بگڑ گئی ہے۔ ہوگیا ہے۔

مجھے بڑا افسوس ہوا۔ ڈاکٹر نے بتایا آتشک کے مریضوں کے ساتھ ایک عمر میں یہ ہوجانا ممکن ہے۔ ان کی عمر اس وقت پینتیس کے قریب تھی مگر بال سب سفید ہوگئے تھے۔ انجان لوگ کبھی کبھی پوچھ بیٹھتے تھے۔
"یہ آپ کے والد ہیں؟"

اس روز انہیں بجابا اسپتال سے کے۔ ای۔ ایم (KEM) اسپتال میں منتقل کیا۔ ڈاکٹر نے کہا، انہیں بجلی کے جھٹکے دینے پڑیں گے۔ میراجی یہ ن کر بہت افسردہ ہوئے۔

"اختر میں یہ نہیں چاہتا۔"

"آپ اچھے ہوجائیں گے"۔ میں نے کہا۔

"میرے دور ہوگئے تو لکھوں گا کیسے؟" انہوں نے افسردہ ہو کر کہا۔

میں ہنسنے لگا۔ "لکھنا تو آپ کے دماغ کا کمال ہے کہیں"

ایک نوجوان ڈاکٹر جو لاہور سے آیا تھا مجھ سے پوچھنے لگا۔ میراجی وہ شاعر تو نہیں جو لاہور میں تھے؟ میں نے بتایا وہی ہیں۔ اس نے ان کے علاج میں بہت دلچسپی لی۔ میں اور سلطانہ، میری بیوی روز انہیں دیکھنے جاتے تھے۔ ایک روز جو گئے تو معلوم ہوا، انہوں نے ایک نرس کی کلائی میں کاٹ لیا۔ میں نے کہا "میراجی اتنی خوبصورت نرس کی کلائی میں کاٹ لیا آپ نے"؛
بگڑ کر کہنے لگے، "پھر اس نے مجھے انڈا کیوں نہیں دیا کھانے کو"

ایک دو روز بعد ریل گاڑیوں کی ہڑتال ہوگئی اور میں شام کو اسپتال نہیں جا پایا — رات کو کھانا کھا رہا تھا کہ اسپتال کا تار ملا کہ میراجی گذر گئے۔

میرے پڑوس میں نجم الحسن نقوی رہتے تھے، مشہور فلم ڈائرکٹر تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا اور ہم دونوں اسی وقت ایڈورڈ میموریل اسپتال پہنچے اور اگلے روز لاش لے جانے کی بات کرکے انہیں میں رکھوا دیا۔

میراجی اپنے زمانے کا بڑا ادبی نام تھا۔ میں نے بمبئی کے تمام ادیبوں کو اطلاع بھجوائی، اخبار میں بھی چھپوایا مگر کوئی ادیب نہیں آیا۔ جنازے کے ساتھ صرف پانچ آدمی تھے۔ میں، مدھوسودن، مہندرناتھ، نجم نقوی اور میرے ہم زلف آنند بھوشن — میرن لائنز کے قبرستان میں تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیئے اور انہیں سپردِ خاک کرکے چلے آئے۔

وفات کی تاریخ ۳ نومبر ۱۹۴۹ء۔ پیدائش ۲۵ مئی ۱۹۱۳ء دن سنیچر

بھرتری ہری کا ترجمہ اتنا ہی جتنا چھپا ہے۔ البتہ خیام کی کچھ رباعیوں کا ترجمہ میرے پاس ہے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو کتابوں کے مسودے "تین رنگ" اور "سہ آتشہ" میرے پاس ہیں۔ کئی سال ادھر کی بات ہے میں بیمار ہو گیا تھا۔ احتیاطاً میں نے اکثر نظمیں نقل کر کے جمیل جالبی اور سب کو بھجوا دی تھیں۔ وہیں نظمیں اکٹھی کر کے ان کا مجموعہ چھاپا گیا ہے۔ چونکہ باہر نظمیں چھپ گئی تھیں اس لئے میں نے کتاب نہیں چھاپی۔ اب ارادہ کر رہا ہوں۔ شاید کچھ نظمیں رہ گئیں۔

انہوں نے آپ بیتی لکھنے کی نیت کئی بار کی تھی مگر کبھی ایک صفحہ کبھی ڈیڑھ صفحہ لکھا اور چھوڑ دیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میراجی سے متعلق تاثرات جاننے کے لئے تو یا آپ کبھی بمبئی آیئے یا کبھی میں ادھر آیا تو ملئے۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

اختر الایمان

۲۷ اکتوبر ۹۱ء

(سوغات (۵) ستمبر ۹۳ء)

جناب محمد احمد سبزواری

ابوسعید بزمی

تاریخ صحافت کا ایک روشن ستارہ

ابوسعید بزمی مرحوم ایک کامیاب صحافی، دانشور اور اہل قلم تھے۔ ان کا تعلق ریاست بھوپال سے تھا۔ وہ مدینہ بجنور، احسان لاہور اور کراچی کے مدیر رہ چکے تھے۔ حیدر علی بہ سلطنت خداداد، انقلابات عالم جیسی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے ان کی شہرت پورے ملک میں پہنچ چکی تھی۔ درج ذیل مقالہ ان کے ابتدائی ادوار کا احاطہ کرتا ہے۔ بنیادی طور پر بزمی مرحوم ایک انقلابی اور سیماب صفت انسان محسوس ہوتے ہیں۔ وہ ایک خلفشار خیال کے آدمی تھے لیکن مدینہ بجنور کی ادارت کے دوران ان کو کبھی پاکستان کے تناظر میں بھارت میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمانوں کی راہ میں حائل مشکلات کا شدت سے احساس ہوا جس کا اندازہ اس دور کے مدینہ کے شماروں کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے جو آج کل میوزیم لائبریری اسلام آباد میں راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ مقالہ میں ظاہر کیے گئے خیالات سے بھوپال کا وہ خوشنما تصور قائم نہیں رہتا جو عموماً ہمارے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس ریاست نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انجمن حمایت اسلام، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور دیگر اداروں کی مدد کی۔ علامہ محمد اقبال، سر راس مسعود، علامہ شبلی جیسی گرانمایہ شخصیات کی سرپرستی کی لیکن ہم کو یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ ریاست بھوپال بہرحال شخصی حکمرانی تھی اور اطراف ملک میں ابھرنے والی جمہوری تحریکات کے اثرات سے وہ کیسے محفوظ رہ سکتی تھی۔ یہ مذہبی کشمکش بھی جو اس وقت سارے ملک میں جاری تھی بہرحال تاریخ کا حصہ ہے اس لیے ہم لوگوں کو خصوصاً تاریخ کا ایک غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے جو جمہوری روایات کے عین مطابق ہے۔ تاہم جناب بزمی مرحوم کے حالات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کا کانگریس کی جانب جھکاؤ ایک سیاسی غلطی تھی۔ (مدیر)

بزمی مرحوم کی وفات کے بعد ان کے رفیقوں اور دوستوں "اے حمید" (مشہور ناول نگار) "مولانا عبدالمجید سالک" مدیر روزنامہ انقلاب" لاہور اور مشہور ڈرامہ نگار "سید امتیاز علی تاج" "مصنف ڈرامہ انارکلی لاہور نے ابوسعید بزمی کو اپنے مضامین کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا۔ جو لاہور کے پندرہ روزہ اخبار "بنت راوی" میں جس کی مدیرہ بیگم بزمی تھی بزمی نمبر میں شائع کیا گیا۔ مگر اول تو تحسین و آفریں بڑی محدود رہی۔ دوسرے اس وقت جو کچھ لکھا گیا اس میں ان کی لاہور اور کراچی کی صحافتی زندگی اور ان کی عادات و اخلاق پر تب روشنی ڈالی گئی اور بچپن اور اوائل جوانی کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ لکھنے والے اس پس منظر سے کما حقہ واقف نہ تھے اور کوئی ان کو یہ تفصیلات فراہم بھی نہ کر سکا۔ خود بیگم بزمی کبھی بھوپال نہ جا سکیں کیونکہ سیاسی وجوہات کی بنا پر ابوسعید بزمی کا بھوپال میں داخلہ ممنوع تھا۔ اور ان کو صرف ان چند موٹی موٹی باتوں کا علم ہو سکا جو مرحوم خود ہی بیان کر دیا کرتے تھے۔ ان کے بچے بہت کم سن تھے اور ان کو والد مرحوم کے بچپن کے حالات کو جاننے کا شعور ہی نہ تھا۔ ایسی صورت میں خاندانی حالات، بھوپال کے ماحول اور وہاں کے دوستوں اور رفقاء کاروں کے کوائف اور ان کی ابتدائی سیاسی زندگی کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی اسی وجہ سے ان کی

زندگی کا یہ اہم گوشہ تشنہ ہی رہا۔ حالانکہ بچپن اور جوانی کے نقوش انسانی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں اور کسی شخصیت کو پوری طرح سمجھنے میں ان سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ بزمی کے ابتدائی ساتھیوں میں سے چند ہی باقی رہ گئے ہیں جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے لہٰذا بیگم بزمی کے اصرار پر میں نے اپنی یہ اخلاقی ذمہ داری بھی سمجھی کہ مرحوم کی زندگی کے ان گوشوں کو جدید نسل کے لئے اجاگر کردوں تاکہ ان کی شخصیت کے صحیح خط و خال سامنے آسکیں ہے۔

ریاست بھوپال سنٹرل انڈیا کی سب سے بڑی مسلمان ریاست تھی اور ہندوستان میں ریاست حیدرآباد کے بعد اسی کا درجہ تھا۔ برصغیر میں پانچ ریاستوں یعنی حیدرآباد، میسور، کشمیر، بڑودہ اور گوالیار کے رئیسوں کو ۲۱ توپوں کی سلامی تھی اور بھوپال کے رؤسا کو اندرون ریاست میں ۲۱ اور بیرون ریاست ۱۹ توپوں کی سلامی تھی۔ شمالی ہند کے مسلمان تلاش معاش میں حیدرآباد دکن کا رُخ کرتے تھے اور جو زائد فاصلے پر جانا نہ چاہتے تھے وہ بھوپال ہی میں رُک جاتے تھے۔ مسلسل چار خواتین کی فرمانروائی نے ریاست کو اور زیادہ ممتاز بنا دیا تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں یہاں نواب سلطان جہاں بیگم کی حکومت تھی جو نہ صرف اہل علم خاتون تھیں بلکہ کافی عرصے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی چانسلر بھی رہیں وہ خود صاحب قلم تھیں اور ان کی ذاتی تصانیف کی تعداد ۴۲ ہے۔ بھوپال سے برصغیر کی مشہور درسگاہوں اور مؤلفین و مصنفین کی امداد کی جاتی تھی۔ جس میں قابل ذکر سیرۃ النبی صلعم کی تالیف کے لئے علامہ شبلی نعمانی کی امداد ہے۔ جس کی نسبت خود علامہ نے ایک قطعہ کہا تھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔ ؎

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل — کہ اس میں اک فقیر بے نوا ہے اور اک سلطان ہے

اسی دور میں ایک عالم مولوی سراج الحق دیوبندی بھی بھوپال آئے۔ پہلے "قاضی ریاست" پھر "صدر الصدور" کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ عہدہ اکبر کے عہد میں تو مرکزی حکومت کے وزراء کے مماثل ہوتا تھا۔ اب اگرچہ اس کی وہ شان تو باقی نہ رہی تھی تاہم یہ عزت و وقار کا ایک اہم عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ علوم دینی کی ترویج، اختلافی شرعی مسائل پر فیصلہ دینا، مسلمان علماء و فقہا سے رابطہ رکھنا، ان کو وظائف یا الاؤنس دینا اور منصف اعلیٰ کے فرائض کی انجام دہی اس کی ذمہ داریاں تھیں۔

مولوی صاحب کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی صاحبزادی اُم ہانی۔ دوسرے فرزند (مولوی) انوار الحق عرف احمد حسن اور تیسری محمودہ خاتون۔ مولوی صاحب نے اپنی چھوٹی بیٹی کا عقد اپنے بھتیجے حافظ عبداللطیف سے کیا۔ جو بھوپال کے محکمۂ قانون انصاف میں ملازم تھے۔

حافظ عبداللطیف مولوی سراج الحق کے بڑے بھائی مولوی فضل الحق نامی ایک ذی علم شخصیت کے صاحبزادے تھے جو دیوبند کے بڑے ذی اثر صاحب علم انسان تھے۔ مولوی فضل الحق دیوبند کے مدرسہ کی تاسیس کے سلسلہ میں معروف کار رہے اور بعد میں دار العلوم کے مہتمم مقرر ہوئے۔ آخر میں اختلافات ہونے کی وجہ سے وہ اس عہدے سے مستعفی ہوگئے تھے۔ مولوی فضل الحق کی چار اولادیں تھیں تین صاحبزادے، ضیاء الحق، لطیف احمد، ظہور الحق اور ایک صاحبزادی خدیجہ نامی تھیں۔ مولوی فضل الحق کا تذکرہ مناظر احسن گیلانی نے مولانا قاسم نانوتویؒ کے سوانح میں کیا ہے۔

ابو سعید بزمی حافظ عبداللطیف کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے جو ۱۵ ستمبر ۱۹۱۱ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مولوی سراج الحق کی اولاد میں کیونکہ یہ پہلا بچہ تھا لہٰذا مولوی صاحب نے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری خود سنبھال لی۔ ایک روایت کے مطابق ابو سعید بزمی کا پہلا نام ابو قحافہ رکھا گیا تھا اسی زمانے میں ایک نوجوان شاعر اور ادیب اور اس عہد کے لحاظ سے ایک ترقی پسند فرد رشید احمد ارشد تھانوی مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ان سے دُور کی قرابت داری بھی تھی ایک دن جب انہوں نے مولود کا نام سُنا تو اس سے سخت اختلاف کیا اور کہا کہ بچے کو اپنی زندگی میں اس نامانوس نام سے سخت مشکلات پیش آئیں گی پہلے تو نانا نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا لیکن دو چار مرتبہ کے بحث و مباحثہ کے بعد ابو قحافہ نام تبدیل کرکے "ابو سعید" رکھ دیا گیا۔ جب سن شعور کو پہنچے تو بزمی تخلص اختیار کیا اور یوں یہ ابو سعید بزمی بن گئے۔ کیونکہ گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس لئے یہ اپنے نانا کے بہت ولاڈلے بن گئے۔ ہر وقت ان ہی کے ساتھ رہتے۔ مسجد ان کے ساتھ جاتے۔ مولوی صاحب کافی قدامت پرست

رنگ تھے علاوہ ازیں شمس العلماء مولوی نذیر احمد کو علماء کے ایک گروہ کے طلباء ڈپٹی نذیر احمد کہا کرتے تھے۔

اس زمانے میں شہر بھوپال میں فارسی کا ایک مدرسہ سلیمانیہ تھا نواب صدیق حسن خاں اور مولانا برکت اللہ بھوپالی جیسے اصحاب اس سے منسلک رہے تھے یہاں منشی اور منشی فاضل کی تعلیم دی جاتی تھی جس کے امتحانات جامعہ پنجاب لاہور لیا کرتی تھی چنانچہ برنی کو اس مدرسہ میں داخل کر دیا گیا اور یہیں سے انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں وہ جامعہ احمدیہ میں داخل ہوئے جس میں فقہ، تفسیر، حدیث، منطق وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی اور ذریعہ تعلیم عربی تھا۔ اس درسگاہ میں مقامی طالب علم تو بہت کم ہوتے تھے البتہ پاکستان کے صوبہ سرحد، قبائلی علاقوں، افغانستان، سمرقند و بخارا کے طالب علم ہی آیا کرتے تھے۔

برنی کو بچپن میں مصوری کا شوق ہوا جب چھ سات سال کے تھے تو سلیٹ پر جانوروں اور آدمیوں کی شکلیں بنایا کرتے تھے پھر ان کو کہیں سے مصوری کی ایک کتاب مل گئی جس کی یہ نقل کیا کرتے تھے۔ کیونکہ مصوری خاندانی روایات کے منافی تھی اس وجہ سے یہ چھپ چھپ کر اور پلنگ یا تخت کے نیچے بیٹھ کر اپنا شوق پورا کیا کرتے تھے مگر ایک دن پکڑے گئے اور ان کی اس حرکت پر نہ صرف ان کی گوشمالی ہوئی بلکہ ان کی محبوب ترین کتاب کو نذر آتش کر دیا۔ برنی کو برسوں اس حادثے کا صدمہ رہا۔

انگریزی اسکولوں میں کھیل کے میدان تھے اور ہاکی جو یہاں کا قومی کھیل تھا اس کا عام رواج تھا مگر تعلیم مشرقی کے اسکولوں میں کھیل شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر ان کے گھر کے پاس بھی کوئی میدان نہیں تھا اس وجہ سے یہ ہاکی اور اس قسم کے دوسرے کھیلوں سے الگ تھلگ رہے۔ رہے دوسرے کھیل مثلاً تاش، شطرنج یا چوسر وغیرہ تو ان کی بھی ان کو ہوا نہ لگی اور یہ ان سے عمر بھر بے بہرہ ہی رہے۔

ان کے بچپن کے دوستوں میں زیادہ تر ان کے ہم سبق لوگ تھے۔ ان کے ابتدائی دوستوں میں مولوی عبدالعزیز منشی فاضل جو بعد میں جامعہ احمدیہ میں استاد ہو گئے۔ (مولانا) طرزی مشرقی منشی فاضل جنہوں نے بعد میں سیاست میں حصہ لیا اور مدھیہ پردیش کے اوقاف کے وزیر ہو گئے۔ حافظ منظور احمد منشی فاضل بعد میں تحصیلدار ہو گئے۔ سید حبیب احمد منشی فاضل جو جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کے قرابت دار تھے بعد میں درویش بن گئے۔ سعید اللہ خاں رزمی جو بعد میں ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم ہوئے۔ منظور حسین سرورش منشی فاضل جو بعد میں سرکاری ملازمت میں آگر اوقاف وغیرہ کے نگراں مقرر ہوئے اور بھوپال کی مشہور نامکمل مسجد "تاج المساجد" کی تعمیر میں مولانا عمران ندوی کے ساتھ بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ذوالفقار کیفی منشی فاضل (جو محکمہ تعلیمات میں ملازم تھے) مولانا عبید اللہ قدسی (اوائل جوانی میں پہلے ندوۃ العلماء بعد میں اجمیر چلے گئے بانی اردو جامعہ کراچی کے کتب خانہ سے منسلک رہے اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں) آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ عبدالباری (اسپرٹ عبدالہادی صاحب پرنسپل احمدیہ کالج اور بعد میں منشی ریاست ہوئے) اور مولوی محمود علی خاں مولوی فاضل (پہلے بھوپال میں شملہ زیر ... تھے بعد میں ریاست کے سعودی خانہ سے منسلک ہو گئے)، اور مولوی نور الحسن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ان کے اس وقت کے جملہ دوست احباب ان کے ہم درس یا آگے پیچھے کے ساتھی تھے ان میں سوائے چند سب زاہدان خشک کے زمرہ میں آتے تھے پھر مشرقی تعلیم کی وجہ سے ان کے غور و فکر میں یک رنگی تھی اور وہ ایک محدود سوچ کے مالک تھے۔ برنی زاہد خشک نہیں تھے بلکہ بڑے زندہ دل، شوخ طبیعت اور حس لطیف رکھنے والے انسان تھے۔ ان کو ایک ایسے نوجوان کی ضرورت محسوس ہوئی جو مغربی تعلیم سے روشناس ہو اور ساتھ ہی ساتھ ان کی متابعت بھی کر سکے۔ اتفاق سے یہ نوجوان ان کو محمد احمد سبزواری (راقم الحروف) کی شکل میں مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک انجمن ترقی تعلیم بنائی جس میں وہ خود صدر اور سبزواری اس کے سیکرٹری چنے گئے۔ اس کے جلسے انہیں کے کمرے میں جہاں ایک پلنگ اور چند کرسیاں پڑی تھیں ہوا کرتے تھے تین چار مقرر تقریریں کیا کرتے تھے۔ تعلیم نسواں، کیا پردہ ضروری ہے، شمشیر زیادہ طاقتور ہے یا قلم، ایسے موضوعات پر سیدھی سادی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ چند مہینوں کے بعد یہ انجمن ختم ہو گئی پھر کچھ ماہ بعد ایک دوسری انجمن، انجمن توسیع مذاق علمی کے نام سے بنی اس کے بھی صدر برنی اور سیکرٹری سبزواری تھے۔ اس کے جلسے ماہانہ ہونے لگے۔ تقریریں زیادہ تر

کسی کو نہ آتا تھا۔ دراصل تقریروں کا ڈھنگ ان سب کو ماسٹر امیر الدین گن میکر نے سکھایا۔ ماسٹر صاحب کافی طویل عرصے بمبئی میں رہنے کے بعد بھوپال آئے اور انہوں نے شہر کے چوک میں شام کی کلاسوں کا ایک کوچنگ سنٹر کھولا۔ انہیں ایک انجمن بھی "انجمن ترقی تعلیم" کے نام سے قائم کی۔ جس میں ماسٹر صاحب اپنے شاگردوں کو تقریریں کرنا سکھاتے تھے۔ اس کے جلسے ہر جمعرات کو ہوتے تھے۔ اس میں بیرونی لوگ بھی شامل ہو سکتے تھے۔ جیسے ابو سعید بزمی، محمد احمد سبزواری، شاکر علی خان (جو بعد میں سیاسیات میں شیر بھوپال کے نام سے مشہور ہوئے)۔ پنڈت چتر نرائن جو ریاست بھوپال میں پہلے نائب وزیر اعظم اور بعد میں وزیر اعظم رہے۔ ظہور بھوپالی جو بعد میں وزیر تعلیم بنے اور دوسرے نوجوان حصہ لینے لگے۔ کبھی کبھی ان جلسوں میں منجھے ہوئے سیاستدان بھی شریک ہو کر محفلوں کی رونق بڑھایا کرتے تھے۔

بزمی کو ابتدائے عمر ہی سے مختلف صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ سب سے پہلے والدہ کا انتقال ہوا پھر نانا صاحب رخصت ہوئے ان کی عمر سترہ سال کی ہوگی جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ یہ صدمہ بزمی اور ان کے اس خاندان کے لیے بڑا سخت تھا۔ کیونکہ اب بزمی کو خود اپنے چھوٹے بھائی اور دوسری والدہ کی کفالت کی ذمہ داریاں سنبھالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور ان کو مجبوراً اپنے والد کے محکمہ میں بیس روپے ماہانہ پر ملازمت قبول کرنا پڑی۔

بزمی نے مشرقی علوم کی ڈگریاں تو پہلے ہی لے لی تھیں اب وہ مغربی تعلیم کی جانب راغب ہوئے۔ صرف انگریزی میں امتحان دے کر۔ پہلے میٹرک پھر بی اے اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔ جہاں وہ اول قرار دیے گئے اور گولڈ میڈل ملا۔ ایم اے سے فراغت کے بعد مطالعہ کی ایسی چاٹ پڑی کہ پہلے انہوں نے بھوپال کی تواریخ پڑھی اس میں ان کو نواب سکندر جہاں بیگم کی شخصیت نے کافی متاثر کیا۔ نواب سکندر بیگم اعلیٰ درجہ کی منتظم اور مدبر خاتون تھیں۔ انہوں نے ہی دراصل ریاست کو ریاست بنایا۔ نظم و نسق قائم کیا۔ عہدوں کی جدید تنظیم کے ساتھ عہدے داروں کے اختیارات اور فرائض مقرر کئے، پولیس کا محکمہ بنایا، عدالتوں کی بنیاد ڈالی، اردو کو سرکاری زبان قرار دیا اور کل قوانین اردو میں مرتب کرائے۔ پھر انہوں نے مصر کی تاریخ پڑھی جہاں یہ محمد علی پاشا، احمد عرابی پاشا اور سعد زاغلول پاشا سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے ترکیہ کی تاریخ پڑھی۔ اس میں غازی مصطفےٰ کمال سے متاثر ہوئے مگر ان کے بعض اقدامات سے ان کو اتفاق نہیں تھا۔ غالباً مطالعہ تاریخ کے یہی وہ اولین نقوش تھے جنہوں نے بعد میں ان کو "تاریخ انقلاب عالم" لکھنے کی ترغیب دی۔

۱۹۲۶ء میں نواب حمید اللہ خاں ریاست بھوپال کے فرمانروا ہوئے۔ یہ پہلے گریجویٹ رئیس اور علیگڑھ کالج کے پروردہ تھے۔ ابتدا ہی سے ان کے برصغیر کے سیاسی زعماء سے مراسم تھے۔ جو بعد میں انتہا کو پہنچ گئے۔ بھوپال میں الیگزنڈر ہائی اسکول کے قدیم طلباء کی ایک انجمن تھی۔ نواب صاحب نے بھی اسی اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ لہٰذا جب یہ رئیس بنے تو انجمن نے ان کو ایک استقبالیہ دیا جس میں اس توقع کا اظہار بھی تھا کہ ان کے دور میں بھوپالیوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق پورے پورے حقوق ملیں گے۔ دراصل بھوپال میں اعلیٰ عہدوں پر علیگیرین اور دوسرے غیر ملکی[۱] حکام فائز تھے۔ چنانچہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے ۱۹۲۹ء میں "ینگ مین نیشنل ایسوسی ایشن" کی بنیاد پڑی۔ جس میں زیادہ تر سرکاری ملازم شامل تھے۔ بزمی اس کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"اس تحریک نے ریاست کے ذہین اور پُر جوش تعلیمیافتہ جوانوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اگر یہ جماعت زیادہ عرصہ قائم رہتی تو اپنے نصب العین اور اصول کار کے اعتبار سے ہر پھر کر صحیح راستہ پر آجاتی۔ لیکن حکومت بھوپال نے جوں ہی اس کی آئندہ بڑھتی ہوئی طاقت کا احساس کیا اس کی جڑ پر کلہاڑی رکھنا ضروری سمجھا۔ اور اس کے ممبروں کو اس طرح خائف کیا کہ چند مہینوں کے اندر اس جماعت کے سارے اجزاء منتشر ہو گئے۔"

(ریاستوں کی سیاست)

[۱] مسلمانوں کو اس ملکی غیر ملکی سیاست نے ہر جگہ نقصان پہنچایا۔ (مدیر)

پھر حامد رضوی وکیل نے جو بھوپالی سیاست کے گاندھی کہے جاتے تھے حقوق طلبی کے میدان میں اُترے یہ کئی سال بھوپال کی قانون ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ یہ آئینی جنگ کے قائل تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ بزمی ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں" میں آپ کی فراست و ذکاوت کا ہمیشہ سے معترف رہا ہوں اس کے ساتھ ہی آپ کے قلب کو عام انسانی ہمدردی کا منبع و مخزن بھی سمجھتا ہوں ۔ ۔ ۔ آپ انسانی فطرت کی خامیوں اور پختگیوں کو گہری فلسفیانہ نظر سے دیکھنے کا حسن ملکہ رکھتے ہیں اور آپ کا ذہن جزوی واقعات سے کلی نتائج کو نہایت صحت کے ساتھ اخذ کرتا رہتا ہے۔"

(ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اُردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ صفحہ ۴۳۶)

۱۹۲۶ء میں چند نوجوانوں نے سوشل ورکرز لیگ بنائی جس میں بزمی بھی شامل تھے۔ ۱۹۳۲ء میں "انجمن رعایائے بھوپال" بنی، گو اس کے صدر سعید اللہ خاں رازی تھے۔ مگر اس میں کچھ ایسے عناصر بھی شامل تھے جن کو عوام پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے مقابلے میں چند سرپھرے نوجوانوں نے جن میں شاکر علی خاں پیش پیش تھے "انجمن خدام وطن" بنائی اور اس نے ایک اخبار "صبح وطن" بھی نکالا۔ اسی زمانے میں اور بہت سے اخبار بھی نکلے۔ چنانچہ بزمی نے بھی دسمبر ۱۹۳۵ء میں ایک اخبار "رہنما" نکالا جو تین ہفتوں کے بعد ہی بحکم سرکار ختم ہو گیا۔ اور اس کے پرنٹر اور پبلشر عظمت بھوپالی پر مقدمہ چلا اور ان کو بھوپال چھوڑنا پڑا۔ "انجمن خدام وطن" میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں بزمی، قدوس صہبائی، طرزی مشرقی، لطف اللہ خاں نظمی، فضل علی سرور، عبدالرحمٰن کوکب، اخلاق محمد خاں، نور بانو خان، ظہور ہاشمی، احمد علی وغیرہ شامل تھے۔ "صبح وطن" پر مقدمات بھی چلے اور ان میں سے بہت سے لوگ پکڑے گئے۔ اور ان کو سزائیں بھی ملیں۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ ایک ایسی ریاست میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور جہاں کا حاکم مسلمان تھا وہاں ابتدائی تحریکیں اور قید و بند کی جملہ سختیاں مسلمانوں نے اٹھائیں۔ ماسٹر لال سنگھ اپنی سرکاری ملازمت کے دوران ہندو مہا سبھا کی سرگرمیوں میں غیر رسمی طور پر حصہ لیتے رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اس کے صدر بنے اور بعد میں پرجا منڈل کے لیڈر کی حیثیت سے اُبھرے۔ اور انضمام سے پہلے حادثہ میں ہلاک ہو جانے کی وجہ سے وزیر بنتے بنتے رہ گئے۔ مگر وہ اعزاز پایا کہ ان کی ارتھی میں نواب بھوپال کی نمائندگی ان کے بھتیجے رشید الظفر خان نے کی۔

گویا اب بزمی کھلم کھلا سیاست میں کود چکے تھے۔ اس زمانے میں جیسے جیسے اخبارات نکل رہے تھے ان میں شذروں، سرخیوں، نظموں اور کارٹونوں کے ذریعے حکومت پر تنقید ہوتی تھی لہٰذا حکومت نے اس سے بچنے کے لئے پریس ایکٹ کا سہارا لیا۔ گو مقننہ میں غیر سرکاری ارکان نے اس کی مخالفت کی تاہم حکومت نے یہ قانون نافذ کر دیا۔ نیز ملازمین سرکار کے لئے بھی ایک قانون نافذ کیا گیا کہ وہ خفیہ یا اعلانیہ کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیں۔ چنانچہ اب بھوپال نیشنل لیگ قائم ہوئی اور اس کی گیارہ رکنی مجلس عاملہ میں بزمی بھی شامل تھے۔

"صبح وطن" میں ایک کارٹون شائع ہوا جس پر کچھ لوگوں کو سزائیں ہوئیں۔ پھر ایک کارکن حمید قریشی پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اس مقدمہ کی کارروائی خفیہ ہوگی۔ پیشی کے دن عوام کا ایک بڑا مجمع لگ گیا، لوگ کمرۂ عدالت میں گھس گئے۔ عدالت کو مقدمہ کی سماعت ملتوی کرنا پڑی اور عوام ملزم کو اپنے گھیرے میں لے کر باہر آ گئے۔ اس سلسلہ میں انجمن کے اراکین پر مقدمہ چلایا گیا اور ان کو دو دو سال کی سزا دی گئی۔ جن میں شاکر علی خاں، قدوس صہبائی۔ اور پنڈت چتر نرائن وغیرہ شامل تھے۔

شہر بھوپال کے موجودہ قاضی وجدی الحسینی نے "بھوپال تحریک آزادی کے آئینے میں" ایک بڑی مفید اور کارآمد کتاب لکھی ہے جس میں دور حمیدی کی سیاست کا بڑا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس میں بعض مقامات پر واقعات کا تسلسل برقرار نہیں رہا اور چند باتیں اندراج سے رہ گئیں۔ بہر حال ۱۹۳۸ء میں بھوپال میں "پرجا منڈل" کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے

داعیین میں جو اصحاب شامل تھے، ارشد تھانوی (ادبی بزرگ جنہوں نے بزمی کا نام تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا) شاکر علی خاں، بزمی اور روپ وتی شرما۔ ممبر سازی کے بعد اس کے صدر بزمی اور سیکریٹری بابو لال شرما بنائے گئے۔ پرجا منڈل کا الحاق اگلے سال آل انڈیا اسٹیٹ پیپلز کانفرنس" سے ہوا جس کا پہلا اجلاس لدھیانہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہوا جس میں بھوپال کی نمائندگی شاکر علی خاں نے کی۔

گو پرجا منڈل کے قیام کے بعد انجمن "خدام وطن" ختم ہو گئی مگر اس کے چند ارکان ریاست کی مقننہ کے لئے کھڑے ہوئے جن میں بزمی اور قدوس صہبائی بھی شامل تھے اور یہ دونوں اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ اور پہلے ہی اجلاس میں مختلف امور حکومت پر کڑی تنقید کی اور حکومت کے چھکے چھڑا دئے۔ شہر کے عوام کو مقننہ کے اجلاسوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ اور مہمانوں کی گیلری میں آٹھ دس افراد سے زیادہ نہیں ہوتے تھے مگر جس زمانہ میں بزمی اس کے ممبر بنے اور جس روز ان کی تقریر کا دن ہوتا تھا تو مہمانوں کی گیلری میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ ہوتی تھی بلکہ لوگ ہال کے باہر گیلریوں میں کھڑے ہو کر ان کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ ان کے دلوں کی آواز ہوتی تھی۔

لکھنے پڑھنے کا شوق تو بزمی کو بچپن ہی سے تھا مگر ابھی تک انہوں نے باقاعدہ مضمون نگاری شروع نہیں کی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں اس طرف توجہ دی اور ان کے مضامین رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ کیونکہ خیالات ہمیشہ سے ترقی پسندانہ تھے (ابھی ترقی پسند مصنفین تحریک باضابطہ شروع نہیں ہوئی تھی گو "انگارے" شائع ہو کر ضبط ہو چکا تھا) اور اس وقت رسالہ "نگار" رومانوی اور ترقی پسند تحریک کا نقیب سمجھا جاتا تھا۔ لہذا بزمی نے اسی میں "عربی شاعری"، "عہد جاہلیت کی عربی شاعری"، "قدیم عربی شاعری میں عشق کے تصور" پر مضامین لکھے۔ اسی زمانہ میں بجنور سے ایک سہ روزہ اخبار "مدینہ" نکلا کرتا تھا گو یہ کانگریسی اخبار تھا نیشنلسٹ مسلمانوں کا ترجمان تھا۔ (ویسے اس زمانے میں مسلم لیگ اپنی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور میں تھی) مگر مسلمانوں میں کافی مقبول تھا۔ اتفاق کہ اس زمانے میں قدوس صہبائی جو کچھ عرصہ "مدینہ" کی مجلس ادارت میں شامل تھے استعفیٰ دے کر بھوپال آ گئے اور انہوں نے بزمی سے اس کا تذکرہ کیا۔ بزمی نے ان کے کہنے پر وہاں درخواست بھیج دی جو مجید حسن، مالک اخبار نے منظور کر لی اور اس طرح بزمی ۱۹۳۸ء میں صحافتی دنیا میں داخل ہو گئے اور بزمی وہاں صہبائی سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز رہے گو یہ اخبار کانگریسی تھا مگر مجید حسن اور اخبار کے بیشتر کارکنوں کو مذہب سے لگاؤ تھا اور وہ مذہب کی اہانت برداشت نہیں کرتے تھے۔ صہبائی نے بچپن میں قرآن حفظ کیا تھا مگر بعد میں وہ کٹر کمیونسٹ بن گئے۔ نماز، روزہ اور دوسرے تمام شعائر اسلامی کو ترک کر دیا۔ ویسے نماز تو بزمی نے بھی اپنے والد کے انتقال کے بعد چھوڑ دی تھی مگر روزے پابندی سے رکھتے تھے بعد میں جیل میں نہ صرف نماز کی پابندی کرتے رہے بلکہ اپنے ساتھیوں کو ترجمے اور تفسیر کے ساتھ قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں شاکر علی خان کے علاوہ پنڈت چتر نرائن بھی شامل تھے۔

جب نظم و ضبط برقرار نہیں رہتا اور افراتفری پھیلتی ہے اور عوام کے جذبات حکومت کے خلاف بھڑک اٹھتے ہیں تو ہر گوشہ سے احتجاج بلند ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک بڑے جاگیردار نے جو بھوپال موٹر یونین کے صدر تھے (واضح رہے کہ اس وقت تک بھوپال میں مزدور سبھا ٹریڈ یونین قانون نافذ نہیں ہوا تھا) اپنی یونین کے جلسے میں ایک سیاسی کارکن کو دعوت تقریر دی۔ اس جوشیلے نوجوان نے تقریر کا آغاز ہی کچھ ایسے انداز سے کیا جس میں حکومت کی نفی ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ اس سلسلہ میں ان کے نو دس ساتھی بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اور ان سب کو دو، دو سال قید بامشقت کی سزا بھی سنائی گئی۔ بزمی اس وقت بھوپال میں نہیں تھے۔ مگر اول تو انہوں نے بھوپال کے ایک سیاسی کارکن کا ایک مضمون "بھوپال قتل گاہ عوام" اپنے اخبار میں چھاپا اور خود بھی ایک بیان دیا۔ جس میں صحیح صورت حال کا تجزیہ پیش کیا گیا تھا۔ اسی عرصہ میں یہ بھوپال کونسل میں اجلاس میں شرکت کے لئے بھوپال آئے اور اسی رات ان کو

گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا۔ اور ڈیفنس آف انڈیا کے تحت دو سال قید بامشقت کی سزا دے دی گئی۔ جہاں سے یہ ۱۹۴۲ء میں رہا ہوئے۔ اس طویل سزا نے ان کے اعصاب کو کافی متاثر کیا۔ جیل میں شروع میں ان کے ساتھ اخلاقی مجرموں کا سا سلوک کیا گیا۔ نہ بستر۔ نہ چارپائی۔ بس ایک بوسیدہ کالا کمبل۔ نہ یہاں کسی کتاب اور اخبار کی اجازت تھی اور نہ یہاں لکھنے پڑھنے کا کوئی سامان فراہم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھوک ہڑتال کر دی اور جس میں بعد میں ان کے ساتھی بھی شریک ہو گئے۔ بہرحال کئی ماہ کی کشاکش کے بعد ان کو صرف لکھنے پڑھنے کی اجازت مل گئی مگر اخبارات اور کتابوں کی اجازت پھر بھی نہ ملی۔ اس زمانے میں مجید حسن مالک اخبار مدینہ کا رویہ قابلِ ستائش رہا۔ اگرچہ ان کی گرفتاری کا اخبار سے کوئی تعلق نہیں تھا تاہم انہوں نے نہ صرف ان کی ملازمت بحال رکھی بلکہ درمیان میں کچھ اُن کے خاندان کی مالی اعانت بھی کرتے رہے۔

برقی ۳ راگست ۱۹۴۲ء کو جیل سے رہا ہوئے۔ اسی ہفتے کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا ریزولیوشن پاس کیا۔ یہ طویل جدوجہد کے بعد کچھ عرصہ اپنے گھر میں آرام کرنا چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ اُن کو خیال آیا کہ اس وقت کی موجودہ سیاست۔ معاشیات کے محور پر گھومتی رہتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے معاشیات کے مطالعے کا فیصلہ کیا۔ اور اس زمانے کے مشہور مصنفین جے تھار اور بیری کی کتاب معیشت الہند کا مطالعہ شروع کیا۔ چونکہ میں نے معاشیات ہی میں ایم۔اے کیا تھا اور ان کی فرمائش پر "اخبار مدینہ" کے لئے ہندوستان کے بعض معاشی مسائل پر مضامین لکھے تھے۔ اس لئے یہ روز شام کو عصر کے بعد میرے گھر آ جاتے تھے۔ اور مطالعے کے سلسلے میں جو نکات اُن کے ذہن میں آتے تھے اُن پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ سی۔آئی۔ڈی کا ایک آدمی اُن کی نگرانی کرتا رہتا تھا۔ میں جس مکان میں مقیم تھا اس کی ایک بڑی ڈیوڑھی تھی جس میں میرے مکان کے دروازے کے علاوہ تین اور مکانوں کے دروازے بھی تھے۔ اُس زمانے میں بھوپال میں بیشتر مکانوں کے ساتھ پٹیے (چوڑے اور اونچے چبوترے جو مکینوں کی نشست کے کام آتے تھے) ہوتے تھے۔ چنانچہ پولیس والا برابر والے مکان کے پٹیے پر بیٹھ جاتا تھا اور جب گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد برقی نکلتے تو ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو جاتا تھا۔ ایک دن یہ آئے اور کہا کہ میرا وارنٹ گرفتاری جاری ہو گیا ہے اور شاید رات کو مجھے گرفتار کر لیا جائے لہٰذا میں بھیلسہ (حال ودیشہ جو ریاست کی سرحد ختم ہونے کے بعد پہلا ریلوے اسٹیشن تھا اور اس وقت ریاست گوالیار میں شامل تھا) جانا چاہتا ہوں۔ جہاں کی مقامی کانگریس کے وکیل ایک مسلمان تھے اور جن سے بھوپال کے سیاسی کانگریسیوں کے پرانے تعلقات تھے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میں اس لباس میں (کھادی کی شیروانی کرتہ۔ پاجامہ اور سر پر گاندھی ٹوپی) اسٹیشن جانا نہیں چاہتا لہٰذا تم مجھے اپنی شیروانی اور کپڑے دے دو۔ چنانچہ میں نے انہیں شیروانی اور کرتہ پاجامہ دے دیا جو انہوں نے پہن لیا۔ مگر ٹوپی کا سوال ذرا ٹیڑھا تھا کیونکہ میں ترکی ٹوپی پہنتا تھا اور وہ میرے پاس ایک ہی تھی۔ لہٰذا طے ہوا کہ اسٹیشن تک ان کو وہی ٹوپی دے دوں۔ جو اسٹیشن پہنچ کر وہ مجھے واپس کر دیں گے۔ اس طرح وہ میرے کپڑے اور ٹوپی پہن کر اور میں ننگے سر دروازے سے باہر آئے اور پولیس والے کی مخالف سمت میں چل کر اسٹیشن پہنچ گئے۔ پولیس والا کھادی پوش کی آمد کا انتظار ہی کرتا رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا تھا۔ یہ اُن کی بھوپال سے آخری روانگی تھی۔ اس کے بعد یہ کبھی بھوپال نہیں گئے۔ لطف یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں "پرجا منڈل" کی مخلوط حکومت بنی جس میں ان کے ساتھی پنڈت چتر نرائن نائب وزیر اعظم بنے اور کئی پرانے ساتھی وزیر بنے اور آزادی کے بعد جو دوسری وزارت بنی اس میں تو پنڈت چتر نرائن وزیر اعظم ہو گئے۔ میں اُس وقت بھوپال ہی میں تھا اور میں نے پنڈت جی سے دو ایک مرتبہ کہا کہ برقی صاحب کا جو وارنٹ ہے اور اُن پر بھوپال آنے کی جو پابندی ہے وہ اب ختم کرنے کی کارروائی کی جائے مگر اس پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور اس طرح محسن بھوپالی کا یہ شعر ایک صداقت ثابت ہوا۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل اُنہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

برنی کئی ہفتے بھیلسہ میں رہے اور پھر اِدھر اُدھر پھرتے بجنور پہنچ گئے۔ مگر اتفاق دیکھئے کہ وہاں بھی کچھ عرصے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک مضمون پر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ جس کا سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہا اور جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو انہوں نے بجنور کو خیرباد کہہ دیا اور دہلی آ گئے۔

برنی کی سب سے پہلی تالیف "مسلمان کیا کریں" ہے۔ یہ ہندوستان کے مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ اہم رہنماؤں کے اُن ۵۳ مضامین کا مجموعہ ہے جو اس عنوان سے "مدینہ" بجنور میں اکتوبر ۳۸ء سے اپریل ۳۹ء تک شائع ہوئے۔ ان میں ہندو، لیگی، مسلم لیگی، کمیونسٹ، آزاد خیال سبھی لوگ شامل تھے۔ "مدینہ بجنور" نے ہی اِن کو شائع کیا ہے۔ "ریاستوں کی سیاست" اور "راج محل کے اندر" دونوں سیاسی کتابیں ہیں۔ آزادی سے پہلے برصغیر میں ساڑھے چھ سو چھوٹی اور بڑی ریاستیں تھیں۔ ان میں اگر ایک طرف حیدرآباد جیسی بڑی ریاست شامل تھی جس کا رقبہ یورپ کے اکثر ملکوں سے بڑا تھا، تو دوسری طرف ایسی ریاستیں بھی شامل تھیں جو صرف راجاؤں کی حویلیوں تک محدود تھیں۔ بیشتر ریاستوں میں رئیس وقت کی زبان ہی قانون تھی جہاں قانون نافذ تھا وہاں بھی اس کی آڑ میں بکھیڑے اُڑائے جاتے تھے۔ عوام کا استحصال عام تھا۔ ان کی ذمے داریاں تو تھیں مگر وہ حقوق سے محروم تھے۔ اگر کبھی کوئی رئیس عوام کے آنسو پونچھنے کی کوشش کرتا تو اس کے مصاحب اور حاشیہ نشین اس کی اصلاحات کو ناکام بنانے پر پورا زور صرف کر دیتے تھے اور اس کو یقین دلا دیتے تھے کہ سب کچھ ٹھیک ہے اور عوام خوش حال اور اس کی جان و مال کو دعائیں دیتے ہیں۔ اور یہی راج محلوں کی سیاست تھی۔ برنی کی ان دونوں کتابوں میں اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

۱۴ اور ۱۵ اگست ۴۷ء کو اس برصغیر میں ایک نئی صبح طلوع ہوئی۔ ایسی صبح جس سے کروڑوں عوام کی اُمیدیں وابستہ تھیں لیکن ابھی سورج کی روشنی پوری طرح پھیل بھی نہ پائی تھی کہ خوشی و مسرت کے نعرے۔ آہ و بکا کی چیخوں میں تبدیل ہو گئے۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہنے لگیں، لاکھوں انسانوں کی سربریدہ لاشیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ شیر خوار بچّوں کو ماؤں کی گود سے چھین کر ہوا میں اُچھالا گیا۔ اور اُن کو نیزوں سے چھیدا گیا۔ ہزاروں عورتوں کے دامن عصمت کو سرِ راہ تار تار کیا گیا۔ وہ کون سا ظلم تھا جو روا نہ رکھا گیا۔ برنی نے خون کی یہ ہولی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے تاثرات کو "جب خون بہہ رہا تھا" میں قلم بند کیا۔ اِس کا انتساب بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

• ۱۷ اگست ۴۷ء کی رات کو ماڈل ٹاؤن لاہور کی ایک سنسان سڑک پر جیپ کو روک کر فوجی انداز سے پوچھا گیا "کون ہو"۔ جواب دیا گیا "میں ہوں برنی"۔ "کیا کہا بھجنی؟" ایک نے دوسرے سے کہا "بھئی اِس نے تو بھجنی نام بتایا ہے"۔ پھر یہ تصدیق کی اور پوچھا "بھجنی نام بتایا ہے"۔ "ہاں"۔ "ہندو ہو"۔ خاموشی۔ بھئی یہ تو ہندو ہے چلو چھوڑ دو"۔ یہ ڈوگرا فوج کے سپاہی تھے جو ماڈل ٹاؤن کی حفاظت پر مامور تھے اور نام پوچھنے پر مسلمان کو گولی کا نشانہ بنا رہے تھے۔ چنانچہ یہ کتاب بھجنی کے نام سے ہی منسوب کی گئی۔ یہ کتاب کافی مقبول ہوئی اور ایک سال کے اندر ہی اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

لیکن برنی کی معرکتہ الآرا تصنیف "تاریخ انقلاباتِ عالم" ہے۔ جو ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ انقلاباتِ عالم کی ساری داستان ابتدائے آدم سے لے کر اب تک ایک مربوط زنجیر کی مانند ہے۔ اس میں پہلے تجربے پر دوسرے اور دوسرے پر تیسرے تجربے کی بنیاد رکھی گئی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ ■

العلم (کراچی)، جنوری۔مارچ ۱۹۹۳ء

محمد مارماڈیوک پکتھال

ایک عظیم نو مسلم کی حیرت انگیز سرگزشت

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

مترجم قرآن، مفکر اسلام، ادیب، محقق، صحافی اور مبلغ و خطیب محمد مارماڈیوک پکتھال بلاشبہ ان شخصیات میں سے ہیں جو صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں اور صدیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نابغہ انسان تھے۔ ان پر قدرت خداوندی کا سب سے بڑا کرم یہ تھا کہ اگرچہ وہ کفر و شرک کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں پیدا ہوئے، مگر ان کی عقل سلیم انھیں اسلام کی سیدھی اور روشن شاہراہ پر لے آئی اور بہت سی دیگر تصانیف کے علاوہ انہوں نے خصوصاً" ترجمہ قرآن کی صورت میں انگریزی خواں طبقے کو ایسا انمول تحفہ عطا کیا جو قیامت تک راہروان شوق کی رہنمائی کرتا رہے گا اور خود پکتھال مرحوم کے لئے بھی بے بہا صدقہ جاریہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

مارماڈیوک ولیم پکتھال ۷ اپریل ۱۸۷۵ء کو جنوبی انگلستان میں سفک (SUFFALK) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چارلس پکتھال مقامی گرجا گھر کے پادری تھے۔ چارلس کی پہلی بیوی سے دس بچے تھے۔ وہ وفات پا گئی تو انہوں نے دوسری شادی ایمرا بحر ڈی ایچ اوبرائن کی بیٹی میری سے کی۔ اس بیوی سے چارلس کے ہاں مارماڈیوک پکتھال تولد ہوئے۔

موصوف چھ برس کے تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے، چنانچہ یہ خاندان گاؤں سے ترک مکانی کر کے لندن کے محلہ کنگسٹن میں آ گیا اور ننھے مارماڈیوک کو ہارفوک کے اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں شروع ہی میں انہوں نے اپنی ذہانت کا سکہ جما لیا، خصوصاً" ریاضی میں اپنی قابلیت کا بھرپور مظاہرہ کیا، مگر کچھ عرصے کے بعد وہ سخت بیمار ہو گئے اور ڈاکٹروں نے ایک سال کے لئے آرام تجویز کیا۔

مکمل صحت یابی کے بعد پکتھال کو ہیرو (HARROW) کے مشہور و معروف پبلک اسکول میں داخلہ دلایا گیا جہاں انہوں نے جغرافیہ اور لسانیات میں امتیاز حاصل کیا۔ زمانہ طالب علمی

میں ونسٹن چرچل سے ان کی گہری دوستی تھی جو اخیر وقت تک قائم رہی۔ چرچل نے آگے چل کر برطانوی سیاست میں غیر معمولی نام پیدا کیا۔

ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد مارماڈیوک پکتھال فرانس گئے جہاں انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور پھر اٹلی کے شہر فلورنس سے اطالوی زبان میں دستگاہ حاصل کی۔ واپس لندن آکر جرمن اور ہسپانوی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ اس کے ساتھ انہیں ادب و تاریخ سے بھی گہرا شغف تھا اور اس حوالے سے انہوں نے مشرقی زندگی اور معاشرتی روایات سے بھی اچھی خاصی شناسائی حاصل کر لی اور ان سے گہرے اثرات قبول کئے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر انیس برس کی عمر میں مارماڈیوک امور خارجہ کے امتحان میں شریک ہوئے اور اگرچہ امتحان میں اول آئے' مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر انہیں مطلوبہ ملازمت نہ دی گئی جس سے وہ بہت بددل ہوئے۔ اس زمانے کے تاثرات وہ یوں قلم بند کرتے ہیں:

"میں ناامیدی اور افسردگی کا شکار ہو گیا۔ مجھے لندن کا ابر آلود' گھٹا گھٹا اور بیرنگ ماحول بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ میری سوچوں پر مشرقی ممالک کی وہ فضا چھائی رہتی جہاں سورج پوری آب و تاب سے چمکتا تھا اور جہاں کھجوروں کے نخلستان اور اونٹوں کی قطاریں دل و دماغ کو نئی فرحت اور سکون سے آشنا کر دیتے تھے۔ اگرچہ میری عمر کچھ زیادہ نہ تھی لیکن میرے دل میں ان ملکوں کے لئے بے پناہ کشش تھی جو مجھے اس طرف کھینچتی رہتی تھی۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ میری والدہ نے بھی مجھے خوابوں کی اس سرزمین میں جانے کی اجازت دے دی۔"

اگرچہ ان کے عزیزوں کی طرف سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تجویز بھی تھی' مگر انہوں نے شرق اوسط کی سیاحت کو ترجیح دی اور اپنے ایک دوست ڈولنگ کے ساتھ مصر پہنچ گئے۔

مصر پہنچ کر مارماڈیوک نے یہاں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ شروع کر دیا اور کچھ عرصہ قیام کے بعد شام چلے گئے۔ وہاں وہ ایک پادری ہینور سے ملے جو آثار قدیمہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انہوں نے پادری سے گہرے تعلقات استوار کر لئے اور اس سے عربی سیکھنا شروع کی۔ پھر وہ ایک ترجمان اور گائیڈ کو ساتھ لے کر صحرا عبور کر کے شہران' رملہ اور غزہ پہنچے۔ دوران سفر انہوں نے عرب کسانوں اور دیہاتیوں کی معاشرت اور مسائل سے بھی واقفیت حاصل کی اور عربی کی استعداد میں اضافہ کیا۔ دوسری جانب انہوں نے اونٹ پر سوار ہو کر کوہ جودی (ترکی) تک کا سفر کیا۔ وہ شرق اوسط کی سادہ اور فطری زندگی سے بہت متاثر ہوئے اور یوں لگا جیسے انہیں ان کے پسندیدہ خواب کی تعبیر مل گئی ہو۔ وہ لکھتے ہیں: "مجھے یہاں کی زندگی میں عجب قسم کا سکون ملا۔ یورپ میں رہتے ہوئے میں نے کسی شخص کو بھی خوشی سے ہمکنار نہیں دیکھا' لیکن عربوں میں بیشتر لوگ مجھے خوش نظر آئے۔ ان کی زندگی سادہ تھی اور وہ فطرت کی آغوش میں مطمئن زندگی گزارتے تھے' حالانکہ اکثر عرب ممالک مغربی اقوام کے غلام تھے اور یہ قومیں ان پر بہت برے طریقے سے حکومت کرتی تھیں۔ اہل یورپ کو یہاں حکومت کرتے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انسان انسان کا کس طرح دشمن ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپی قوموں نے اپنے مفادات کے لئے ان معصوم انسانوں کا خوب استحصال کیا۔"

زندگی کے اس تضاد اور سامراج کے اصل کردار نے نوجوان پکتھال کے حساس دل و دماغ میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ انہیں یورپ کی استحصالی قوتوں سے نفرت ہونے لگی اور مشرق کے مظلوم انسانوں سے ہمدردی ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس ماحول میں انہوں نے اپنا پہلا ناول SAID THE FISHERMAN (سعید ایک مچھیرا) لکھا جسے یورپ کے بیشتر ناشروں نے چھاپنے سے انکار کر دیا' البتہ میسرز میتھوئن نے اسے شائع کر دیا اور پھر فرانسیسی' جرمن اور دیگر یورپی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

شرق اوسط کی سیاحت کے بعد پکتھال' انگلستان واپس چلے گئے اور کئی سال لندن' سفک اور سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہے۔ اس دوران پڑھنا' اور غور و فکر کرنا ان کے محبوب مشاغل تھے' مگر ان کی بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی اور یورپ کا ماحول انہیں سچا سکون اور اطمینان فراہم کرنے سے قاصر تھا۔ اسی دوران برطانوی سفیر لارڈ کرومر نے انہیں مصر بلوا لیا تاکہ اہل مصر کی نفسیات کے سلسلے میں ان سے رہنمائی حاصل کرے۔ یہ وہ دور تھا جب مصر

میں سخت بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ برطانوی سامراج اپنے پورے عروج پر تھا مگر مصر کے لوگ اس کی قاہرانہ سطوت کو خاطر میں لائے بغیر ہنگاموں اور شورشوں میں مصروف رہتے تھے۔

[illegible] میں پکتھال مصر پہنچے تو بعض حلقوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ برطانیہ کی خفیہ سروس سے تعلق رکھتے ہیں، حالانکہ اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ پکتھال نے مصر کے تعلیمی اداروں کے تفصیلی دورے کئے جس سے اہل مصر کی معاشرت کے نئے گوشے ان پر وا ہوئے اور عربی زبان کی استعداد میں اور اضافہ ہوا۔ اپنے تجربات اور مشاہدات پر مبنی انہوں نے دو کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔

CHILDREN OF THE NILE اور VEILED WOMAN

مصر سے پکتھال اپنی اہلیہ کے ساتھ بیروت گئے، وہاں سے شام پہنچے اور پھر بیت المقدس میں خاصا عرصہ قیام کیا۔ اس سفر میں انہوں نے عربی کی تحصیل مکمل کی، اسلام کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کیا اور مشہور علماء سے طویل طویل گفتگوئیں کیں۔ اس زمانے میں وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ مسجد اقصیٰ میں شیخ الجامعہ سے عربی پڑھتے پڑھتے انہوں نے قبول اسلام کا ارادہ ظاہر کیا۔ شیخ معمر تھے اور جہاندیدہ بھی۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ ایک نوجوان آدمی کا یہ جذباتی فیصلہ نہ ہو، انہیں مشورہ دیا کہ اپنے والدین سے صلاح کر لیں اور خوب سوچ سمجھ لیں۔ پکتھال لکھتے ہیں: "اس مشورے نے میرے دل پر عجیب اثر کیا۔ میں تو عام یورپیوں کی طرح یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مسلمان کرنے پر تلے رہتے ہیں، مگر اس گفتگو نے میری رائے بدل دی اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ مسلمان تو بڑے روادار اور حقیقت پسند ہیں، ان پر متعصب ہونے کا خواہ مخواہ الزام لگایا جاتا ہے۔"

اسلام کے بارے میں پکتھال کا براہ راست مطالعہ جاری رہا اور وہ شدت کے ساتھ اس کا اثر قبول کرتے رہے۔ مصر و شام کے علاوہ انہوں نے عراق اور ترکی کی بھی سیاحت کی۔ ترکی زبان بھی سیکھی اور ان ملکوں کے مسلم معاشروں کا انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا اور ساری چیزوں نے مل کر ان کے دل و دماغ کا یوں احاطہ کیا کہ انہوں نے عربی لباس پہننا شروع کر دیا اور اسلام کی حقانیت ان کی روح میں اترتی چلی گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت عثمانیہ میں اندرونی خلفشار پیدا ہو رہا تھا اور یورپی طاقتیں خلافت کی قوت توڑنا چاہتی تھیں۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں خلافت عثمانیہ کو شکست ہو چکی تھی۔ مارماڈیوک پکتھال کا خیال تھا کہ یورپی طاقتیں محض مذہبی تعصب اور اسلام دشمنی کے سبب خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں۔ [illegible] میں وہ مشرق اوسط سے واپس انگلستان گئے اور اینگلو عثمانیہ سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترکوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کا تدارک ہو، مگر شدید مخالفانہ اور متعصبانہ فضا میں یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور غیر معمولی ذہنی دباؤ کے تحت پکتھال بیمار ہو گئے۔

بقول پکتھال "نومبر [illegible] میں میں نے چھ ماہ کے لئے ترکی جانے کا ارادہ کیا تاکہ اس فضا سے چھٹکارا پا سکوں جس نے مجھے بیمار کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے ان ایام میں برطانوی اخبارات اور عوام ترکوں کے خلاف اس صلیبی جنگ کے نعروں کی پرجوش حمایت کر رہے تھے جو بعض عیار بلقانی حکمرانوں نے بلند کئے تھے۔ ایک مسلم طاقت کے خلاف عیسائیوں کی اس یکجہتی اور اتحاد کو بہت سے لوگوں نے سراہا، لیکن اس سے ان انگریزوں کے دل ٹوٹ گئے جو مشرق سے پیار کرتے تھے۔ اس وقت مجھے یوں لگتا تھا جیسے عیسائیت دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کی خیراندیشیاں اور فیض رسانیاں صرف عیسائی اقوام تک محدود تھیں اور دوسری وہ جو ساری دنیا کو بلا لحاظ مذہب و نسل عدل و انصاف اور محبت کا مستحق سمجھنے کی دعوے دار ہے، مگر روس، انگلستان اور بلقانی ریاستوں میں پہلی قسم کی عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ یہ مذہبی جنون اور تعصب و تنگ نظری کی وہی کیفیت تھی جو اگر کم علم جاہل مسلمانوں میں نمودار ہوتی ہے تو ہم اس کی مذمت کرتے نہیں تھکتے۔ مگر خود اس کا بار بار مظاہرہ کرتے ہیں۔"

پکتھال ترکوں سے پہلے ہی سے متاثر تھے، مگر اب انہیں کئی ماہ تک یکسوئی کے ساتھ وہاں قیام کا موقع ملا تو ترکوں کی سماجی اور مذہبی خوبیوں نے انہیں

انھیں جنور پر اپنا امیر بنا لیا' چنانچہ غازی طلعت بک اور دوسرے ترک رہنماؤں کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں: "ایک روز میں نے طلعت بک سے کہا آپ یونہی غیر مسلح پھرتے رہتے ہیں۔ آپ کو اپنے ساتھ اسلحہ بردار محافظ رکھنے چاہئیں۔ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر میرا کوئی محافظ نہیں۔ مجھے اسی پر اعتماد ہے اور موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔"

پکتھال' غازی انور پاشا' شوکت پاشا' غازی رؤف بک اور دوسرے ترک رہنماؤں کا تذکرہ بھی بڑی عقیدت اور والہانہ محبت سے کیا کرتے۔ ان کا تاثر تھا کہ لوگ ناحق ترکوں پر آزاد خیالی اور لادینی کا الزام دھرتے ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ خدا سے ڈرنے والا مسلمان پایا۔

قیام ترکی کے دوران پکتھال نے قبول اسلام کا مصمم ارادہ کر لیا' چنانچہ انہوں نے غازی طلعت بک سے کہا: "میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔" اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ قسطنطنیہ میں قبول اسلام کا اعلان نہ کیجئے۔ بہتر ہے کہ اس کا اعلان لندن سے ہو۔ یورپ میں اس کے تبلیغی نتائج زبردست رہیں گے۔ اسی مشورے کا نتیجہ تھا کہ پکتھال صاحب نے لندن جا کر دسمبر ۱۹۱۴ء میں اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا جس سے وہاں کی علمی اور سیاسی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ عیسائی دنیا کا عمومی تبصرہ یہ تھا کہ جس مذہب کو پکتھال جیسا شخص قبول کرتا ہے اس میں یقیناً بہت سی اچھائیاں ہوں گی۔

قبول اسلام کے موقع پر پکتھال کے تاثرات یہ تھے: "میں اپنے زور مطالعہ سے مسلمان ہوا ہوں اور میرے دل میں اس کی بے حد قدر ہے۔ مسلمانوں کو اسلام ورثے میں ملا ہے' اس لئے وہ اس کی قدر نہیں پہچانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن و عافیت کا گہوارا ہے اور اس نعمت پر میں خدائے بزرگ و برتر کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے۔"

جنگ عظیم شروع ہوئی تو انہوں نے پوری کوشش کی کہ انگریزوں اور ترکوں کے درمیان صلح ہو جائے۔ جنگ ختم ہونے پر انہوں نے خلافت کی بقا کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا مگر افسوس انگریزوں کے تعصب اور غرور کے سامنے پکتھال کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ یوں بھی جب چند سال بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے خود ہی خلافت کا قلع قمع کر دیا تو ترکی کے ساتھ پکتھال کی دلچسپیاں مدھم پڑ گئیں۔

جنگ عظیم کے دوران محمد مارماڈیوک پکتھال لندن میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ وہ جمعہ کا خطبہ دیتے' امامت کراتے' عیدین پڑھاتے اور نماز میں تراویح کے امام ہوتے۔ رسالہ "اسلامک ریویو" کی ترتیب و تدوین بھی انہی کے سپرد تھی۔ اس دوران وہ "ادارہ معلومات اسلامی" سے بھی منسلک رہے۔ ترکی کے حق میں متعدد مضامین کے علاوہ ان کی تین کتابیں بھی شائع ہوئیں یعنی "ٹیلز فرام فائیو چمنیز" (۱۹۱۵ء) "دی ہاؤس آف وار" (۱۹۱۶ء) اور نائیٹس آف اعرابی (۱۹۱۷ء)

۱۹۲۰ء میں جناب عمر سبحانی کی دعوت پر پکتھال بمبئی آ گئے اور وہاں کے مشہور اخبار "بمبئے کرانیکل" کی ادارت سنبھال لی اور ۱۹۲۴ء تک یہ ذمہ داری نباہتے رہے۔ انہوں نے بے شمار اداریوں میں یہ بات کھل کر لکھی کہ خلافت عثمانیہ کی تباہی میں عیسائی دنیا کا کیا کردار تھا اور یہ کہ عالم اسلام کے خلاف انگریز کس انداز کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ غرض اس دوران انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کے مسائل میں گہری دلچسپی لی۔ ہندوستان کی مقامی سیاست میں جزوی طور پر حصہ لیا اور ناگپور اور بڑوچ میں کانگرس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔ ہندوستانی طرز معاشرت پر انہوں نے کہانیاں بھی لکھیں اور ایک انسائیکلوپیڈیا کے لئے بمبئی اور گجرات کے بارے میں دو بھرپور مقالے بھی قلم بند کئے۔

۱۹۲۴ء میں انہوں نے "بمبئے کرانیکل" کی ادارت ترک کر دی اور مغربی گھاٹ میں کچھ دن آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ یہیں انہیں نظام حیدر آباد کی جانب سے دکن کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری اور ناظم تعلیمات سر راس مسعود کے خطوط ملے جن میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ پکتھال اپنی خدمات حیدر آباد دکن کے سپرد کر دیں' چنانچہ موصوف نے نظام کے حکم پر چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی قبول کر لی اور یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو نئی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

پکتھال حیدر آباد دکن کے ماحول اور معاشرت سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں: "حیدر آباد ایک شاندار جگہ ہے' ناقابل بیان حد تک خوبصورت۔ یہ آفتاب مغلیہ کی ایک ضو فشاں کرن ہے۔ تہذیب و ثقافت میں اس کا مشرق میں کوئی جواب نہیں۔" دکن اور اس کی تہذیب سے پکتھال کا گہرا قلبی لگاؤ آخر وقت تک قائم رہا۔ انہوں نے چادر گھاٹ کالج کو ترقی دینے کے لئے خوب محنت کی' طلبہ کی کردار سازی کے لئے خصوصی اقدامات کئے اور بہت جلد اسے مثالی ادارہ بنا دیا۔ ان خدمات کی قدر کرتے ہوئے حضور نظام نے انہیں ریاست کے سول سروس ہاؤس کا منتظم اعلیٰ بنا دیا۔ اس ادارے میں حیدر آباد سول سروس کے تمام اعلیٰ عہدیدار تعلیم و تربیت حاصل کیا کرتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے "اسلامک کلچر" کے نام سے ایک سہ ماہی انگریزی رسالے کا اجرا کیا جس کے سرپرست اعلیٰ حیدر آباد کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری تھے۔ اس رسالے میں علمی اور تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے جن میں اسلامی تعلیمات کا اثبات دلائل و براہین کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اس رسالے کو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ بنانے کے لئے سخت محنت کی۔۔ ایک ایسا علمی جریدہ جو ہر پہلو سے اسلامی ثقافت اور روایات کا آئینہ دار ہو۔ اپنے عہد ادارت میں انہوں نے متعدد مستشرقین کو اس رسالے میں لکھنے پر آمادہ کیا اور دنیا بھر کی تقریباً" ستر یونیورسٹیاں اس کے خریداروں میں شامل ہو گئیں۔ اشاعت کے لئے آنے والے مضامین کو وہ اکثر دوبارہ لکھتے اور رسالے کے اعلیٰ علمی معیار کو کسی صورت بھی کمزور نہ ہونے دیتے۔ چونکہ پکتھال دنیا کی بہت سی زبانیں جانتے تھے' اس لئے وہ ان زبانوں کے علماء اور محققین کے مقالات کا آسانی سے ترجمہ کر لیتے' تازہ ترین کتابوں پر تبصرہ بھی خود کرتے اور یوں انگریزی خواں طبقہ دنیا بھر میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے چھپنے والی کتابوں سے باخبر ہو جاتا۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے مدراس میں مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد لیکچر دیئے۔ سالانہ لیکچروں کا یہ اہتمام اسی شہر کے ایک دیندار اور علم دوست ماجر جمال محمد کرتے تھے اور ان میں مختلف مشاہیر اپنے رشحاتِ فکر پیش کرتے تھے۔ ان لیکچروں کے موضوعات میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلو شامل تھے جو بعد میں "کلچرل سائیڈ آف اسلام" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ تعلیم یافتہ سنجیدہ طبقے میں یہ لیکچر بہت پسند کئے گئے۔

پکتھال کا سب سے بڑا' سب سے لازوال اور عظیم کارنامہ ان کا ترجمہ قرآن ہے۔ اس سے قبل انگریزی زبان میں قرآن حکیم کے جتنے ترجمے ہوئے تھے وہ غیر مسلم مستشرقین اور علماء نے کئے تھے اور مختلف مواقع پر موصوف نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ ان مترجمین کا رویہ اسلام اور قرآن کے بارے میں معاندانہ اور تعصب پر مبنی ہے' اس لئے وہ قرآن پاک کے مطالب سے انصاف نہیں کر سکے' چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ترجمے کا فریضہ انجام دے۔ حیدر آباد میں انہوں نے اس مبارک کام کا ارادہ کیا اور یہ خبر نظام تک پہنچی تو انہوں نے اس منصوبے پر خوشنودی کا اظہار کیا اور پوری تنخواہ کے ساتھ انہیں دو سال کی رخصت عطا فرمائی تاکہ ترجمے کا کام کامل سکون' توجہ اور یکسوئی کے ساتھ مکمل ہو۔ جب ترجمہ مکمل ہو گیا تو نظام نے اپنے خرچ پر پکتھال کو مصر بھیجا تاکہ علمائے ازہر سے ضروری نکات پر مشورہ کیا جا سکے' چنانچہ موصوف نے قاہرہ میں کئی ماہ قیام کیا اور جامعہ ازہر کے ریکٹر شیخ مصطفیٰ المراغی اور علامہ محمد احمد الغمراوی سے طویل ملاقاتیں اور مشورے کئے اور بعض دیگر علماء و فضلاء سے بھی قرآن حکیم کے مشکل مقامات پر بحث مباحثہ کیا اور جہاں ضروری سمجھا ترجمے پر نظر ثانی کی۔ بالآخر تین سال کی محنت شاقہ رنگ لائی اور ۱۹۳۰ء میں یہ ترجمہ THEGLORIOUSQURAN کے نام سے بیک وقت لندن اور نیو یارک سے شائع ہوا۔ یہ نسخہ دو جلدوں میں حیدر آباد دکن سے بھی شائع ہوا اور اس کے جملہ اخراجات حضور نظام نے ادا کئے۔

محمد مارماڈیوک پکتھال ترجمہ قرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اس ترجمے کا مقصد انگریزی خواں طبقے کے سامنے یہ بات پیش کرنا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان

قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ہیں۔ اس کا مقصد قرآن کی ماہیت کو موزوں الفاظ میں سمجھانا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ یہ دعویٰ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ کسی الہامی کتب کو ایک ایسا شخص موزوں سے پیش نہیں کر سکتا جو اس کے الہامات اور پیغام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا ہے جو مسلمان ہے جبکہ بعض تراجم میں ایسی تعبیریں کی گئی ہیں جو مسلمانوں کے لئے دلآزار ہیں اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ یہ قدیم علماء کا اور میرا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لئے کوشش کی گئی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی جائے۔ لیکن بہرحال یہ ترجمہ قرآن مجید نہیں ہو سکتا کہ قرآن تو بے مثل و بے بدیل ہے۔ قرآن میں تو اتنی ہم آہنگی ہے کہ لوگ اسے سنتے ہی رونے لگتے ہیں اور وجد میں آ جاتے ہیں۔ یہ تو قرآن کے مفہوم کو انگریزی زبان میں پیش کرنے کی محض ایک کوشش ہے اور اس کے سحر کی قدرے عکاسی کی گئی ہے۔ یہ عربی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا اور نہ میرا یہ مقصد ہے۔"

چنانچہ یہ پہلا انگریزی ترجمہ قرآن ہے جس میں بائبل کے سے ترجمے کا لطف آتا ہے اور نہ صرف صحت' سلاست اور فصاحت کے اعتبار سے مقبول ترین ہے بلکہ پرشکوہ اور بے پناہ اثر آفریں ہے۔ محترمہ مریم جمیلہ نے اس ترجمے کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

"مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں مل سکا۔ کسی ترجمے میں وہ فصاحت و بلاغت اور دلنشیں انداز بیاں نہیں جو اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لئے "گاڈ" کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے لیکن پکتھال نے ہر جگہ "اللہ" ہی استعمال کیا ہے۔ اس سے اسلام کے پیغام میں مغرب کے قاری کے لئے بڑی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔"

بہرحال پکتھال صاحب کی اس عظیم دینی اور علمی خدمت کو پورے عالم اسلام میں سراہا گیا اور حضور نظام نے انہیں پہلی گول میز کانفرنس میں سلطنت آصفیہ دکن کے وفد کا سیکرٹری نامزد کیا۔

جنوری ١٩٣٥ء میں محمد مارماڈیوک پکتھال حیدر آباد ایجوکیشن سروس سے مستعفی ہو گئے۔ سرکار نظام نے تاحیات پنشن مقرر کر دی' اور پکتھال واپس لندن چلے گئے اور وہاں ہمہ تن تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ "اسلامک کلچر" جو پہلے حیدر آباد سے چھپتا تھا اب لندن سے چھپنے لگا۔ رائل سنٹرل ایشین سوسائٹی لندن کی طرف سے ان کے سلسلہ وار مضامین "جدید دنیا میں مسلمانوں کا کردار" بھی شائع ہوتے تھے۔

اس طرح بقیہ حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ دین حق کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کرتے ہوئے یہ عظیم انسان' بے مثل عالم اور منفرد مبلغ ١٩' مئی ١٩٣٦ء کی صبح حرکت قلب بند ہونے سے وفات پا گئے۔ ١٨' مئی کی رات سونے سے پہلے انہوں نے ایک کاغذ پر قرآن پاک کی یہ آیت اور اس کا انگریزی ترجمہ تحریر کیا:

"بلیٰ من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عند ربه ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون"

ترجمہ: حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے' اس کے لئے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں (البقرۃ۔ آیت ١١٢)

گویا اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں محمد مارماڈیوک پکتھال کو کامیابی اور خوشنودی کا مژدہ سنا دیا۔ یہ نصیب اللہ اکبر! انہیں لندن میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا اگرچہ ان کی دیرینہ تمنا تھی کہ ان کی موت اسپین میں ہو اور وہ وہیں دفن ہوں۔ اسپین کے اسلامی دور سے انہیں بے حد محبت تھی۔

پکتھال یورپی ہونے کے باوجود مکمل طور پر اسلامی اخلاق سے آراستہ تھے۔ پنج گانہ نمازوں اور رمضان کے روزوں میں کبھی ناغہ نہ ہونے دیتے۔ قدم قدم پر اللہ اور رسول ﷺ کا ذکر فرماتے۔ اللہ پر ان کا ایمان بڑا مستحکم تھا۔ ہر کام اس کی رضا کے مطابق انجام دیتے۔ بے حد شریفانہ جذبات کے مالک تھے۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران غریب اور نادار طلبہ کی دل کھول کر مالی امداد کرتے۔ بے تعصب اور بے ریا انسان تھے اور ان سے ملنے والے ایمان میں تازگی محسوس کرتے تھے۔ مشہور مصنف شیخ عطاء اللہ لکھتے ہیں:

"مجھے علی گڑھ میں ان کے چند شاگردوں سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی' لیکن ہر ایک ان کے خلوص اور ان کی شفقت پدرانہ کا مداح تھا۔"

("اردو ڈائجسٹ" جنوری ١٩٩٣ء)

حیاتِ جگر کا ایک اہم باب[*]

ایک خط کی روشنی میں

ڈاکٹر افضال احمد

حضرت مسعود حسن ذوقی صاحب مرحوم جگر مراد آبادی مرحوم کے بہت قریب رہے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ جگر پر ایک جامع اور معلوماتی کتاب تصنیف کریں۔ ہر طرف سے حالات جمع کر رہے تھے۔ مرحوم نے جناب یوگیندر پال صابر (جن کا قیام ۱۹۶۰ء میں شکوہ آباد میں تھا) ان کو جگر اور شیراز بی صاحبہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے بمبئی بھیجا۔ صابر صاحب نے شیراز بی سے ملاقات کی اور تمام حالات ایک خط کی صورت میں ذوقی صاحب کو بھیج دیے۔ یہ خط انھوں نے ۱۳- نومبر ۱۹۶۰ء کو لکھا تھا۔ خط کی عبارت حسبِ ذیل تھی۔

> میں آج ۱۳- نومبر ۱۹۶۰ء کو شیراز صاحبہ سے ملنے کی غرض سے بھن پوری گیا۔ دوپہر کے وقت خدا خدا کر کے بھن پوری میں پہنچ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ پاکستان نہ چلی گئی ہوں۔ مگر محلے پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ وہیں ہیں اور اسی مکان میں جس میں وہ جگر مرحوم کے زمانے رہتی تھیں اور جس مکان کو جگر صاحب اپنا "طور" کہا کرتے تھے۔ جس مکان میں شیراز صاحبہ رہا کرتی ہیں اس کے کئی حصے ہیں۔ اور زیادہ حصے کرایے پر اٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن صحن سے ملا ہوا جو حصہ ہے اس میں شیراز صاحبہ، ان کی ماں اور ایک بہن رہتی ہیں۔ میں اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر ایک بوڑھی عورت باہر نکلی، میں نے ان سے کہا میں شیراز صاحبہ سے ملنے آیا ہوں۔ اور ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ شیراز صاحبہ کی بہن تھیں۔ میری بات سن کر وہ اندر چلی گئیں اور تھوڑی دیر بعد دونوں بہنیں باہر آئیں۔ مجھے اندر بلا لیا گیا اور ایک چوکی جس پر قالین بچھا تھا بٹھا دیا گیا۔ خود دونوں بہنیں برابر کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔
>
> . . . پہلے بڑی دیر وہ مہمان نوازی میں مصروف رہیں۔ اپنی بیماری کا ذکر کیا۔ میرے حالات دریافت کیے۔ پھر میں نے خود ہی کہا کہ میں ایک خاص غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ عرض یہ ہے کہ حضرت مسعود حسن صاحب ذوقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، حضرت جگر مراد آبادی مرحوم پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ذوقی صاحب جگر صاحب کے خاص دوست رہے ہیں۔ وہ جگر مرحوم کی زندگی کے ہر پہلو سے بخوبی واقف ہیں۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ جگر مرحوم کے اس زمانے

---

[*] یہ خط اور شیراز صاحبہ کی تصویر دونوں میرے پاس موجود ہیں۔ افضال احمد

کے حالات جمع کروں ۔ جب مرحوم مین پوری میں رہتے تھے ۔ جگر صاحب کے ان تاثرات کے سلسلے تلاش کروں ، جن کے تحت جگر مرحوم نے شعلۂ طور میں بہت سی غزلیں کہی ہیں اور جن کا تعلق مین پوری اور آپ کی (شیراز صاحبہ) ذات سے ہے ۔ شیراز صاحبہ بڑی معاملہ فہم عورت ہیں ۔ میری غرض کو بخوبی سمجھ لیا ہوگا ۔ اور پھر نہایت دل نشین لہجے میں تمام حالات بتائے ۔

شیراز صاحبہ کا اصل وطن شکوہ آباد ہے ۔ اب ان کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال ہے ۔ جب وہ پندرہ ، سولہ سال کی تھیں ، تب اپنی ماں کے ساتھ مین پوری چلی آئی تھیں اور پھر یہیں کی ہوگئیں ۔ تیس سال کی عمر تک انھوں نے خاص اور اونچے درجے کی طوائفوں کی طرح زندگی گزاری ، وہ شروع ہی سے کافی مشہور تھیں ۔ شکوہ آباد میں ، ایک پختہ مکان تھا ۔ اور مین پور میں کئی مکان ہیں ۔ اس کے علاوہ نقد روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے ۔ وہ کبھی روپے کی بھوکی اور محتاج نہیں رہیں ۔ اس کے علاوہ کافی تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں ۔ اسی لیے انھوں نے عام طوائفوں کی طرح زندگی نہیں گزاری ۔ ۱۹۲۸ء تک وہ مستقل اور پابندی کے ساتھ مین پور کے ایک رئیس کے ساتھ رہیں ۔ ۱۹۴۸ء کو حج کعبہ کو چلی گئیں ۔ اور وہاں سے واپس آکر پردہ اختیار کر لیا ۔ قریب ۲۰ سال پردے میں رہیں ۔ اس عرصے میں اپنے شرعی محرموں کے علاوہ کسی مرد سے نہیں ملیں ۔ ان رئیس سے بھی نہایت شریفانہ اور مہذب طریقے سے مل لیتی ہیں ۔ ان کی موجودہ زندگی نہایت پاک صاف اور شریفانہ ہے ۔ نماز کی سختی سے پابند ہیں ۔ ذریعہ معاش مکانوں کا کرایہ ہے ۔ ان کے ساتھ ان کی بوڑھی ماں اور اعجاز صاحبہ (بہن) رہتی ہیں ۔!

شیراز صاحبہ نے جگر مرحوم کے حالات خود بتائے ۔

جگر مرحوم شیخ اصغر حسین اصغر مختار کلکٹری مین پوری کے یہاں رہتے تھے ۔! اصغر صاحب خود بھی اچھے شاعر تھے اور بڑے شاعر نواز مہمان نواز آدمی تھے ، جگر صاحب ان کے یہاں برسوں رہے ہیں ۔ اصغر صاحب کے ساتھ جگر صاحب شیراز صاحبہ کے یہاں جایا کرتے تھے ! اور غالباً جس دن شیراز صاحبہ کو پہلی بار دیکھا اسی دن عشق ہوگیا ۔ اور پھر وہ برابر بڑھتا ہی گیا ۔ جگر صاحب کا رندی کا زمانہ تھا ۔ شراب بے حد پیتے تھے ! شیراز صاحبہ شراب کو سخت ناپسند کرتی تھیں جگر صاحب اس سے واقف تھے ! اس لیے ان کے پاس اکثر بغیر پیے ہی جاتے تھے ۔ لیکن جب کبھی وہ پی کر جاتے تو شیراز صاحبہ ان کے سامنے سے اٹھ جاتی تھیں ۔ اس پر جگر صاحب اصغر صاحب کے پاس جاتے اور کہتے تھے کہ "سرکار مجھ سے خفا ہیں" ! اصغر صاحب تسلی دیتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی بات نہیں ۔ آج تم نے پی لی ہے ۔ اس لیے خفا ہیں ۔ پھر جگر صاحب غسل کرتے اور کپڑے بدل لیتے تھے اور دوبارہ جاتے تھے تب شیراز صاحبہ انھیں اپنے پاس بٹھا لیتی تھیں ۔

جگر صاحب مرحوم شیراز صاحبہ سے جلوت و خلوت ہر حالت میں ملے مگر ہمیشہ تہذیب و محبت کی حدود میں رہے ۔ بدمستی و خلوت میں بھی انھوں نے شیراز کو کبھی "عورت" نہیں سمجھا ، ہمیشہ محبوب اور بعض اوقات تو معبود تک ہی سمجھتے رہے ۔ اس سلسلے میں حد یہ ہوتی تھی کہ وہ شیراز صاحبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ، لے لیتے تھے ۔ ہتھیلی اوپر کو کر کے نہایت نرمی سے پوچھتے تھے :

"سرکار کے مزاج کیسے ہیں ؟"

اور اس کا جواب پاکر ہاتھ چھوڑ دیتے تھے، بوسہ صرف قدموں کا لیا ہے۔

اکثر یہ ہوا کہ جگر صاحب شیراز صاحب کے کمرے میں آئے فرطِ محبت میں نیم غشی کا عالم ان پر طاری ہو گیا، پھر جو کچھ کہا بزبانِ خاموشی ہی کہا ہے۔ ... انتہائی نشے کے عالم میں وہ کبھی بے تمیزی کی بات یا حرکت نہیں کرتے تھے۔ جب غافل ہو جاتے تو چپ چاپ لیٹ جاتے تھے۔

شیراز صاحبہ جگر مرحوم سے محبت کرتی تھیں اور احترام کرتی تھیں۔ اور آج تک نہایت خلوص و احترام سے ان کا ذکر کرتی تھیں ان کا ذکر کرتے وقت وہ کبھی مسکرا دیتی ہیں اور کبھی آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔

جگر صاحب شیراز صاحبہ کو ہمیشہ شررہ کہتے تھے اور ان کے گھر کو طور کہتے تھے، میرا خیال ہے کہ ان کے دیوان "شعلۂ طور" کا نام بھی اسی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ جگر صاحب شیراز صاحبہ کی بہن اعجاز صاحبہ کو ہمیشہ "اعجاز بہن" کہہ کر پکارتے تھے۔ اس سے اعجاز صاحبہ کے کردار پر تو خیر کوئی روشنی نہیں پڑتی مگر جگر صاحب کی شرافت اور خلوص روشن ہو جاتا ہے۔

جگر مرحوم کی توبہ کی وجہ بھی شیراز صاحبہ ہی ہیں۔ جب وہ ۱۹۵۳ء میں حج سے واپس آئیں تو جگر صاحب اپنے ایک مین پوری کے دوست کے ساتھ شیراز صاحبہ سے ملنے گئے۔ شیراز صاحبہ پردے میں تھیں۔ وہیں سے انھوں نے مین پوری والے صاحب کے لیے کچھ کھجوریں اور ایک گلاس آبِ زمزم بھیجا۔ انھوں نے کچھ کھجوریں کھالیں اور آبِ زمزم پی لیا۔ اور کہا: "آپ نے جگر صاحب کے لیے یہ چیزیں کیوں نہیں بھیجیں۔"

شیراز صاحبہ نے پردے سے جواب دیا: "انھیں صاحب اس سے کیا حاصل؛ آج اس حلق میں آبِ زمزم جائے گا... اور کل پھر شراب جائے گی۔ زمزم کی بھی توہین ہوگی اور پینے والے کو بھی کچھ لطف حاصل نہ ہوگا۔"

جگر صاحب یہ سن کر فوراً اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اپنے دوست کو وہیں چھوڑ کر اصغر صاحب کے گھر چلے گئے، غسل کیا، کپڑے بدلے اور پھر واپس آ گئے۔ اور بلند آواز سے کہا:

"اب زمزم بھیجئے۔ میں اسے پیوں گا اور انشاء اللہ اب اس حلق میں کبھی شراب نہ جائے گی۔"

زمزم بھیجا گیا اور جگر صاحب نے پیا اور اس کے بعد تمام زندگی شراب نہیں پی۔

مجھے شیراز صاحبہ نے ایک تصویر دکھائی۔ گروپ کے بیچ میں جگر صاحب کھڑے ہیں تصویر کی پشت پر جگر صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک شعر ہے ؎

اب بھی ہیں تیرے تصور سے وہی راز و نیاز
اپنے اُجڑے ہوئے آغوشِ محبت کی قسم

جگر مرادآبادی

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ جگر صاحب کا خط نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ جگر صاحب حج سے واپس آئے تو شیراز صاحبہ سے نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ شیراز صاحبہ نے انکار کیا تو نہیں مگر یہ کہا کہ وہ نکاح ایک سال بعد کر سکیں گی۔ جگر صاحب کو شاید یہ بات پسند نہیں آئی... اور وہ گونڈے چلے گئے۔ ادھر اصغر گونڈوی صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ جگر صاحب نے اپنی پہلی بیوی سے جو اصغر صاحب کے عقد میں تھیں دوبارہ شادی کر لی۔ شیراز صاحبہ کی زبانی معلوم ہوا کہ جگر صاحب نے غصے میں انھیں طلاق دیدی تھی اور جب شیراز صاحبہ

سے ملے تو اپنی اداسی اور تکلیف کو چھپا نہ سکے۔

شیراز صاحبہ آٹھ آٹھ مہینے کراچی میں رہی ہیں جگر صاحب بھی کراچی مدتوں رہے ہیں اور وہاں بھی دونوں حضرات برابر ملتے رہتے تھے، جگر صاحب اور شیراز صاحبہ کی آخری ملاقات دسمبر ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ ہندوستان چلی آئیں! اور پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔

جب جگر صاحب کے انتقال کی خبر میں پور پہنچی تو شیراز صاحبہ کے گھر میں کہرام مچ گیا اور انھوں نے بہت کچھ خیرات وغیرہ بھی کی۔ انھیں اس بات کا ملال ہے کہ ان کے پاس کوئی خط وغیرہ نہیں آیا۔

آج کل شیراز صاحبہ بیمار ہیں۔ پہلو میں درد ہے۔ مجھ سے ہنس ہنس کے کہہ رہی تھیں کہ... معلوم ہوتا ہے جگر کی روح مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ جب وہ یہاں تھے تو اکثر اپنا شعر پڑھتے تھے ؎

ستم آپ اُلفت میں آساں نہ سمجھیں
تڑپ جایئے گا جو تڑپایئے گا

خیر میں نے انھیں کبھی تڑپایا نہیں مگر وہ اب مجھے ضرور تڑپا رہے ہیں۔

میں نے شیراز صاحبہ سے کہا کہ اگر آپ اپنی کوئی تازہ تصویر عنایت کردیں تو بڑا کرم ہو۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا "خیر آپ مانگتے ہیں تو لے جایئے۔ یہ کہہ کر مجھے تصویر دے دی۔ میں نے اسے شائع کرنے کی اجازت چاہی! تو پھر تھوڑی دیر کو خاموش ہوگئیں اور پھر کہا۔ "اچھا کوئی بات نہیں آپ اسے شائع کر سکتے ہیں۔!"

میں شیراز صاحبہ کے پاس تین گھنٹے بیٹھا۔ وہ نہایت خلوص و محبت اور تہذیب سے پیش آئیں۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا۔! حاجی عبدالحفیظ خان صاحب درانی شکوہ آبادی سے جگر صاحب کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے شیراز صاحبہ کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کی۔! حاجی صاحب بڑے نمازی اور اللہ والے ہیں! ان کی صداقت اور حق گوئی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

یوگیندر پال صابر

"دائرے" جنوری۔ مارچ ۹۳ء

مولانا سید حامد علی مرحوم

آیات (سال رواں کا پہلا شمارہ) پریس میں جانے ہی والا تھا کہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ مشہور عالم دین مولانا سید حامد علی صاحب کا ۴ مارچ ۱۹۹۲ء بروز بدھ انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی ولادت یکم مئی ۱۹۰۳ء کو قصبہ میران پور کٹرہ ضلع شاہجہاں پور (یوپی) میں ہوئی اور تقریباً [illegible] برس کی عمر پائی۔ مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم بریلی کے مدرسوں اشاعت العلوم اور مصباح العلوم میں حاصل کی۔ منشی، کامل، مولوی، فاضل دینیات اور فاضل ادب کے امتحانات الٰہ آباد بورڈ سے دیئے۔ انگریزی کے امتحانات پرائیویٹ طور سے پاس کئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کا مدرسہ اشاعت العلوم ہی میں عربی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔ جولائی ۱۹۳۲ء سے تقریباً چار سال تک اسلامیہ کالج شاہجہاں پور میں عربک ٹیچر کی حیثیت سے کام کیا۔

مولانا مرحوم مولانا مودودی کی تحریروں سے متأثر ہوکر جماعت اسلامی کی تشکیل سے قبل ہی تحریک اسلامی کی فکر کے ہم نوا بن گئے تھے۔ البتہ اس سے باضابطہ وابستگی غالباً ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں جماعت اسلامی ہند کی تشکیل کے بعد اس کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے۔ متعدد ذمہ داریوں کے ساتھ شعبۂ نشر و اشاعت و شعبۂ دعوت غیر مسلمین کی بھی ذمہ داریاں نبھائیں۔

آپ کو تصنیف و تالیف سے شغف اور اس کا خصوصی ملکہ تھا۔ اپنی تصانیف کا جو گرانقدر سرمایہ آپ نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے (جس کی تعداد تقریباً سو ہے) وہ رہتی دنیا تک صدقۂ جاریہ رہے گا۔ ابتداء میں آپ کی تصانیف مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہوئیں۔ بعد میں ادارۂ شہادتِ حق کے نام سے آپ نے ایک الگ اشاعتی ادارہ قائم کرلیا۔ آپ نے مختلف دینی موضوعات پر چھوٹے بہت سے کتابچے تحریر کئے۔ مثلاً اسلام آپ سے کیا چاہتا ہے؟ اسلام ایک نظام رحمت۔ اقامتِ دین اسلام کا تقاضہ۔ حج کیا ہے؟۔ تعددِ ازدواج۔ نماز اور اس کے اذکار وغیرہ۔ قرآن پر آپ کی گہری اور وسیع نظر تھی۔ آپ کی ایک اہم تصنیف 'قرآنی اصطلاحات اور علمائے سلف و خلف' اس پر شاہد عدل ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں آپ نے

سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمہ اور تحشیہ کا معرکۃ الآراء کام شروع کیا تھا۔ ابھی پارۂ عم کے علاوہ سورۂ مائدہ تک چار جلدیں ہی شائع ہوسکی تھیں کہ آپکے سانحۂ وفات کے سبب یہ سلسلہ ناتمام رہ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیرمسلمین میں دعوتی کام کرنے کی بہترین صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ اس میدان میں آپ نے زبان اور قلم دونوں کے ذریعے خوب خوب خدمات انجام دیں۔ ملک کے طول و عرض کے دورے کئے۔ بے شمار ٹریننگ کیمپس میں شرکت کی اور نہ جانے خدا کے کتنے بھٹکے ہوئے بندوں کو آپ کے ذریعے ایمان کی روشنی ملی۔ غیرمسلموں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر آپ نے متعدد کتابچے تصنیف کئے۔ مثلاً تحریکِ اسلامی اور برادرانِ وطن۔ شرک کے اثرات اسلامی زندگی پر وغیرہ۔ آپ کو مذاہب کے تقابلی مطالعہ سے بھی خصوصی دلچسپی تھی۔ اور آپ نے اس موضوع پر بہت سے کتابچے تصنیف کئے۔ اگر ایک طرف باطل مذاہب کی گمراہیوں کو واشگاف کرتے ہوئے آپ نے ان کے مقابلے میں اسلام کی برتری اور حقانیت واضح کی تو دوسری طرف مذہب کا انکار کرنے اور الحاد کا علم بلند کرنے والوں کے خلاف بھی محاذ لیا۔ اور ردِّ الحاد پر متعدد کتابچے تحریر کئے۔ مثلاً خدا کا انکار کیوں؟۔ خدا ہے۔ کیا خدا کی ضرورت نہیں؟۔ ملحدین کے شبہات۔ اور خداپرستی ملحدین کی نظر میں۔ ان کتابچوں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان میں آپ نے خدا کے ساتھ شرک کرنے یا اس کا انکار کرنے والوں کے دلائل کی کمزوری کو مدلل انداز میں واضح کیا ہے اور ان کے پراگندہ ذہنوں کو صاف کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آپ نے مسائل سے علمی اور عقلی اسلوب میں بحث کی ہے اور حق و باطل میں امتیاز کرنے اور صحیح و غلط کو پرکھنے میں تدبّر و تفکّر سے کام لینے پر ابھارا ہے۔

تقریباً چار سال قبل مرکز الدراسات العلمیہ علی گڈھ کے ذمہ داروں نے جب مجلۂ آیات نکالنے کا فیصلہ کیا تو مولانا مرحوم کی انھیں خدمات کے پیش نظر آپ کو اس کی مجلسِ مشاورت کا رکن منتخب کیا۔ آپ نے نہ صرف اس کی منظوری عطا فرمائی بلکہ وقت کے اس اہم فیصلہ پر اپنی جانب سے تحسین اور ہمت افزائی کے کلمات سے نوازا۔

ادارۂ آیات مولانا مرحوم کے لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان خدمات کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اعلیٰ العلیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

(مدیر معاون)

"آیات" جنوری، اپریل ۹۳ء

ہم اور ہمارے اسلاف

مولانا محمد فاروق صاحب اعظمی

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رح

جب مؤرخ بنام جہادِ وطن سرفروشی کی تاریخ دُہرائیگا
آپ حیرت کریں گے کہ اس باب میں سب سے پہلے ہمارا ہی نام آئیگا

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جس جانبازی اور سرفروشی کا ثبوت مسلمانوں نے دیا ہے شاید ہی کسی قوم وملت کے ماننے والوں نے دیا ہو انہیں مجاہدینِ اسلام میں سے مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ بھی ہیں آپ میں جبن و بزدلی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ٹاؤن ہال امن کمیٹی کا سینٹر تھا، امن کی کوشش کرنیوالے ہندو مسلمان یہاں تقریبا ہر دوسرے تیسرے دن جمع ہوتے تھے۔ ایک روز جب خونریزی کا دورِ شباب تھا ٹاؤن ہال کے چاروں طرف مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئیں تھیں بلوائیوں کے ہجوم کے سامنے پولیس اور ہجوم بھی ہتھیار ڈالے ہوئے تھے۔ ہندو دوستوں نے بڑے اصرار سے کہا:۔

"مولانا آپ اور آپ کے ساتھی ہمیشہ قوم پرور رہے ہیں ہماری ندامت کی کوئی انتہا نہیں رہے گی اگر آپ صاحبان پر آنچ آئی یہ وحشی ہجوم کسی کے بس کا نہیں ہے۔ یہاں ہمارے تمام حفاظتی انتظامات ناکام ہوچکے ہیں اُو کھلے میں ایک کیمپ بنایا گیا ہے وہاں یہ ہجوم نہیں پہونچ سکتا ہے وہاں فوجی دستے لگا دیے گئے، آپ اور آپ کے ساتھی وہاں تشریف لے چلیں آپ حضرات کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

اس نازک وقت میں جب موت سامنے کھڑی تھی ہندو دوستوں کی یہ اپیل کس قدر مؤثر ہوسکتی تھی، آپ خود اپنے دل سے پوچھئے کیا آپ اس وقت اس اپیل پر لبیک نہ کہتے اسوقت آپ کے ساتھ اور بھی رفقاء تھے۔ مگر سب سے پہلے جس نے ترنت جواب دیا وہ مجاہدِ ملت کا عالی حوصلہ تھا آپ نے فرمایا:۔

"ہمارے لئے اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی بات کوئی نہیں ہوسکتی کہ خود اپنے وطن میں ہم پناہ گزیں بن کر رہیں۔ بیشک یہ سخت آزمائش ہے مگر اس میں ڈٹ کر اس بحران کا سامنا کرنا ہے۔ ع

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

حفظ الرحمٰن کی زندگی تک ممکن نہیں

ایک دفعہ مولانا شہر کا گشت لگا رہے تھے اچانک دیکھا کہ کچھ نہتے مسلمان کسی مؤمن کی نماز جنازہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، جنازہ سامنے رکھا ہوا ہے مولانا تیزی سے اس مقام پر پہونچے تو صف بندی ہو چکی تھی مولانا کی نظر اچانک سامنے پڑی تو دیکھا کہ چند فوجی اسلحہ سے لیس چلے آرہے ہیں، مسلمانوں کی صف باندھے دیکھکر فوجیوں نے گولی چلانے کا ارادہ کرلیا اور بندوقیں سیدھی کرلیں، اگر چند لمحے اسی طرح بیت جاتے تو اس میں سے کوئی بھی نہ بچتا، مولانا اس منظر کو دیکھکر موٹر سے کود ے اور آنا فانا ان درندے فوجیوں کے سامنے جا چپکے اور گرج کر پوچھا ان نہتے مسلمانوں پر گولی چلانے کا تمہیں کس نے اختیار دیا ہے مولانا کی پُر وقار آواز کانپ رہی تھی قومی غیرت اور حمیت کے جذبات نے ان کو فرشتہ بنا کر بھیجا تھا، فوجی مولانا کی اس بے باکی اور غیر معمولی شجاعت پر حیران رہ گئے ان میں سے کسی نے کہا کہ یہ سب مسلمان ملکر ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ:۔

"کیا یہ نہتے مسلمان جن کے سامنے ایک بھائی کا جنازہ رکھا ہے تم پر حملہ کر سکتے ہیں اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمانوں کے تون سے اس طرح ہولی کھیلو تو یہ حفظ الرحمٰن کی زندگی تک ممکن نہیں، میں ہرگز یہ نہیں ہونے دوں گا"

مولانا کے آہنی ارادے نے ان وحشیوں کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ کنور مہندر سنگھ آئی، اے، ایس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنگرور لکھتے ہیں

میں اکیلا ہی جاؤں گا

۱۹۴۷ء کے فسادات کے فوراً ہی بعد جب میں دہلی میں بطور مجسٹریٹ تعینات تھا ان دنوں مجھے دہلی کے گلی کوچوں میں وقت بے وقت گشت کرنا پڑتا تھا کبھی کبھار مولانا بھی ہمراہ ہوتے تھے جو شخص اپنے عقائد کا پکا بہادر بھی ہوا کرتا ہے اسی جذبے نے دنیا میں غازی اور شہید پیدا کئے ہیں مولانا بھی اپنے دھن کے پکے تھے اور کبھی کسی مصیبت یا رکاوٹ میں گھبراتے نہیں تھے میں نے ان کو

کئی بار مخدوش علاقوں میں اکیلے چکر کاٹتے دیکھا ایک بار لال کنواں بازار کی ایک گلی میں کسی پر قاتلانہ حملہ ہوا میں پولیس لے کر فوراً موقعہ پر پہونچا دیکھا کہ مولانا پہلے ہی وہاں موجود ہیں میں نے گذارش کی کہ اب آپ تشریف لے جائیں میں یہاں کی دیکھ بھال کر لوں گا میں نے ہرچند چاہا کہ پولیس ساتھ کردوں تاکہ مولانا کو گلی قاسم جان تک پہونچا آئے، لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمانے لگے کہ میں اکیلا ہی جاؤں گا، میں نے تعمیل حکم میں پولیس کو کہیں اور گشت کیلئے بھیجدیا مولانا پیدل ہی واپس گلی قاسم جان کی طرف چل پڑے۔ بظاہر تو میں نے مولانا سے رخصت چاہی جب وہ تھوڑی دور چلے گئے تو میں آہستہ سے انکے پیچھے ہولیا تاکہ راستہ میں کہیں کوئی اور واقعہ نہ پیش آجائے، مولانا کی زندگی ہمارے لئے ایک بیش بہا سرمایہ تھی جسے ہم کسی قسم کے خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے، اس واقعہ کا ذکر آج پہلی بار کر رہا ہوں، مولانا کو بھی اس کا علم نہ تھا۔

مجاہد ملت کے تین خاص وصف

مجاہدِ ملتؒ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے تین جوہر ایسے عطا فرمائے تھے جنہوں نے مجاہد ملتؒ ملک و ملت کا بہترین رہنما بنا دیا، اور جن کی وجہ سے نہ صرف ان کی شخصیت اُبھری بلکہ ہندوستانی مسلمانوں نے ان کی ان صفات اور شخصیت سے حیات تازہ کا پیام پایا، ورنہ ہندوستان میں ان کی حیثیت غلامانہ ہو گئی تھی۔ مولانا کے یہ تین جوہر تدبر، جرأت، اور خطابت تھے، تدبر سے تقاضائے وقت سمجھ کر، جرأت سے عملی قدم اٹھاتے اور قوتِ بیان سے سمجھاتے تھے۔!!!

"ریاض الجنہ" مئی ۱۹۶۳ء

عرفان عباسی
۹۱، باسا مئو، موتی لال بوس روڈ
لکھنؤ

خان محبوب طرزی
ایک البیلا ناول نگار

تقسیم ملک کے بعد یعنی چوتھی و پانچویں دہائی کے درمیانی چند سالوں میں لکھنؤ سے رسالہ "نگار" نکلتا تھا جس کا دفتر امین آباد چوراہے کے قریب گوئن روڈ پر تھا۔ اس کے سرپرستوں میں رفیع احمد قدوائی، موہن لال سکسینہ، گووند سہائے اور ترلوکی سنگھ وغیرہ تھے اور مجلس مشاورت میں متعدد معروف ناموں کے ساتھ صحافی، شاعر و ادیب اور سماجی و سیاسی کارکن مولانا محمد اسمٰعیل اسلم لکھنوی و عبدالواحد خاں مائل ملیح آبادی وغیرہ بھی شامل تھے۔

یوں تو معاونین کی فہرست طویل تھی لیکن انتخاب و ترتیب مضامین میں مائل صاحب، کتابت و طباعت کے مراحل میں اسلم صاحب، دفتری کاموں میں فروغ علوی کاکوروی و اقبال صدیقی اور مالی معاملات میں رفیع صاحب ہی کام آتے تھے۔

ایک بار زیر کتابت شمارے کی تکمیل میں چند صفحات کی کمی پڑ گئی۔ دفتر میں جو مضامین موجود تھے وہ مجلس مشاورت کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اکثر اس طرح کی کمی مائل صاحب کے قلم سے پوری ہو جاتی تھی لیکن اس شمارے کے لیے ان کا کتابت شدہ مضمون پریس جا چکا تھا اور اس میں اضافہ کرنا ممکن نہ تھا۔ دو ایک صفحہ کی بات ہوتی تو کسی غزل وغیرہ سے پوری کر لی جاتی لیکن کسی غلط فہمی کی وجہ سے یہ کمی آٹھ نو صفحات کی تھی۔ اُدھر کاتب صاحب منتظر تھے کہ مواد ملے، اِدھر اقبال صدیقی صاحب خاموشی کے ساتھ دفتر سے چلے گئے۔ ہم لوگ پریشان تھے اور اخبارات و رسائل الٹ پلٹ رہے تھے کہ کوئی مناسب مضمون مل جائے تو نقل ہی کر لیا جائے

چند لمحات گزرے تھے کہ کسی کے زینہ چڑھنے کی آواز نے متوجہ کیا۔ ہماری نگاہیں اٹھی ہی تھیں کہ اقبال صدیقی داخل ہوئے ان کے ساتھ "متوسط القامت، ہلکا پھلکا چھریرا بدن، الجھا چہرہ، اس پر غور و فکر اور متانت و سنجیدگی کی تہیں، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، خوابیدہ پپوٹے، متبسم دہانہ، سر پر انگریزی تراش کے بال، جسم پر معمولی لباس، مزاجاً خلیق لیکن کچھ بے نیاز اور خود فراموش" سے ایک صاحب اور تھے — وہ تھے اپنے دور کے بسیار نویس، زبان و بیان پر قادر، کثیر التصانیف صاحب طرز ناول نگار — خان محبوب طرزی — میں نے انھیں اکثر امین آباد کے مختلف حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے دیکھا تھا لیکن ان کی زود نویسی، فنی مہارت، وسعت معلومات، حاضر دماغی اور قلم کی حیرت انگیز روانی دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

میز پر قلم دوات و کاغذ موجود تھا۔ طرزی بیٹھے، کاغذ کھینچا، قلم اٹھایا اور تحریر شدہ صفحات مشین کی طرح گرانے لگے۔ ایک گھنٹہ شاید ہی لگا ہو کہ ایک پیالی چائے کے خاتمے کے ساتھ ایک طویل کہانی مکمل کر کے خاموشی کے ساتھ زینے سے نیچے اتر گئے۔ کہانی ان کے تحریر کردہ سترہ صفحات پر مشتمل تھی۔ عنوان تو حافظہ میں محفوظ نہیں ہے لیکن وہ ایک ایسی ضعیف ماں کی کہانی تھی جس کا اکلوتا بیٹا نہ محاذ جنگ سے لوٹا تھا نہ ماں کو اس کے بارے میں ادھر سے کوئی اطلاع ملی تھی۔ وہ بے چین و بے قرار ہر وقت بیٹے کا انتظار کرتی اور ہر آہٹ کو اس کے پیروں کی چاپ سمجھ کر دوڑتی کبھی گرتی اور کبھی کہیں ٹکرا کر لہولہان ہو جاتی — کہانی شائع ہوئی اور حاصل شمارہ

نصیب ہوئی۔

خان محبوب طرزی کی ولادت محلہ حسین گنج لکھنؤ میں قیام پذیر ایک متوسط الحال گھرانے میں ۱۹۱۰ء میں ہوئی تھی۔ ان کے اجداد کا وطن تاتار تھا اس نسبت سے افراد خاندان "تاتارزئی" کہے جاتے تھے جو رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے "طرزی" ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ خان محبوب طرزی کے دادا و والد کوئٹہ سے لکھنؤ آئے تھے اور محلہ حسین گنج میں بس گئے تھے۔ طرزی کی ابتدائی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ گھریلو تعلیم کے بعد کچھ دن مشن اسکول میں رہے بعدہ امیر الدولہ اسلامیہ (کالج) اسکول لکھنؤ (اب ڈگری کالج) میں دسویں درجے تک پڑھنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔

وہاں سے بی۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور معاشی تگ و دو میں لگ گئے۔ ملازمت کا آغاز علی گڑھ کی تالا ساز فیکٹری میں بعہدہ سپروائزر ہوا تھا۔ چند ماہ گزرے تھے کہ ۱۹۳۲ء میں محکمۂ دفاع میں سٹور کیپر ہوگئے لیکن وہاں بھی دل نہ لگا۔ ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرکے فلم انڈسٹری سے وابستہ ہوگئے۔ بالی ووڈ اسٹوڈیو، بینڈن پکچرز اور ایسٹ انڈیا بمبئی میں کام کیا۔ لیکن والد کو فلم انڈسٹری سے ان کی وابستگی پسند نہ تھی۔ ان کی ہدایت پر ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ واپس آگئے۔

۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہوئے۔

کچھ دن گزرے تھے کہ عالمی جنگ نے شدت اختیار کرلی اور انھوں نے ایک فوجی عہدہ قبول کرلیا۔ اسی زمانے میں یوپی گورنمنٹ نے ڈرامہ شعبہ قائم کیا جس نے طرزی کی خدمات حاصل کرلیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۶ء تک چلا۔ ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ میں ایک فلم کمپنی "سینی ٹون" کے نام سے قائم ہوئی طرزی اس سے منسلک ہوگئے لیکن وہ کمپنی بھی چل نہ سکی۔

طرزی کی زندگی کا بیشتر حصہ افکار و مصائب، بے روزگاری اور معاشی تنگی میں گزر چکا تھا۔ اب انھوں نے عمر تمام کے مسائل حیات کے پیچ و خم سے گزرنے کا فیصلہ کرلیا اور سارا وقت ادبی مشاغل میں صرف کرنے لگے۔

طرزی بچپن ہی سے بڑے ذہین، طباع اور قوی الحافظہ تھے۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق فطری تھا جس پر علی گڑھ یونیورسٹی کے ادبی ماحول میں جلا ہوئی۔ انھوں نے پہلا افسانہ "خوبصورت شرارت" کے عنوان سے لکھا تھا اور پہلا ناول "شہزادی کا شب نور" تھا۔ جو پہلے ہفت وار "سرپنچ" لکھنؤ میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ پھر کتابی شکل میں چھپا۔ اس کے بعد اس طرح مصروف قلم کاری ہوئے کہ ان کا قلم رکا نہیں۔ رومانی، نیم رومانی افسانے اور سیاسی، مذہبی واقعات، سائنسی، جاسوسی، سیاسی، ثقافتی، تاریخی، سماجی، اصلاحی، تبلیغی و دیگر موضوعات پر ناولوں کا انبار لگا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ناولوں کی تعداد دو سو سے زائد ہے اور ایسے ناولوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو انھوں نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے معمولی معاوضہ لے کر دوسروں کے نام سے لکھے اور وہ ان کے ناموں سے شائع ہوکر مقبول ہوئے۔

طرزی سائنس جیسے خشک، غیر رومانی موضوع کے باوجود بڑے شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ناول نگاری میں انہماک، بسیار نویسی، موضوعات کے انتخاب، سائنسی نکات، انفرادیت، معلومات کی وسعت اور طرز نگارش میں ان کی مثال ملنا دشوار ہے۔ وہ بیک وقت مختلف موضوعات پر چار پانچ ناول شروع کرتے اور لکھتے تھے۔ احباب و قدرداں موجود ہیں۔ وہ ان سے مخاطب بھی ہیں اور قلم بھی چل رہا ہے۔ لکھنے کے لیے کسی مخصوص جگہ کی ضرورت تھی نہ سکون و سناٹے کی۔ بچوں کے شور، ٹریفک کی ہنگامہ خیزی، احباب کی گفتگو، چائے اور قہقہے ان تمام حالات میں ان کے قلم کی روانی میں فرق نہیں آتا تھا۔ شگفتہ ذہن اور قوی الحافظہ تھے۔ ایک ناول کے ۲۰۰ صفحات لکھتے لکھتے دوسرے ناول کا بقیہ حصہ شروع کردیتے تھے۔ وہ کردار جو لکھتے تھے، ان کی خصوصیات، جہاں سے لکھنا چھوڑتے تھے گزشتہ صفحات پر نظر ڈالے بغیر وہیں سے آگے لکھنا شروع کردیتے تھے۔ پلاٹ اور کردار ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے وہ جب اور جہاں چاہتے تھے ختم کردیتے تھے لیکن کیا مجال کہیں چوک جائیں یا تحریر میں کسی طرح کے جھول کا شائبہ تک نظر آئے۔

طرزی سائنس کے طالب علم رہے تھے اور سائنسی نکات کو سادہ و سلیس زبان اور لطیف و دلچسپ انداز میں ناول کے قالب میں ڈھالنے میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ حسب ضرورت سائنسی ایجادات اختراع کرکے انھیں اس طرح ناول کا پیکر عطا کرتے تھے کہ قاری کو اختراع کا گمان تک نہ ہو اور ناول ختم ہونے تک اس کی حیرت و دلچسپی قائم رہے۔

ناول نگاری میں انھوں نے اپنی راہ الگ نکالی تھی۔ اپنے ناولوں کے موضوعات عموماً عام زندگی سے اخذ کرتے تھے اور روزمرہ پیش آنے والے اہم واقعات کو چند دنوں میں دلچسپ کہانی اور ضخیم ناول کی شکل میں پیش کردیتے تھے۔ کئی سو صفحات کے ناول چند روز میں اور طویل افسانے چند گھنٹوں میں مکمل کرلینا ان کے معمولات میں تھا۔ ان کے ناول کردار نگاری اور پلاٹ کی ترتیب کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

طرزی نے مختصر وقفہ حیات میں جو ادبی خدمات انجام دیں اور جتنا کام کیا اس کے لیے کئی زندگیاں درکار تھیں۔ وہ

واحد تو کیا کسی ادارہ نے بھی اتنا کام شاید ہی کیا ہو۔۔۔ ان کی بسیار نویسی کا اندازہ ان کی زندگی کے آخری دو سال کے شائع شدہ ناولوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، جب مسلسل مصائب، افکار، عسرت و افلاس انھیں توڑ چکے تھے اور اعصاب زود نویسی میں معاونت سے کترانے لگے تھے۔ ــــــ

۱۹۵۶ء

صبح بنارس ۔ سیلاب ۔ نازک ادا ۔ اُفق کے پار ۔
دوشیزۂ روم ۔ انجمن ۔ صنم کدہ ۔ پُراسرار عرب ۔
نئی زندگی ۔ قمر طلعت ۔ دُلہن ۔ جنگل کا راجا ۔
مہرافروز وغیرہ

۱۹۵۷ء

مقدس لہو ۔ دوسری دُنیا کا انسان ۔ رُوحِ رواں ۔
پارس ۔ گیتی آرا بیگم ۔ جاں باز ۔ نیلوفر ۔
حادثہ ۔ صنوبر ۔ گل بانو ۔ وغیرہ

انھیں دو سالوں میں متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی ان کی کہانیاں اور افسانے وغیرہ ناولوں کے علاوہ ہیں۔ یوں تو طرزی کے مختلف موضوعات پر لکھے گئے تقریباً سارے ناول پسند کیے گئے اور انھوں نے سارے ملک میں اپنے قارئین و مداحین کا ایک وسیع حلقہ بنا لیا تھا جو ان کے ناول ذوق و شوق سے پڑھتا تھا اور نئے ناول کی اشاعت کا منتظر رہتا تھا۔ لیکن "معصومہ" "اُفق کے پار"، "قیامتِ صغرا"، "مصنوعی چاند"، "مقدس لہو"، "آغازِ سحر"، "نیا راستہ"، "قمر طلعت"، "برق پاش"، "جانباز"، "ایک جان تین قالب"، "اُمِّ مشتری" اور "امین آباد" وغیرہ بہت مقبول ہوئے۔ اور بعض کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

طرزی ایک ہی وقت میں متعدد باتیں سوچتے، کئی ناول بیک وقت شروع کرتے اور روانیِ قلم کے ساتھ پلاٹ ترتیب دینے کے گُر سے خوب واقف تھے۔ ان کے ذہن میں کوئی موضوع آئے اور ناول شروع نہ ہو، یہ ممکن نہ تھا۔ متعدد موضوعات کے ساتھ انھوں نے "آغازِ سحر"، "مقدس لہو" اور "جاں باز" وغیرہ ناول لکھ کر جدوجہدِ آزادی کی نہایت موثر و حسین انداز میں عکاسی کی ہے۔

وہ لکھنؤ کی آب و ہوا میں پروان چڑھے تھے، اس کی معاشرت پر "اودھ کے بانکے"، "سیلاب"، "نواب قدسیہ محل"، "رنگی جل گئی"، "نازک ادا بیگم"، "دلہن"، "قمر طلعت" اور "امین آباد" وغیرہ ناول لکھ کر اس کا حق ادا کیا ہے۔

طرزی کو صحافت سے بھی لگاؤ تھا۔ روزنامہ "اردو" کانپور کے ایڈیٹر رہے تھے اور دوسرے اخبارات سے بھی وابستہ تھے جن میں "سرپنچ" لکھنؤ بھی شامل ہے۔

طرزی کی سب سے بڑی کمزوری ان کی قناعت پسندی، مروّت اور بے لوث ادبی خدمت کی لگن تھی جس نے کبھی انھیں معاشی خوشحالی اور فارغ البالی کا منھ نہ دیکھنے دیا۔ وہ دن رات اور بے تکان لکھتے تھے پبلشر ان کے ناول چھاپ کر تجوریاں بھرتے تھے لیکن ان کی دیدہ ریزی و جاں فشانی کا برائے نام معاوضہ قسطوں میں اس طرح ادا کرتے تھے کہ ان کی کوئی ضرورت پوری نہ ہو سکے۔ وہ بے زری کے شکنجے سے نکل نہ سکیں اور پیٹ کا دوزخ پاٹنے کے لیے نت نئے ناول لکھ کر پیش کرنے پر مجبور رہیں۔

طرزی نے ساری زندگی انھیں حالات میں گزاری۔ نہ کبھی ناقدر شناسیِ زمانہ کا شکوہ کیا، نہ اپنی محنت کے صلے کا تعین کیا اور نہ کبھی پبلشر سے کوئی مطالبہ کیا۔

ایک بار کسی نے ان سے قلم کاری کی آمدنی اور تخلیقات کے معاوضے کے بارے میں سوال کیا، تو ــــــ

"میں اُردو ادب کی خدمت کو عبادت سمجھتا ہوں
اور عبادت کا معاوضہ طلب نہیں کیا جاتا۔"

یہ جواب تھا، قناعت پسند، تنگ دست، باصلاحیت، بسیار نویس اور صاحبِ طرز ناول نگار کا، جس نے ساری عمر اسی عبادت میں گزار دی۔ شہرت و مقبولیت کے باوجود نہ کبھی معاشی بدحالی میں فرق آیا نہ کبھی بے زری کے بھنور سے نکل سکا۔

طرزی نے مسلسل جن نامساعد حالات میں خونِ جگر صرف کر کے ملک، ادب اور معاشرے کی خدمت و اصلاح کی پرخلوص و بے لوث کوشش کی اس کا ساتھ ایک ناتواں جسم کب تک دیتا۔ بالآخر وہ وقت بھی آیا جب خونِ جگر سے اہلِ ذوق کی تسکین کا سامان کرنے والے بے مثل ناول نگار کی صحت نے جواب دے دیا۔ جسم ٹوٹنے لگا، لیکن اس کا قلم چلتا رہا، روٹی حاصل کرنے کی جدوجہد جاری رہی اس وقت تک جب تک آخری سانس کے جھٹکے نے اس کے ہاتھ سے قلم گرا نہیں دیا۔

۱۹۷۰ء میں خان محبوب طرزی کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا

"نیا دور" جون ۹۲ء

نواب میر عابد علی خاں صاحب مرحوم

خواجہ حسن ثانی نظامی

(پیدائش ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء وفات ۱۱ نومبر ۱۹۹۲ء)

آنکھیں بڑی۔ دہانہ چوڑا۔ ہونٹ رنگین ـــــ پان کی لالی سے کم سگرٹ کے دھوئیں سے زیادہ! ـــــ پیشانی کشادہ و روشن اور ٹھوڑی کی سرپرستی سے بے نیاز! مگر تن نازک جب دیکھو شیروانی کا نیاز مند!

قد ایسا جیسے بوٹا سا کہئے۔ لیکن وہ بوٹا جس کے اندر ایک اونچا گھیرا، چھتنار درخت چھپا ہو۔ سایہ دار بھی، پھل دار بھی اور سر بلند بھی!

اردو کی ترقی پسند تحریک سے عابد علی خاں صاحب (ایڈیٹر سیاست حیدرآباد) کی وابستگی کا حال مجھے بہت دن بعد معلوم ہوا۔ اول اول انھیں ایک خانقاہ کی نسبت سے جانا کر وہ حضرت شاہ صابر حسینی رح سجادہ نشین درگاہ حضرت خاموش رح کے داماد ہیں۔ ریاست حیدرآباد کی بعض دعوتوں یا ہنگاموں میں لوگوں نے انھیں "عابد نواب" کہہ کر مخاطب کیا تو سمجھا کہ حضرت صابر حسینی رح کی صاحبزادی کسی جاگیردار سے بیاہی گئی ہیں۔ تھوڑی واقفیت سے بعض اوقات غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ اللہ مجھے معاف کرے میرے ذہن میں بھی ان کی پہلی تصویر ادھوری اور کسی قدر غلط بن کر آئی!

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی وقت اللہ تعالیٰ نے دنیا کا سارا کارخانہ نوابوں اور جاگیرداروں ہی کے سپرد کر رکھا تھا۔ اور اس طبقے نے بڑی عظیم ہستیاں پیدا کی تھیں نیز خانقاہیں بھی کسی زمانے میں ایسی تھیں جہاں نمود کا نام تھا نہ نمود کی جگہ باقی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ جاگیریں کاہلوں اور نکموں کی جاگیر ہو گئیں۔ اور خانقاہوں میں پیر طریقت اور شیخ وقت کو نہیں گدیوں اور عقیدت مندوں کا سکہ چلنے لگا۔ یہ لوگ اپنے قوالی جہاں پیروں اور پیر زادوں نے جسم پر بھی بوڑھے ہو لے دیکھنا پسند کرتے تھے اور ان کی تسکین کا سامان بس یہ رہ گیا تھا کہ خانقاہیں چلت پھرت سے خالی ہوں اور ان کی چھتوں پر گہرا۔ دیواروں پر کائی اور حجروں میں لوبان کی ایسی دھونی رمائی جائے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے! پھر جیسی طلب ویسی رسد۔ اچھے اچھے لوگ شرما حضوری زمانے کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے!

ہر چند کہ عابد علی خاں صاحب ایک روشن خیال اور روشن نظر خانقاہ کے داماد تھے اور ان کے بڑے برادر نسبتی حضرت قطب میاں صاحب نے خانقاہ کے سجادے کے ساتھ گلبرگہ کی کرسی کو بھی رونق بخشی تھی اور ان سے چھوٹے برادر نسبتی حضرت فرید میاں نے ذکر و شغل کی مشق کے ساتھ نظام حیدرآباد کے "صرف خاص" کے اہتمام کی

مشقت بھی سہی تھی۔ تاہم یہ کیا ضرور ہے کہ کسی خانقاہ میں سب افراد ایک جیسے ہوں۔ خاص کردہ داماد جو نواب بھی ہوں اور چھاپے خانے اور اردو اخبار کے مالک بھی! خبر نہیں کیوں۔ چھاپے خانے کے ساتھ میرے دماغ میں کالک کا تصور آتا تھا۔ اور اردو اور اس کا اخبار اور پھر اس اخبار کا دفتر یہ سب تو مجھ ہی کو کیا بقول کسے ہر ایک کو عاشقی اور شاعری اور بے ترتیبی یاد دلاتے ہیں!

مگر پھر ایک کاروباری ضرورت سے اخبار سیاست کے دفتر اور پریس جانا پڑا جہاں عابد علی خاں صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ قریب سے دیکھنے پر ان کی دنیا کچھ اور ہی نظر آئی۔ نہ کاہلی نہ کثیرانہ دھواں نہ کالک نہ فرسودگی نہ بے ترتیبی! سیاست کا سا چھاپے خانہ تو میں نے انگریزی اخباروں کا بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری، سجی ہی۔ نک سک سے درست در و دیوار، زمین و آسمان سب سے خوش حالی اور بلند اقبالی نمایاں!

یہ دوسری تصویر پہلی تصویر یا تصور سے بالکل مختلف پائی۔ مگر واقفیت اب بھی مکمل نہیں تھی۔ اس لئے پھر غلط فہمی پیدا ہوئی کہ فی زمانہ نہ تو مسلمانوں میں ایسے اولوالعزم پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ نہ ہندوستان میں کوئی کارخانہ یورپ و امریکہ کے انداز کا دکھائی دیتا ہے اس لئے عابد علی خاں صاحب مسلمانوں میں کیسے موجود ہیں اور ان کا کارخانہ ہندوستان میں کیونکر ہے؟ اگر عابد علی خاں صاحب واقعی مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے تو اب تک آنکھوں سے اوجھل کس طرح رہے؟ اور ان کے سے اعلیٰ طباعتی اور اشاعتی کارخانہ جات بھلا ہمارے بیچارے اُجڑے ہندوستان میں کیوں ہونے لگے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں پر اعتبار کریں؟ یہ تو خود ہندوستان کا ہندوستان میں پردیسی ہونا ہو گیا!

میں خیالات کے اس طلسم میں الجھا ہوا تھا کہ ایک ساتھی نے چونکایا اور کہا کہ اس نئی دنیا کے چلانے والے دراصل حضرت جگر ہیں۔ ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے بھائی جگر! مگر میں نے بے اختیار کہا کہ حضرت جگر اس جگ کے ابدال قطب جس قدر بھی ہوں اور خوش عقیدہ لوگوں کے خیال کے مطابق اس دنیا کے انتظام و انصرام کی ڈوریاں چاہے جس طرح ہلاتے ہوں۔ لیکن اس کا "کُن فیکون" تو اللہ میاں نے عابد علی خاں صاحب ہی سے کرایا ہوگا۔ پھر انہیں داد کیسے نہیں ملے گی؟

کسی نے سچ کہا ہے کہ صاف ستھرا نستعلیق آدمی اندر سے بھی پاک اور ستھرا ہوتا ہے۔ اور اس کی کاروباری بگ بیٹھک کی ہو تو معاملات کا بھی کھرا نکلتا ہے۔ تجربے نے عابد علی خاں صاحب کی ایک اور خوبی یہ دکھائی کہ وہ دل کے بھی بڑے ہیں۔ کاروباری آدمی اگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھتے رہنے کی عادت نہ ڈال لے تو اس کا کاروبار چوپٹ ہو جائے یا ترقی نہ کرے۔ دوسری طرف یہ مشکل کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھنا سیکھئے۔ پھر اور طبیعت ثانی بنے تو آدمی خود چھوٹا ہو جائے اس لئے وہ کاروباری لوگ جو باریک بینی کے عادی ہونے کے باوجود وسیع النظر اور دل کے بڑے ہیں خصوصی تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں میں عابد علی خاں صاحب کو اونچے مقام کا مالک سمجھتا ہوں۔

میں نے جب جب مرحوم کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ انھوں نے میری درخواست کو شرف قبول عطا فرمایا اور پھر ہزار اصرار کے باوجود نہ کبھی آمد و رفت کا کرایہ لیا۔ نہ ہوٹل کے بل میں دخل انداز ہونے دیا نہ یہ بات مانی کہ غریب خانے پر قیام فرمائیں۔ اس کے برعکس خود حیدرآباد بلاتے تو بیٹی کی شادی تک میں دعوت نامے کے ساتھ ہوائی جہاز کا ٹکٹ رکھتے!

عابد علی خاں کی عظیم شخصیت کے کئے پہلو تھے۔ میں انھیں رائٹر، صحافی، منتظم، کامیاب تاجر اور اہرآجر کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ لیکن ان کی زندگی کے ان پہلوؤں میں سے ہر پہلو صرف پہلو نہیں ایک آدمی لگتا تھا۔ پورا اور مکمل آدمی! ان کی ذات میں واقعی کئی آدمی جمع تھے اور وہ اکیلے دنیا سے نہیں گئے ہیں۔ کئی اور آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئے ہیں۔ ان کی موت نے دنیا کو ایک آدمی سے سونا نہیں کیا ہے۔ کئی آدمیوں سے سونا اور محروم کیا ہے۔

مرحوم کی صحافتی زندگی کے بارے میں کبھی بطور خاص کچھ سوچا نہیں تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے سنسنی خیزی کو اپنائے بغیر ایسی زبردست کامیابی کس طرح حاصل کی۔ سنسنی اخباری دنیا کا سکۂ رائج الوقت ہمیشہ سے ہے۔ بڑے بڑے تیس مار خاں انگریزی اخبار بھی ہر وقت چونکا دینے والی اسٹوری اور کہانی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لیکن سیاست وہ واحد اخبار نظر آتا ہے جو سنسنی کے ذریعے عارضی مقبولیت کے پیچھے کبھی نہیں پڑا۔ اس نے اپنی ان تھک محنت سے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ ہی پیدا نہیں کیا بلکہ اس حلقے کا ذوق بھی بنایا۔ اس حلقے کو واقعی سنسنی سے زیادہ ٹھوس، مکمل اور بھرپور

کی شہروں سے دلچسپی رہی اور عابد علی خاں صاحب کے سادہ مگر پرکار اسٹائل نے ان کو دل موہ لیا۔

مرحوم اس لحاظ سے بھی اردو صحافت کی تاریخ میں نمایاں مقام پا لیں گے کہ انھوں نے طویل مدت تک بڑے صبر اور وضع داری کے ساتھ اپنی پالیسی کو قائم اور جاری رکھا۔ ان کی پالیسیاں صبح و شام نہیں بدلیں۔ ان کے ہاں کوئی تبدیلی آئی بھی تو اس نے قلابازی کی شکل اختیار نہیں کی بلکہ ربط و تسلسل کے ساتھ شریفانہ اور باوقار انحراف کی شان دکھائی گئی۔ ان پر سرکار پرستی کی تہمت تو دھری گئی لیکن دلچسپ تماشا تھا کہ کسی بھی تہمت لگانے والے نے اس سرکار درباری اخبار کو پڑھنا نہیں چھوڑا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ عابد صاحب مرحوم کے ہاں کوئی کشش ایسی ضرور ہے کہ اختلاف رکھنے والے بھی ان کے ساتھ چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور جس کے ساتھ دنیا چلے۔ اس کے ساتھ دنیا سے فائدہ اٹھانے والے کیوں نہ چلیں؟ سیاست کی مقبولیت اور عابد علی خاں صاحب کی ترقی کا راز شاید یہی تھا۔

سردار دیوان سنگھ مفتون کا نام اردو کے مشہور ترین صحافیوں میں آتا ہے۔ انھوں نے اپنی زرد صحافت کو احترام عطا کرنے کے لئے لکھا تھا کہ دوسرے اخبار والے قصیدے پڑھ کر فائدے حاصل کرتے ہیں اور میں پولیس کے تھانیدار کی طرح رقمیں وصول کرتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ عابد علی خاں صاحب جیسے لوگوں نے اردو صحافت کو بھیک اور تھانے داری دونوں کے چکر سے نجات دلائی اور فنی مہارت، مستقل مزاجی اور ان تھک محنت کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ انھوں نے اپنے اخبار سیاست کو ایک مقناطیس بنائے رکھا جس کی طرف محتاج اور مختار سب کھنچے چلے آتے تھے اور وہ دولت جس کے لئے دنیا میں اتنی چیخ و پکار ہے عابد صاحب پر بن مانگے برستی تھی۔

میں نے عابد صاحب کو دوستوں کا دوست دیکھا اور کبھی کبھی یہ شان بھی نظر آئی کہ ایک چھوٹا سا بیر نما آدمی اپنی بھاری بھرکم آواز کے ساتھ گھن گرج رہا ہے اور الفاظ اس کے ہونٹوں پر فیصلے بن کر نمودار ہو رہے ہیں۔ چھوٹے اپنی ضرورتیں اس کے پاس لا رہے ہیں اور بڑے اپنی مشکل کشائی کے لئے اس کے ہاں حاضر ہیں۔ ذاتی معاملات میں، سماجی معاملات میں، سیاسی معاملات میں، قومی معاملات میں۔ کہیں بھی وہ پیچھے نہیں ہے۔ اگر وہ کسی ولایت کا مالک ہے تو اس ولایت کا کوئی دور دراز کونا بھی ایسا نہیں جہاں اس کا فرمان جاری و ساری نہ ہو۔ اس کی رائے کا وزن حیدرآباد اور آندھرا ہی میں نہیں ہے۔ دہلی کا ایوان اقتدار بھی اس کی بات سننے کے لئے کان لگائے رکھتا ہے۔ نہایت شائستہ، نہایت ملنسار، بہت ہی خلیق، واقعی ایک بڑا انسان! زاہد میاں شاہد میاں خوش قسمت ہیں کہ عظیم باپ کی وراثت کے ساتھ ایک تابناک روایت بھی انہیں ملی ہے۔ خدا اس روایت کو قائم رکھے۔

میں ادارۂ منادی اور جماعت نظامیہ کی طرف سے مرحوم کا پرسا بیگم صاحبہ، اہل خاندان اور پوری اردو برادری کو دیتا ہوں اور اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ عابد علی خاں صاحب کی مغفرت بھی فرمائے اور ان کے درجات بھی بلند کرے کہ مرحوم نے منکروں کے درمیان بھی اپنے اقرار کو برقرار رکھا اور زندگی بھر اللہ کے بندوں کی خدمت کرتے رہے۔ اللہ تعالےٰ اس بڑے غم کی سہار بھی ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین۔

منادی فروری ۹۳ء

من کہ

عابد علی خاں

میں کہ میر عابد علی خاں ابن میر محمود علی خاں ابن میر حافظ علی خاں الملقب نواب انتخاب جنگ بہادر اپنے بارے میں کچھ لکھنا بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ یہ بھی مشکل کام ہے کہ ۶۴ سال کی اس داستان کو کہاں سے شروع کیا جائے۔ میرے اعمال نامے میں دھرا ہی کیا ہے جس کے تذکرے کے لیے جواز پیدا ہو۔

جمعہ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء م ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ بوقت فجر میری تاریخ پیدائش ہے۔ میں نے حیدرآباد کے ایک جاگیردارانہ گھرانے میں ایک ایسے وقت جنم لیا، جب کہ جاگیردارانہ نظام، نظام دکن کے اقتدار کے تحفظ کا دوسرا نام بنا ہوا تھا۔

میرے والد نواب میر محمود علی خاں نے بھی جن کے پدر محترم یعنی میرے دادا حافظ علی خاں انتخاب جنگ سے جو نظام ششم نواب میر محبوب علی خاں کے مدرسہ عالیہ میں ہم جماعت اور حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم کے اتالیق تھے اور نانا عابد علی خاں (نواب صولت جنگ) سے غالباً دور بینی ورثے میں حاصل کی تھی اور جاگیردارانہ نظام کے تعلق سے نوشتہ دیوار پڑھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اسی لیے تو انہوں نے اپنے دور کے بیشتر جاگیرداروں کے لڑکوں کے برخلاف ہم تمام بھائیوں کو اسکول اور کالج کی راہ دکھائی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مال و دولت، یہ جاگیر و منصب، یہ جاہ و حشم سب عبث ہیں۔ یہ زیادہ دنوں تک کام دینے والی چیزیں نہیں۔ جو چیز اہم ہے، وہ تعلیم ہے۔ اسی سے تمہارے آباء و اجداد کا نام باقی رہ سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جاگیرداروں نے بچے ایک علحدہ درس گاہ، جاگیردار کالج یا ثانوی درجے تک مدرسہ عالیہ میں پڑھا کرتے تھے۔ میری تعلیم کی ابتدا بھی مدرسہ عالیہ میں ہوئی اور یہیں سے میں نے میٹرک کامیاب کیا۔ جاگیردارانہ گھرانوں کی روایات کے مطابق مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے نظام کالج میں داخلہ لینا چاہیے تھا لیکن میں نے اردو ذریعہ تعلیم کی واحد اور منفرد یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کا انتخاب کیا اور اس مادر جامعہ نے جس میں "انقلابی شاعر" مخدوم کے نغمے گونجا کرتے تھے، مجھے امارت اور غربت کے فرق و تفاوت سے واقف کرایا۔ میں نے فلسفے سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ یہ میری خوش بختی تھی جو مجھے خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر شیو موہن لال اور ڈاکٹر ولی الدین جیسے بلند قامت دانشوروں کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل رہا۔

جامعہ عثمانیہ ہی میں مخدوم سے ملنے کا موقع ملا تھا اور جب فارغ التحصیل ہو کر باہر نکلا تو انہیں کی سنگت اور صحبت میں ادب و سیاست کی تحریکات سے اولاً نظری اور پھر عملی دلچسپی بڑھنے لگی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" نکالا کرتے تھے۔ ان دنوں حیدرآباد سے کئی اردو اخبارات شائع ہوتے تھے، لیکن "پیام" ہی وہ اخبار تھا جو سیاسی بیداری اور ترقی پسند و جمہوری تحریکات کا علمبردار تھا۔ "پیام" سے اور قاضی عبدالغفار صاحب سے ربط کے علاوہ دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی سرگرمیوں نے انقلاب کے تصور سے مجھے روشناس کرایا۔ ۱۹۴۳ء میں دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ آمریت پر جمہوری اور اتحادی طاقتوں کا غلبہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دنیا بھر کی نوجوان نسل ترقی پسند اور امن دوست تحریکات سے وابستہ ہو رہی تھی۔ میں بھی مخدوم، میر حسن اور سجاد ظہیر اور کیفی اعظمی جیسے ابھرتے ہوئے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کے قافلے میں شامل ہو گیا۔ اسی لیے مجھے ۱۹۴۳ء میں اپنے شہر کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری بنایا گیا۔ ان ہی دنوں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی عظیم الشان تاریخی کل ہند کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ میں نے ۱۹۴۷ء تک یہ فرائض ادا کیے اور اشتراکیت کو انسانی دکھ درد کی نجات کے ایک نسخہ کی حیثیت سے قبول تو کر لیا لیکن پارٹی کی باقاعدہ رکنیت قبول نہیں کی کیوں کہ میں شروع ہی سے کسی جماعت سے وابستگی ناپسند کرتا رہا ہوں۔ یہ بھی میرے لیے

ایک اعزاز تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود میں نے ہندوستان میں پارٹی پر سے پابندی اٹھائے جانے کے بعد بمبئی میں منعقد ہونے والی پہلی پارٹی کانفرنس میں مخدوم کے ساتھ شرکت کی اور بمبئی ہی میں قیام کے دوران مجھے بنے بھائی اور پروفیسر نورالحسن سے قریب ہونے اور ان سے کھل کر مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملا۔ حیدرآباد سے جو مندوبین اس کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے، ان میں میں واحد تھا، جسے بنے بھائی کے گھر قیام کا موقع ملا۔ نورالحسن صاحب بھی ان دنوں بنے بھائی کے ساتھ مقیم تھے۔ اس موقع پر مجھ سے خواہش کی گئی تھی کہ میں کارل مارکس کی کتاب WAGE.: ABOUR AND CAPITAL کا ترجمہ کروں۔ یہ میرا پہلا قلمی کام تھا جو کتابی شکل اختیار کر سکا۔ میں نے "جمہوریہ چین" اور چین کی شخصیتوں پر دو اور کتابیں لکھیں۔

والد صاحب کی خواہش کے احترام میں نظام کی حکومت کے چھوٹے افسر کی حیثیت سے داخل ہوا لیکن اس حال و ماحول میں سرکاری ملازمت کا بندھن کب تک گوارا کرتا اور ارباب مجاز بھی ایک ایسے آدمی کو کب تک سرکاری عہدے پر باقی و برقرار رکھتے جو سرپھرے انقلابیوں کا بااعتماد دوست تھا۔ گھر والے بھی میری ان سرگرمیوں پر تشویش کا اظہار کرنے لگے تھے۔ والد محترم کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ اپنے گھر اور اپنے ماحول سے ذہنی تصادم کی داستان اس مرحلے پر اختتام کو پہنچی جب کہ ریاست حیدرآباد میں شخصی حکمرانی کا تاروپود بکھر کر رہ گیا اور یہ ریاست آزاد ہندوستان کا ایک جز بن گئی۔ ایسے وقت میں نے صحافت کو اپنا پیشہ بنانے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۴۸ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء سے روزنامہ "سیاست" نکال رہا ہوں۔ ۴۳ برس کی عمر کے اس "کینوس" پر آپ کو نہ جانے کتنے ہی اچھے برے رنگ ملیں گے۔ جاذب نظر بھی اور آنکھوں میں کھٹکنے والے بھی، لیکن اس "کینوس" کو ایک روشن لکیر سی کھینچی ہوئی ہے اور یہ لکیر میرے فکری ارتقا کی نمائندگی کرتی ہے۔

میرا اخبار جس دن شائع ہوا تھا اس دن سے کافی عرصے تک اس کی ۱۰۰۰ کاپیاں بھی مشکل سے فروخت ہوتی تھیں لیکن آج اس اخبار کا حلقۂ اشاعت وسیع ہو گیا ہے۔ "سیاست" ان چند اخباروں میں سے ہے جو اپنی تعداد اشاعت اور درجہ بندی کے لحاظ سے متوسط درجہ کے زمرے سے تعلق رکھتا ہے۔ "سیاست" آج میری میراث نہیں رہا ہے۔ یہ اس کے بے شمار پڑھنے والوں کی آواز بن گیا ہے اور آج بھی اسے وہ تمام طبقے اپنا ترجمان سمجھتے ہیں، جنہیں سیکولرازم، سوشلزم اور پرامن بقائے باہم پر ایقان ہے۔

سیاست کی اشاعت کے آغاز کے بعد سے میری زندگی کی عائلی نوعیت ختم ہو گئی ہے۔ سیاست کے صفحات میں ہر روز آپ جو کچھ دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں، اس میں زندگی کی ہر اچھائی اور برائی صاف جھلکتی نظر آئے گی۔ میں بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ سیاست میں خبروں کی ترتیب، معلوماتی مضامین و پس منظر کا مواد کچھ ایسا ہوتا ہے کہ نہ صرف اہل علم و دانشور بلکہ ایک عام قاری بھی اس کی اہمیت اور افادیت تسلیم کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اب خبر رسانی کے قومی اداروں اور ترسیل و ابلاغ کے عصری وسائل تنظیم جدید یا صحافتی امور کے کسی بھی مسئلے میں سیاست کی رائے کو وقعت و اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ قومی پریس کے نمائندوں کے دوش بدوش پریس ٹرسٹ آف انڈیا اور یو این آئی کے انضمام اور علیحدگی دونوں مرحلوں پر میں بھی ان اداروں کے ڈائرکٹروں میں شامل رہا اور یہ اعزاز اردو میں شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوا ہو لیکن اس افتخار سے بڑھ کر یہ بات میرے لیے قابل عزت ہے کہ "سیاست" ملک کا واحد اردو اخبار ہے جسے کم و بیش تمام ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا قلمی تعاون حاصل ہے اور اس میں ان کی تخلیقات شائع ہوا کرتی ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں کے کنبے کی طرح "سیاست" نے اپنے لکھنے والوں کا ایک خاندان بھی بنا لیا ہے۔ انگریزی اخبارات کے ساتھ ساتھ "سیاست" کے ایڈیٹر کو بھی ایسے مباحث اور ایسے سمیناروں میں اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے، جن میں قومی مسائل زیر بحث رہتے ہیں۔ اب اردو صحافت کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنا اور زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے اپنی بساط کے مطابق کوشش کرنا ہی میرا مقصد حیات ہے۔ سیاست کی آواز اور اس کے اثر کے باعث حکومت ریگن نے ۱۹۸۸ء میں صدارتی انتخابات کے معائنہ کی دعوت دی تھی۔ سوویت یونین بھی دو مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ یورپ کے کئی شہر اور مشرق بعید بھی جا چکا ہوں۔ صدر جمہوریہ جناب فخرالدین علی احمد مرحوم کے ہمراہ مشرقی یورپ اور یوگوسلاویہ اور نائب صدر مسٹر پاٹھک کے ساتھ افغانستان اور خلیجی ممالک کے دورے کا موقع ملا۔

چونکہ شہر حیدرآباد کی وضعداری اور بھائی چارگی کی روایات میرے نزدیک سب سے بلند مقام رکھتی ہیں، اس لیے میں پوری دیانت داری اور خلوص سے کوشش کرتا ہوں کہ "سیاست" کو صحت مند پرانی اور نئی قدروں کا ایک خوش گوار امتزاج بناؤں۔

اردو سے میری والہانہ محبت کو آپ میری مادری زبان ہونے کے سبب قرار دے لیں لیکن میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ یہ ہی وہ زبان ہے، جس نے ہمارے ملک میں مختلف تہذیبوں کو ملانے اور ان اقدار کو مضبوط بنانے کے عمل میں تیزی پیدا کی اور جس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ عصری تقاضوں کو بڑی آسانی سے قبول کر سکتی ہے اسی لیے میں اس کی نشوونما اور اس کے ارتقا کی ہر تحریک سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ ویسے مرکزی انجمن ترقی اردو کی نائب صدارت اور اپنی ریاست کی انجمن ترقی اردو کے شریک معتمد اور آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کے ایگزیکیٹو چیرمین کی حیثیت سے مجھے اردو اور اردو والوں کی خدمت گزاری کا شرف حاصل رہا ہے۔ اردو تعلیم کو عام کرنے کے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے پرائمری سے ثانوی درجوں تک ماڈل اسکول اور کوچنگ سنٹروں کے قیام کی جدوجہد میں اپنے دوست احباب کے ساتھ کندھے پہ جھولی لٹکائے، صاحب خیر سے اردو کے لیے اس کا حق صرف ایک روپیہ مانگتا رہا ہوں۔

مجھے فخر ہے کہ میری اپیل رائیگاں نہیں گئی۔ میں نے ساڑھے تین لاکھ روپے کا تعلیمی ٹرسٹ بنایا ہے جس کے منافع سے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام دو اردو ماڈل اسکول، اردو ہال اور اردو گھر میں کامیابی سے چلائے جا رہے ہیں۔ اردو مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے ساتھ انگریزی، ہندی اور تلگو میں تعلیم کا کامیاب تجربہ جاری ہے۔

میں نے پہلے ہی بتایا ہے کہ میری تعلیم اس دور کے نوابوں کے طبقے کی روایات کے مطابق انگریزی ماحول میں ہوئی تھی اور میں نے اپنی مرضی سے اچانک اپنا ذریعہ تعلیم بدل کر ملک کی پہلی اردو ذریعہ تعلیم کی مادر جامعہ کو اپنایا تھا۔ اس لیے میں اردو میں کسی حد تک "ہمہ دانی" کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا، لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ اردو میرا ایمان ہے۔ میرا سرچشمہ وجدان ہے۔ اس وارفتگی نے شاید مجھ سے کچھ ایسے کام بھی کرائے ہوں جو میری بساط سے بہت بڑے تھے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اردو کی اچھی تخلیقات کے لیے سرمایہ کی فراہمی ادیبوں اور لکھنے والوں کے بس کی بات نہیں ہوتی اور اردو کے شاعر و ادیب اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود افلاس کے دلدل سے نکلنے نہیں پاتے۔ ان کی امداد و اعانت کے لیے ادبی ٹرسٹ کے قیام کا اعلان کر دیا لیکن سوال یہ تھا کہ سرمایہ کہاں سے آئے لیکن جو تحریک پورے خلوص سے شروع کی جاتی ہے اس کے پھلنے پھولنے کی راہیں نکل ہی آتی ہیں۔ چنانچہ میری حوصلہ افزائی کرنے والے کچھ لوگ اور بھی مل گئے اور میں جو یکا و تنہا ایک مشکل سفر پر چل پڑا تھا، بہت جلد اپنے آپ کو ایک کارواں کا جزو محسوس کرنے لگا۔ میں نے اس ٹرسٹ کے کارپس کی فراہمی کے لیے ہر سال ایک کل ہند مشاعرے کے انعقاد کا انتظام کیا۔ ۱۸ سال قبل پہلا مشاعرہ ہی اپنے نظم و ضبط، ہندوستان کے مشہور شاعروں کی شرکت اور اردو نوازوں کی اعانت سے بڑا کامیاب ہوا۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے اب سارے ملک میں مشہور ہو گئے۔ میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ان مشاعروں کو سننے کے لیے ایسے سرکاری حکام اور قومی قائدین بھی بے چین رہا کرتے ہیں، جنہیں اردو کی شاعرانہ نزاکت خیالی کو سمجھنا تو دور کی بات ہے، اردو زبان بھی نہیں آتی۔ اسی ٹرسٹ کے زیر اہتمام اب تک آٹھ مطبوعات شائع ہو چکی ہیں اور شاعروں ادیبوں کی بروقت امداد کے لیے زائد از دو لاکھ روپے جاری کیے گئے۔ اب ادبی ٹرسٹ کا کارپس ڈھائی لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ حکومت نے جناب اندر کمار گجرال، سابق مرکزی وزیر برائے سوویت یونین کی صدارت میں گجرال کمیٹی کی تشکیل کی تو مجھے بھی اس کا ایک رکن نامزد کیا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ گجرال کمیٹی کی ضخیم رپورٹ اب تک منظر عام پر نہیں آ سکی ہے۔ تاہم میرا ضمیر مطمئن ہے کہ اس کمیٹی کے اجلاسوں میں، میں نے کسی مصلحت کو پیش نظر رکھے بغیر اردو والوں کی انتہائی دیانت داری سے نمائندگی کی اور اس سیکولر زبان کو اس کے حقیقی روپ میں پیش کیا۔ بعض ایسی تجاویز منظور کرانے میں کامیاب رہا جن کو نیک نیتی سے روبہ عمل لانے کی صورت میں مجھے یقین ہے کہ اردو والوں کے کئی مسائل طے پا سکتے ہیں۔

مجھے اردو والوں سے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ ہر مرحلے پر مجھے ان کا اعتماد حاصل رہا ہے اور "سیاست" کو محض ایک اخبار کی بجائے ایک ادارہ بنانے میں انہوں نے

مجھے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا گراں بہا تحفہ دیا ہے۔ وہی اب میرا مقصود نظر بن گئے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب کے ادارہ ادبیات اردو سے کون اردو داں واقف نہیں۔ اس عظیم ادارے کی مالی حالت بے حد خراب تھی۔ سالانہ صرف ۶ ہزار روپے کی سرکاری گرانٹ پر یہ ادارہ چل رہا تھا۔ ادارے کے عہدے داروں کی خواہش پر میں نے ادبی ٹرسٹ کے ایک مشاعرے سے ڈیڑھ لاکھ روپے جمع اور حوالے کیے جس سے ایک ٹرسٹ بنایا گیا۔ کہ جس کی رقم سے سالانہ ۲۲ ہزار روپے آمدنی ہوتی ہے۔

پرانے شہر حیدرآباد میں جو مہاراجہ کشن پرشاد اور چندولال شاداں کا شہر ہے۔ انجمن ترقی اردو کو ۶۰ سال قبل حکومت سے ایک قطعہ اراضی کا مل گیا تھا۔ پرانے شہر میں چونکہ اردو سرگرمیوں کے لیے کوئی مرکز نہ تھا، میں نے مشاعرے اور عطیے سے ساڑھے تین لاکھ روپے کا ایک خوبصورت ہال تعمیر کروایا جہاں آج شاندار لائبریری تعلیم بالغان کا مرکز ہے اور اب حیدرآباد کے ۹۰ فیصد جلسے اسی اردو گھر میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو گھر کے اخراجات کی پابجائی کے لیے ایک لاکھ روپے کا ٹرسٹ بھی بنایا۔

میں نے زندگی کے چھ دہے مکمل کرلیے ہیں۔ زندگی کے نشیب کم اور فراز زیادہ دیکھے ہیں۔ مجھے اپنی ہی زندگی میں دین و دنیا کی تمام مسرتیں، اعزازات اور نیک نامی ملی ہے۔ ان بے شمار نعمتوں کے لئے میں جتنا بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں کم ہے۔ زندگی کے اس آخری مرحلے میں بھی میری سانسوں کی تکمیل کے لیے جو کچھ وقت باقی رہا ہے، یہ کوشش ہے کہ وہ اردو کو اس کا مستحقہ مقام و مرتبہ دلانے کی جدوجہد میں صرف ہو۔ میں نے ہمیشہ عدل اور انصاف اور میل ملاپ کے راستے کو اپنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے قدم انشاء اللہ تعالیٰ نہیں ڈگمگائیں گے۔

۲۸ سبب رس ۲۸ مارچ ۱۹۹۳ء

* * * *
* * * *

خیالِ یار کبھی ذکرِ یار کرتے رہے

ظفر الحسن.

یاری کا سبق لینا ہو تو عابد سے لو۔ نواب عابد علی خاں سے۔ نوابی کی بات بعد میں کروں گا۔ عابد جیسا دوست بڑی مشکل سے ہاتھ لگتا ہے۔ سبط حسن اپنے ایک لنگوٹی یار اور ہمدم دیرینہ کے متعلق بتارہے تھے ارے بھئی اب وہ بہت بڑے شاعر اور اس سے بڑے ہندوستان گیر شہرت کے لیڈر ہوگئے ہیں اپنی اور ہماری لکھنؤ کی یاری اور فاقہ مستی کے دنوں کو حرف غلط کی طرح مٹا کر راج کپوروں اور ولیپ کماروں کی باتیں کرتے اور ان ہی سے کھلتے ملتے ہیں۔ دوستی یوں بھولی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

اوپر میں نے عابد کو ایک وجہ سے "نواب" لکھا ہے۔ عابد بلاشبہ سابق ریاست حیدرآباد کے ایک ممتاز جاگیردار خاندان کا فرد ہے۔ میں نے اسے کئی بار لکھا کہ نواب انتخاب جنگ سے تیرا کیا رشتہ تھا اور تیرے خاندان کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نوابی اس کی گھٹی میں ضرور ملائی گئی ہوگی۔ مگر جب سے میں نے اسے دیکھا ہے اور پینتالیس سال سے دیکھ رہا ہوں عابد کسی طرف سے بھی نواب نظر نہیں آیا۔ نہ پہلے اور نہ اب۔ حیدرآباد پہنچے دو تین دن ہوئے تھے میں شباب جگر اور دو ایک پرانے یار روزنامہ سیاست میں عابد کے کمرے میں بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک خاص بات محبوب حسین جگر کے متعلق بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ جب سے عابد کو دیکھا ہے جگر کے ساتھ اور جگر کو دیکھا ہے عابد کے ساتھ۔ جس طرح ریاست حیدرآباد میں ل الرحمن اور عطاء الرحمن جیسے سگے بھائیوں کی طرح دو دوستوں کی جوڑی بھی نہیں ملی۔ اتنی مدت گزر گئی آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس دوست داری میں کس کا کتنا حصہ ہے۔ ہاں تو ہم حاضرین کمرے میں قہقہے لگا رہے تھے، پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے کہ ایک صاحب جن کا شمار یاران محفل میں نہ تھا۔ مخل ہو کر اور عابد کو بار بار نواب نواب کہہ کر تعریف کرنے لگے کہ نواب صاحب ایسے ہیں نواب صاحب نے فلاں کارنامہ انجام دیا وغیرہ۔

دو ایک بار تو میں طرح دے گیا۔ صبر کے گھونٹ پی لیے پھر ایک دم مجھ پر "اشفاقی دورہ" پڑا۔ ہمارا یار اشفاق حسین جب ایسی صورت پیدا ہوتی تو فحاشیات کی پوری ڈکشنری سنا دیتا۔ خود مزے لیتا اور مخالف کو بے موت مار ڈالتا۔ گالی کے جواب میں وہ ماں بہن سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ گالی کا رسیا تو میں آج بھی ہوں اور اسے زندہ دلی کی علامت سمجھتا ہوں مگر گالی تو اشفاق حسین، میر حسن اور مخدوم محی الدین کے ساتھ دفن ہوگئی۔ نہ ان جیسے کلاسیکی گالیاں دینے بلکہ اختراع کرنے والے ہیں اور نہ ہم جیسے لطف اندوز ہونے والے۔ لے دے کے ایک شباب رہ گیا ہے مگر وہ بھی کسے گالی دے اور کس سے گالی سنے۔ ہمارے پہنچنے سے اس کے چمنستان میں تھوڑی بہت بہار آئی تو وہ بھی ہمارے لوٹنے کے بعد خزاں کا شکار ہوگئی۔ عابد کا گالی سے کیا تعلق۔ غلطی سے کبھی زبان سے "تو" نکل جائے تو فورا کلی کرلے۔

ہاں تو اس بے تکلف محفل میں ان ناجنس نے "نواب" کی گردان شروع کی۔ مجھ میں اشفاق کی روح حلول کر گئی تو میں نے ان سے کہا آپ جس کو بار بار نواب کہہ رہے ہیں اس کا پول کھولوں؟ آپ کا یہ نواب عابد، جب میں انجمن اتحاد طلبا نے جامعہ عثمانیہ کا صدارتی انتخاب لڑ رہا تھا، دیواروں پر ہماری پارٹی کے پوسٹر چپکاتا۔ جلسوں میں پمفلٹ تقسیم کرتا اور "ظفر وزارت زندہ باد" کے نعرے لگاتا تھا۔ نہ اس نے خود کو نواب منوایا نہ ہم نے نواب مانا اس لیے ہماری ایسی محفل میں خدا کے لیے اسے نواب نہ کہیئے۔ ابتداء میں مجھے افسوس ہوا کہ اشفاق کی روح نے میرے جسم میں داخل ہو کر مجھ سے ایسی بات کیوں کہلوائی مگر بعد میں خوشی ہوئی کہ تیس سال بعد حیدرآباد آیا ہوں میرے گالی دینے والے یار زندہ نہیں تو کم از کم ان کی روحیں تو میرے اطراف منڈلا رہی ہیں۔

میں نے عابد سے کہا اخبار سیاست کا دفتر ہمارا جی ایچ کیو ہے۔ اپنے عملے سے کہہ دو کہ ہمارے ہر آرڈر آف دی ڈے کی تعمیل کریں۔ زاہد علی خاں سے کہا جو عابد کا فرزند دلبند ہے، تم ہمارے اے ڈی سی، پرائیویٹ سکریٹری وغیرہ وغیرہ

ہو۔ زاہد جو اپنے باپ کا بڑا بیٹا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے سیاست کو پروان چڑھتے دیکھا ہے اسے اپنے باپ کی صحافت کا علم اور اس سے زیادہ اس روزنامہ سے محبت کا علم ہے۔ وہ عابد کے نقش قدم پر چل کر اس اخبار کو مزید ترقی دینے کی تگ ودو میں لگا ہوا ہے۔ میں بارہا اس کے کمرے میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ باپ کے دوست کے ساتھ گپ لڑانے کو اس نے اپنے کام پر ترجیح دی ہو۔ مجھے یہ بھی احساس ہونے نہیں دیا کہ میں اس کے کام میں مخل ہو رہا ہوں اس لیے گل کھلانے کے لیے کسی دوسرے کمرے کا انتخاب کروں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ اخبار کے کس شعبے کے کس کام پر زاہد کو مکمل عبور حاصل ہو گیا ہے کیونکہ اس نقطہ نگاہ سے میں نے اس کے کام اور کارکردگی کا تجزیہ نہیں کیا مگر یہ میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ روزنامہ سیاست کے کسی [illegible] بارے وہ غافل نہیں ہے۔ سمجھدار ہے، معاملہ فہم ہے، متوازن مزاج کا مالک ہے، عابد کی طرح کی ادب آداب کی پرانی روایات کا احترام کرتا ہے۔ اسی باعث محبوب حسین جگر کی اخبار میں جو اور جتنی نگرانی ہے اس میں رتی برابر دخل نہیں دیتا۔ یہ زاہد کی سعادت مندی ہے۔

محفل جمی ہوئی تھی اور عابد کا چپراسی بار بار اندر آکر کاغذات وغیرہ پیش کر رہا تھا۔ میں نے چپراسی سے کہا جب تک عابد صاحب کے کمرے میں ہماری محفل جمی رہے نہ باہر کا کوئی مہمان اندر آنے اور نہ دفتر کا کوئی آدمی، کاغذ، خط یا سلسلہ وغیرہ۔ اخبار دیر سے نکلے یا بالکل ہی نہ نکلے کوئی مضائقہ نہیں ہماری گپ شپ میں خلل نہ پڑے۔ تین سواتین بجے اخبار بھی وقت پر نکلا اور ہماری محفل بھی جاری رہی۔ عابد ہماری دلجوئی بھی کرتا رہا اور اپنے پروگراموں کی پابندی بھی۔ ایک بجے تک دفتر میں، اس کے بعد دوپہر میں قیلولہ اور آرام اور شام چھ بجے نظام کلب میں بلیرڈ۔ ساری دنیا ایک طرف عابد کا بلیرڈ ایک طرف۔ ایسی پابندی پر مجھے نواب دلاور جنگ یاد آگئے۔ بارش ہو، آندھی آئے، کچھ ہو جائے نواب صاحب اپنی رولس رائس میں بیٹھے حسین ساگر کے بند پر

سیاست کی شہرت و مقبولیت اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی دولت آسمان سے نہیں ٹپکی ہے اور نہ عابد کی کسی اور "سیاست" کا نتیجہ ہے۔ دراصل اس کے خون پسینے کی کمائی ہے۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا حیدرآباد میں موسلادھار بارش ہوئی۔ حیدرآبادی بارش یا وہاں کے نکاسی آب کے نظام یعنی ڈرینج سسٹم کا کمال یہ ہے کہ ادھر بارش رکی ادھر دس بیس منٹ کے اندر بارش کا تمام پانی نالیوں میں سے ہوتا ہوا غائب۔ نشیبی علاقوں اور تنگ گلیوں کی بات مختلف ہے مگر عام اور بیشتر جگہوں پر برسات کا ٹھہرا ہوا پانی دکھائی نہیں دیتا۔ سیاست کا دفتر جو جواہر لال روڈ کی ایک چھوٹی سی گلی میں واقع ہے ذرا نشیبی حصے میں واقع ہے۔ پانی نشیب ہی میں مرتا ہے۔ مرے پہ سو درّے گلی کے جمع شدہ پانی کو باہر نکالنے کا کوئی راستہ نہ ملا کیونکہ گلی میں کوئی نالی ہی نہ تھی اس پر جواہر لال روڈ کا پانی بن ناتھی کے بیل کی طرح گلی میں گھسنے لگا۔ وہ تو کہیئے عمارت دو منزلہ ہے ورنہ معلوم نہیں کیا محشر برپا ہو جاتا۔

عابد اور جگر بڑے دل والے ہیں۔ دونوں نے ایک ایک بالٹی اور جھاڑو سنبھالی اور بالٹی بھر بھر کر نہر روڈ کی طغیانی میں اضافہ کرنے لگے۔

پہنچا وہیں پہ آب جہاں کا خمیر تھا

ذرا تصور کیجئے دونوں کے پاجامے گھٹنوں تک، آستینیں کہنیوں تک سر جھاڑ منہ پہاڑ ایک ہاتھ میں بالٹی دوسرے میں جھاڑو کام میں اس طرح جٹے ہوئے جیسے اس کے سوا انہیں کوئی اور کام کرنا ہی نہیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب سیاست ایک ہزار چھپتا تھا۔ عابد کے خواب وخیال میں بھی نہ ہوگا کہ ایک دن اس کی اشاعت پندرہ ہزار روزانہ ہو جائے گی۔ اسے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اس نے تو ایک خاص جذبے کے تحت اور ایک مثال قائم کرنے کے لیے جھاڑو دی تھی۔ اس جھاڑو نے دھن برسایا۔

سقوط دکن کی پہلی برسی سے کچھ پہلے اور فوجی حکومت کے دنوں میں سیاست کی اشاعت شروع ہوئی ۱۵/ اگست ۱۹۴۹ء۔ یہ زمانہ بڑی افراتفری، پریشانی اور مشکلات کا تھا۔ اردو داں اور اردو خواں یا تو جوق در جوق پاکستان منتقل ہو رہے تھے یا مستقبل قریب میں پیش آنے والے معاشی مسائل سے خوفزدہ ہو کر ایک ایک پائی بچانے کی فکر میں تھے۔ نیلام گھر مسلمانوں کے پچاسوں سال کے جمع کردہ نوادرات اور دوسری اشیاء سے پٹے پڑے تھے۔ خود میرے گھر کا سامان جس میں صوفہ سیٹ، مسہری، دریاں، سنگھار میز، سلائی مشین، ڈنر سیٹ، باورچی خانے کا سامان اور دوسری چیزیں تھیں محض بارہ سو میں نیلام ہوئیں۔ ایسے میں اردو اخبار اپنی اہمیت اور افادیت کے باوجود ضرورت نہیں رہا تھا۔ مسلمانوں

کو روٹی کی فکر تھی خبروں کی نہیں۔ اردو اخبار کون خریدتا۔ ایسا اخبار جس کا مسلک قوم پرستی اور ترقی پسندی تھا۔ جیسا کہ ابھی لکھ چکا ہوں ابتدا میں اس کی اشاعت صرف ایک ہزار تھی اور جب میں گیا ہوں تو کچھ کم پندرہ ہزار ہو گئی۔ پاکستان کے معیار سے یہ اشاعت بہت کم ہے مگر سنجیدگی سے سوچیے تو پاکستان میں جس کی قومی زبان اردو ہے لاکھ سوا لاکھ کی اشاعت کوئی غیر معمولی معیار ہے۔ دونوں ملکوں کے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے میں لاکھ سوا لاکھ کے مقابلے میں اس پندرہ ہزار کو زیادہ بڑی تعداد سمجھتا ہوں۔

واہ واہ شاباش عابد واہ واہ
اردو والوں میں تو بازی لے گیا

مخدوم کی ایک تحریر کے مطابق روزنامہ سیاست اب میری عادتوں اور طلب میں شامل ہو چکا ہے۔ صبح بستر سے اٹھتے ہی سگریٹ کی طلب اور ساتھ ہی ساتھ سیاست کی طلب ہوتی ہے۔۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ایک جگہ لکھا ہے "میری بات تو پوچھو مت۔ اخبار سیاست تو میری زندگی کا جزو اور روزمرہ کا معمول ہے۔ علی الصبح چائے کی پیالی کے ساتھ سیاست کی لت سی پڑ گئی ہے۔ جب تک میں حیدرآباد میں رہا مخدوم اور راج کی طرح صبح سویرے سب سے پہلے جو کام کرتا تھا وہ سیاست کا مطالعہ تھا۔ عابد کی مہربانی سے چھپنے کے دو دن کا سیاست غالب لائبریری آتا ہے۔ مجھے خوشی اور اس کے ساتھ حیرت بھی ہے کہ ممتاز محقق اور مولوی عبدالحق کے تاحال مجوزہ سوانح نگار مشفق خواجہ سیاست کا بڑے اشتیاق سے انتظار کرتے، شوق اور التزام کے ساتھ پڑھتے اور تعریف کرتے ہیں۔ ان کی تعریف بطور سند اس لیے نقل کر رہا ہوں کہ وہ بڑے نک چڑھے محقق اور نقاد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سیاست کی طلب اور لت میں اس کے محاسن کے ساتھ ساتھ عابد کے پیار کی خوشبو بھی شامل ہے۔ پیار پیار میں عابد کو ایک بات بتا دوں۔ وہ اپنے کاتبوں سے کہہ دیں کہ بیڑی کو بیانڑی، بینڈ کو بیانڈ ایم اے کو یم اے لکھنا ترک کر دیں۔ یہ پرانے حیدرآباد کی غلط کتابت اور لکھائی تھی۔

ایک دن عابد کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک شاعر صاحب تشریف لائے۔ جیب سے ایک غزل نکالی اور سنانے کی بجائے عابد کے سامنے رکھ دی اور کہا بچی بیمار ہے۔ عابد نے مسودے پر کچھ لکھا اور ایک صاحب کا نام لکھ کر کہا ان سے مل لیجیے۔ ان کے جانے کے بعد کہا یہ سب فراڈ ہے کوئی بیمار نہیں ہے، شاعر محترم کو شراب کے لیے پیسے درکار تھے اس لیے دہک گئے۔ اب انہیں غزل چھپنے سے پہلے اور ابھی معاوضہ مل جائے گا اور یہ آج اور ابھی شراب خانے جائیں گے۔ عابد اس طرح کے لوگوں کی بھی مالی امداد کرتا ہے۔ خود زاہد خشک ہے مگر رند قدح خوار کی بھی اعانت کرتا ہے نہ جانے کس کس طرح کی کتنی مدد کرتا ہے۔

دوسرے موقع پر ایک اور صاحب تشریف لائے۔ دراز قامت، چوڑا چکلا سینہ، گمبھیر آواز، شیر کا سا پنجہ، نام ان کا یاد ہے مگر عمداً درج نہیں کر رہا ہوں کیونکہ ان کی ہندوستان گیر شہرت اسمگلنگ کی وجہ سے ہے۔ سنا ہے وہ ہندوستان کے سب سے بڑے اسمگلر ہیں۔ ان کی بابت بہت کچھ سن چکا تھا۔ یہ کہ ہندوستان کے ہر بڑے افسر اور اہلکار اور وزیر اور سفیر نے ان سے رشوت لی تھی۔ وہ ہزاروں غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتے ہیں اور اداروں کو رقمی امداد دیتے ہیں۔ مجھ سے تعارف ہوا تو کہنے لگے ہمیں پاکستان بلائیے۔ میں نے کہا کہ آپ کے لیے تو ساتوں سمندر کھلے ہوئے ہیں جس ملک میں چاہیں جا سکتے ہیں۔ آپ کو کون روک سکتا ہے۔ یہ حضرت عابد کے مداح تھے اور اس سے ملنے کے لیے بطور خاص سیاست کے دفتر آئے تھے۔ میں نے ان کے جو حالات سنے ان سے اندازہ ہوا کہ قاسم بھنی جیسے لوگ ان کے آگے طفل مکتب ہیں۔ جہاز پر قلی کا کام کرتے تھے اور وہیں بہت سے گر سیکھے اور اس طرح شہرت حاصل کی۔

عابد نے روزنامہ سیاست میں کتابوں کی مطبوعات کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ شہر حیدرآباد، حیدرآباد نگینہ، صورت گران دکن، برجستہ اشعار، دکن دیس اور مخدوم کے نثری مضامین کا مجموعہ نجمی کے پیچھے جھوکرا اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ بعض مطبوعات بڑی گراں قدر اور مورخ کے لیے مفید ہیں۔

ہلتے میں ایک بار پرانے حیدرآباد دکن کی اہم اور نادر تصاویر سیاست میں شائع ہوتی ہیں جو کہ دکن کے مشہور فوٹوگرافر راجہ دین دیال کی اتاری ہوئی ہیں۔ تصاویر کا یہ سلسلہ نہایت روح پرور اور دل خوش کن ہے۔ یہ تصاویر حیدرآباد کی پرانی تاریخ یاد دلاتی ہیں۔ دکن دوستی کی قابل فخر مثال ہے۔ یہ کام صرف عابد جیسا فعال ایڈیٹر ہی کر سکتا تھا جس کی نظر میں حال اور مستقبل ہی نہیں حافظے میں ماضی بھی ہے۔

ادبی ٹرسٹ اور عابد علی خاں ایک سکے کے دو رخ ہیں۔ یوں تو اس۔ کے قیام کا خیال نواب مہدی نواز جنگ کو آیا اور ان

ہی کے کہنے پر عابد نے اس ٹرسٹ کی امداد میں پہلا مشاعرہ کیا اور سوونیر نکالا اور ٹرسٹیوں کی فہرست میں بعض بڑے نام ملتے ہیں مگر جہاں تک کام کا تعلق ہے میرے خیال میں عابد اور میر حسن نے اس پودے کی آبیاری کی۔ میر حسن کے انتقال کے بعد تو عابد نے تنہا اسے اپنے خون جگر سے سینچا۔ اس بارہ مشاعرے ہیے اس کی آمدنی سے ایک بک ڈپو قائم کیا اور سب سے اہم یہ بات کہ اردو آرٹس کالج، نظام اور انوارالعلوم کالج پرانے لوگوں کی رقمی امداد اور پھر ایک درجن کتابیں شائع کرنا اور شاعروں اور نثر نگاروں کی ان کی تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں جزوی رقمی مدد دی۔ شاعروں اور صحافیوں کے علاج معالجے اور شدید ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر یا تجہیز و تدفین کے لیے امداد چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو نہایت شریفانہ اور انسانی جذبے پر دلالت کرتی ہے۔ غرض عابد کی سرکردگی میں ادبی ٹرسٹ کی جو بھی سرگرمیاں رہیں لائق صد ستائش رہیں۔ وہ شہرت سے بے نیاز ہے دولت سے بے نیاز ہے عزت اور عظمت سے بے نیاز ہے اللہ نے اسے سب کچھ دیا ہے اور اس لیے دیا ہے کہ وہ مستعد کارکرد اور ایماندار ہے اس نے اپنے ہر جوہر قابل سے کام لیا ہے۔

مخدوم کے بعد فرزندان جامعہ میں جو بہ لحاظ عمر معلوم نہیں کتنے چھوٹے بڑے ہیں صرف دو نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور عابد علی خاں۔ راج کی مصروفیات بہت کچھ سیاسی اور کچھ ادبی ہیں وہ اردو کی گود میں پلا، جوان ہوا اور اب بڑھاپے کی منزل کی طرف گامزن ہے سیاست اس کا اوڑھنا اور اردو اس کا بچھونا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند اور انجمن ترقی اردو حیدرآباد سے وابستہ ہے۔ یہ وابستگی نمائشی اور کاغذی نہیں ہے۔ کام کرتا ہے اور دل لگا کر۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود راج اور عابد اردو کے معاملے میں یک جان ہیں۔

عابد نہ ادیب ہے نہ مقرر مگر ہندوستان کا ہر ادیب نہ صرف اس سے واقف ہے بلکہ اس کی ہر صدا پر لبیک کہتا ہے۔ ادبی ٹرسٹ کا مشاعرہ ہو یا شنکر جی کی یاد میں عابد جس شاعر کو مدعو کرے گا وہ ضرور آئے گا۔ قوم پرست ہونے کے باوجود عابد اول بھی مسلمان ہے اور آخر بھی مسلمان۔ مگر ایسا کٹر اور گمراہ مسلمان نہیں کہ غیر مسلموں کے درپے آزار ہو۔ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت پوری انسانیت کی خدمت کو ایک نیکی سمجھتا ہے اس کا دامن سیاسی آلائشوں سے پاک ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ عابد کا کوئی مخالف ہی نہیں۔ میں جب دکن میں تھا اس وقت اور کراچی آنے کے بعد کچھ لوگوں نے دبی زبان میں اس کی مخالفت کی۔ ان سب کو میں نے ایک ہی جواب دیا اس وقت دکن میں کون ہے جو عابد کی طرح خلوص اور لگن کے ساتھ اتنی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ مجھے صرف اور صرف ایک نام بتا دیجئے میں عابد کی مخالفت میں آپ کا شریک کن ہو جاؤں گا۔

ooo

سب رس۔ مارچ ۱۹۹۳ء

مکاتیبِ قاضی عبدالودود بنام سید انیس شاہ جیلانی*

قاضی عبدالودود بلاشبہ اردو دنیا کے محقق اعظم تھے۔ جب جب وہ علمِ لغات سے بحث، غیر ضروری تمہید اور لفاظی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ کام کی باتیں ہمیشہ لپیٹنے کا فن ان کو خوب آتا تھا۔ خوب پڑھے لکھے اور کڑھے ہوئے آزاد تھے۔ لندن، جرمنی اور متحدہ ہندوستان کے ہر کتب خانے تک ... ان کی معلومات وسیع و عریض تھیں۔ بیمار بیمار وہ عنفوانِ شباب ہی سے رہنے لگے تھے اسی لیے کسی قدر نازک مزاج کیوں نہ ہوتے۔

ایک ماہنامے کے اجرا کی سوجھی تھی مجھے، سرکار دربار سے اجازت نامہ سرٹیفکیٹ بن گیا۔ ویسے صلاحیت کا فقدان [illegible] سے موجود تھا ہی۔ قاضی صاحب نے دوسرے شمارے کے لیے مضمون کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتے ہوں گے شاید [illegible] یہ پرچہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ جب یہ نہ ہوا تو [illegible] کچھ نہ بھیجتے تھے۔ نصیر حسین خاں خیال کے بارے میں کچھ کا کچھ لکھ گئے۔ وہ سچ لکھنا اور سہنا بھی جانتے تھے۔ میں نے حیرت شملوی کے خطوط طلب کیے تو فرمایا پہلے وہ رسالہ تو نکال لو، اس کے بعد تحسین "ذرا کیو ہرج" پر تحقیقی مضمون کی سوجھی تھی وہ کر لو، تب شاید حیرت شملوی کے خطوط تک بھی پہنچ سکو گے۔ رسالہ تو مجھ سے کیا نکلتا اور تحقیقی مضمون کو کیا لکھتا۔ البتہ نگارشِ حیرت شملوی کی جمع آوری میں طبیعت ہیٹ رہا۔ دو ہزار خطوط فراہم اور نقل ہو چکے ہیں۔ حیرت مرحوم کے سلسلے کی ایک کتاب "مخطوطے ویدم" "منظوم" ہو کر آ چکا ہے۔ "معاصر" یا حیرت کا تذکرہ حیرت کے غم سے ہے، اور کاغذات کے ایک منتشر انبار سے میری دس روزہ کان کنی، جانفشانی اور کرید کا مظہر ہے۔ اب دیوان کی باری ہے۔ خطوط قاضی عبدالودود صاحب نے عطا نہیں کیے۔ پس ماندگان قاضی صاحب تک رسائی میرے بس میں نہیں رہی۔ قاضی صاحب کے خطوط میں ڈاکٹر عبدالحق

اس پر ہیچ معانی و مطالب کا فقدان، بس غزل ہے اور
خوب ہے۔"

یہ رائے تصدیق اور تردید کے دونوں پہلو لیے ہوئے جب نقوش کے غزل نمبر حصہ سوم میں چھپی تو میں نے متعدد شاعروں ادیبوں اور ناقدوں سے رائے طلب کی۔ قاضی صاحب کی رائے افقر موہانی کی تائید نہیں کرتی، جیسا کہ آپ ان کے آخری مکتوب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

میرے ممدوح حضرت حیرت شملوی مرحوم کی ایک غزل ہے ۔۔

کیوں ہوں نہ مغفرت کا طلب گار بھی بہت
بیمار بھی بہت ہوں گنہ گار بھی بہت
سنگین ہے سزا تو کسی سے کہیں بھی کیا
یہ دیکھ کر کہ ہم ہیں خطاکار بھی بہت
اچھا ہوا کہ آپ الگ ہم سے ہو گئے
الفت کی ورنہ راہ تھی دشوار بھی بہت
ہم پر غرورِ عشق کی تہمت بجا مگر
ہے بے نیازِ حسن کی سرکار بھی بہت
ہے یہ بھی واقعہ کہ صداقت کے نام پر
باندھے گئے ہیں جھوٹ کے طومار بھی بہت
کچھ اہلِ قافلہ ہی نہیں مست و بے خبر
بہکے ہوئے ہیں قافلہ سالار بھی بہت
حیرت نیازمند تو ہے آپ کا ضرور
لیکن نہ بھولیے کہ ہے خوددار بھی بہت

یہ غزل لکھنؤ کے افقر موہانی صاحب کو پسند نہ آئی۔ اپنے ایک شاگرد زبیر کیفی کے نام لکھتے ہیں :

"حیرت کی غزل ہے بالکل پسند نہ آئی، اولاً اغلاط کا مجموعہ،

کا ذکر آیا ہے مراد بابائے اردو ہیں۔

خطۂ بہار، پنجاب کی طرح بڑا مردم خیز ہے۔ خدابخش اور خدابخش لائبریری کا ہر ایک کے علم میں ہیں۔ سید سلیمان ندوی اور دو ایک دوسرے سلیمان بھی وہیں کے تھے۔ قاضی عبدالودود ایک معزز خانوادے کے نہایت محترم ادیب اور انسان تھے۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔

انیس شاہ جیلانی

۱۳ اپریل ۱۹۸۷

۱۷ نومبر ۶۲ء

پٹنہ ۴

مکرمی، خط ملا، یاد آوری کا شکریہ۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں، اور اس کا بالکل وقت نہیں کہ آپ کے رسالے کے لیے مضمون لکھ سکوں۔

---

* محمد آباد، تحصیل صادق آباد، ضلع رحیم خاں (پاکستان)

امید ہے کہ آپ کا رسالہ کامیابی حاصل کر سکے گا۔

خیر اندیش

قاضی عبدالودود

پٹنہ

۹ فروری ۶۳ء

مکرمی: میں تین ہفتوں کے سفر سے واپس آیا تو آپ کے متعدد خطوط ملے۔ میں فی الحال بہت مصروف ہوں، اور آپ کے رسالے کے شمارہ ۱ کے لیے کچھ لکھنا میرے لیے ممکن نہیں، یہ وعدہ کرتا ہوں کہ دوسرے شمارہ کے لیے ایک مضمون ضرور بھیجوں گا۔

خیر اندیش

قاضی عبدالودود

پٹنہ ۴

۲۴ فروری ۶۳ [۱۹۶۳ء]

مکرمی: آپ کا خط مورخہ ۲۰ فروری ملا۔ میں نے نوائے کیمرج کے شمارہ ۲ کے متعلق ایک مفصل مضمون کلکتہ کے ایک رسالے میں جس کا نام شاید چراغ راہ تھا، تین چار سال ہوئے لکھا تھا۔ آپ براہ مہربانی جلد بتائیے کہ اس کے کون کون سے شمارے آپ کے پیش نظر ہیں۔

نصیر حسین خیال شاد عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے، اور ان لوگوں میں جنھیں سچ بولنے سے کبھی اذیت ہوتی تھی۔ یہ پٹنہ میں پیدا ہوئے، ۱۸۹۷ء میں انیس بیس برس کے ہوں گے۔ صحیح سال ولادت معلوم نہیں۔ ان کی شادی کلکتہ میں ہوئی اور اسی بنا پر وہیں مقیم ہو گئے۔ غالباً ۱۹۱۷ء میں اردو کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی جس کے یہ صدر تھے۔ ان کی بعض تصانیف نثر چھپی ہوئی موجود ہے۔ ازاں جملہ "مغل اور اردو" یہ مجموعہ خرافات ہے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۴ یا ۳۵ء میں بمقام علی گڑھ ہوا۔ وہاں یہ حیدرآباد میں سر علی امام کے اردو سکریٹری تھے۔ لیکن مشہور کر رکھا تھا کہ وہاں کسی بڑے عہدے پر تھے اور وہاں "ادیب الملک" خطاب تھا۔ یہ خطاب خود انھوں نے اپنے کو دے رکھا تھا۔ ایک حمید صاحب جن کا ادارۂ نوائے کیمرج سے تعلق تھا سنا ہے کہ آج کل پنجاب ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ بشیر حسین زیدی کا بھی اس سے گہرا تعلق تھا۔ یہ دو تین سال قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے اور آج کل پارلیامنٹ راجیہ سبھا کے ممبر ہیں۔

والسلام

عبدالودود

پٹنہ ۴ ۶۳ ۳/۴

مکرمی: آپ کا خط ملا اور اس کا جواب بھی گیا، لیکن شاید پتا ٹھیک میں نے نہیں لکھا۔ اس لیے یہ دوسرا خط تحریر ہوتا ہے۔ (۱) میں نے نوائے کیمرج کے شمارہ ۱ (شمارہ ۲ نہیں) پر ایک مفصل مضمون کلکتے کے ایک رسالے میں جس کا نام شاید چراغ راہ تھا، تین چار سال گزرے شائع کیا تھا۔ آپ کے پاس نوائے کیمرج کے کون کون سے نمبر ہیں؟ (۲) شمارہ ۱ میں ایک حمید (طالب علم کیمرج) کا نام رکن ادارہ کی حیثیت سے درج ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ تین چار برس قبل تک پنجاب ہائی کورٹ کے جج تھے۔ آج کل کا حال معلوم نہیں۔ (۲) بشیر حسین زیدی کا نام شاید رکن ادارہ کی حیثیت سے شمارہ ۱ میں نہیں، لیکن ان کا اس سے گہرا تعلق تھا۔ وہ ریاست رام پور کے وزیر اعلیٰ اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں، اور فی الحال لوک سبھا یا راجیہ سبھا کے رکن ہیں۔ حسین الدین نسہاری جو ہائی کورٹ کے جج ہوئے ان کی وفات ہو چکی ہے۔ (۳) نصیر حسین خیال مشہور عظیم آبادی شاد عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں انیس بیس سال کے تھے۔ سال ولادت معلوم نہیں۔ معمولی تعلیم پائی، کلکتہ میں شادی ہوئی اور وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء (غالباً) میں ایک اردو کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی، یہ اس کے صدر تھے۔ دو تین اردو کتابوں کے مصنف ہیں، ازاں جملہ "مغل اور اردو"۔ حیدرآباد میں سر علی امام کے اردو سکریٹری رہے لیکن مشہور کر رکھا تھا کہ وہاں کسی بڑے عہدے پر تھے، لوگ یہ بھی سمجھتے تھے اور غالباً خود انھیں نے اسے شہرت دے رکھی تھی کہ انھیں ادیب الملک کا خطاب حیدرآباد سے ملا تھا، لیکن یہ غلط محض ہے۔ غالب ۱۹۳۵ء میں ان کی وفات علی گڑھ میں ہوئی۔ مدفن پٹنہ ہے۔ ان کی تحریروں میں حقیقت سے انحراف کی ہر ممکن کوشش موجود ہے۔ انتہائی درجے کے غیر معتبر شخص تھے۔ ذاتی معاملات میں بھی اور علمی معاملات میں بھی۔ مگر چونکہ دنیا احمقوں سے بھری ہوئی ہے، ان کی زندگی میں کماحقہ ان کا حال نہ کھلا۔

اس خط کا جواب ذیل کے پتے سے عنایت ہو۔

C/o Mr. Nuruddin Ahmad
Barrister At Law
10. Alipur Rd.
DELHI

۱۰- علی پور- دہلی

والسلام

قاضی عبدالودود

[کارڈ - مہر ڈاک خانہ اپریل ۱۹۶۳ء]

بوساطت: مسٹر نورالدین احمد بیرسٹر
۱۰- علی پور روڈ، دہلی

شفیق مکرم! آپ کا خط ملا۔ میرے پاس نوائے کیمبرج کا صرف پہلا شمارہ ہے۔ آپ نے ۳ شماروں کے بارے میں لکھا ہے جن میں سے دوسرا آپ کے پاس نہیں ہے، کیا تیسرا ہے؟

میرا مضمون جس پرچے میں نکلا تھا وہ بند ہو گیا۔ اس کے ایڈیٹر کا پتہ یہ ہے:

نیاز احمد خاں صاحب ایم۔اے لکچرار اردو
16 E. WELLEZLEY SQUARE
CALCUTTA-15

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

قاضی عبدالودود

پٹنہ
۹ مئی ۶۳ء

مکرمی! آپ کے کئی سند پے واپسی پر ملے۔ جواباً گزارش ہے:
۱- نوائے کیمبرج کا وہ شمارہ جس میں میرا مضمون نوائے کیمبرج پر چھپا تھا شاید ہی میرے پاس ہو۔ اس کی تلاش فی الحال میرے لیے ممکن نہیں۔ اگر کچھ زمانے کے بعد ملا تو عاریۃً بھیج دوں گا۔ نیاز احمد صاحب کو میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکتا۔ مدتوں سے میری ان کی مراسلت نہیں۔

۲- میرا احساس ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق کا کوئی مذہب نہ تھا۔ یہ محض سماعیات ہے، یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ڈاکٹر عابد حسین (جامعہ ملیہ) مجھ سے کہتے تھے کہ انھوں نے عبدالحلیم شرر کے ایک پوتے کا نام وحید تجویز کیا تھا۔ اگر آپ اس اطلاع سے کام لینا چاہیں تو اس کی ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے تصدیق کر لیں، ممکن ہے وہ اس کی اشاعت نہ چاہیں۔

میں "عبدالحق بحیثیت محقق" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ رہا ہوں۔ دو تین سو صفحے اس کے چھپ بھی چکے ہیں مگر ابھی تک نامکمل ہے۔

قاضی عبدالودود

۱۹ نومبر ۶۳ء
پٹنہ

مکرمی! آپ کے دو خط ملے۔

آپ ایک ماہنامہ نکالنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں آپ نے کم و بیش ۱۲ خط مجھے لکھے تھے۔ اس کے بعد نوائے کیمبرج، آپ کی توجہ کا مستحق ٹھہرا۔ اب حیرت شملوی مرحوم کے خطوط کی طرف التفات ہے۔ پہلے رسالہ نکالیے، اس کے بعد نوائے کیمبرج پر مضمون لکھیں اس کے بعد حیرت مرحوم کے خطوط کی نوبت آئے گی۔

"عبدالحق بحیثیت محقق" کی ۳ قسطیں معاصر کے ۳ شماروں میں شائع ہوئی ہیں اور مقالہ اب تک نامکمل ہے۔ آپ شائع شدہ اجزا کے شائق ہیں تو معاصر والوں سے طلب کریں۔

شعلہ صاحب کے پاس حیرت صاحب کے بہت سے خطوط ہوں گے، مجھ سے ان کی مراسلت بہت کم رہی تھی۔ ان کا پتہ یہ ہے:

Naraindas & Co Chemist
Gurdwara Rd.
Karol Bag New Delhi

خیر اندیش

قاضی عبدالودود

ادارۂ تحقیقات اردو
پٹنہ ۴
۲۳/۵/۶۹ء

شفیق مکرم!

آپ کا خط ملا۔ آپ کی مرسلہ غزل (۶ شعر) میں کسی طرح "اغلاط کا مجموعہ" نہیں کہہ سکتا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اس میں صحیح معانی و مطالب کا فقدان ہے۔ رہا پسند نہ کرنا، یہ اور بات ہے۔

مخلص

قاضی عبدالودود

(مراسلہ: ڈاکٹر مختار الدین احمد)

زبان و ادب پٹنہ جلد ۱۶ شمارہ ۵

ایک تحریر مجتبیٰ حسین کی یاد میں

فیروزہ جعفر

میرے سامنے ایک کتاب کھلی پڑی ہے۔ نام ہے "منتخب و تحریر" جسے محترمہ فنکار نے طبع کیا اور جس پر قلم ہاتھ سے لکھا ہے۔ "بکر اور مجتبیٰ تنقیدی مضامین" پہلا صفحہ الٹتی ہوں تو ایک خوبصورت تحریر، نگاہوں میں اتر جاتی ہے۔ "من و فیروزہ جعفر۔ یہ حرف اپنے واسطے جینا ایک فن ہے اور دوسروں کے لئے جینا عبادت ہے۔ دعاؤں کے ساتھ مجتبیٰ حسین۔ لندن۔ ۱۵ جولائی ۱۹۸۳۔ شام پانچ کر ۵ منٹ۔

پتہ نہیں کتنے برسوں سے یہ کتاب، میری کتابوں کے ذخیرے میں شامل تھی۔ اس نے مجھے ادب اور عبادت سے آشنا کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ادب اور مذہب میں کیا رشتہ ہے ---- پھر یہ کہ آنے والے زمانوں میں ادب کا مستقبل کیا ہے۔ اس نے مجھے ذوقِ سلیم اور تجھ کے بارے میں آگہی دی تھی۔ اور ساری بات یہ ہے کہ آگہی ذمہ داریوں سے دوچار کرتی ہے۔

عبادت کا لفظ، کتنا وسیع ہے۔ اور مجتبیٰ صاحب نے، جب یہ فقرہ، لندن کی اس گرم شام کو میری اس کتاب پر لکھا ہوگا تو اس لفظ نے اپنے پھیلاؤ میں کائنات کے خلق و تخلیق کو اپنے میں ضم کر لیا ہوگا۔ دونوں جہان کی بشارت دینے والے نے بھی تو سورۂ ذاریات میں یہی کہا ہے

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"

میں نے تو جن و انس کو پیدا ہی نہیں کیا، سوائے اس کے کہ وہ عبادت کریں۔

وہ ۱۹۸۳ء کی شام تھی، جس میں ۱۹۸۸ء کے سرد و بیستی دسمبر سے لگ بھگ پانچ سال کی دُوری تھی۔ لیکن یہ دُوری انہیں اور مجھے، کتنا قریب لے آئی تھی۔ یہ پانچ سال میں نے عبادت کے تصور کو کائنات کے وسیع کینوس پر پھیلا پھیلا کر اور شش جہت کے اس سرے سے اس سرے تک، رشتوں اور جذبوں کے تئیں طویل و عریض سانچوں میں اس عبادت کے مفہوم کو سمجھنے کی سعی بہم کی ہے مجتبیٰ بھائی سے محبت، ان کی بے پناہ شفقت اور خلوص کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی تمنا۔ یہ بھی عبادت کی وہ منزل ہے، جس کے لئے کائنات وجود میں آئی ہے۔ لیکن عبادت جسم سے ادا ہوں تو ہوں، جب تک وجود میں عبادت کی دنیا نہیں اترتی، اُسے گہرے معنی نہیں ملتے

نومبر میں عبداللہ علیم کا فون آیا —— مجتبیٰ صاحب تم ہے ہیں۔ جلدی پاس رہتا ہے۔
خیال و کھا بھی مضطرب ہو گیا۔ یا اللہ، مجتبیٰ بھائی کے دل کی رگیں بھی تھکنے لگ چکی ہیں۔

میں نے کہا "خدا کے سپرد کرو۔ ہم کیا بستی ہیں ——"

آپریشن کامیاب رہا۔ وہ تیزی سے رو بہ صحت رہے۔ کرامویل روڈ پر سرخ اینٹوں سے بنی، عمارت میں، اُن کا مختصر سا فلیٹ چاہنے والوں، ادیبوں، شاگردوں اور اوب نواز دوستوں سے گھرا رہتا تھا۔ وہ باتیں کرتے، تھم تھم کر، رُک رُک کر، مگر لہجے میں وہی روانی تھی، وہی وقار، وہی رچی بسی تہذیب اور شائستگی۔ شخصیت کی وہ قوت بڑی مسحور کئے دیتی تھی۔ ہر ملاقات پر یہی دیکھا کہ آس پاس لوگ بیٹھے محویت سے اُن کی باتیں سن رہے ہیں۔ سوال پوچھے جا رہے ہیں اور وہ سلسل سے جواب دے رہے ہیں۔ چہرے کا طمینان اور سکون، اندر کی نقاہت پر دبیز پردے ڈال دیتا تھا۔

پھر انہوں نے واپسی کی ٹھان لی۔ میں نے کہا۔ "ابھی ٹھہریئے جلدی کیا ہے۔ شاید آپ لندن کی سردی سے اُکتا گئے ہیں۔ "ایسا نہیں ہے۔ کوئٹہ بھی کچھ کم ٹھنڈا نہیں ہے دراصل مجھے بہت پیدل چلنا ہے۔ اچھا ہونے کے لئے —— اور تمہارے شہر کے اس فلیٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ بولے "اچھا تو ہمارے پاس آجایئے "میں اصرار کرکے ایک دن ایک شام گھر لے آئی۔ وہ بستر پر آرام سے لیٹے تھے۔ اور ہم لوگ اُن کے ارد گرد بیٹھے لا متناہی باتوں میں مصروف تھے کھڑکیاں اُن کے قریب تھیں، جیسے ایک لمحے کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہونے نہ دینا چاہتی ہوں۔ اسی رات ہم نے کتنی باتیں کیں۔ کتنی اچھوتی اور نایاب باتیں۔ میں نے اُن کے ایک مضمون کا اقتباس سنایا۔ "آج کی نئی نسل، ہم سے پوچھ رہی ہے کہ آپ نے ہمیں کیا دیا —— پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگ عظیم، گیس چیمبرز، نیپام بم اور تیسری ایٹمی جنگ کا منڈلاتا ہوا، منحوس سایہ۔ یہ آپ کی ڈپلومیسی، یہ نظریات، اخلاقیات، اور کرتوت، ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ قومی، جنگ کے اسی درخت پر نظر جمائے ہے، جس میں روپے پھلتے ہیں۔ اس لئے محرومی اور معاشرے سے کٹ جانے کا احساس بڑھ گیا ہے۔ یہ خوف، یہ تشویش، یہ تنہائی، یہ ویرانی، یہ کرب، یہ بے خوابی ——— ایلیٹ نے The Rock میں لکھا ہے۔

The desert is sqreezed in the tube

The desert is in the heart of your brother

کہنے لگے، "تم نے اس بارے میں کیا سوچا —— " میں نے کہا "جہنم میں جھلس جانے کے بعد ہی کردار نروان حاصل کر سکتے ہیں —— " اصل بات تو وابستگی کی ہے۔ "بولے "وابستگی بڑے گنویں جھنکواتی ہے —— " "وابستگی، عبادت کا ہی تو ایک نام ہے۔ یہ تصور نہ ہو تو ساری عمارت دلدل میں کھڑی ہے —— " ایک یقین کا اُجالا تھا جو لفظوں کی صورت ہر طرف پھیل رہا تھا۔ رات آدھی ہو چکی تھی۔ جعفر نے سلسلے کو روکنے کی کوشش کی "انہیں آرام کرنے دو —— صبح باتیں کر لینا" مگر وہ نہ رُکے "تخلیقی عناصر اور جمالیاتی اقدار۔ آدمی کو پہچاننے کا نام ہے۔ اس اعلیٰ سماجی شعور سے بے بہرہ اور بے خبر ہو کر فن اور جمالیات کی ساری بحث واہمہ ہے۔ آدمیوں میں کسی قسم کا جذبہ، کوئی نفرت، کوئی محبت، کوئی اُداسی کوئی خوشی نہ ہو تو، ایسی دنیا میں کوئی کب تک رہ سکتا ہے۔ آئن اسٹائن ایسی دنیا کو چھوڑ کے بھاگ نکلا تھا

----- ۔ گفتگو میں اُن کا احساس گہرا ہو چلا تھا۔

Man is composite Creature . he needs not only

money. but also morality. mirth. music and mystry.

جانتی ہوں نا۔۔۔۔ انسان کو اخلاق، مسرت، موسیقی اور رمزیت درکار ہے۔۔۔۔

میں نے پلٹ کر بھائی کی طرف اس خیال سے دیکھا کہ سچ ہے جیسے ایک پاؤں پر کھڑی ہیں چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے میاں کی طبیعت اور کیفیت پہچان لیتی ہیں۔ زیادہ جگا کر تھکانا مناسب نہیں ہے۔ مگر بھائی چاق و چوبند اور پوری طرح گفتگو میں محو تھیں۔ معافی چاہتی ہوں۔ بھائی۔ تھک گئی ہوں گی آپ۔ اب سو جائیے۔ مگر ان کا احساس، گفتگو میں دلچسپی اور مجتبیٰ بھائی کے ایک مصرعے کے پڑھنے کے بعد دوسرا مصرعہ روانی سے پڑھنے پر اندازہ ہو گیا کہ یہ خاتون، کس پائے کا ذوق رکھتی ہیں۔

اگلے دن فیروزہ آپا آئیں۔۔۔۔۔۔۔ یادیں اور باتیں چھڑیں۔ غیر منقسم ہندوستان، ادب، شعر، سیاست، موجودہ عہد کے بحران پر انتہائی متنوع، وسیع اور جذباتی منظر کو اُبھارتی گفتگو

لندن سے رخصت ہوتے ہوئے ہم نے کوئٹہ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ آنکھیں اشکبار تھیں کسے پتہ تھا کہ یہ الوداعی ملاقات ہے۔

مجھے ان سے جو ذہنی قربت اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ اس میں شاید میری اپنی ذات کا کوئی کمال نہ تھا۔ یہ اُن کا خلوص، محبت، حُسنِ سلوک اور انسان دوستی کا اعجاز تھا۔ ذہنی وابستگی اور اکرام کے جو رشتے اُستوار ہوئے تھے، وہ میری ذات پر قرض ہیں آج جب ہم، اُن کی یاد منانے اردو مرکز میں یکجا ہوئے ہیں اور میں تعزیتی مضمون پڑھ رہی ہوں تو مجھے اپنے عجز اور کم مائیگی کا اعتراف کرنا ہے۔ میں پروفیسر مجتبیٰ حسین کے شایانِ شان، عقیدت کے الفاظ پیش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مگر مجتبیٰ بھائی سے محبت کے حوالے سے انہیں آواز دے سکتی ہوں۔ ۔ مجتبیٰ بھائی۔ آپ نے وعدہ وفا نہیں کیا۔ میں تو کراچی میں گھٹی گھٹی حبس زدہ، کلاشنکوف، اور آتش و آہن کی گھن گرج اور معلق ہوئی فضاؤں سے نکل کر کوئٹہ کے کشادہ۔ فطرت سے جو کلام عظیم الشان مناظر دیکھنے گئی تھی۔ جہاں بلند و بالا پہاڑ، زمین کی گہرائیوں میں مضبوطی سے قدم جمائے کھڑے ہیں رنگت کی وادیاں، چشمے، جھیلیں اور آبشاروں کا حُسن ہے۔ مگر یہ کیا ہوا۔۔۔۔۔ ۔

لمحے بھر میں فضا کی شادابی رخصت ہو گئی۔ فضا سیاہ پوش اور عالم سوگوار تھا۔ سناٹے میں فقط سسکیاں اور ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ بھائی مجھے دامن تھامنے یاد آئی تھیں۔ اور آپ کا پیغام محبت لائی تھیں۔ اس دم مجھے آپ سے کراچی میں ملنا تھا، چلو مختصر ہی۔ مگر تم اُن سے مل تو لو گی ۔ کتنی چاہت اور اپنائیت تھی۔ ہم جب کسی کے دوست ہوتے ہیں، محبت کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ ساری دنیا اُسے چاہے۔۔۔۔۔ مگر پل بھر میں کوئٹہ کا نقشہ بدل چکا تھا۔ سڑک سے

گزرنے والی ہر گاڑی یونیورسٹی کیمپس میں واقع بارہ نمبر کے بنگلے کے سامنے ہجوم دیکھ کر رک جاتی تھی اور گاڑی چلانے والا مجتبیٰ بھائی کے قلب کی عافیت کی دعائیں مانگتا جا رہا تھا۔ طالب علم، اساتذہ، علم شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے، دوست احباب، سب ہی تو جمع تھے۔ ٹھیک سے پتہ نہیں چل رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ کسی ظالم نے لاہور میں ائیرپورٹ جانے والی ایک سڑک پر بھابی کے سہاگ کو کچل دیا تھا۔ پامال کر دیا تھا ------ مجتبیٰ بھائی کی موت کی خبر جنگل کی آگ بنی کوئٹہ کی سرد اور سخت فضاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ کہہ رہے تھے ------ یہ سانحہ صرف کوئٹہ کا نہیں۔ پاکستان کا ہے۔ اردو ادب کا ہے ------۔

بھیگی بھیگی اور ویران آنکھیں لئے بھابی ایک ہی سوال کر رہی تھیں "میں ساتھ کیوں نہ گئی ------ میں تو لندن سے اتنے بڑے آپریشن کے بعد سنبھال سنبھال کر بچا بچا کر لائی تھی ------ میں نے انہیں تنہا کیوں جانے دیا ------۔"

سہ پہر کو پی آئی اے کی پرواز سے جب میں ان کے شانوں کو سہارا دیتے جہاز کی سیڑھیاں طے کر رہی تھی تو ان کے ہاتھوں میں مجتبیٰ بھائی کی گرم ٹوپی تھی۔ جسے وہ بے ساختہ چوم رہی تھیں۔ خشک اور سنسان نگاہوں سے تک رہی تھیں۔ آنکھیں، جن کا کٹورا چھلک نہ رہا تھا۔ کراچی ائیرپورٹ پر ان کے بیٹے نایاب کی چیخ نے جیسے انہیں جگا دیا۔ وہ یکایک رونے لگیں اور اس دن سے مسلسل روئے جا رہی ہیں۔

آتے وقت میں نے کہا۔ بھابی حوصلہ رکھیے۔ بولیں، حوصلہ تو جانے والا ساتھ لے گیا۔ یہی چاہا کیوں بھابی ------ ابھی اور دیکھیے ------ وقت کی یہی تو کسوٹی ہے جب پرکھا جائے گا کہ ادب سے کسے کتنی وابستگی ہے ------ قدریں کیا ہیں اور احساسِ درد کیا ہے ------۔

مجتبیٰ بھائی نے کہیں لکھا تھا۔ اگر احساس مر جائے تو ادب ہی نہیں، پوری قوم کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ جب قومیں شعر کہنا اور سننا چھوڑ دیتے ہیں تو زمین بانجھ ہو جاتی ہے۔ وہ فریاد کرتی ہے۔ میرے سبزے نہیں بولتے، میری وادیوں میں پھول نہیں کھلتے۔ میرے چشمے گنگناتے نہیں۔ میرے کھیت لہلہاتے نہیں ------ اب کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ کوئی میری بات نہیں سنتا ------۔

خواتین و حضرات ------! میں ان ہی کی زبان میں آپ کی سماعت تک الفاظ پہنچانا چاہتی ہوں۔ ادب، زمین کی آواز ہے ------ جب تک زمین گھومتی ہے۔ ہم اس آواز سے بھاگ نہیں سکتے ------ اس آواز کو زندہ رکھیے کہ یہ آواز مجتبیٰ بھائی کی پکار ہے ------

(تشکیل (کراچی) شمارہ ۱۰ اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۳ء)

ن۔م راشد کا ایک خط

نوادرات

ن۔م۔ راشد کا غیر مطبوعہ خط بنام سید ضمیر جعفری

آپ نے سنا ہوگا "شوق دا کوئی مُل نہیں" یعنی شوق کی کوئی قیمت نہیں۔ کسی کو ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے، کوئی ہیرے جواہرات جمع کرتا ہے، کوئی موتیاں جمع کرتا، کوئی دولت جمع کرتا ہے۔ کسی کے ہاں سے چند تصویریں تو کسی کے ہاں چند حسینوں کے خطوط ملتے ہیں۔ مجھے مشاہیر کی تحریریں جمع کرنے کا شوق رہا۔ ۵۲-۱۹۵۱ء کی بات ہے میں حکیم یوسف حسن (مرحوم) کے ساتھ نیرنگ خیال میں کام کرتا تھا۔ حکیم صاحب نے ایک دن ڈھیر سارے خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب بیکار ہیں انہیں ضائع کر دو۔ ہم نے ان سے اجازت لے کر جلدی جلدی خطوط دیکھنے شروع کر دئے اور کچھ خطوط محفوظ کر لیے جو اب بھی میرے پاس ہیں۔ ان میں مرزا عظیم بیگ چغتائی، قاضی عبدالغفار کے چند خطوط ہیں جو ان حضرات کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں حکیم صاحب کے ساتھ کاروباری معاملات پر مبنی ہیں۔ امتیاز علی تاج، بیگم تاج، نذیر لکھنوی، یگانہ چنگیزی، محترمہ تسنیم سلیم چھتاری (جب ان کی تحریر کا ابتدائی دور تھا ۱۹۳۰ء-۱۹۳۲ء کا عرصہ) سیدہ اختر حیدرآبادی وغیرہ کے خطوط مضامین و دیگر مسائل سے متعلق ہیں۔ سیدہ اختر کے خطوط بعض خاص وجوہ کی بنا پر بہت اہم ہیں۔ ذیل کا خط اردو کے نامور شاعر اور ادیب ن۔م۔ راشد کا ہے جو مشہور و معروف مزاح نگار جناب سید ضمیر جعفری کے نام ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں آٹھ اشعار کی ایک غزل شامل ہے اور گمان غالب ہے کہ یہ غزل مجموعہ (شاید) راشد کے مجموعے میں نہ ہو اس طرح اس خط کی افادیت و اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ اس خط پر میں نے کب اور کس طرح ڈاکہ ڈالا تھا۔ میں اسے نوادرات میں سمجھتا ہوں اسی لیے نوادرات کے عنوان سے مرشدی سید ضمیر جعفری کی اجازت و اطلاع کے بغیر شائع کر رہا ہوں، کیونکہ یہ ایک نادر چیز ہے۔ (ق۔س)

اصل تحریر کا عکس

147 – 47 (C),
Village Road,
JAMAICA 35,
L.I., N.Y.

۵ جون ۱۹۵۳ء

پیارے ضمیر — یہ انگریزی میں ٹائپ شدہ خط
لکھنے کا تکلف شعر میں نہیں آیا۔ پیارا نامہ، راشد خیرا ہو تو
ضروری ہے۔ پہلی جون کی ... کو ... مجھے سیان
تو دیکھے ... خیریت سے پہنچ گئے لیکن ابھی تک راستے کی

تمہاری وحشت دور نہیں کر سکے۔ دنیا کے ہر حصے کا ماحول
اتنا نیا اور اتنا مختلف ہے۔ کہ خود میرے لئے بھی۔ تھا۔ لیکن
امید ہے آہستہ آہستہ اس سے اجنبیت، لگاؤ پیدا ہو جائے گا۔
یہاں تمہارا ذکر اکثر رہتا ہے۔ آفتاب۔ ذکی جو تمہارے ساتھ
شریک ہو رہے تھے۔ آج کل یہاں (اقوام متحدہ) کے نیو یونٹ
میں کام کر رہے ہیں۔ وہ تمہاری نئی علاقہ نیز اور نئی "خفیہ"
باتیں سنتے رہتے ہیں۔

گاؤں میں کیا کر رہے ہو؟ کیا حسان الملک بہادر
بے گناہ کشش پڑھتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو تمہارے ذہن کی
نشوونما کے لئے برا نہیں ہوگا۔

پچھلے دنوں ایک غزل ہو گئی تھی۔ اس کے چند شعر یہ ہیں

"یگانہ مونس حال تباہ بن کے رہی — شراب دل زدگاں کی پناہ بن کے رہی"
ہم اس کا تذکرہ یوں بار بار کرتے رہے — شب گناہ کی لذت گناہ بن کے رہی
بہار نور و گل و نغمہ بن کے آئی تھی — شرار غم کے لئے مثنوی گواہ بن کے رہی
شب وصال جدائی کا وہ خیال رہا — کہ وہ بھی ہجر کا روز سیاہ بن کے رہی
اسی نے خود نگری کا یہ حوصلہ بخشا — کبھی کی کم نگہی بھی نگاہ بن کے رہی
جو شیخ نے سر منبر لگا دی تھی وہ بات — پھر ایک بار سر منزل گواہ بن کے رہی
وہ سرزمیں جسے عشاق کا لہو نہ ملا — لب اک جہنم آب و گیاہ بن کے رہی
ہر آرزو مرے سینے میں آہ تھی راشد
ستارہ بن نہ سکی اور راہ بن کے رہی

عزیزہ تمہیں دعائیں دے رہی ہے۔ سب بڑوں کو سلام

مخلص
راشد

«فیض الاسلام» مارچ ۱۹۹۳ء

ثاقبہ رحیم الدین

نسیم حجازی

اردو ادب کی تاریخی ناول نگاری میں نسیم حجازی صاحب کم و بیش پچاس پچپن سال سے وہ قدآور شخصیت بن چکے ہیں کہ ان پر قلم اٹھانا یا کچھ لکھنا خاصہ محال ہے۔ آج اس اہل قلم اور باذوق لوگوں کے اجتماع میں، میں مختصراً آپ کی شخصیت نہیں بلکہ آپ کی تحریروں کے دو پہلوؤں پر کچھ کہنے کی جسارت کروں گی۔

نسیم حجازی ۱۹۳۲ء میں میر جعفر جمالی کے رفیق کی حیثیت سے بلوچستان گئے۔ وہاں روزنامہ تنظیم جاری کیا اور اپنے قلم اور زور صحافت سے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اسی دوران میں آپ کی پانچ معرکۃ الآرا کتابیں "داستان مجاہد" "محمد بن قاسم" "انسان اور دیوتا" "سو سال بعد" اور "آخری چٹان" شائع ہوئیں۔ نسیم حجازی صاحب کا ایک ہی خواب تھا اور ان کو ایک ہی آرزو بے چین رکھتی تھی کہ بلوچستان اور اس کی کل ریاستوں کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ صحافت، سلطنت اور روزمرہ کی تنقید کی جھاڑیوں کے درمیان اگتی ہے۔ نسیم حجازی کی بصیرت اور صداقت کو جاننے کے لیے ان کے ان چند مقالات پر نظر ڈالیے مثلاً "پاکستان۔ ایک نظریاتی ریاست اور اس کی ذمہ داریاں" "ہم نے زندگی سے کیا سیکھا" اور "عبرت انگیز کہانی" جو سکندر مرزا کے گورنر جنرل بن جانے کے بعد کے تاثرات ہیں۔ آج بھی بلوچستان میں لوگ شاہد ہیں کہ نسیم حجازی صاحب نے ایک صحافی کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں وہ قابل تحسین ہیں۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ تاریخ میں افراد کی کہانی اور گزرتے ہوئے واقعات غیر جانبداری سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ تاریخی صداقتیں جذبے سے عاری اور کسی قدر یا مبالغہ پر زور نہیں دیتیں۔ تاریخ نویسی اجتماعی حیات کا سچا اور سادہ بیان ہے۔

تاریخی ناول نگاری تاریخ کے ان گوشوں کو چھوتی ہے جس سے زمانہ ناواقف رہا ہو۔ مورخ جہاں ریاست کی ہموار راہ پر متوازن قدم سے گزر گیا ہوتا ہے، وہاں تاریخی ناول نگار رک رک کر راہ کے چھوٹے چھوٹے خود رو پھولوں کو چن لیتا ہے اور باریک کانٹوں کو سمیٹتا جاتا ہے۔ تاریخی حادثے سے ہٹ کر انہی واقعات سے ناول کی دنیا تعمیر ہوتی ہے۔ تاریخی ناول میں ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ تاریخی واقعات کے درمیان کچھ امکانات چھپے ہوئے ہوتے ہیں جو اگرچہ پوری سچائی نہیں ہوتے مگر سچائی سے قریب ہوتے ہیں۔ تاریخی ناول نگاری کا فن نہ صرف تاریخ ہے اور نہ مکمل طور پر ناول نگاری۔ تاریخی ناول نگاری کا فن تاریخی حقائق کو مسخ یا تبدیل نہیں کر سکتا بلکہ تاریخ کے دبیز پردوں میں انسانی احساسات و جذبات اس کا مرکز بنتے ہیں۔ لہٰذا ادب کے دامن کا ایک سرا تاریخ سے بندھا اور دوسرا داستان یا کہانی کے گرد لپٹا ہوتا ہے۔

نسیم حجازی کے ناول "معظم علی" اور "تلوار ٹوٹ گئی" میں سلطنت بنگال اور میسور کی سوا دو سو سال پرانی تہذیب صحیح انداز میں موجود ہے۔ اسی طرح سے آپ کے ناول "آخری چٹان" میں تاریخی صداقت اور بعض اوقات ناول کے ہیرو کے الفاظ میں بھی جوں کی توں نظر آتی ہے۔

دنیائے ادب میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض خشک اور غیر دلچسپ تاریخ کو دہرانے سے ناول کس طرح وجود میں آ سکتا ہے۔ جہاں تاریخ کردار میں جھول ہو وہاں نسیم حجازی بھرپور خامہ فرسائی کرتے ہوئے رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ مثلاً سلطان جلال الدین اداسی اور خاموشی سے پیچھے ہو جاتا ہے تو اس سلسلے میں نسیم حجازی دو ایک صفحے لکھ جاتے ہیں۔

نسیم حجازی کی ناول نگاری میں اسلوب پر دو طرح کی چھاپ ہے۔ ایک تو مشرقی پنجاب کی ہری بھری زمین کے رنگ ہیں اور دوسرے بلوچستان کے بے ثمر کہسار، صحرا اور طویل وادیاں ہیں۔ کسی فن پارے میں زندگی کی لہریں بکھیرنے کے لیے منظر نگاری اسلوب کا جزو بن جاتی ہے۔ منظر نگاری کی رو سے ادب کی ایک مسلسل صفت ہے۔ شاعری میں خصوصاً مثنوی اور مرثیہ میں منظر نگاری کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ نثر میں قدیم داستانوں اور ناولوں میں اس کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ کچھ مدت سے اور دور حاضر میں منظر نگاری وسیع مفہوم رکھتی ہے۔

ان میں قدرتی مناظر، ثقافتی مناظر اور تہذیب و تمدن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ آج کے ادب میں منظر نگاری سے مراد صرف حسین فضا قائم کرنا نہیں بلکہ کرداروں کی پسِ پردہ روح اور کہانی کے چھپے معنی کو اجاگر کرنا ہے۔

نسیم حجازی کے ناول "شاہین" میں کئی منظروں میں اندلس میں مسلمانوں کے زوال پر اپنے درد و کرب کا اظہار ہے۔ یوں یوسف بن تاشفین کی مقبولیت تاریخ کا اہم باب ہونے کی وجہ سے بھی ہے مگر اس کا ایک کمال دیکھئے۔

"آفتاب کی روشنی میں ہم ان ستاروں کو بھول جاتے ہیں جو رات کی تاریکی میں بھٹکے ہوئے قافلوں کو منزل کی راہ دکھاتے ہیں" اس کے بعد نسیم حجازی فتوحات میں ہونے والے گمنام شہیدوں اور تاج محل کے بے نام مزدوروں کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کے خون سے تاریخ کے عنوان لکھے گئے اور جن کا پسینہ چمک کر سرخی بن کر تاج محل تعمیر کرتا رہا۔ نسیم حجازی کے "اندھیری رات کے مسافر" میں بڑا معنی خیز حال بندھا ہے۔ لکھتے ہیں "میں نے دیکھا کہ جب طوفان آرہا ہو تو پرندے اچانک خاموش ہو جاتے ہیں، یہی حالت آج اہلِ غرناطہ کی ہے" اور "محمد بن قاسم" میں قدرتِ بیاں ملاحظہ کیجئے۔ "زبیر مجھے اس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے اس کی زندگی کس قدر مختصر ہے اسی قدر اس کا مقصد بلند ہے"۔

نسیم حجازی بلاشبہ علامہ اقبال، مودودی اور شبلی نعمانی سے متاثر تھے وہ ہلال اور صلیب کی جنگ کو صرف حکومتوں کی جنگ یا سیاسی بحران یا فوجی یلغار کا نام نہیں دیتے بلکہ دو نظام حیات، دو نظریوں اور دو تہذیبوں کا تصادم قرار دیتے ہیں۔ نسیم حجازی صاحب نے اسے خود قبول کیا ہے کہ ناول نگاری ان کے نزدیک ایک مشن کی تکمیل کا ذریعہ رہی ہے اور وہ اسلامی نظریہ حیات و آخرت ہے۔

زمانہ قدیم سے ادب میں ہیرو کا تصور واضح مگر بدلتا رہا ہے اس تصور کے بنیادی ستون یہ تھے کہ ہیرو عظیم، مقبول اور اعلیٰ ترین صفات سے آراستہ ہوتا تھا۔ ہیرو کی ذات ہر مشکل و الجھن پر آخر کار حاوی ہوتی تھی۔ البتہ کہیں ہیرو ذہنی طور پر فاتح اور کہیں جسمانی اور مادی لحاظ سے فاتح ہوتا تھا۔ یہ تصور عرصہ دراز تک چھایا رہا۔ وقت کے بدلتے دھارے نے ہیرو کو خاصہ بدل دیا ہے۔ یقیناً ہیرو عموماً خلاصے اور نتیجے کے طور پر تو مقبولوں کی چند نیک خصلتوں پر ہوتا ہے مگر اس کا راستہ حقیقت سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کا ہیرو پہلے سے طے شدہ برائیوں کا مالک نہیں ہوتا اور نہ وہ آئیڈیل طریقے سے ہر بدی پر قابو پاتا ہوا نیکیوں کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ دراصل آج کل ادب میں ہیرو نہایت پیچیدہ انداز کے ذہنی اور عملی عمل میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کی شخصیت کی کئی تہیں ہیں اور وہ جد و جہد اور تقاضوں کے میدان کو آزمائشوں سے عبور کرپاتا ہے۔ دورِ حاضر کے ہیرو کی زندگی میں خیر اور شر کے دھارے ملتے اور جدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بات بھی بڑی حد تک درست ہے کہ آج بھی ہیرو کا کردار عمومی لحاظ سے اچھے انداز میں یا گہرے معنوں میں اچھائی کا عنصر بیدار کرتا ہے مگر ہر انسان کی بنیادی صفت کی طرح آج کے ہیرو میں نیکی اور بدی کے سلسلے گڈمڈ ہوتے رہتے ہیں۔

نسیم حجازی کے ناولوں میں تاریخی ہیرو تو خوبیوں کا مکمل پیکر ہیں ہی مگر جو کردار تاریخی ثبوت سے کچھ پرے ہیں وہ بھی آئیڈیل انسان ہیں۔ جو خوبی زیادہ اچھائی اور تھوڑے سے سلسلے سے مل کر جنم لیتی ہے اور انسان سے زیادہ قریب ہوتی ہے نسیم حجازی کے اکثر ہیرو اور کئی کرداروں کی تقریروں میں نظر نہیں آتی ہے۔

نسیم حجازی کی زندگی کے پچاس پچپن سالوں میں ان کے ناولوں کا عربی، سندھی اور بنگالی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ شدہ سے شدہ تک آپ کی بیشتر ناولوں کا ایک یا دو ایڈیشن شائع ہوتا تھا مگر اب زیادہ تر کتابوں کے تیس سے پچاس تک ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

"فیض الاسلام" فروری ۹۳ء

وفیات

۱۹۹۲ء میں اردو زبان و ادب اور صحافت کو فائدے کم اور نقصانات سے زیادہ دوچار ہونا پڑا۔ اہم اور سربلند شخصیتوں کی وفیات نے ادب اور تہذیب کے افق کو نم دیدہ سا کر دیا۔

○ ۳ / ستمبر ۱۹۹۲ء کو کراچی پاکستان میں اردو کے بزرگ شاعر جناب سید شاہ محمود عالم وفا براہی ۷۰ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ جناب وفا ایک محفل مشاعرہ میں صدارت کر رہے تھے کہ قلب پر شدید حملہ ہوا اور قیدِ حیات سے آزاد ہو گئے۔ وہ پٹنہ، بہار کے رہنے والے تھے اور ہند و پاک کے مشاعروں میں اپنے کلام اور پرسوز ترنم کے باعث بے حد مقبول سخن ور تسلیم کیے جاتے تھے۔ نکہتِ گل، سحرِ نظر، شرارِ فطرت اور شعاعِ نو، چار شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ سب رس کے دیرینہ قلمی معاون بھی رہے ہیں۔ خدا مغفرت فرمائے۔

○○ ۲۲ / نومبر ۱۹۹۲ء کو نامور طنز و مزاح نویس ادیب، ڈرامہ نگار، جناب رشید قریشی سابق ڈپٹی سکریٹری حکومت آندھرا پردیش قلب پر حملے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ رشید قریشی جامعہ عثمانیہ کے نامور فرزندوں میں سے تھے۔ ادارہ ادبیات اردو اور اس کے بانی ڈاکٹر زورؔ سے انھیں دیرینہ رفاقت رہی۔ ادارہ سے ان کی پہلی کتاب "ممی کی دنیا" شائع ہو چکی ہے۔ طنز و مزاح کی تین کتابیں قریشی مرحوم کی ذہانت، فکر اور شعورِ تخلیق کی روشن مثال ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد اور ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد نے دسمبر ۹۲ کا خصوصی شمارہ رشید قریشی کی یاد میں شائع کر کے انھیں بروقت خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔

○○○ ۵ / دسمبر ۱۹۹۲ء کو بزرگ اقبال شناس عالم اور ماہرِ تعلیم مولوی سید خلیل اللہ حسینی (بانی و صدر کل ہند مجلس تعمیرِ ملت) کا انتقال ہوا۔ خلیل مرحوم نے انوار العلوم کالج کی ترقی میں بہ حیثیت پرنسپل (۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۳ء) گراں قدر خدمات انجام دیں۔ خوش بیان مقرر، اقبال شناس عالم اور کلامِ پاک کے مفسر ہی نہیں نئی نسل کے لیے حرکت اور حوصلہ کا درس دینے والے استاد بھی تھے۔ اربابِ حیدرآباد ان کی یاد کو فراموش نہ کر سکیں گے۔

○○ ۳ / جنوری ۱۹۹۳ء کو لاہور میں ممتاز شاعر جناب طفیل ہوشیارپوری ایڈیٹر ماہنامہ "محفل" نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ غزل، نظم اور نعتیہ شاعری میں طفیل نے نام کمایا۔ ۱۹۱۴ء میں بمقام ہوشیارپور (پنجاب) پیدا ہوئے۔ تمام اصنافِ شعر میں طبع آزمائی کی۔ جامِ مہتاب (رباعیات) شعلۂ جام (مجموعۂ غزلیات) سوچ مالا (نظمیں) رحمتِ یزداں (نعتیہ شاعری) چار ثبت طفیل صاحب کو زندہ رکھیں

○○ ۷ / فروری ۱۹۹۳ء کو انسانیت، سیکولرزم اور اتحاد کے بے باک مجاہد شاعر جناب غلام ربانی تاباں (۸۰) سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ تاباں صاحب ۱۵ / فروری ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے انٹر کامیاب کیا پھر آگرہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایل ایل بی ہوئے۔ وکالت میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چوں کہ مزاج شاعرانہ تھا ملک کی تحریکِ آزادی میں شامل ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ سازِ لرزاں، حدیثِ دل اور ذوقِ نظر، نوائے آوارہ شعری مجموعوں کے علاوہ نثر میں ایک کتاب "ہوا کے دوش پر" بھی آپ کی یادگار ہے۔ ۱۹۷۱ء میں پدم شری ایوارڈ ملا تھا جسے آپ نے اربابِ حکومت کی اردو زبان اور تہذیب نیز ملک میں آئے دن کے دنگے فساد و برتاؤ پر احتجاج کرتے ہوئے اس ایوارڈ کو واپس کر دیا تھا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے ادبی مشیر وضعدار اور ترقی پسند اقدار کے فرد اور سخنور رہے اور غزل کے محبوب شاعر۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

(د۔ش)

"سب رس" اپریل ۱۹۹۳ء

"کندن" کے مدیر لیاقت قریشی کا انتقال

نہایت دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی جا رہی ہے کہ گوہر پبلیشرز کراچی کے مالک اور ادبی ماہنامہ "کندن" کراچی کے مدیر اعلیٰ لیاقت قریشی ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء کی صبح ۳ بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ ادبی حلقوں میں لیاقت قریشی مرحوم کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

ان کے لائق فرزندوں کا یہ عہد کہ لیاقت قریشی مرحوم کی جلائی ہوئی شمع فروزاں رکھیں گے۔ قابل ستائش ہے۔

ادارہ "قومی زبان" جناب لیاقت قریشی کے اس "سانحہ ارتحال" پر ان کے پسماندگان کے غم میں شریک ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

علامہ اقبال کے بچوں کی آیا انتقال کر گئیں

شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کے بچوں کی آیا مسز ڈورس احمد گزشتہ دنوں لاہور میں ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔۔۔۔ آں کو یہاں عیسائیوں کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال کی اہلیہ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے جاوید اقبال، صاحبزادی منیرہ اقبال کی پرورش کی تھی۔

صحافی ستار طاہر انتقال کر گئے

ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور کے ایڈیٹر ستار طاہر حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ وہ نماز عید کے بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور وہ طبی امداد ملنے سے قبل ہی خالق حقیقی سے جا ملے انھیں اسلام پورہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ میں ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی ستار طاہر کے سوگواران میں بیوہ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہیں۔ (روزنامہ "جنگ" کراچی ۲۸ مارچ ۱۹۹۳ء)

قومی زبان مئی ۱۹۹۳ء

اردو شعر و ادب میں خود ساختہ دانشوروں کی کمی نہیں ہے۔ ایسے افراد بے شمار ہیں جن کی تخلیقی صلاحیت تیسرے درجہ کی اور مطالعہ صرف چند حوالوں پر مشتمل ہوتا ہے، قوتِ مشاہدہ بہت کمزور، تنقیدی شعور سے ناشناس اور تحریر کے رموز و نکات سے بے بہرہ ہوتے ہیں مگر ان کی پی آر بہت زبردست ہوتی ہے لہٰذا ادب کا شعور نہ ہونے کے باوجود، تخلیقات کے کمزور و بے جان ہونے کے باوصف اور تنقیدی اصول و ضوابط سے ناواقفیت کے بعد بھی ان کے دستہ نذور ہی اور حاشیہ بردار ان کی زندگی میں انھیں عظیم شاعر یا ادیب، نقاد اور دانشور بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں اور ان کی تعریف و توصیف میں صفحات کے صفحات سیاہ ہوتے رہتے ہیں مگر جب ان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو وہ ماضی کی خاک تلے ایسے دبتے ہیں کہ ان کا چہرہ بھی پہچان میں نہیں آتا۔ تاریخ انھیں فراموش کر دیتی ہے اور آنے والی نسلیں ان کے نام سے بھی ناآشنا ہوتی ہیں لیکن اس کے بالکل برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حقیقی معنوں میں دانشور، نقاد، شاعر اور ادیب ہوتے ہیں وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے متعلق میر نے کہا تھا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایسے ہی نابغہ روزگار میں اختر حسین رائے پوری اور سید ممتاز حسین بھی تھے جو ۱۹۹۲ میں دنیائے ادب کو داغِ مفارقت دے گئے یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کو تعلق اردو کی ترقی پسند ادبی تحریک سے تھا اور دونوں نے اس سال رحلت فرمائی جس سال سوویت روس کا شیرازہ منتشر ہوا۔

پہلے اختر حسین رائے پوری نے اردو ادب کو سونا کیا۔ کون نہیں جانتا کہ اختر حسین رائے پوری ترقی پسند ادبی تحریک کے معماروں میں سے ایک تھے۔ ایک بلند پایہ نقاد، مترجم، افسانہ نگار اور سوانح نگار تھے۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے نظریہ سازوں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعے، تنقیدی بصیرت، علمی استدلال، ژرف نگاہی اور فکر و نظر کے ذریعہ "تخلیقی ادب کو سماجی عمل کے تابع قرار دے"۔ خارجی حدلیت کی کسوٹی پر پرکھنے کا سلیقہ سکھایا۔ انھوں نے ترقی پسند نظریات کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ترقی پسند نظریات کے معیارات مقرر کر کے عصری مسائل کے تناظر میں تخلیقات پر تنقیدی فکر و نظر ڈال کر اردو ادب کو ایک نئے ادبی رویہ سے روشناس کیا۔ وہ اختر حسین رائے پوری ہی تھے جنھوں نے ترقی پسندی کو سلجھت اور جدلیاتیت

کے دائرے سے نکال کر تجزیاتی، سائنسی اور علمی رویہ سے آشنا کیا۔

اگرچہ اختر حسین رائے پوری کے ادبی کارناموں کی تعداد بہت کم ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تحریروں میں ایسی بلند نظری، پاکیزگی، جذبہ کی سرشت، صحت مند روایات کی پاسداری، زندہ عناصر کی بازیافت، تاریخی شعور اور حرکت و حرارت ہے کہ انھوں نے نہ صرف ترقی پسند ادبی تحریک کو اولین دور میں اعتبار اور سربلندی سے نوازا بلکہ آئندہ نسلیں بھی ان کی تحریروں سے متاثر ہوتی رہیں گی اور اردو ادب کی تاریخ ان کے نام کے بغیر مکمل نہیں کی جا سکے گی۔

ابھی ترقی پسند ادبی تحریک کے آنسو اختر حسین رائے پوری کے غم میں خشک نہیں ہونے تھے کہ ترقی پسند ادب کا ایک اور بلند ستارہ سرنگوں ہو گیا اور عظیم المرتبت ادیب و نقاد پروفیسر ممتاز حسین تھے جنھوں نے رحلت فرما کر اردو تنقید کو یتیم کر دیا۔

پروفیسر ممتاز حسین ایک بلند پایہ نقاد اور ایک اہم دانشور تھے۔ ان کا شمار اردو کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو تنقید کو تنقیص و تبصرہ سے نکال کر سائنسی تنقید کے معیار تک پہنچایا۔ وہ اردو تنقید کی تاریخ میں نہ صرف ایک باب کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ وہ ایک نظریہ ساز شخصیت کے حامل تھے۔

پروفیسر ممتاز حسین نے یوں تو افسانے بھی تحریر کیے، صحافت سے بھی وابستہ رہے لیکن ادب میں ترقی پسند تنقید ان کی شناخت و پہچان کا ذریعہ بنی۔ انھوں نے ترقی پسند تنقید کو ذہنی فکر و نظر، علم و آگہی، بصیرت و بصارت، عقلیت و مطالعہ، منطقی استدلال، سماجیاتی تجزیہ اور سائنسی معروضیت کے ذریعہ سائنسی تنقید کے درجہ تک پہنچایا۔

موجودہ دور میں پروفیسر ممتاز حسین وہ واحد نقاد تھے جو کٹر ترقی پسند نقاد ہونے کے باوجود توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ انھوں نے ادبی روایات کو فراموش نہیں کیا تھا اور نہ ہی جدید ادبی سرمایہ کی طرف سے یکسر نظریں پھیر رکھی تھیں۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا فکر و شعور مختلف جہتوں کا احاطہ کرتا تھا۔ انھوں نے کلاسیکی ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اس کے اندر جو قوت، دلکشی اور جاذبیت ہے، اس سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف وہ جدید ترین رجحانات، جدید ادبی مسائل اور تحریکات سے بھی بخوبی واقف تھے لہٰذا ان کی تنقید گہری بصیرت اور وسیع مطالعہ کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ان کا انداز فلسفیانہ اور منطقی تھا۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جو انھیں اپنے دور کے تمام نقادوں سے ممتاز کرتی تھیں۔

شخصی طور پر پروفیسر ممتاز حسین کی رحلت سے اردو تنقید میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کسی بھی صورت سے پُر نہیں ہو سکتا۔

ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند تنقید کے حوالے سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دورِ انتشار میں جب کہ ترقی پسند افکار و نظریات پر شب خون مارنے میں دشواری کی توپیں کامیاب ہو گئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک اپنا رول ادا کر چکی، ترقی پسند تحریک کے دو چند نقادوں، دانشوروں اور ادیبوں کی موت ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اس دورِ ابتلا میں جبکہ PSUDO ادیبوں کی بھرمار ہے، حقیقی ادیبوں سے دنیائے ادب خالی ہو جائے تو یقیناً یہ ادبی تاریخ کے لئے بدقسمتی کا عہد کہا جائے گا۔

”اردو انٹرنیشنل“ جنوری، فروری ۹۳ء

○

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ اپنی چالیس سالہ عمر میں موت کے کتنے ہی صدمات سے دوچار ہو چکا ہے۔ سب سے پہلے ہم نے اس کے بانی ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے لیے صفِ ماتم بچھائی، پھر میاں محمد شریف کا نوحہ کیا، اس کے بعد رئیس احمد جعفری کا مرثیہ پڑھا، بعد ازاں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کی موت پر آنسو بہائے، پھر سید محمد جعفر شاہ پھلواروی کے انتقال پر اظہارِ ملال کیا، پھر بشیر احمد ڈار کی رحلت کا مرحلہ پیش آیا، اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا محمد حنیف ندوی نے سفرِ آخرت اختیار کیا، متعلقین ادارہ میں ڈاکٹر رفیع الدین اور پروفیسر محمد سرور جامعی کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں، ہم نے ان کو بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہوتے دیکھا۔ کچھ عرصہ پروفیسر حمید احمد خاں کا نام نامی بھی ارکانِ ادارہ میں شامل رہا، ہماری آنکھوں کے سامنے وہ بھی لقمۂ اجل ہو گئے۔

یہ تمام حضرات اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت کے حامل تھے اور ان کی بوقلموں خدماتِ علمی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان میں سے ہر بزرگ نے علم کے ہر میدان میں تگ و تاز کی اور بعد میں آنے والوں کے لیے اپنے پیچھے بڑا تصنیفی ذخیرہ چھوڑا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ چکے تھے اور ان کی حیاتِ مستعار کے تقاضے زندگی کے نشیب و فراز کی بہت سی منزلیں طے کرتے ہوئے موت کی منزل کے قریب آ پہنچے تھے۔

۲۵۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کو رات کے آخری پہر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے قافلہ سالار سراج منیر آخری سفر پر روانہ ہوئے۔ انھوں نے زندگی کی صرف اڑتیس ۳۸ بہاریں دیکھی تھیں کہ موت کا پیغام آ گیا اور عین موسمِ بہار میں خزاں چھا گئی -!

انا للہ و انا الیہ راجعون

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ نے اپنی چالیس برس کی عمر میں جو گوہرِ آب دار کھوئے اور جن بڑے بڑے اصحابِ علم کو رخصت کیا، بعض معاملات میں سراج منیر ان سب سے بڑھے ہوئے تھے۔

"المعارف" خصوصی شمارہ ۱۰

"فنون" نمبر ۳۵ کی اشاعت کے بعد اب تک حزیں لدھیانوی، ممتاز ڈاہر، الطاف پرواز، کمار پاشی، بشیر بدر (ابن حیدر (سید علی حیدر زیدی) اور تصور کرتپوری کے سے اہم شعراء کا سانحہ انتقال ہو چکا ہے۔ بنارس یونیورسٹی کے پروفیسر حکم چند نیر کی وفات کی خبر بھی ملی ہے۔ مرزا غلام نبی جانباز بھی جو شاعر، سیاسی کارکن اور مؤرخ تھے، رخصت ہو چکے ہیں۔ معروف اداکارہ نیر سلطانہ اور نوجوان اداکار اسماعیل شاہ بھی ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ ان سب کی رحلت سے شعر و ادب اور تہذیب و ثقافت کی دنیا اداس ہو گئی ہے۔ ادارہ "فنون" ان کے پسماندگان کے دکھ میں شریک ہے۔

اس شمارے کی طباعت کے دوران میں خلیل ہوشیارپوری اور احمد وفا، براہی کے سے کہنہ مشق شعراء اور اظہر درانی کے سے نوجوان شاعر کے انتقال کی روح فرسا خبریں بھی ملی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

فنون: ۳۷، ستمبر - دسمبر ۱۹۹۲ء

فنون - ۳۷ اور فنون - ۳۸ کی اشاعت کے وقفے میں علم و ادب اور فن و صحافت کی بعض بڑی شخصیتیں رخصت ہو گئیں۔ مقبول عوامی شاعر حبیب جالب، قدآور صحافی مظہر علی خاں، ایک انتہا درجے کا وسیع المطالعہ نقاد، افسانہ نگار اور مترجم ستار طاہر، معروف نقاد ڈاکٹر ملک حسن اختر، محترم محقق ڈاکٹر محمد باقر، مشہور صوفی واصف علی واصف، ثقافت کے میدان کا ایک سرگرم ادیب یا محمد انور، ایک عمدہ شاعر محمود کنور، اور ایک کامیاب موسیقار ماسٹر عنایت حسین کے علاوہ اُدھر بھارت میں غالبیات کے ایک بے مثل ماہر مالک رام، ایک ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں اور ایک مقبول فلمی ہدایت کار اور ادیب کمال امروہوی —— ان سب نے اسی دوران میں رختِ سفر باندھا اور عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔

بھارت کے معروف شاعر بشیر بدر کے بارے میں پاکستان کے اخبارات میں ایک غلط خبر چھپ گئی تھی چنانچہ فنون میں بھی اس کا ذکر آگیا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ صرف علیل ہوئے تھے اور اب اللہ کے فضل سے چاق و چوبند ہیں۔

"فنون" جنوری - اپریل ۱۹۹۳ء

محمد عمر فاروق

جوابِ آں غزل

م-ش کی قادیانیت نوازی
اور شیخ اعجاز احمد و اولادِ اقبالؒ کی گارڈین شپ

زیرِ نظر مکتوب "مشہور" نوائے وقتی کالم نگار "م-ش" کے جواب میں ایڈیٹر "نوائے وقت" کو لکھا گیا مگر "جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے والے" سچائی کے چند بول برداشت نہ کر سکے۔ لیکن حق و صداقت کو اپنے اظہار کے لئے "نوائے وقتوں" کی ضرورت کبھی نہیں رہی اور نہ ہی اس کے ابن الوقت لکھاریوں کی تائید و تصدیق کی کمی محسوس ہوئی ہے۔

فروری ۹۳ء میں قادیانیت زدہ مضمون نگار م-ش نے علامہ اقبال کے حوالے سے قلم کی جو ابکائی کی ہے یہ اُن کے قدیمی و دائمی "امراضِ خبیثہ" کی علامت جدیدہ ہے۔ ہر چند کہ ادارہ ایسے مرفوع القلم لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہتا لیکن کبھی کبھی ریکارڈ کی درستگی کے لئے مذکورہ قماش کے دریدہ دھنوں کی خبر گیری کرنا از حد ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسے دو نہادوں کے لئے جناب محمد عمر فاروق کا یہ "نسخہ شافی" خاصے کی چیز ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔ اللہ کریم ایسے سرطانی مریضوں کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین)

ادارہ

محترمی ایڈیٹر صاحب روزنامہ نوائے وقت لاہور

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

گذارش ہے کہ بندہ "نوائے وقت" کا مستقل قاری ہے۔ تاریخ سے گہری شیفتگی کی وجہ سے میں م-ش صاحب کی یادداشتوں کا بغور مطالعہ کرتا ہوں۔ ریکارڈ کی درستگی کے لئے یہ چند سطور پیشِ خدمت ہیں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

م-ش صاحب نے "پدرم دھقان بود" کی ۱۳۷ ویں قسط بابت ۱۲ فروری ۱۹۹۳ء میں "علامہ کے ٹرسٹی" کے عنوان سے چودھری محمد حسین مرحوم کی خدمات پر ایک تفصیلی مضمون رقم کیا ہے۔ لیکن انہوں نے مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے ایک واضح مکتوب کے ناقابلِ تردید شواہد کو مبالغہ آمیزی کی حد تک جھٹلانا چاہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس مضمون میں انہوں نے نجانے کیوں حقائق سے چشم پوشی کرنے کی سعیٔ ناکام کی ہے۔ شاید یہ اُن کے حافظے کی کمزوری ہے۔ یا دروں خانہ مصلحتوں کا اظہار بے اختیار! بلکہ انہیں یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ علامہ اقبالؒ کی محفلوں کے رازدار ہیں اور انہیں علامہ کی خدمت کا موقع بھی میسر آیا ہے۔ آخر وہ بھی بات کہنے

بے گریز کیوں ہو جاتے ہیں؟ بیم۔ شین صاحب کے اس ناروا طرزِ عمل کی شکایت میگزین کے انہی صفحات پر ممتاز پنجابی دانشور سید سبط الحسن ضیغم اور جناب احمد محمود سعید میاں بھی کر چکے ہیں۔ محترم م۔ش سے ہماری گذارش ہے کہ اگر وہ مصلحتوں سے دامن چھڑا نہیں سکتے تو خدارا تاریخ کے اُجلے اوراق کو مسخ نہ کریں۔ حقائق مقدس ہوتے ہیں۔ صداقت اپنے اندر ایک قوت رکھتی ہے۔ جو سچائی کے دامن پر دیدہ دانستہ ڈالے گئے دبیز پردوں کو اتار پھینکتی ہے۔ "نوائے وقت" ایک قومی اخبار اور نظریۂ پاکستان کا منادی ہونے کا دعویٰ بھی رکھتا ہے۔ اس حوالے سے یہ بات "نوائے وقت" ایسے موقر جریدے کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اس کے صفحات پر روزِ روشن کی طرح واضح حقیقتوں کا مذاق اڑایا جائے۔ اور علامہ اقبال کے کروڑوں عقیدت مندوں کے جذبات مجروح کئے جائیں۔

م۔ش صاحب نے چودھری محمد حسین کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"قبلہ چودھری صاحب ان چار افراد میں شامل تھے جنہیں حضرت علامہ اقبال نے اپنے کمسن بچوں کا گارڈین مقرر کیا تھا۔ باقی تین حضرات میں حضرت علامہ اقبال کے برادرِ نسبتی خواجہ صاحب، دوسرے شیخ اعجاز احمد جو شاعرِ مشرق کے سگے بھتیجے اور تیسرے میاں طاہر الدین تھے......"

اس مختصر پیراگراف میں انہوں نے شیخ اعجاز احمد کا تذکرہ کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات اقبالیات کے ماہرین نے اپنے مکمل دلائل و براہین کے ساتھ واضح کر دی ہے کہ علامہ محمد اقبال نے اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کو قادیانی عقائد کی بناء پر اپنے بچوں کی گارڈین شپ سے علیحدہ کر دیا تھا اور سر راس مسعود کو ایک خط میں شیخ اعجاز احمد کی جگہ پر بچوں کی سرپرستی کے لئے لکھا تھا۔ گارڈین شپ سے علیحدگی کی اصل وجہ سامنے لانے کی بجائے م۔ش نے لکھا ہے کہ: "شیخ اعجاز احمد اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں میں مصروف تھے"۔ بہرحال یہ وہ حقائق ہیں جو اقبال اکادمی پاکستان کے مجلہ "اقبالیات" لاہور کے جولائی ۱۹۸۷ء کے شمارے میں جناب ڈاکٹر وحید عشرت کے قلم سے سامنے آ چکے ہیں۔ اور پھر ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت کے اوراق کی زینت بھی بن چکے ہیں۔ یہ تو تھی وہ سچائی جسے پسِ پردہ ڈالنے کے لئے نوائے وقت کا سہارا لیا گیا۔ اب سنیئے مکتوبِ اقبالؒ کی وہ حیرت ناک کہانی جس کے مرکزی کردار چودھری محمد حسین اور شیخ اعجاز احمد تھے۔ یہ مکتوب اس لئے بھی اہم ہے کہ اقبال کے نام نہاد وارث اس خط میں کتربیونت سے باز نہ آئے۔ اسی لئے خط کا اصل عکس نہ شائع کیا گیا۔ پہلے خط کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

لاہور
۱۰ جون ۱۹۳۴ء

ڈیئر مسعود۔ پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔
امید ہے تم کو مل گیا ہوگا۔ اس خط میں آپ نے بہت لکھنے کا سوال کیا۔ جواب لکھتا ہوں۔

مسٹر [redacted] وائس چانسلر کے چار [redacted]
سفارش کئے تھے۔ [redacted] اور دو امیدوار سفارش کئے گئے ہیں۔ جو سب کے سب
بہتر سے بہتر ہیں تحریر کرتا ہوں۔ تمام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ ... یہ پہلے لکھ چکا ہوں۔ جو قریباً ... سال کا تجربہ
رکھتا ہے۔ عربی انگریزی دونوں میں قابل آدمی ہے۔ (۲) چوہدری محمد حسین ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ
پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی پنجاب کے قدیم ... ہیں۔ نہایت مخلص مسلمان
(۳) شیخ اعجاز احمد ... ایل ایل بی ... جج دہلی۔ (۴) میاں عبدالغنی ... جو عیسائی
... ہیں ... (۵) ... خان صاحب میاں امیر الدین ...
... ہیں۔ (۶) شیخ ... بڑا عالم ہے۔ ...
... ہے۔ ...
... تمام مسلمان ... ہیں۔ ...
... [redacted] ...
... بہت
[redacted] ... میں ... اس کی جگہ ...
... ہوگا۔ ...
... بہت ... مگر اگر ... ایسا ہوا۔ تو ...
[redacted] ... بھی ...
... درجہ ... کسی ... ہے ... مسعود ...
... اس ... ہے۔ ...
[redacted] ... اس کو بہت ... ہے۔ ... کی ...
... ہے۔ ... کا استقلال ... ہے۔

والسلام

محمد اقبال

لاہور

۱۰ جون ۱۹۳۷ء

ڈیئر مسعود!

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار GUARDIAN مقرر کئے تھے۔ یہ GUARDIAN ازروئے وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ طاہر دین۔ یہ میرے کلرک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

۲۔ چودھری محمد حسین۔ ایم۔اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان۔

۳۔ شیخ اعجاز احمد بی۔اے، ایل۔ایل۔بی سب جج دہلی۔

۴۔ عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی کے بارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیرالدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳۔ شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے شرعاً یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا GUARDIAN ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے۔ اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو GUARDIAN مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجۂ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا۔ کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لئے بہت مفید ہے۔ یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے دوسری سیال صورت میں۔ سو مؤخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

(بحوالہ "اقبال اور ممنون حسن" ص۔۱۵۰۔ از ڈاکٹر اخلاق اثر)

علاوہ ازیں شیخ عطاء اللہ کے مرتب کردہ مجموعۂ مکاتیب "اقبال نامہ" کے ایک ہی ایڈیشن کے دو نسخوں کے درمیان اس قدر واضح فرق موجود ہے کہ یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ شعوری کوشش کے تحت علامہ اقبال کے

اس خط کے مندرجات میں تحریف سے کام لیا گیا۔ جس کا مقصد شیخ اعجاز احمد کے عقائد کے بارے میں علامہ اقبال کے تاثرات کو چھپانا تھا۔ شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں چودھری محمد حسین پر یہ الزام دیا ہے کہ: "گارڈین شپ میں ان کے حریف چودھری محمد حسین نے سیاست کرتے ہوئے علامہ محمد اقبال کی طرف سے ان کی صالیت کے سرٹیفکیٹ کو دبانے کے لئے یہ تحریف کی"۔ حالانکہ چودھری محمد حسین نے شیخ اعجاز احمد کے بارے میں متعلقہ حصہ حذف کر کے ان کے قادیانی عقیدے کے لئے فائدہ مند ہونے کی بجائے اُلٹا نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ بقول ڈاکٹر وحید عشرت: "چودھری محمد حسین نے تو شیخ اعجاز سے سیاست نہیں کی بلکہ شیخ اعجاز احمد کی گارڈین شپ محفوظ کرنے کے لئے اقبال کے خط کی عبارت کو بدل دیا۔ اور شیخ اعجاز کے عقائد اور اُن کی گارڈین شپ سے محرومی کی وجہ کو چھپا دیا ہے اور انہیں خط سے نکال کر شیخ اعجاز احمد کی خدمت انجام دی۔ اس لئے شیخ اعجاز کو تو چودھری محمد حسین کا احسان مند ہونا چاہیئے۔ حالانکہ وہ اُلٹا گلہ کر رہے ہیں کہ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز کی غیر متنازع شخصیت کو متنازع بنا دیا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گارڈین شپ میں شیخ اعجاز کو شریک رکھنا بھی مطلوب ہو سکتا ہے کہ خاندانِ اقبال کے اس فرد کو کسی نہ کسی طرح گارڈین شپ میں باقی رکھا جائے۔ تاہم نیک نیتی سے بھی کی گئی اس کتر بیونت کے اخلاقی جواز کی تفہیم نہیں ہوتی کہ جس چیز کو علامہ شرعاً مشتبہ سمجھتے تھے اس کو عبارت سے حذف کر کے مباح کرنے کی سعی کیوں کی گئی اور شیخ اعجاز کے لئے یہ نرم گوشہ کیوں پیدا کیا گیا۔

(اقبالیات" جولائی ۱۹۸۷ء)

فی الحقیقت علامہ اقبالؒ جن کے قادیانیوں کے متعلق افکار چھپے ڈھکے نہیں ہیں۔ ان کی ذات کو متنازع بنانے کی یہ کوششیں دراصل قادیانیوں کی زیرِ زمین تخریبی کارروائیوں کا ایک حصہ ہے۔ جس کے لئے انہوں نے مختلف افراد کو استعمال کیا۔ حالانکہ علامہ محمد اقبالؒ نے ۱۹۳۱ء میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے محض اس لئے استعفیٰ دے دیا تھا کہ قادیانی سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کشمیر کمیٹی کے ذریعے قادیانیت کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ اور کشمیری مسلمانوں کے مسائل اُن کا مطمحِ نظر نہ تھے۔ قادیانی مسئلہ پر ہی علامہ اقبال کی پنڈت نہرو سے خط و کتابت ہوئی۔ جو "کلکتہ ریویو" میں اشاعت پذیر ہوئی۔ جو نفسِ مضمون کے اعتبار سے علامہ اقبالؒ کے عقیدۂ ختمِ نبوت پر غیر متزلزل ایمان کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔ قادیانیوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی خوفناکی کا اندازہ انہوں نے بہت پہلے کر لیا تھا اور اپنی غیرتِ ایمانی کا برملا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"ختمِ نبوت کے معنیٰ یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے۔ اور واجبُ القتل! مسیلمہ کذاب کو اسی بناء پر قتل کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا مصدق تھا۔ اور اسکی اذان میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق تھی۔ (انوارِ اقبال ص ۴۵۔ از بشیر احمد ڈار)

اپنے ان مستحکم عقائد کی بنیاد پر علامہ اقبال یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ اُن کا قادیانی العقیدہ بھتیجا ان کی مسلمان اولاد کا سرپرست بن جائے۔ شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں اقبال کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ قادیانیوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور عمر کے آخری حصے میں وہ مجلسِ احرار کے رہنماؤں کی باتوں میں آ کر قادیانیت کے سخت خلاف ہو گئے تھے۔ حالانکہ ایسا شرمناک الزام حضرت علامہ اقبال کی شفاف شخصیت کو ا

داغدار بنانے کے مترادف ہے۔ اور ان کے عقائد و افکار پر گھناؤنا حملہ ہے۔ جبکہ اقبال ختم نبوت کے عقیدے کو جان سے زیادہ عزیز گردانتے ہیں۔ اور اس عقیدہ کو اسلام کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اور وہ زندگی کے کسی مرحلے میں بھی قادیانیت کے قریب نہیں رہے۔ رہی بات مجلسِ احرار کی تو یہ حقیقت کبھی مخفی نہیں رہی کہ حضرت علامہ محمد اقبالؒ اور مجلسِ احرار کے رہنماؤں امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور چودھری افضل حق مرحوم کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ اور علامہ مرحوم نے قادیانیت کے خلاف مجلسِ احرار کی تحریک کو تحسین کی نظروں سے دیکھا اور ہمیشہ ان کی تائید کی۔ سیاسی راہیں اگرچہ جدا ہوں لیکن وضعدار لوگ شخصی احترام اور انسانی اقدار کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ کے بعد علامہ مرحوم نے ہی حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ایماء پر مجلسِ احرار کو "تحریکِ کشمیر" چلانے کا عندیہ دیا تھا۔ اس تحریک میں پچاس ہزار سے زائد احرار رضاکاروں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ علامہ اقبالؒ ہمیشہ حق پرست علماء و مشائخ کے قریب رہے۔ اور بعض علمی مسائل و اشکالات میں ان سے مستفید ہوتے رہے۔ علامہ مرحوم نے قادیانیوں کی مخالفت عقیدہ "ختمِ نبوت" پر کامل یقین و اعتماد کی بنیاد پر کی تھی نہ کہ اس میں کسی ذاتی رنجش کو عمل دخل تھا۔ جو شخص یا جماعت علامہ کی قادیانیت دشمنی کو ذاتی اختلافات کا نتیجہ بناتی ہے وہ خود در حقیقت اقبال دشمنی کا شکار ہیں۔ علاوہ ازیں علامہ اقبال کے قادیانیوں کے بارے میں صریح و مضبوط موقف کو چھپانے سے خود علامہ مرحوم کی ذات پر حرف آنے کا اندیشہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبالیات کے ماہرین قادیانیوں اور ان کے کارپردازوں پر کڑی نظر رکھیں۔ اور مکاتیب اقبال کا ازسرِ نو جائزہ لیں اور ان کے خطوط کے مکمل عکس چھاپیں تاکہ ان میں ہونے والی بددیانتیوں اور تحریفات کو آشکارا کیا جا سکے۔ اقبال اکادمی اس اہم قومی معاملے پر ضرور توجہ کرے۔ اسی کے ساتھ م۔ش صاحب سے بھی گذارش کروں گا کہ وہ بھی روایات تحریر کرتے وقت احتیاط اور چھان پھٹک سے کام لیں اور محض اپنے حافظے و یادداشت پر انحصار کرنے کی بجائے تحقیق سے مدد لیں اور کتب و جرائد سے اپنی تحریر کو باحوالہ بنائیں۔ تاکہ مستند تاریخی روایات کا ذخیرہ مرتب ہو سکے۔ اور اصل حالات و واقعات قوم تک منتقل ہو سکیں۔ آپ کے قادیانیوں سے تعلقات اپنی جگہ لیکن للہ علامہ اقبال کا نام لے کر خرافات کے ملغوبے سے اقبال کے افکار اور عقائد کو پامال نہ کریں۔ کیا یہ بات اپنی جگہ درست نہیں ہے کہ آپ قیام پاکستان سے قبل قادیانی تنظیم انٹر کالیجیٹ مسلم برادرہڈ کے صدر نہیں رہے۔ کیا یہ بھی غلط ہے کہ ربوہ میں قادیانی سربراہوں سے آپ کی ملاقاتیں بالتزام ہوتی رہیں۔ کیا اس حقیقت کا انکشاف بھی بے موقع نہ ہو گا کہ لاہوری قادیانیوں کا ترجمان ہفت روزہ "لاہور" آپ ہی کے پریس پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپتا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود آپ کو مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال کا محافظ اور ترجمان و خدمت گار سمجھا جائے کیا اسی اقبال کا؟ جنہوں نے اپنے خطبات میں فرمایا تھا کہ: "قادیانی اسلام اور وطن دونوں کے غدار ہیں"[1]۔ "قادیانیت یہودیت کی طرف رجوع ہے"[2]۔

اور آپ ابھی تک انہیں غداروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ایں چہ بوالعجبی است

والسلام

محمد عمر فاروق (تلہ گنگ۔ ضلع چکوال)

• نقیب ختم نبوت ۱۰ اپریل ۱۹۹۳ء

۱۔ پنڈت نہرو کے نام خط ۲۱ جون ۱۹۳۶ء

۲۔ حرفِ اقبال صفحہ ۱۱۵

ہفتہ وار "پیام" اور مولانا آزاد

ڈاکٹر فیروز احمد

مولانا آزاد نے اپنی طویل صحافتی زندگی میں جن اخبارات و رسائل کی ادارت کی یا جن اخبارات کے اجراء میں بنیادی کردار ادا کیا، اُن کی فہرست لمبی ہے، لیکن اس فہرست میں چار اخبارات ایسے ہیں جو تحریک آزادی کے ایک خاص موڑ پر بہت کم وقفے سے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے، اور جن کی مجموعی مدتِ اشاعت دس برسوں سے زیادہ نہیں۔ یہ اخبارات ہیں: پیغام، الجامعہ، الہلال دورِ ثانی، اور پیام۔ ان میں پیغام ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء، الجامعہ یکم اپریل ۱۹۲۳ء اور الہلال ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو منظرِ عام پر آیا اور یہ تینوں بالترتیب ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء، مارچ ۱۹۲۳ء اور ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو شائع ہو کر بند بھی ہو گئے۔

ان میں الہلال سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو پیغام اور الجامعہ کے ساتھ مولانا آزاد کی وابستگی اس ڈائریکٹر کی ہے جو پس پردہ رہ کر اپنے منصوبوں کو قوت سے فعل میں لاتا ہے، دوسرے لفظوں میں پیغام اور الجامعہ سے مولانا آزاد کا تعلق ان اخبارات کی پالیسی کے نگراں اور محافظ کا تھا اور جب تک ان کی اشاعت جاری رہی یہ اخبارات مولانا آزاد کی مرتب کردہ پالیسی کے پابند رہے۔ تقریباً یہی صورتِ حال پیام کی بھی ہے، جس کی تقریب کے سلسلے میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، لیکن قبل اس کے کہ 'پیام' کی اشاعت اور مولانا آزاد کی اس سے وابستگی کے متعلق تفصیلات پیش کی جائیں، ایک ضمنی لیکن بے حد اہم پہلو کی طرف توجہ ضروری ہے۔

شعبۂ اُردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی جے پور

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ الہلال کے اجرائے ثانی اور پھر اس کے بند ہو جانے کے بعد مولانا آزاد صحافت سے دور ہو گئے تھے، یہ خیال درست نہیں ہے۔ الہلال کا دور ثانی جس شان سے شروع ہوا، اس کا اختتام بلا شبہ اتنا ہی حیرت انگیز ہے، لیکن اس حقیقت سے عام طور پر لوگ واقف نہیں کہ الہلال کے بند ہو جانے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد مولانا آزاد نے دہلی سے ایک نیا اخبار 'اقدام' جاری کرنے کا اعلان کیا تھا، یہ اعلان کب اور کس اخبار میں شائع ہوا اور اس کی اصل عبارت کیا تھی، ان سب کا تو علم نہیں لیکن دہلی سے ہی عبدالوحید نامی ایک شخص کا مراسلہ تاج (آگرہ) میں شائع ہوا تھا جس کے مطالعہ سے مذکورہ اعلان کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے مراسلہ نگار نے لکھا ہے :-

> "سنا گیا تھا اور اعلان بھی ہو چکا تھا کہ مولانا ابوالکلام 'اقدام' کے نام سے ایک نیا اخبار دہلی سے نکالنے والے ہیں، مگر اخبار اب تک نہیں نکلا اور مولانا بدستور کانگریس کے کاموں میں مصروف ہیں جو غالباً دسمبر تک ختم نہ ہو سکیں گے۔ ایک رہنمائے قوم کا اعلان کر کے اس طرح خاموش ہو جانا تعجب خیز ہے۔ اس وقت ہمدرد کے بند ہو جانے کے بعد 'اقدام' کی سخت ضرورت ہے[1]"

اس مراسلے میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ اعلان کسی غیر معروف شخص کی طرف سے نہیں بلکہ 'رہنمائے قوم' یعنی مولانا آزاد کی جانب سے کیا گیا تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ 'اقدام' کی اشاعت کے لئے انتخاب دہلی کا کیا گیا تھا۔ اب یہ 'اقدام' شائع ہوا یا نہیں، فی الوقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے، لیکن اس جانب توجہ ضروری ہے کہ جن ایام میں 'اقدام' کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا، ان دنوں مولانا آزاد کا قیام زیادہ تر دہلی میں ہی تھا، اور ان کی سیاسی سرگرمیاں روز افزوں تھیں، اس کا اندازہ خود مراسلہ نگار کو بھی تھا، مگر اس نے یہ چبھتی ہوئی بات لکھ دی تھی کہ "ایک رہنمائے قوم کا اعلان کر کے اس طرح خاموش ہو جانا تعجب خیز ہے" یہ ایک بڑی بات تھی اور نہ صرف اس زمانے میں سیاسی حالات سے باخبر اشخاص بلکہ آج بھی مولانا آزاد کے تقریباً تمام ناقدین اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ رانچی کی نظر بندی سے رہائی کے بعد مولانا آزاد نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لینے کا فیصلہ کیا

---

[1] تاج ص ۱۶ مطبوعہ ۷؍ جون ۱۹۲۹ء

تھا، مگر یہ سیاست سے زیادہ دینی فرض کی ادائیگی کا جذبہ تھا جو مولانا آزاد کو ایک بار پھر سیاست کی راہ پر لے آیا۔ ۱۹۲۹ء تک وہ اس راہ پر چل کر بہت دور آچکے تھے، ان کے عزم وارادے نیز اصابتِ رائے نے ساتھ چلنے والوں کے دلوں میں انکے لیے عزت واحترام کا جو جذبہ پیدا کیا، اسکا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جولائی ۱۹۲۹ء میں وہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے صدر اور اس کے اگلے ہی سال کانگریس کے قائم مقام صدر منتخب ہوئے۔ اس زمانہ تک تحریکِ آزادی جن مراحل میں داخل ہو چکی تھی، اس کا مزید اندازہ اس سے ہوگا کہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں 'مکمل آزادی' کی تجویز منظور ہو چکی تھی اور یہ فیصلہ بھی کیا جاچکا تھا کہ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو پورے ملک میں 'یوم آزادی' منایا جائیگا۔ اس طرح قائم مقام صدر کی حیثیت سے مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات دوچند تھیں، بقولِ شاعرے

اس وقت ہیں آپ مسند آرائے وطن
اور آپ کے قبضہ میں ہے فردائے وطن
کچھ سوچئے تدبیر سکونِ منزل
اترے گا کہاں محملِ لیلائے وطن

اس پس منظر میں تاج کی ایک چھوٹی سی خبر ملاحظہ فرمائیے:

"دہلی۔ ۱۱ اگست، مولانا ابوالکلام آزاد صدر انڈین نیشنل کانگریس آج صبح پنجاب میل سے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا دفتر اب کلکتہ میں رہے گا۔" لہ

الہلال بند ہو چکا تھا۔ 'اقدام' اعلان کے باوجود اگست ۱۹۲۹ء تک نہیں نکل سکا اور مولانا آزاد بعض سیاسی اسباب کی بناپر دہلی سے کلکتہ منتقل ہو گئے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نئے اخبار یا رسالے کے نکالنے کا ارادہ انہوں نے ترک نہیں کیا، خصوصاً اس صورت میں کہ اب وہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے قائم مقام صدر بھی تھے۔ چنانچہ وہ اسباب موجود تھے، جن کے پیشِ نظر ایک نیا اخبار نکالا جاسکتا تھا۔ یہی اخبار مولانا آزاد کی کلکتہ آمد کے بعد 'پیام' کی صورت میں سامنے آیا۔

اس مقام پر اُن غلط بیانیوں کی طرف توجہ ضروری ہے، جو 'پیام' کے متعلق اب تک رائج ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ابوسلمان شاہجہاں پوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"...مولانا آزاد نے ۱۹۲۷ء میں 'پیام' کے نام سے ایک اخبار کلکتہ سے جاری کیا تھا۔

لہ تاج ص ۱۱، ۱۲ اگست ۱۹۳۰ء

اس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری کا خیال ہے کہ "پیام جنوری ۱۹۲۷ء کے بعد نکلا اور جون ۱۹۲۷ء میں جب الہلال نکلا تو پیام اس سے پہلے بند ہو چکا تھا۔"[1]

ابو سلمان شاہجہاں پوری اور ان کی تائید میں ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ کہنا کہ پیام جنوری ۱۹۲۷ء کے بعد نکلا اور جون ۱۹۲۷ء میں الہلال کے اجراء ثانی سے قبل بند ہو چکا تھا، صریحاً غلط ہے، اسکے علاوہ یہ بات بھی مشتبہ معلوم ہوتی ہے کہ پیام کے مدیر عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ اس قسم کے بیانات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ابو سلمان شاہجہاں پوری کی نظر سے پیام کا ایک بھی شمارہ نہیں گذرا اور انہوں نے غیر محققانہ طور پر ایک ایسا فیصلہ صادر کر دیا جس کی صحت ہر لحاظ سے مشکوک ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ پیام کا اجراء الہلال کے بند ہو جانے کے تقریباً ۳ برس بعد عمل میں آیا، اس درمیان جیسا کہ مذکور ہوا، دہلی سے 'اقدام' نکالے جانے کا اعلان ہو چکا تھا، مگر بعض وجوہ سے 'اقدام' کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی، لیکن بعد ازاں اقدام کا نعم البدل پیام کی صورت میں ظاہر ہوا۔

پیام کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا، اس کا قطعی جواب دینے سے قبل درج ذیل 'اشتہار' کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ منیجر پیام کی جانب سے اخبارات کو جاری کیے گئے اس اشتہار میں کہا گیا ہے کہ:

"پیام ہفتہ وار مصور ملک کے مشہور اخبار نویسوں کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مرحوم پیغام اور الہلال کو جو قلم مرتب کرتے تھے، وہی اب 'پیام' کے صفحات پر گل افشانی کر رہے ہیں، اگر آپ کو اخبار بینی کا صحیح ذوق ہے تو 'پیام' بہت پسند آئے گا۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ 'پیام' آزادی کا علم بردار اور اعلانِ حق میں بیباک ہے۔ ہر اشاعت میں مزین تصاویر کے ساتھ نہایت مفید اور دلچسپ مضامین شائع ہوتے ہیں۔

پتہ منیجر پیام نمبر ۱، تاراچند اسٹریٹ کلکتہ"[2]

پیام کے اس اشتہار سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہفتہ وار مصور اخبار تھا اور اس کی ادارت میں پیغام اور الہلال کے مرتبین شامل تھے۔ (پیغام کے مرتب مولانا ملیح آبادی اور الہلال کے مرتب خود مولانا آزاد تھے) دوسرے لفظوں میں اشتہارِ بالا کی رو سے پیام کی ترتیب و تہذیب میں دونوں اہلِ قلم شریک

---

[1] مولانا آزاد شخصیت اور کارنامے ص ۱۰۱ از ناشر اردو اکیڈمی دہلی ۱۹۸۶ء۔ [2] تاج ص ۱۸۔ ۷ و ۱۴ رجون ۱۹۳۱ء۔

تھے، یہ اگرچہ قرینِ قیاس ہے لیکن پیام کے جو شمارے اس وقت پیشِ نظر ہیں اور جن کی تفصیلات حسبِ موقع درج کی جائیں گی۔ ان پر نہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا نام ہے اور نہ ہی مولانا آزاد کا، اس کے برخلاف ایک غیر معروف شخص ملّا جان محمد کا نام بطور ایڈیٹر جلد ۲ کے شمارہ نمبر ۱۰ مطبوعہ ۱۶ مارچ ۱۹۳۱ء پر تحریر ہے، اور اس سے قبل یعنی جلد ۲ کے شمارہ ۹ مطبوعہ ۹ مارچ ۱۹۳۱ء پر یہ نام بھی موجود نہیں، چونکہ پیام کے مذکورہ دونوں شماروں کے علاوہ مجھے ماقبل یا مابعد کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہو سکا اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ پیام کے ابتدائی شماروں پر بطور مدیر کس کا نام درج تھا۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری نے اس سلسلہ میں قطعیت کے ساتھ عبدالرزاق ملیح آبادی کو پیام کا مدیر قرار دیا ہے لیکن مندرجہ بالا اشتہار کی رو سے اس بیان میں قباحت یہ ہے کہ جو دلیل مولانا عبدالرزاق کے مدیر ہونے کے حق میں دی جا سکتی ہے اس کا اطلاق مولانا آزاد کے سلسلہ میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب کسی اخبار یا رسالے کے مدیر کی تعداد بیک وقت دو تو ہو نہیں سکتی، اس لئے پیام کے ابتدائی ۹ شماروں تک ادارت کے فرائض کس نے انجام دیئے، یہ مسئلہ پھر بھی تحقیق طلب ہے۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ پیام ہفتہ وار مصوّر اخبار تھا، اس کے جو دو شمارے فی الوقت ہمارے پیشِ نظر ہیں، وہ اردو ریسرچ سینٹر حیدرآباد میں موجود ہیں۔ میں ذاتی طور پر عبدالصمد صاحب مالک اُردو ریسرچ سینٹر حیدرآباد کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس سے استفادے کا موقع عنایت فرمایا۔

پیام کے یہ دونوں شمارے مارچ ۱۹۳۱ء کی ۹ اور ۱۶ تاریخ کو شائع ہوئے۔ ان تاریخوں کو ذہن میں رکھا جائے تو بقیہ ۸ شمارے جنوری اور فروری میں شائع ہوئے ہوں گے اور اس اعتبار سے جنوری ۱۹۳۱ء کو بہ آسانی پیام کی اشاعت کا سال قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس میں ایک بڑی الجھن یہ ہے کہ جو شمارے اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں ان پر جلد ۲، تحریر ہے اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پیام کا اجراء جنوری ۱۹۳۱ء سے قبل عمل میں آیا ۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پیام ہفتہ وار اخبار ضرور تھا، مگر اس کی اشاعت وقتِ مقررہ پر اور مسلسل نہیں تھی یعنی اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ مارچ کے مذکورہ شماروں سے قبل پیام کے بعض شمارے وقت پر نہ نکل سکے ہوں۔ مثلاً اگر جنوری ۱۹۳۱ء کو پیام کی اشاعت کا سال قرار دیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جنوری کی ۷، ۱۴، ۲۱ اور ۲۸ کو پیام شائع ہوا ہوگا، مگر شواہد کی روشنی میں ایسا نہیں ہے۔

۱۶ر مارچ ۱۹۳۱ء کو پیام میں 'بصائر' کے تحت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی کسی غیر مطبوعہ تصنیف کے کچھ حصے "مسلمانوں سے وعدۂ الٰہی کس صورت میں پورا ہوگا" کے عنوان سے شائع کرتے ہوئے ایڈیٹر ملا جان محمد نے جو مختصر نوٹ تحریر کیا ہے، اس کی ابتدائی سطور ہی قابل لحاظ ہیں، ایڈیٹر نے لکھا ہے:

"۱۸ر جنوری کے پیام میں ملیح آبادی صاحب کی ایک قلمی کتاب کے بعض حصے شائع کیے گئے تھے، جن میں صرف کلام اللہ کی آیات کا ترجمہ تھا۔"[1]

اسی طرح ۹ر مارچ ۱۹۳۱ء کے شمارے میں "پیام کی قیمت میں تخفیف" کا اعلان کرتے ہوئے ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ:

"جب سے 'پیام' کی قیمت میں اضافہ کیا گیا ہے، بکثرت بھائی التجا کر رہے ہیں کہ قیمت کم کی جائے کیونکہ انھیں ۱/ آنہ ادا کرنا شاق گذرتا ہے، اس طرح کی درخواستیں کلکتہ سے لیکر پشاور تک سے آئی ہیں، مجبوراً فیصلہ کیا گیا ہے کہ قیمت کم کرکے حسب سابق ایک آنہ کر دیا جائے اور صفحے بھی ۱۶ کر دیے جائیں۔ ہم نے یہ قربانی قبول کرلی ہے۔

اب قارئین کے ذمہ ہے کہ دفتر کی مالی مشکلات کا خاتمہ نئے خریدار بہم پہنچا کر کردیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ جلد اسی قیمت کے صفحات بڑھادیں۔"[2]

اس ضمن میں پیام کے معاصر تاج میں شائع شدہ ایک اشتہار کا مطالعہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا یہ اشتہار پیام کے 'عید نمبر' سے متعلق ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:

"پیام کا عید نمبر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوگا، جس میں علاوہ صدہا مختلف دلچسپ مضامین کے تقریباً آٹھ صفحوں پر بے شمار رنگین تصاویر اور نظر فریب کارٹون شائع ہوں گے۔ یہ نمبر بہت بڑی تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ تاجر پیشہ حضرات کے لئے اپنی تجارت فروغ دینے کا یہ زریں موقع ہے۔"[3]

اب ان شواہد کا تجزیہ کیا جائے تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱. جنوری کی مقررہ تاریخوں میں سے کم از کم ایک تاریخ ایسی ہے جب پیام وقت پر شائع نہیں ہوا، ۹ر اور ۱۶ر مارچ کے پیام کی صورت بھی یہی ہے۔

---

[1] پیام ص ۶، نمبر ۱۰ر جلد ۲ر ۱۶ر مارچ ۱۹۳۱ء۔ [2] پیام ص ۳۔ نمبر رجلد ۲۔ ۹ر مارچ ۱۹۳۱ء۔
[3] تاج ص ۱۸، ۲۸ر جنوری ۱۹۳۱ء۔

۲۔ کسی ایسے اخبار کا جو وقت مقررہ پر کم نکلتا ہو، اس کی قیمت میں اضافہ کرنا اور پھر قارئین کے اصرار پر نہ صرف قیمت میں کمی کا اعلان کرنا بلکہ اخبار کے صفحات میں اضافے کا وعدہ بھی کرنا، اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ اخبار کو نام و نمود حاصل ہو چکا تھا۔

۳۔ اس نام و نمود کے ساتھ اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اخبار نے 'خاص نمبر' کا اعلان کیا اور تاجر پیشہ حضرات کو متوجہ کیا کہ وہ اخبار میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں[1]۔ واضح ہے کہ یہ اشتہار اواخر جنوری میں شائع ہوا تھا۔ اگر اس سے پیشتر اخبار ہم عصر صحافت میں اپنی جگہ نہ بنا چکا ہوتا تو چند شماروں کے بعد ہی کسی خاص نمبر کا اعلان بے معنی معلوم ہوتا۔

اِن مباحث کی روشنی میں جنوری ۱۹۳۱ء میں پیام کا اجرا مشتبہ معلوم ہوتا ہے اور قیاس غالب ہے کہ اس کی اوّلین اشاعت نومبر کے وسط یا دسمبر[2] کے اوائل میں عمل میں آئی ہوگی۔ اب اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو مارچ کے شماروں میں درج جلد۔ ۲، کی معنویت سمجھ میں آجاتی ہے۔ یعنی نومبر یا دسمبر میں اس کا جو شمارہ یا شمارے شائع ہوئے، انھیں جلد اوّل کے تحت شمار کیا گیا اور چونکہ جنوری سے نیا سال شروع ہو چکا تھا، اس لیے اس کے بعد کے شماروں پر جلد۔ ۲ لکھا گیا۔

---

[1] ۲۶ مارچ کے پیام سے معلوم ہوتا ہے کہ 'پیام' کا عید نمبر اپنی خصوصیات کے لحاظ سے 'مقبول' ہو چکا تھا۔
[2] ایک امکان یہ بھی ہے کہ اگست ۱۹۳۰ء میں مولانا آزاد کی گرفتاری سے قبل پیام جاری ہوا ہو، اور ان کی گرفتاری کے بعد اس کی اشاعت میں دشواریاں پیدا ہو گئی ہوں۔

(نخلستان، جنوری۔ مارچ ۹۳ء)

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ

الفاظ "انجیل، تورات اور زبور"
کی
لغوی تحقیق

[ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ (۱۹۰۱ء - ۱۹۷۹ء) ماضی قریب کے ان اہل علم میں سے تھے جو اپنی علمی زندگی کے آغاز میں ہی "ہفت زبان" عالم کی حیثیت سے معروف ہو گئے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ وہ مغربی زبانوں میں سے انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور ہسپانوی جانتے تھے۔ ان مغربی زبانوں کے علمی سرمائے سے انھوں نے نہ صرف اپنی تحقیقی کاوشوں میں استفادہ کیا بلکہ ان زبانوں میں شائع شدہ بعض مقالات کو اردو میں بھی منتقل کیا۔ اطالوی مستشرق پرنس کایتانی کی مرتبہ "تاریخ اسلام" کا دیباچہ ان کی کاوش سے ہی اردو دان طبقہ پڑھ سکا تھا۔

مشرق و مغرب کی متعدد زبانیں جاننے کے باعث انہیں الفاظ کی تحقیق اور اشتقاق سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا اظہار یوں تو ان کی اکثر تحریروں سے ہوتا ہے تاہم زندگی کے آخری آٹھ دس برسوں میں یہ موضوع، بالخصوص، ان کے غور و فکر کا مرکز رہا۔ فروری تا ستمبر ۱۹۷۰ء کے "اورینٹل کالج میگزین" (پنجاب یونیورسٹی - لاہور) میں ان کا ایک طویل مقالہ "تحقیق اللغات" شائع ہوا، جو بعد میں حذف و اضافہ اور ترتیب کی مناسب تبدیلیوں کے ساتھ ماہنامہ فکر و نظر (اسلام آباد) [بابت دسمبر ۱۹۷۱ء و جون ۱۹۷۲ء] میں اشاعت پذیر ہوا۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے مزید الفاظ کی لغوی تحقیق اور اشتقاق کا کام جاری رکھا اور اس سلسلے کا ایک اور مضمون فروری و مئی ۱۹۷۶ء کے "اورینٹل کالج میگزین" میں پہلے مقالے کے تکملہ و تتمہ کے طور پر شائع ہوا۔

ماہنامہ "فکر و نظر" میں شائع شدہ مقالے میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے ابتداً مفسرین کرام کے درمیان موجود اس اختلافِ نظر پر بحث کی ہے کہ آیا قرآن مجید میں عجمی زبانوں کے قرآنی الفاظ موجود ہیں یا نہیں اور پھر عجمی زبانوں کے ۲۴ الفاظ کی لغوی تحقیق پیش کی ہے۔ آئندہ صفحات میں

ڈاکٹر مرحوم کے مقالے کا ابتدائی حصہ اور تین الفاظ — انجیل، تورات اور زبور — کے بارے میں ان کی تحقیق پیش کی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں عجمی الفاظ کے استعمال کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے، تعصب سے خالی نہیں۔ غیر مسلم مستشرقین کے تعصب کی کیفیت تو دوسری ہے، خود مسلمان اہل علم بھی بعض اوقات زبان کے تعصب کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس موضوع پر متعدد کتب اور مقالات لکھے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

* آرتھر جیفری، The foreign Vocabulary of the Quran، بڑودہ: اورینٹل انسٹی ٹیوٹ (۱۹۳۶ء)

* شوکت سبزواری، قرآن میں عجمی الفاظ، ماہنامہ فکر و نظر (اسلام آباد)، اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۶۶۳ - ۶۷۳

* علی محسن صدیقی، قرآن میں غیر عربی الفاظ کی حقیقت، ماہنامہ چراغ راہ (کراچی)، مئی ۱۹۶۸ء، ص ۴۳ - ۵۳ —— مدیر

آیا قرآن شریف میں عجمی الفاظ پائے جاتے ہیں یا وہ "عربی مبین" ہونے کی حیثیت سے غیر زبانوں کے الفاظ سے بالکل پاک ہے، اس مسئلہ پر آئمہ اسلام دو گروہوں میں منقسم ہیں اور انہوں نے اپنی اپنی رائے کے حق میں بہت سے دلائل دیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عکرمہ اور مجاہد اس بات کے قائل تھے کہ قرآن پاک میں عجمی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور انہوں نے متعدد الفاظ مثلاً سجیل، مشکوٰۃ اور یم کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہ عجمی ہیں۔ بعض دیگر مفسرین بھی اس بات میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے کہ قرآن میں عجمی الفاظ کے وجود کا اعتراف کریں۔ کیوں کہ ان کی یہ رائے ہے کہ جو عجمی الفاظ معرب بن جائیں اور عربی قالب میں ڈھال لیے جائیں، ان کا استعمال مخل فصاحت نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ عسیر الفہم نہیں رہتے بلکہ قریب الفہم بن جاتے ہیں۔

لیکن اس قول کے برعکس بہت سے آئمہ مثلاً امام شافعی، امام ابن جریر طبری، ابو عبیدہ، معمر بن مثنیٰ، قاضی ابو بکر باقلانی اور ابن فارس قزوینی (م ۳۹۵ھ) قرآن پاک میں عجمی کلمات کے منکر ہیں۔ ان کی بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اس کی زبان "عربی مبین" ہے اور وہ ایسی واضح زبان میں نازل ہوا ہے کہ جس کو عرب لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔

انا جعلنٰہ قرءٰنا عربیا (الزخرف: ۳)

اس کے علاوہ خداوند کریم فرماتا ہے:

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم (ابراہیم: ۴)

ان کے دیگر ہم خیال علماء نے بھی یہ دلیل پیش کی ہے کہ قرآن میں عجمی الفاظ کے وجود کو تسلیم کرنے سے عربی زبان پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ ناقص اور نامکمل ہے اور آسمانی پیغام کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے اپنے پیغام کے لیے ایسی زبان اختیار کی جو سب زبانوں سے

اکمل ہے اور ادائے مطلب کے لیے نبطی، فارسی اور سریانی زبانوں کی محتاج نہیں ہے۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ "اگر قرآن میں غیر عربی الفاظ آئے ہیں تو اس سے یہ شبہ پیدا ہوگا کہ عربی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں نامکمل ہے۔"

امام طبری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ کی تفسیر میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ابن عباسؓ اور دوسرے مفسروں نے بعض الفاظ کو فارسی اور بعض کو حبشی یا نبطی بتایا ہے، تو دراصل یہ الفاظ کا توارد اور توافق ہے یعنی عربوں، ایرانیوں اور حبشیوں نے یکساں الفاظ کو اتفاقاً استعمال کیا ہے لیکن امام ممدوح کی یہ توجیہ تسلی بخش نہیں ہے کیوں کہ سینکڑوں الفاظ کے متعلق متعدد قوموں کا توارد، تجربہ اور قیاس کے خلاف ہے۔

ابو منصور ثعالبی (م ۴۲۹ھ) نے کتاب الجواہر میں اس مسئلہ کو یہ کہہ کر سلجھانے کی کوشش کی ہے کہ

"قرآن مجید "مبین" یعنی صاف اور واضح زبان میں نازل ہوا ہے اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو عربی نہ ہو یا جسے کسی غیر زبان کی مدد کے بغیر سمجھا نہ جاسکے۔ قدیم عربوں کے شام اور حبشہ کے ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے اور وہ ان ملکوں کا سفر کیا کرتے تھے۔ انہوں نے عجمی کلمات اخذ کر لیے لیکن ان میں کچھ تبدیلیاں کر دیں مثلاً بعض حروف کو گرا دیا اور بعض عجمی الفاظ میں جو ثقالت تھی، اسے دور کیا اور پھر ان الفاظ کو اپنی شاعری اور گفتگو میں استعمال کیا۔ چنانچہ اس طرح سے وہ الفاظ خالص عربی الفاظ کی مثل بن گئے اور ان کے لٹریچر کے علاوہ قرآن میں بھی استعمال ہوئے۔ لہذا حقیقت یہ ہے کہ الفاظ پہلے عجمی تھے لیکن جب عربوں نے ان سے کام لیا اور ان کو معرب بنا لیا تو وہ الفاظ عربی بن گئے۔"

امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے بھی تقریباً اسی رائے کا اظہار کیا ہے اور "اتقان" میں اس بحث کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے۔

"میرے نزدیک صحیح رائے وہ ہے جس سے دونوں قولوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ الفاظ اپنی اصل کے لحاظ سے عجمی ہیں لیکن جب وہ عربوں کے استعمال میں آئے اور انہوں نے ان کو معرب بنا لیا اور ان کو تبدیل کر کے اپنے الفاظ کی صورت دے دی تو وہ الفاظ عربی بن گئے اور جب قرآن نازل ہوا تو یہ الفاظ عربوں کے کلام میں مخلوط ہو چکے تھے۔ لہذا جو شخص یہ بات کہے کہ یہ الفاظ اپنی موجودہ معرب صورت میں عربی ہیں، تو وہ بھی سچا ہے اور جو شخص یہ کہے کہ وہ الفاظ اپنے اصل ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں تو وہ بھی سچا ہے۔"

ابو منصور جوالیقی (م ۵۳۹ھ) اور ابن الجوزی بغدادی (م ۵۹۸ھ) اور دیگر علماء کے اقوال بھی اسی قول کے قریب قریب ہیں۔

[انجیل، تورات اور زبور ایسے قرآنی الفاظ ہیں] --- جن کے متعلق اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ اپنے اصلی ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن معرب بننے کے بعد عربی زبان کا جزو بن گئے ہیں اور قرآن پاک نے ان کو جس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبول ﷺ

کے اولیں مخاطب ان کے مفہوم و معنی سے بخوبی واقف تھے اور ان کا استعمال قرآن پاک کی زبان کے "مبین" ہونے میں کسی طرح حارج و حائل نہ تھا۔

انجیل

قرآن مجید کی رو سے انجیل وہ آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ انجیل کا لفظ قرآن پاک کی چھ مختلف سورتوں میں بارہ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ المائدہ میں انجیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ

(ہم نے ان انبیاء کے بعد قدم بقدم حضرت عیسیٰ فرزند مریم کو بھیجا۔ جس نے پیش نظر تورات کی تصدیق کی اور ہم نے اسے انجیل دی۔ اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔)

قرآن پاک کے باقی مقامات میں بھی جہاں کہیں انجیل کا ذکر آیا ہے، اسی طور پر ایک الہامی کتاب کی حیثیت سے آیا ہے۔ لیکن جو انجیل آج کل عیسائیوں کے ہاں متداول ہے، وہ ایک انجیل نہیں بلکہ چار الگ الگ کتابیں ہیں جن میں سے ہر ایک انجیل کہلاتی ہے اور اپنے مولف کی طرف منسوب ہے۔ ان اناجیل اربعہ کو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا نے (علماء مغرب کی تحقیق کے مطابق) حضرت مسیح علیہ السلام کے تقریباً ایک سو سال بعد تالیف کیا تھا۔ ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے چند متفرق واقعات اور ان کے معجزات و کرامات کا ذکر آیا ہے۔ اور ان کے علاوہ ان کی تعلیم و تلقین بھی شامل ہے جو بیشتر وعظ و نصیحت کی صورت میں ہے اور جس میں پہاڑی والے وعظ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

بعض عرب علماء نے [لفظ] انجیل کو عربی قرار دیا ہے اور اسے مادہ "نجل" سے مشتق کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن قاضی بیضاوی نے اس قول کو قبول نہیں کیا۔ ابو منصور جوالیقی اور شہاب الدین احمد خفاجی نے بھی انجیل کو معرب بتایا ہے لیکن انہوں نے اس عجمی لفظ کی نشان دہی نہیں کی جس کی تعریب کی گئی ہے۔ ابوالسعادات ابن الاثیر جزری نے "النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر" میں لکھا ہے کہ یہ کلمہ عبرانی ہے یا سریانی یا عربی۔ علامہ زبیدی صاحب تاج العروس نے بھی علماء لغت کے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ انجیل کو عبرانی کہتے ہیں، بعض سریانی اور بعض عربی۔ لیکن انہوں نے اس بارے میں خود کوئی قطعی بات نہیں کہی۔ علماء لغت کے نزدیک قول راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کسی غیر زبان کا لفظ ہے جسے معرب کیا گیا ہے لیکن وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے اور اس کی اصلی صورت کیا تھی۔

لفظ انجیل کے بارے میں مغربی علماء کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دراصل یونانی کلمہ Euaggelion ہے جو عبرانی یا ارامی کے توسط سے عربی میں آیا ہے۔ اس کے لغوی معنی بشارت ہیں اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اور ان کے پیغام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مروجہ اناجیل کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے پیغام کو آسمانی بشارت کہتے تھے جسے انہوں نے الجلیل اور فلسطین کے دیگر شہروں اور قوموں میں چل پھر کر سنایا اور اپنے حواریوں سے بھی کہا کہ "جاؤ! اور لوگوں کو خوش خبری دو کہ آسمانی بادشاہت کا وقت قریب آپہنچا ہے۔" لوقا کی انجیل (باب چہارم) میں لکھا ہے کہ ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام شہر ناصرہ میں یہودیوں کی عبادت گاہ میں گئے اور اشعیا نبی کی کتاب کھول کر یہ عبارت پڑھی کہ "خدا کی روح مجھ پر غالب ہے، کیوں کہ اس نے مجھ کو مسیح کہا تاکہ میں مساکین کو یہ بشارت سناؤں کہ اس نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں دل شکستہ لوگوں کو شفا دوں، اسیروں کی آزادی کی منادی کروں، جو اندھے ہیں ان کو بینائی عطا کروں اور جو مظلوم ہیں ان کو آزاد کروں۔" چوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی تعلیم اور اپنے پیغام کو بشارت سے تعبیر کیا ہے، اس لیے وہ کتاب بھی جس میں ان کی سیرت اور ان کی تعلیم مدوّن اور محفوظ ہوئی، انجیل یعنی بشارت کہلائی۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اہل وطن کی زبان ارامی تھی، پھر ان کے پیغام کے لیے ایک یونانی لفظ کیوں مروج ہوا۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت مسیح کے زمانہ میں فلسطین اور مشرق وسطیٰ کے اکثر ملکوں میں کئی صدیوں سے یونانی ایک علمی زبان کی حیثیت سے رائج چلی آرہی تھی اگرچہ قدیم یونانی قوم کی حکومت زوال پذیر ہوچکی تھی لیکن ان کے علوم کا سکہ جاری تھا اور ان کی زبان کا علمی تسلط بہت سے ملکوں پر ہنوز قائم تھا لہٰذا حضرت مسیح کے حواریوں اور مبلغوں نے اپنے دین کی اشاعت کے لیے اسی عالمگیر علمی زبان سے کام لیا چنانچہ اناجیل اربعہ جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات زندگی اور عقائد مندرج تھے، یونانی ہی میں لکھی گئیں اور چونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے پیغام کو بار بار بشارت کہا تھا اس لیے وہ انجیل کے نام سے موسوم ہوئیں جس کے معنی خوش خبری کے ہیں۔

انگریزی زبان میں انجیل کے لیے گاسپل (Gospel) کا جو لفظ مستعمل ہے، اس کے معنی بھی بشارت ہیں۔ گاسپل گویا انجیل کا لفظی ترجمہ ہے۔ انگریزی لفظ Evangel بھی مذکورہ بالا یونانی کلمہ سے ماخوذ ہے چنانچہ اناجیل کے مؤلفین Four Evangelists کہلاتے ہیں۔

تورات

قرآن پاک کی رو سے تورات وہ الہامی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھی۔

تورات کا لفظ قرآن پاک میں اٹھارہ مرتبہ آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں ہے۔

اِنَّا اَنزَلنَا التَّورٰةَ فِيهَا هُدًى وَّ نُورٌ يَحكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ اَسلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبّٰنِيُّونَ وَالاَحبَارُ بِمَا استُحفِظُوا مِن كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوا عَلَيهِ شُهَدَاءَ

(ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ فرماں بردار پیغمبر اسی کے مطابق یہود کے مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں اور ان کے عالم اور فقیہ بھی جو اللہ کی کتاب کے نگہبان ہیں اور اس کے شاہد ہیں۔)

تورات ایک عبرانی لفظ ہے جس کے لغوی معنے شریعت یا قانون (Law) کے ہیں۔ انگریزی میں تورات کو Torah کہتے ہیں۔

ہمارے بعض علماء نے تورات اور انجیل کو وری اور نجل سے مشتق بتایا ہے لیکن علامہ زمخشری نے اس قول کو قبول نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں اور تکلف سے کام لے کر ان کو وری اور نجل سے مشتق بتانا اور ان کا وزن تفعلہ اور افعیل قرار دینا صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب یہ دونوں لفظ عربی ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً پندرہ سو سال پیشتر کا ہے۔ اس دوران میں بنی اسرائیل پر بہت سے مصائب آئے اور طاقت ور ہمسایہ قوموں اور سلطنتوں نے ان پر کئی بار حملہ کیا اور ان کے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ ان انقلابات میں تورات بھی کئی بار برباد ہوئی لیکن بنی اسرائیل نے اسے ہر بار از سرِ نو مرتب کیا۔ علماء کا اندازہ ہے کہ تورات اپنی موجودہ صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً آٹھ سو سال پیشتر مرتب ہوئی تھی۔

جو تورات آج کل یہودیوں کے ہاں متداول ہے، وہ ذیل کی پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ سفر التکوین (کتاب پیدائش) جس میں پیدائش عالم سے لے کر حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے تک کے حالات مذکور ہیں۔

۲۔ کتاب الخروج جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور فرعون کے پنجۂ ستم سے نجات پانے کی کیفیت مندرج ہے۔

۳۔ الاحبار

۴۔ العدد

۵۔ التثنیہ میں حضرت موسیٰ کی بقیہ زندگی کے حالات اور ان کی لائی ہوئی شریعت کی تفصیلات ہیں۔

مذکورہ بالا پانچ کتابوں کو انگریزی میں Books of Moses کہتے ہیں اور سورۃ اعلیٰ میں جن "صحفِ موسیٰ" کا ذکر آیا ہے ان سے شاید یہی کتابیں مراد ہیں۔ مغربی علماء کے ہاں ان کے لیے Pentatench کی اصطلاح بھی رائج ہے جس کے لفظی معنی "کتبِ خمسہ" ہیں۔

زبور

ازروئے قرآن مجید زبور وہ الہامی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد پر نازل کی تھی۔ قرآن پاک میں زبور کا ذکر حضرت داؤد کے تعلق سے تین بار آیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔
وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا یعنی ہم نے داؤد کو زبور دی۔ اور یہی الفاظ سورۃ النساء میں بھی آئے ہیں۔

اس کے علاوہ سورۃ الانبیاء میں بھی زبور سے ایک اقتباس منقول ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ
(اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھا ہے کہ بے شک زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔)

جیسا کہ جوہری نے "صحاح" میں لکھا ہے زبور کے معنی کتابت یعنی لکھنے کے ہیں اور زبر (کسرہ

کے ساتھ) کتاب کو کہتے ہیں، جس کی جمع زبور آتی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ زبور زبر (فتحہ کے ساتھ) سے مشتق ہے اور وہ فعول کے وزن پر ہے اور مفعول کے معنے میں آیا ہے۔

قرآن پاک میں جمع کا صیغہ زبر (ضمہ کے ساتھ) چند بار الہامی کتابوں کے معنے میں آیا ہے اور ان آسمانی نوشتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جن میں انسانی اعمال لکھے جاتے ہیں، لیکن اصطلاحی طور پر زبور سے مراد وہ الہامی کتاب ہے جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے یروشلم کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اس کے قریب صیہون (Zion) کی پہاڑی پر ایک عالی شان خیمہ نصب کیا جہاں قربانی دی جاتی تھی اور اللہ کی عبادت کی جاتی تھی۔ انھوں نے

اس معبد میں خدا کی حمد و ثنا کے لیے سینکڑوں آدمی مقرر کیے۔ حضرت داؤد (خود بھی خوش گلو تھے اور خدا کی تعریف میں ترانے گاتے تھے اسی لیے آج تک لحن داؤدی ضرب المثل ہے۔

آج کل یہود کے مقدس مذہبی نوشتوں میں داؤد کے ترانے بھی شامل ہیں جن میں خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء کی گئی ہے۔ ان کو عبرانی میں مزامیر داؤد اور انگریزی میں Psalms of David کہتے ہیں۔ ان مزامیر کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔

حواشی

۱۔ بحوالہ الاتقان للسیوطی، جلد اول ص ۲۱۵

۲۔ علمائے لغت کی اصطلاح میں معرّب کسی عجمی زبان کا وہ کلمہ ہے جسے عربی میں اختیار کرتے وقت حروف کی کمی بیشی یا تبدیلی کے بعد عربی قالب میں ڈھال لیا جائے اور اسے عربی الفاظ کی شکل و صورت دے دی جائے۔

۳۔ الاتقان فی علوم القرآن، فصل فیما وقع لغیر لغۃ العرب

عالم اسلام اور عیسائیت - جنوری ۱۹۹۳ء

سلیم الدین قریشی

"مرآۃ القدس" یا "داستان مسیح"

[مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی اور مذہبی آزاد خیالی و وسیع المشربی کی بنیاد پر گوا کے جیسوٹ پادریوں کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی تاکہ ان کے مذہبی افکار سے آگاہ ہو سکے۔ معاصر مؤرخین نے اکبر کے دربار میں تین مسیحی جماعتوں کے آنے کا ذکر کیا ہے۔ پہلی جماعت ۱۵۸۰ء میں آئی، دوسری ۱۵۹۱ء اور تیسری ۱۵۹۵ء میں وارد ہوئی۔ تیسری اور آخری جماعت میں شامل پادری جیروم زیویر یا زیر نیموشویر (۱۵۴۹ء - ۱۶۱۷ء) اپنے علمی کام کی وجہ سے اہلِ تحقیق کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

یورپ کی "تحریکِ اصلاحِ مذہب" کے بالمقابل کیتھولک نقطۂ نظر کی تائید و تبلیغ کے لیے ۱۵۳۹ء میں اگنیشس لویلا (Ignatius Loyala) نے انجمن عیسوی (Society of Jesus) کی بنیاد رکھی تھی۔ اس انجمن کے ابتدائی کارکنوں میں ایک شخص فرانسس زیویر تھا جو ۱۵۴۲ء میں ہندوستان آ گیا تھا۔ اس نے گوا میں تبلیغ و اشاعتِ مسیحیت کی خاطر سینٹ پال کالج کی بنیاد رکھی۔ فرانسس زیویر کے خاندان میں جو دوسرا اہم مشنری پیدا ہوا وہ جیروم زیویر (یا زیر نیموشویر) تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ فرانسس زیویر کی بہن کا پوتا (یا نواسہ) تھا۔[1]

زیر نیموشویر پرتگال کے ایک قصبے نور میں پیدا ہوا تھا۔ انیس برس کی عمر میں "انجمن عیسوی" کا باقاعدہ رکن بن گیا تھا۔ فلسفہ اور مسیحی دینیات کے مطالعہ کے بعد ۱۵۸۱ء میں گوا آیا۔ ابتداءً کوچین میں مقیم رہا، بعد میں گوا میں انجمن کی شاخ کا افسرِ اعلیٰ اور نائب پروونشل مقرر ہو گیا۔ تقریباً بیس برس (۱۵۹۵ء - ۱۶۱۳ء) آگرہ اور لاہور میں مغل دربار سے منسلک رہا۔ واپس گوا جانے پر کرانگا نور کا معاون آرچ بشپ بنا اور گوا میں فوت ہوا۔

زیر نیموشویر نے اپنے ذوقِ تبلیغ اور جلال الدین اکبر اور اس کے جانشین کے "مذہبی مزاج" کے پیشِ نظر مسیحیت اور اس کی تعلیمات پر چند کتابیں لکھیں جو فارسی میں منتقل کی گئیں اور اکبر کو پڑھ کر سنائی گئیں۔ زیر نیموشویر کی حسبِ ذیل ترجمہ شدہ کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

۱۔ مرآۃ القدس یا داستانِ مسیح

۱۶۰۲ء میں پرتگیزی زبان سے فارسی میں منتقل کی گئی اور اسی سال اکبر کی خدمت میں پیش کی

گئی۔ اکبر کو پیش کردہ نسخہ جس پر اکبر کی مہر اور شویر کے دستخط ثبت ہیں، بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے، تاہم اس کے متعدد نسخے دنیا کے دوسرے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔[۲] ایک معتور مگر ناقص نسخہ عجائب خانہ لاہور میں موجود ہے۔ اس کے پہلے ورق کے پہلے صفحے پر اکبر کی مہر ہے۔ اسی صفحے کی باقی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی خاندان کے افراد کی نظر سے گزرتا رہا ہے۔[۳]

مراۃ القدس کا ایک نسخہ ہالینڈ کی لیڈن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیو (Ludovico De Dieu) کے ہاتھ لگا تو انہوں نے اسے لاطینی میں منتقل کر دیا۔ پروفیسر ڈیو ۱۶۳۵ء سے ۱۶۴۰ء تک لیڈن یونیورسٹی میں عربی اور فارسی زبانوں کے استاد تھے۔ مراۃ القدس کا فارسی اور لاطینی ترجمہ، جناب سلیم الدین قریشی کی تحقیق کے مطابق[۴] "یورپ میں فارسی رسم الخط میں شائع ہونے والی کتابوں میں قدیم ترین" ہے۔

جناب قریشی نے "مراۃ القدس" یا "داستانِ مسیح" کے فارسی اور پھر لاطینی ترجمے پر اپنی تحریر میں روشنی ڈالی ہے جس کا متعلقہ حصہ زیرِ نظر شمارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۲۔ آئینۂ حق نما

اس کتاب کا ملخص "منتخب آئینۂ حق نما" کے نام سے ملتا ہے۔

۳۔ آداب السلطنت (تالیف ۱۶۰۹ء، نورالدین جہانگیر کے نام معنون ہے۔)

۴۔ "داستانِ احوالِ حواریاں" یا "وقائع حواریانِ دوازدہ گانہ"

زیرنیمو شویر پرتگیز تھا اور اس نے جملہ کتابیں اپنی مادری زبان ہی میں تالیف کی تھیں جنہیں عبدالستار بن قاسم لاہوری نے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ عبدالستار بن قاسم لاہوری کون تھے؟ ان کے کارنامۂ حیات کے بارے میں معلومات از حد محدود ہیں۔ عبدالستار بن قاسم نے پادری شویر سے پرتگیزی زبان سیکھی اور شاید پادری شویر کو فارسی سیکھنے میں مدد دی۔ پرتگیزی زبان سے ترجمہ شدہ "ثمرۃ الفلاسفہ" میں انہوں نے لکھا ہے کہ[۵]

> پادری شویر دانایانِ فرنگ میں سے برگزیدہ شخص حال ہی میں دربار میں آیا ہے۔ اس سے [پرتگیزی] زبان سیکھنا شروع کی۔ اقبال روزافزوں یاور ہوا۔ چھ مہینے میں اس زبان کے مطالب علمی و عملی سمجھنے کی طاقت آ گئی۔ بات چیت کم کرنے اور شغلِ ترجمہ کی وجہ سے اس زبان میں گفتگو کی مہارت نہیں ہوئی ہے۔

"ثمرۃ الفلاسفہ" یا "احوالِ فرنگستان" میں یونان اور روم کے حالات اور وہاں کے فلسفیوں کے افکار پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مخطوطات متعدد کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔[۶] جان رائے لینڈ، مانچسٹر کے کتب خانے کے نسخے کے سرورق پر ایک تحریر ہے جس میں عبدالستار کو "تاریخِ فرشتہ" کے مصنف محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ کا فرزند بتایا گیا ہے۔

پادری شویر کی تالیفات اور "ثمرۃ الفلاسفہ" کے تراجم کے علاوہ عبدالستار بن قاسم لاہوری نے شرف الدین علی یزدی کی تالیف "ظفرنامہ" کی تلخیص بھی کی ہے۔ مدیر

حواشی

۱۔ پادری برکت اللہ نے پادری شوبر کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس کا باپ مقدس فرانسس زیویر کا بھتیجا" تھا۔ دیکھیے: پادری برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، لاہور: پنجاب ریلجس بک سوسائٹی (۱۹۷۰ء)، ص ۱۷۶

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: سی۔ اے۔ اسٹوری Persian Literature: A Bio-bibliographichal Survey جلد ۱، حصہ ۱، لندن: دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ (۱۹۷۰ء)، ص ۱۶۳ - ۱۶۵، جلد ۱، حصہ ۲، لندن: لُزاک اینڈ کمپنی (۱۹۵۳ء)، ص ۱۲

۳۔ رشید احمد، مفصل فہرست مخطوطات و نادر مطبوعات (مشتمل بر ذخیرۂ عجائب گھر)، لاہور: عجائب گھر (۱۹۷۱ء)، جلد اوّل، ص ۱۷ - ۱۸

۴۔ سلیم الدین قریشی، فارسی کی پہلی کتاب، ماہنامہ "کتاب" (لاہور)، نومبر ۱۹۸۵ء

۵۔ بحوالہ حافظ احمد علی، عبدالستار بن قاسم لاہوری: اکبری عہد کا فرنگی زبان کا مترجم، ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ)، جنوری ۱۹۳۶ء، ص ۵۵

۶۔ "سرۃ الفلاسفہ" کے خطی نسخوں کے لیے دیکھیے: سی۔ اے۔ اسٹوری، جلد ۱، حصہ ۲، حوالہ مذکورہ، ص ۱۱۱۰ - ۱۱۱۱

اسٹوری نے "سرۃ الفلاسفہ" کو "شرۃ الفلاسفہ" لکھا ہے جو درست نہیں۔ اسٹوری کی فہرست میں رضا لائبریری، رامپور کے نسخے کا ذکر نہیں ہو سکا۔ یہ نسخہ ۱۲۳۶ھ کا مکتوبہ ہے اور حافظ احمد علی خان نے اسی نسخے کے حوالے سے "عبدالستار بن قاسم لاہوری" پر مقالہ لکھا تھا، حوالہ مذکورہ، ص ۵۳ - ۵۹]

اس کتاب [داستان مسیح] کی ایک نقل جو شوبر کی وفات کے بعد، ۷ رمضان ۱۰۲۷ھ کو مکمل کی گئی تھی، ہالینڈ پہنچی جہاں لیڈن یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ڈیو (Dieu) نے اسے لاطینی ترجمے کے ساتھ ۱۶۳۹ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا سرِ ورق لاطینی میں ہے اور کتاب کا عنوان فارسی رسم الخط میں بھی دیا گیا ہے۔ البتہ فارسی ٹائپ میں جلی حروف کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس عنوان کی چھپائی بلاک سے کی گئی ہے۔ فارسی متن کے لیے جو ٹائپ استعمال کیا گیا ہے وہ نسخ اور ثلث کے ملے جلے رسم الخط میں ہے، کچھ حروف کے لیے نستعلیق بھی استعمال کیا گیا ہے۔

"داستان مسیح" ۱۹ سنٹی میٹر کے ۶۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ایک صفحہ پر فارسی عبارت دی گئی ہے اور مقابل میں لاطینی ترجمہ دیا گیا ہے۔

"داستانِ مسیح" -- مترجم کی نظر میں

کتاب ڈیو کے لاطینی مقدمے سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد مترجم نے "راہنموئی [راہنمائی] وہدایت صاحبِ ترجمہ برائے خوانندگان" کے عنوان کے تحت قارئین کو مطلع کیا ہے کہ[1]

> شویر نے اس کتاب میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کر دی ہیں جن کا تعلق انجیل سے نہیں اور جو یا تو ناقابل اعتبار ہیں یا جھوٹی ہیں۔ اس میں دی گئی بہت سی باتیں خدا تعالیٰ کی بزرگی اور انجیل مقدس کے دین کے خلاف ہیں حتیٰ کہ جو چیزیں اس نے انجیل سے لی ہیں، ان کو بھی پلید اور ملوث کر کے پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے ان کے اثر اور پاکیزگی کو ختم کر دیا ہے۔ میں نے یہ کلمات اس لیے لکھ دیے ہیں تاکہ لوگ اس کو پڑھ کر گمراہ نہ ہو جائیں۔ ان کو چاہیے کہ اس کتاب کو پڑھتے وقت صرف وہی چیزیں قبول کریں جو انجیل سے موافقت رکھتی ہوں۔

ڈیو نے اس کتاب کا عنوان "داستانِ مسیح انا آلودہ" لکھا ہے۔ ڈیو نے لاطینی عبارت کے ساتھ جو حاشیہ دیا ہے، اس میں جگہ جگہ اس آلودگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شویر نے اپنے دیباچے کو اللہ اکبر کے الفاظ سے شروع کیا تھا۔ ڈیو نے ان الفاظ کو عبارت سے حذف کر دیا ہے۔

شویر کا اندازِ تالیف

ڈیو کی اس کتاب پر تنقید کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شویر پر اسلامی تعلیمات کا کافی اثر تھا۔ "داستان مسیح" لکھنے سے پہلے وہ قرآن کریم کا پرتگیزی زبان میں ترجمہ کر چکے تھے۔[2] جس کی وجہ سے

> حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم اور دوسرے پیغمبروں کے متعلق جو بیانات اس کتاب میں درج ہیں، ان میں سے کئی ایک قرآن کریم کے بیانات سے موافقت رکھتے ہیں۔ شویر کے لیے ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عیسائی عقائد کو اگر اسلامی تعلیمات کے ساتھ ملا کر پیش کیا جائے تو اکبر کو یہ تعلیمات قبول کرنے میں آسانی ہوگی۔ شویر نے اپنے دیباچے کے شروع میں کتاب کا عنوان "مراۃ القدس" دیا ہے اور اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "در این گزارش می باید داستان احوال عجیب حضرت یسوع کرسٹس و بیان درباره تعلیم آسمانی و معجزات بزرگ قدراو۔" اس کے بعد "گفتار اندر خطاب زمین پوش" کے الفاظ ہیں۔

شویر کا یہ دیباچہ اس کتاب کے لکھنے کے محرکات کے علاوہ اکبر کی مذہبی پالیسی اور اس دور کے عیسائی مبلغین کے طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

دیباچہ کتاب

"جب حضرت مسیح کے معجزات کی شہرت روئے زمین پر پھیلی تو ادیسہ کے بادشاہ ابگر کی خواہش ہوئی کہ ان کے دیدار سے فیض یاب ہو۔ اس نے اپنے ایک دانا ایلچی کو ان کی خدمت میں روانہ

کیا اور پیغام بھیجا کہ اگر وہ اس کے ملک تشریف لے آئیں تو وہ اپنی آدھی سلطنت ان کی خدمت میں پیش کر دے گا۔

بادشاہ نے ایلچی کے ساتھ ایک ماہر مصور بھی روانہ کیا تاکہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ نہ آ سکیں تو وہ ان کی ایک تصویر کھینچ کر اپنے ساتھ لے آئے اور اس طرح ان کو دیکھنے کی خواہش پوری کر سکے۔ ایلچی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا اور اپنے بادشاہ کا پیغام دیا۔ اس نے جب یہ جان لیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ان کے ملک جانا دشوار ہے تو مصور نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اور اپنی عقل و دانش کو استعمال کر کے اپنی توقع سے بہتر اور خوب تر تصویر تیار کی اور اسے دیکھ کر خوش ہوا لیکن دوسرے دن جب اس نے اس تصویر کا اصل سے مقابلہ کیا تو بے حد شرمندہ ہوا، اور اس تصویر کی درستی اور تصحیح میں مصروف ہو گیا۔

یہ کام ختم کرنے کے بعد اس کا احساسِ شرمندگی دور ہوا اور وہ خدا کا شکر بجا لایا۔ دوسرے اور تیسرے روز پھر ایسا ہی ہوا اور وہ پہلے سے زیادہ شرمندہ ہوا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ جو کچھ وہ ایک دن تیار کرتا، اگلے روز اسے ناقص اور نامکمل پاتا حتیٰ کہ شرمندگی اور ناامیدی سے مایوس ہو گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس پر ترس آیا اور اس کی روانگی سے قبل انھوں نے اس سے اس کی چادر طلب کی اور اسے اپنے چہرے پر لگا کر اسے واپس کر دی۔ اس نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر اس چادر پر بالکل درست اور صحیح اتر آئی تھی۔

اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر مصور اپنے ملک واپس آیا اور یہ تصویر بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ بادشاہ نے بڑی عزت اور اہتمام کے ساتھ اس تصویر کو اپنے پاس رکھا اور اس کی برکت سے اپنی مہموں میں کامیاب ہوا۔

میں نے یہ قصہ اس لیے بیان کیا ہے کہ جہاں پناہ آپ نے چوں کہ حضرت یسوع کے کمالات کی داستانیں مختلف روایات سے سن رکھی تھیں، خواہش ظاہر کی کہ میں ان کی صحیح داستان پیش کروں۔ آپ نے اپنی علم دوستی اور سچائی کی تلاش میں اس کمترین دعاگو پادری —— زیویر نیو شویر —— کو جس کی پیشانی آستاں بوسی سے روشن ہے، اشارہ کیا کہ آنحضرت کے کردار و گفتار کے متعلق جو کچھ ہماری کتابوں میں درج ہے، میں اس کو فارسی میں لکھ کر پیش کروں۔ شاید اس لیے کہ میں نے اپنی زندگی کے چالیس برس اسی پیشے میں گزارے تھے اور پچھلے سات یا آٹھ سال سے فارسی سیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے سراپا دل ہو کر اس کام پر کمر باندھی اور زندگی کی ضروریات و آسائشات سے کنارہ کشی کر کے کئی روز اس کام میں مصروف رہا حتیٰ کہ ظلِ الٰہی کی فرمائش کو پورا کیا، کیوں کہ بادشاہ کے احکام کو کسی دوسرے حکم سے کم نہیں سمجھنا چاہیے، خاص کر ان چیزوں میں جن کا پوشیدہ رکھنا لوگوں پر ستم کرنے کے مترادف ہے اور جن پر عمل کرنا خدا کی عبادت کے برابر ہے۔

چنانچہ رفیلِ فرشتے نے پیغمبر طبوبیات سے فرمایا تھا کہ بادشاہوں کے رازوں کو پوشیدہ رکھنا نیک کام ہے لیکن اسرارِ الٰہی کا بیان اور ان کی تشہیر کرنا بہت ہی پسندیدہ اور قابلِ تعریف فعل ہے۔

اس لیے اس کتاب کے مکمل کرنے میں اگر کوئی تاخیر ہوئی ہے تو وہ اس وجہ سے کہ میں نے اس کتاب کو کئی مرتبہ ترتیب دیا اور اپنے طور پر مکمل کیا لیکن ہر بار اس کو ختم کر کے مسودہ پر نظر ڈالی

اور فارسی کا لاطینی کتابوں سے مقابلہ کیا تو دل کو تسکین نہ ہوئی۔ جو کام مجھے پہلے کامل نظر آیا تھا، بعد میں ناقص معلوم ہوا، اور اپنے کام کو دیکھ کر دکھ ہوا اور اپنی کم مائیگی اور نارسائی سے ناامید ہوا۔ میں نے اس کام کی تکمیل کے لیے خدا سے دعا مانگی اور خدا کی عنایت اور ظل الٰہی کے اقبال سے مجھے اپنی مشکلات حل کرنے میں مدد ملی اور یہ کام مکمل کر کے میرے دل کو قرار آیا اور تسلی ہوئی اور حوصلہ ہوا کہ میں یہ کتاب آپ کے سامنے پیش کروں۔

میں دعا کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ آپ کو اور دوسرے سامعین کو خوش رکھے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کتاب کے عہد میں جو کتابیں فارسی میں ترجمہ کی گئیں، ان سب میں سے یہ کتاب اس چیز کی مستحق ہے کہ آپ کو اس پر سب سے زیادہ ناز ہو، کیوں کہ اس سے پہلے اس قسم کی کوئی کتاب ترجمہ نہیں کی گئی۔

شاید اس لیے کہ اس دور میں فارسی دانوں کو لاطینی زبان نہ آتی تھی اور لاطینی ادب فارسی سے ناواقف تھے، اور شاید اس لیے بھی کہ اس دور میں آپ کی طرح کوئی ایسا علم دوست بادشاہ نہ تھا جو سچائی کی تلاش میں آپ کی طرح سرگرم رہا ہو۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب آپ کو پسند آئے گی۔ اس لیے نہیں کہ بندہ نے اسے شوق، اخلاص اور محنت سے مرتب کیا ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں ان تمام چیزوں کا ذکر ہے جن کی حضرت عیسیٰ نے تعلیم دی تھی یا کہی تھی۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حضرت عیسیٰ کی ولادت سے لے کر نبوت تک کے حالات کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں ان کے معجزات، عجائبات اور تعلیمات کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں ان کی وفات اور لوگوں کی سلامتی کے لیے انہوں نے جو مشکلات اٹھائیں اور محنت کی، اس کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں ان کے قبر سے اٹھائے جانے اور آسمان پر لے جائے جانے کا بیان ہے۔

میں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھ سکتا تھا، نہیں لکھا، لیکن مجھے امید ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ درج ہے، وہ حضرت عیسیٰ اور ان کی تعلیمات کو جاننے کے لیے کافی ہوگا۔ جس طرح ہاتھی کے قدم کے نشان سے اس کے جثہ کا پتا چل جاتا ہے اور شیر کی طاقت کا اس کے پنجہ کے نشان سے پتا چل جاتا ہے، اسی طرح مجھے امید ہے کہ یہ کام آپ کو میری خدمت گزاری کی آرزو کی طرف نشاندہی کے لیے کافی ہو گا۔

میری درخواست ہے کہ یہ کتاب دربار میں پڑھ کر سنائی جائے کیوں کہ اس کی تعلیمات ہر نیک کام کا سرچشمہ ہیں اور اس میں روح کے علاج اور دل کی تسکین کے لیے دوا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ ہر کتاب روح کے لیے دوا کا کام دیتی ہے لیکن یہ کتاب حضور کی روح کی تسلی کے لیے دوسری کتابوں سے افضل ہے کیوں کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے کہ میری گفتار روح کے لیے دوا اور سرچشمہ ہدایت ہے۔ آخر میں میرے لیے یہ کہنا لازم ہے کہ اس کتاب کا بیشتر حصہ انجیل مقدس سے لیا گیا ہے اور میں نے دوسری کتابوں کے حوالے دینے سے گریز کیا ہے لیکن جہاں کہیں یہ حوالے دیے گئے ہیں، میں نے ان کتابوں کے نام حاشیے میں درج کر دیے ہیں۔

پڑھنے میں آسانی کے لیے میں نے متن کا خلاصہ بھی حاشیہ میں دے دیا ہے۔ حضرت مسیح کی

بعض باتیں ایسی ہیں کہ انسان کی عقل عاجز اور دنگ رہ جاتی ہے۔ میں نے یہ باتیں اور ان کی مثالیں دوسری کتاب "آئینۂ حق نما" میں جو میں لکھ رہا ہوں اور جو ان شاء اللہ تعالیٰ جلد مکمل ہو جائے گی، بیان کی ہیں۔

میری دعا ہے کہ حضرت عیسیٰ آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے اور اپنی شناسائی کو جو سلامتی جاں کے لیے لازم ہے، اس بندے کی دعا کے مطابق آپ پر عیاں کرنے کا کرم فرمائے۔ در دار الخلافہ آگرہ بتاریخ پانزدہم اردی بہشت سن ہزار و شصد و دو از ولادت حضرت خداوند اختتام [پذیرفت]"

شوریر کے اس دیباچے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اس کتاب کا خود لاطینی زبان [۳] سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا لیکن کتاب کے اختتام پر دی گئی مندرجہ ذیل عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ

رجمہ مولانا عبدالستار لاہوری نے مصنف کی اعانت سے کیا تھا۔

این نامہ گرامی و دیباچہ سعادت مندی پادری زیر نیمو شوریر فرنگی از طائفہ محبت حضرت عیسیٰ بحکم شاہنشاہ دوران خدیو روشنہان دارای روزگار جلال الدین اکبر پادشاہان خلد اللہ ملکہ و سلطانہ از انجیل مقدس و دیگر کتبِ پیغمبران در دار الخلافہ آگرہ فراہم آوردہ، مولانا عبدالستار بن قاسم لاہوری باتفاق این بندہ در جہاں دار الخلافہ ترجمہ کردہ در سن ہزار و شصد و دو از ولادت حضرت ایشوع و چہل و ہفت الٰہی از جلوس مقدس شاہنشاہی انجام یافت۔"

پادری شوریر کی ایک دوسری کتاب

داستان مسیح کے بعد ڈیو نے اسی سال یعنی ۱۶۳۹ء میں فارسی کی مزید دو کتابیں اسی مطبع [جو لیڈن یونیورسٹی کے استاد تھامس اربینس (THOMAS ERPENIUS) نے ۱۶۱۳ء میں قائم کیا تھا۔] سے شائع کیں۔ ان میں سے پہلی "داستان سان پیدرو" ہے۔ یہ شوریر کی کتاب "داستان احوال حواریاں" یا "وقائع حواریان دوازدگانہ" کی پہلی جلد پر مشتمل ہے۔

"داستان مسیح" کی طرح یہ کتاب بھی شوریر نے اکبر کی فرمائش پر لکھی تھی اور اس کا فارسی ترجمہ مولانا عبدالستار لاہوری نے مصنف کی اعانت سے سرانجام دیا تھا۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں مرتب کی گئی تھی۔ مصنف نے اس کی پہلی چار جلدیں ۱۶۰۵ء میں اکبر کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ اکبر کی وفات کے بعد ۱۶۰۷ء میں یہ کتاب مکمل ہوئی تو شوریر نے اسے جہانگیر کے نام معنون کیا اور اس کی ایک جلد جہانگیر کو پیش کی۔

ڈیو نے "داستانِ مسیح" کی طرح اس کا بھی فارسی سے لاطینی میں ترجمہ کیا اور یہ کتاب دونوں متنوں کے ساتھ شائع کی۔ ڈیو نے ترجمے میں اور حاشیہ کے ذریعے اس کتاب کو بھی شوریر کی غلط بیانیوں اور نجاست اسیری سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب ۱۹ سنٹی میٹر کے ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک صفحے پر لاطینی ترجمہ دیا گیا ہے اور اس کے مقابل دوسرے صفحے پر فارسی عبارت درج ہے۔ سرورق پر فارسی عنوان بلاک سے چھاپا گیا ہے اور کتاب کی بقیہ عبارت فارسی ٹائپ میں ہے۔

اس کتاب کے قلمی نسخے یورپ اور ہند و پاکستان کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔ آصفیہ

کتب خانہ [حیدر آباد - اندھرا پردیش] میں اس کا جو نسخہ ہے، اس کا عنوان "مجموعہ رسائل حالات پیٹرس وغیرہ حواریان حضرت عیسیٰ" دیا گیا ہے۔ یہ نسخہ اس سے قبل اکبر کے کتب خانہ میں رہ چکا تھا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "نسخہ کتاب بارہ اپاسل" کے عنوان سے ١٨٩٣ء میں سردھنہ سے شائع ہوا تھا۔

حواشی

١۔ ترجمہ از فارسی

٢۔ ای - جی - براؤن، A, LITERARY HISTORY OF PERSIA لندن (١٩٠٢ء)،
جلد ١، ص ٣٠

٣۔ اس کتاب کا اصل نسخہ جو پرتگیزی زبان میں ہے، اب روم میں ویٹیکن کے کتب خانے میں موجود ہے۔ شویر ١٦١٥ء میں واپس گوا چلے گئے تھے۔ وہاں ٢٧ جون ١٦١٧ء کو گھر میں آگ لگ جانے کی وجہ سے وفات پائی تھی۔ مذکورہ بالا نسخے پر آگ سے جلنے کے آثار باقی ہیں۔

عالم اسلام اور عیسائیت - جون ١٩٩٣ء

داستان مسیح

HISTORIA CHRISTI PERSICE

Conſcripta, ſimulque multis modis contaminata,

A

P. HIERONYMO XAVIER, Soc. Jeſu.

LATINE

Reddita & Animadverſionibus notata

A

LUDOVICO DE DIEU.

LVGDVNI BATAVORVM,
Ex Officina Elſeviriana, A° CIↃ IↃ CXXXIX.

"داستان مسیح" کا سرورق، جو مارچ ۱۶۳۹ء میں لیڈن سے شائع ہوئی۔

اخلاق جہانگیری

فارسی میں بے شمار منابع ایسے ہیں، جو آج تک قلمی نسخوں کی شکل میں دنیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انہیں منظر عام پر لایا اور شایع کرایا جائے۔ جس سے ہماری تہذیب اور تاریخ کے نئے نئے گوشے سامنے آسکیں گے۔ ایسی کتابوں میں ایک "اخلاق جہانگیری" بھی ہے جس کا ایک قلمی نسخہ نیشنل میوزیم۔(۱) نئی دہلی میں محفوظ ہے(۸۱-۶۸) اس نسخہ کے پہلے اوراق پر حسب ذیل تحریریں ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ نسخہ کن کن شخصیتوں کے کتب خانوں کی زینت رہا ہے۔ نیز کتاب کی فہرست دی گئی ہے۔

۱۔ اللہ اکبر در شہور ۔۲ عالمگیری بخزانہ کتب افقر احقر محمد ابراہیم حسینی است۔

مہر: محمد ابراہیم حسینی خانہ زاد عالمگیر بادشاہ

۲۔ بیست و دوم محرم الحرام از جلوس اشرف۔ مطابق ۱۱۱۹ھ..... ابتیاع نمود۔

مہر: سید مرتضیٰ عالمگیر شاہی

۳۔ نور الدین محمد۔ فہرست مقالات کتاب "اخلاق جہانگیری" کہ محققین و علما و حکما کہ ندماء حضرت نور الدین محمد جہانگیر محمد نور اللہ مرقدہم و جعل الجنتہ مثواہم بودہ متفق اللفظ والمعنی بود نقلیات غریبہ و حکایات عجیبہ مشتمل بر بیست و دو مقالہ، کہ ہریکی قاری و سامع را برای حق ہمل لحمانہ ہدایت و فواید عظیم می بخشد، از کتب معتبرہ برداشتہ در ضبط رقم و قید قلم درآوردہ اند۔

(ا) مقالہ اول در محبت و عشق و سخنان اولیا۔ اللہ۔(ب) مقالہ دوم در فضیلت علم و علماء رحمہم اللہ تعالیٰ۔(ج) مقالہ سیوم در خوف و رجا۔(د) مقالہ چہارم در حسن خلق و مذمت بد خلقی۔(ہ) مقالہ پنجم در تواضع و شفقت۔(و) مقالہ ششم در علو ہمت۔(ز) مقالہ ہفتم در توکل۔(ح) مقالہ ہشتم در صبر۔(ط) مقالہ نہم در سخاوت و مذمت بخل و حسد۔(ی) مقالہ دہم در عدالت امرا و اولی الامر و تامل در حکم۔(ک) مقالہ یازدہم در عزم۔(ل) مقالہ دوازدہم در فراست۔(م) مقالہ سیزدہم در فواید مشورت۔(ن) مقالہ چہاردہم در میامن توبہ۔(س) مقالہ پانزدہم در درجات۔(ع) مقالہ شانزدہم در معارج شجاعت۔(ف) مقالہ ہفدہم در سیاست۔(ص) مقالہ ہژدہم در وفاو عہد۔(ق) مقالہ نوزدہم در برکات صدق

وشامت کذب۔(ر) مقالہ بیستم در قناعت و مذمت طمع و حرص و سرقہ۔(ش) مقالہ بیست ویکم در مطایبات۔(ت) مقالہ بیست و دوم در متفرقات و در تصحیح روایات و تنقیح حکایات۔

۴۔ ۷ اشہر شعبان ۱۱۰۰ھ، مہر

۵۔ سوال امیر الامرا، مہر امیر الامراخان مرحوم..... شعبان ۲۱

۶۔ شہر ربیع الثانی عرض دیدہ شد

۷۔ در شہور ۲۲ در خزانہ کتب افقر احقر محمد ابراہیم..... شہر جمادی الاول عرض دیدہ شد۔

۸۔ کتاب اخلاق جہانگیری...... داخل کتاب خانہ نواب مستطاب..... بتاریخ ۵۔ شہر محرم الحرام ۱۰۹۲ھ۔ اس میں بہت سی مہریں ہیں جو پڑھی نہیں جاتیں۔

اس کتاب کے مؤلف نور الدین محمد ہیں، جن کو جہانگیر نے لاہور کا قاضی بنایا تھا۔ شیخ معین الدنیا والدین الواعظ ہروی مؤلف کے اجداد میں سے ہیں۔ جس کا ذکر انہوں نے کئی جگہ کیا ہے۔ سلطان حسین مرزا (م ۹۱۱ھ) کے زمانے میں قاضی نظام تھے اور ان کے انتقال کے بعد یہ عہدہ مولانا معین الدین واعظ کے سپرد ہوا جو قاضی کے حقیقی بھائی تھے۔ مؤلف نے لکھا ہے کہ وہ یہ عہدہ قبول نہیں کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے چار شرطوں پر راضی ہوئے۔

یہاں یہ بھی بتلا دیا جائے کہ یہ وہی معین الدین ہیں، جن کا دیوان غلطی سے خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نام سے شایع اور مشہور ہو گیا ہے۔

بہر حال مؤلف نے اس کتاب کی تالیف کا سبب یہ بتلایا ہے کہ جہانگیر بادشاہ آگرہ سے اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لیے کچھ دنوں رک کر مانڈو اور گجرات کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت اس کتاب کی تالیف شروع ہوئی۔ پھر جب لاہور کے قاضی بنا کر بھیجے گئے، جس کی وجہ سے وہ دربار سے دور ہو گئے، اس مفارقت کے زمانے میں بھی وہ بادشاہ کی تعریف و توصیف سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس کتاب کی تالیف کی اور اس کا نام "اخلاق جہانگیری" رکھا۔ اس کے حروف کی تعداد کے مجموعہ سے اس کتاب کے اختتام کی تاریخ ۱۰۳۱ھ / ۲۲-۱۶۲۱ء نکلتی ہے۔ مگر کتاب کے آخر میں مؤلف نے اس کے اختتام کی تاریخ ذیقعدہ ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) بتلایا ہے۔

اس کتاب میں مؤلف نے بے شمار صوفیوں، اولیاء اللہ، علما و حکما، شعرا وغیرہ کے اقوال اور حالات درج کیے ہیں۔ نیز بے شمار منابع سے استفادہ کیا ہے، جن میں ریاض الملوک، صور الاقالیم، زہرۃ الریاضین، تاریخ ملوک عجم، روضۃ العلما، ملح النوادر، تفسیر

بحر العلوم، اخلاق ناصری، زاد المعاد، تاریخ ہرات، جامع الحکایات وغیرہ ہیں۔ ہندستانی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے مگر ان کا نام نہیں بتلایا گیا ہے۔ مؤلف نے صرف "در کتب ہند مسطور راست" یا "در کتب حکمائی ہند آوردہ اند" لکھ دیا ہے.....

ان مقالات میں ہندستان سے متعلق بہت سی تاریخی اور اساطیری شخصیتوں کے حالات اور واقعات ملتے ہیں۔ جو ہندستانی تاریخ اور تہذیب کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ واقعات کہاں تک مبالغہ آمیز یا صحیح ہیں، اس کا اندازہ خود پڑھنے والے لگا سکتے ہیں۔ مثلاً ہندستان میں حضرت آدمؑ کی قبر پر ایک درخت ہے، جس میں سال میں دو مرتبہ پھول آتے ہیں، نیز ہر پھول پتے کی شکل کا ہوتا ہے، جس پر لا الٰہ الا اللہ لکھا ہوا ہوتا ہے۔

ہندستان کی کتابیں قدیم زمانے میں ایران میں بھی بہت مقبول تھیں۔ چنانچہ نوشیرواں نے ہندستانی کتاب میں پڑھا کہ ہندستان بھی ایک جگہ ہے، جہاں کے میوے مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ اس نے ایک قاصد ہندستان بھیجا کہ اس کی تحقیق کرے۔ وہاں کے ایک بزرگ نے کہا کہ میوے سے مراد علم کا پھل ہے کہ یہاں کے علما اس سے جہل کے مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ جب نوشیرواں کو پتا چلا تو اس نے علما کی عزت کرنے میں اور بھی مبالغہ کیا....

سلطان علاؤالدین خلجی (م ۷۱۶ھ) کے زمانے میں دلار نامی خواجہ سرا نے جو پانی پت کا حاکم تھا کسی کو قید میں ڈال دیا اور ایک بڑی رقم لے کر اس سے معاملہ طے کیا۔ اس کے بعد پھر ایک رقم مانگی۔ اس نے حضرت بوعلی قلندر (م ۷۲۴ھ) کے آستانہ پر جا کر پناہ لی۔ دلار بھی وہاں پہنچا، جسے دیکھتے ہی حضرت نے غصے سے اپنی جانماز کو خانقاہ کی دیوار پر مارا اور اسی وقت وہ گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ مقامی لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ مگر شیخ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ اسی غصے میں سلطان کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا "علاؤالدین کوتوال دہلی کو شرف پانی پت کا سلام پہنچے۔ اگر پانی پت میں کوئی اچھا حاکم نہیں بھیجا تو دہلی میں کوئی اور کوتوال بنایا جائے گا" علاؤالدین بہت خوش ہوا کہ آپ نے اسے "شحنۂ دہلی" کہہ کر یاد کیا ہے۔ نیز اس نے اپنے لڑکے کے ہاتھ جواب بھیجا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس خادم کے بیٹے کو وہاں کا حاکم بنائیں ورنہ کوئی اور حاکم بھیجا جائے گا۔

اسی طرح ایک قصہ دیا ہوا ہے جو "اخلاق جلالی" میں بھی ملتا ہے کہ ملک شاہ نے لوگوں کے کہنے پر ۲۹ رمضان کو اعلان کروا دیا کہ کل عید ہوگی، جب کہ شافعی مذہب کے بہت

بڑے عالم امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک جوینی نے جو امام غزالی کے استاد تھے۔ فتویٰ دیا کہ کل لوگ روزہ رکھیں۔ اس پر پہلے تو بادشاہ بہت غصہ ہوا اور امام الحرمین کو بلوا بھیجا، لیکن بعد میں انہیں بڑے احترام سے واپس کیا، نیز انہیں کے فتوے کے مطابق عمل ہوا۔

اس کتاب کا اصل مقصد یہ ہے کہ جہانگیر تمام اخلاق حمیدہ کا مظہر تھا، چنانچہ تقریباً ہر مقالے کے آخر میں مؤلف نے بادشاہ وقت کی تعریف کی ہے۔

●●

العلم فروری ۱۹۹۳ء

ڈپٹی نذیر احمد پر کفر کا فتویٰ

مُسلمان عوام ہمیشہ اس عالم کی جان کے دُشمن رہے ہیں جس نے کوئی ایسی بات کی جو اُن کے فہم و خیال سے باہر ہو اور ظاہر پرست فقہا نے بھی ایسے میں عوام کا ساتھ دیا

کُفر کے فتوے جاری کرنا ہمارے بیشتر علما کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔

"امہات الامہ" ہم نے ابھی دیکھ کر رکھی ہی تھی کہ روزنامہ "پیسہ" اخبار، لاہور میں کسی فرخ آبادی کا ایک مراسلہ دیکھنے میں آیا جس میں یہی کچھ لکھا تھا کہ دہلی میں بہت بڑا جلسہ رہا اور اس میں "امہات الامہ" کے اکثر مضامین پڑھے گئے۔ آخر متفق الفاظ ہو کر وہاں کے مولویوں نے مصنف امہات الامہ کو کافر قرار دیا۔ ان کے ساتھ کھان پان سب بند، حقہ پانی ترک۔ اس کے چند ہی روز کے بعد ایک مطبوعہ اور مہر شدہ کفر کے فتوے کی زیارت بھی ہوئی۔ زیارت کرتے ہی یادش بخیر ہمیں چند اور کافر یاد آگئے، جن کی نسبت ایک زندہ علامہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

"عوام کا ہر زمانے میں یہ حال رہا ہے کہ جو بات ان کے فہم اور خیال سے باہر ہوتی تھی اس کے اظہار پر وہ جان کے دشمن بن جاتے تھے۔ سلطنت کی روک تھام سے صرف اس قدر ہو سکتا تھا کہ کسی کی جان کو خطرہ نہ پہنچنے پائے لیکن صرف اس بندش سے کیا کام چل سکتا تھا۔ عوام جس کو چاہتے تھے مردود عام کر سکتے تھے —— اس سے بڑھ کر یہ آفت تھی کہ ظاہر پرست فقہا بھی عوام کے ساتھ ہو جاتے تھے اور کفر کے فتووں سے انسان کا زندہ رہنا مشکل کر دیتے تھے۔ امام غزالی، آمدی، رازی، ابن رشد، شہرستانی اور ابن تیمیہ کے حالات پڑھو ان میں ایک بھی فقہا کے فتووں کے حملوں سے نہ بچ سکا۔"

ان کافروں کا حال پڑھ کر ہم کو معلوم ہو گیا کہ ہمارا زمانہ بھی متعصب فقہا سے خالی نہیں۔ جن بزرگوں نے مصنف امہات الامہ کے کفر کے فتوے پر مہریں لگائی ہیں۔ ان میں ماشاء اللہ آج ایک ایک فقیہ اور اسلام کا چمکتا ہوا تارا ہے۔ ان کے علم و فضل کے ڈنکے چار دانگ ہندوستان میں بج رہے ہیں۔ وہ اسلام کی خدمت میں اپنے تمام عیش و نشاط کو نثار کیے ہوئے جابجا مدارس قائم کرتے پھرتے اور اسلامی انجمنوں کی بنیادیں ڈالتے پھرتے ہیں۔ دہریوں، نیچریوں اور عیسائیوں اور آریوں اور خدا معلوم کن کن مذہب کے والوں کے سامنے بحث مباحثہ کر کے اسلام کی حقانیت ثابت کرتے پھرتے ہیں مگر افسوس نتیجہ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے اور وہ یہ کہ سال بھر میں ایک کو مسلمان بناتے ہیں تو چار کو خارج کرتے ہیں۔

براحوال آں کس بباید گریست
کہ دخلش بود نوزدہ خرج بیست

شمس العلماء علامہ شبلی فرماتے تھے کہ "امہات الامہ کی تصنیف کے بعد جب ندوہ کا جلسہ دہلی میں ہونے والا تھا تو میں نے جلسے کا اشتہار دیتے ہوئے ہندوستان کے نامور علماء کی فہرست بھی شرکت جلسہ کے لئے چھاپی تھی۔ اس میں مولوی نذیر احمد خان کا نام بھی تھا —— وہ اشتہار کہیں مولوی نذیر احمد خان کے پرانے حریف کی نظر پڑ گیا تو انہوں نے مجھے بھی صرف اس بنیاد پر کافر قرار دے کر فتویٰ چھپا دیا کہ نذیر احمد کے نام کے ساتھ میں نے مولوی کیوں لکھا۔"

"روشن خیال" ۱(۴)

ولادیمیر گاوریلین

ماسکو سے اردو میں کتابیں

"رادوگا" اشاعت گھر ۱۹۸۲ء میں دارالاشاعت "ترقی" سے الگ ہو کر قائم ہوا تھا۔ وہ غیر ملکی قارئین کے لئے دنیا کی کوئی تیس زبانوں میں ادبی کتابیں شائع کرتا ہے جن میں اردو بھی شامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کتابیں قوموں کو ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی قارئین کے لئے ماسکو سے اردو میں پہلی کتابیں ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اس زمانے سے آج تک ایک سو سے زائد ادبی کتابیں ترجمہ ہو کر اردو میں چھاپی جا چکی ہیں۔ ان میں بڑوں اور بچوں کے لئے ایسے کلاسیکی مصنفین کے شاہکار شامل ہیں جیسے پشکن، گوگول، ترگنیف، لیو تالستائی، دستوئیفسکی، کوپرین، چیخوف۔ ان ادیبوں کی تصانیف قارئین میں بہت ہی مقبول ہیں اور وہ ان کو شوق سے پڑھتے ہیں چنانچہ ان کتابوں کے کئی ایڈیشن شائع ہو گئے اور یہ سمجھنے میں آنے والی بات ہے کیونکہ روسی کلاسیکی ادیبوں کی تخلیقات انسانیت پسندی، انصاف، نیکی، محبت و شفقت کی پیغامبر ہیں۔ مثال کے طور پر دستوئیفسکی کو لے لیجئے۔ وہ پچھلی صدی کی روسی نثر کے دور عروج کی نمایاں پیداوار ہیں۔ ان کی بیشتر کتابیں غریب اور سادہ انسانوں کی مصیبتوں اور اس بات کے بارے میں ہیں کہ وہ بدی اور زیادتیوں کا کس طرح سامنا کرتے ہیں۔ اپنے ناول "ذلتوں کے مارے لوگ" کے کرداروں کی کہانی میں دستوئیفسکی نے اپنے فن کے مرکزی موضوع کا اظہار کیا۔ یعنی انسانیت کے احترام [illegible] جسے کہ زندگی کے [illegible] جیسے کہ مصنف کے ہم عصر سماج نے [illegible] طور پر کچل دیا تھا اور بے نصیب کر دیا تھا۔ دستوئیفسکی کے ایک اور مشہور ناول "ایڈیٹ" کے بھی دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دستوئیفسکی نے خود لکھا تھا "ایڈیٹ" کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ایک لاجواب اور دل پسند ہستی کی تصویر کشی کی جائے۔ اور یہ اتفاقی بات نہیں کہ بہت سے اردو قارئین دستوئیفسکی کا کوئی [illegible] ہو کر ہم سے ان کا ایک اور ناول ارسال کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔

لیو تالستائی کی کتابیں بھی قارئین میں کم مقبول نہیں۔ پچھلے سال تالستائی کی کہانیوں کا مجموعہ بعنوان "گھر واپسی" دوسری بار شائع کیا گیا۔ یہ کہانیاں اس عظیم مصنف کی تخلیقی راہوں کا پتہ دیتی ہیں۔ کتاب کی ابتدا وسط میں سالہ تالستائی کی کہانی "[illegible]" سے ہوتی ہے اور خاتمہ "[illegible]" کے بعد [illegible] کہانی

یہ ناول جو مصنف کی موت کے بعد شائع ہوا۔ تالستائی کی اردو میں شائع شدہ ایک اور ضخیم کتاب "آنا کارینینا" دو جلدوں میں ناول ہے۔ مصنف نے اس ناول پر چار سال کے دوران کام کیا اور شروع میں ان کا ارادہ تھا۔ اعلیٰ سوسائٹی کی ایک خاتون کی زندگی کو بیان کرنا لیکن اس ناول کو لکھتے لکھتے اس کا ڈھانچہ درجہ بدرجہ وسیع تر ہوتا گیا اور اس کے موضوع میں زیادہ گہرائی آتی گئی۔ ایک "متلون مزاج بیوی" کے متعلق ناول سے شروع ہو کر "آنا کارینینا" نے سب سے۔۔۔ عظیم سماجی ناول کی شکل اختیار کر لی جس نے روسی زندگی کے ایک پورے دور کی یعنی گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی سے نویں دہائی کی ابتدا تک کے دور کی اس کی تمام تر پیچیدگیوں اور تضادات کے ساتھ عکاسی کی۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۸ء میں لیو تالستائی کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تالستائی ہمارے دور کے سب سے پُرخلوص انسان تھے، کہ انہوں نے اپنی زندگی حق کی تلاش کے لئے وقف کر دی تھی اور سچائی کے حصول اور اس کو زندگی میں رائج کرنے کی کوششوں میں مستقل لگے رہتے تھے۔

سوویت دور کے مصنفین کا حصہ "رادوگا" اشاعت گھر کے پروگرام میں بھی کافی وسیع ہے اور اس میں میکسم گورکی کی کتابیں آگے آگے ہیں۔ گورکی کے عالمگیر شہرت کے ناول "ماں" کی بنیاد ۱۹۰۵ء کے پہلے روسی انقلاب کے حقیقی واقعات پر ہے۔ عالمی ادب کی تاریخ میں نہ تو کسی فن کارانہ تخلیق کو قارئین کی اتنی زبردست تعداد نصیب ہوئی اور نہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی قسمت پر اس کا اتنا زیادہ اور براہ راست اثر پڑا جتنا گورکی کی اس کتاب کا۔ اردو میں اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ گورکی کی ایک اور مقبول عام تصنیف ہے تین جلدوں کی آپ بیتی۔ پہلی کتاب کا نام ہے "بچپن" یہ اس لڑکے الکسیئی پیشکوف کی زندگی کی کہانی ہے جو بعد میں عظیم سوویت ادیب میکسم گورکی بنا۔ اپنے باپ کی موت کے بعد وہ اپنے بڑے دل نانا کے گھر آتا ہے۔ کتاب میں اس بچے کا دل دھڑکتا ہے جو اس کے سب سے زیادہ قریب تھی۔ رحمدل اور زندگی سے سرشار نانی کا دل اور ان کی "[illegible]" کہانیوں کی جادو بھری دنیا۔ اس ناول میں اس زمانے کے روس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ "بچپن" گورکی کی آپ بیتی کی پہلی جلد ہے۔ باقی دو میں: "زندگی کی شاہراہ پر" اور "منزل کی تلاش" ہر جلد بجائے خود ایک ناول ہے۔

اردو قارئین کا شاعری سے لگاؤ جانتے ہوئے ہم نے اس قسم کی کئی کتابیں شائع کی ہیں حالانکہ شاعری کا ترجمہ کرنا جیسا کہ سب کو معلوم ہے بہت ہی مشکل کام ہے۔ اس کام میں [illegible] انصاری، تقی حیدر اور نظر سلیم جیسے تجربہ کار مترجموں نے اپنا کمال نمایاں دکھا دیا۔ ان کی کوششوں کی ایک مثال

شاعرانہ مجموعہ "سرخ ہوا" نے معرّب ہے۔ یہ سوویت یونین کے انتہائی مختلف شاعروں کی منتخب نظموں اور شاعری تخلیقات کا مجموعہ ہے جو ساری سوویت جمہوریوں کی قومی زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ولادیمیر مایاکوفسکی، الکساندر بلوک، سرگئی یسینن اور بریس پاسترناک سے لے کر یوگینی یوتوشینکو، رسول حمزاتوف اور مرزا ترسون زادہ جیسے ہم عصر شاعروں تک بیسویں صدی کے سوویت شعراء اس مجموعے میں مختلف شعری اصناف کی بھی نمائندگی کرتے ہیں اور انفرادی شاعرانہ اسلوب کی بھی۔

ہم اپنے منصوبوں میں بچوں کی کتابوں کے لئے بھی کافی جگہ الاٹ کرتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں اس قسم کی کتابیں نستعلیق میں شائع ہونے لگی ہیں۔ ان میں کئی معلوماتی کتابیں شامل ہیں مثلاً کرلیوف کی کتاب "الاؤ سے ری ایکٹر تک" طیارے کیوں پرواز کر سکتے ہیں، کاریں اور گاڑیاں کیوں چل سکتی ہیں؟ ہمیں اپنے گھروں اور کارخانوں میں بجلی کی کس لئے ضرورت ہوتی ہے؟ روسی ادیب الکسئی کرلیوف ان اور دوسرے بہت سے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس کتاب میں رنگین تصویریں اور خاکے بھی ہیں یہ دکھانے کے لئے کہ مختلف آلات کی ساخت کیسے ہوتی ہے!

بچوں اور نوجوانوں کے لئے ایک اور دلچسپ کتاب ولادیمیر کرالینکو کا طویل افسانہ "نابینا موسیقار" ہے۔ یہ کرالینکو کی جنہوں نے ۱۹۲۱ء میں وفات پائی مقبول ترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک نابینا لڑکے کے بارے میں کہانی ہے جو بعد میں مشہور موسیقار بن گیا تھا۔ اس افسانے کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے اور اسی نے کرالینکو کو ساری دنیا میں شہرت عطا کی ہے۔ اکثر اس افسانے کا ذکر "فسانۂ مسرت" کہہ کر کیا جاتا ہے۔ انسان کی خوشی و مسرت کس بات میں ہے؟ اس کی جانب لے جانے والی سب سے صحیح، سب سے یقینی راہیں کون سی ہیں؟" افسانے کا ہیرو اپنے جداگانہ انداز میں اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ یہ روشن و دانا کتاب انسان سے محبت کا سبق دیتی ہے۔

ایک اور مقبول ادیب نکولائی نوسوف نے بچوں کے لئے ایک افسانوی دنیا کا تصور کیا ہے۔ جس میں ایک لڑکا رہتا ہے، نِجانوں۔ اس کی مہمیں صرف مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ بہت سبق آموز بھی ہیں۔ نِجانوں اپنے دوستوں کے ساتھ حیرت انگیز سیاحت کرتا ہے، غبارے میں پرواز کرتا ہے، تصویریں بنانا اور نظمیں لکھنا سیکھتا ہے، گیس سے چلنے والی موٹر کار پر سیر کرتا ہے، گانا اور ساز بجانا سیکھتا ہے۔

سوویت ماہر تعلیم سوخوملنسکی کو ادیب کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل ہے۔ بچوں کے لئے ان کی کہانیوں کا مجموعہ "کانا مچرا پڑ" بھی نستعلیق میں شائع کیا گیا ہے۔ سوخوملنسکی کی کہانیاں عام طور پر چھوٹی اور سادہ لیکن پُرمعنی ہیں۔ وہ بچوں کے بارے میں ادیب کے مکمل علم کا اظہار کرتی ہیں۔

لیوین اور رادلووا کی کتاب "ستاروں اور سیاروں کی دنیا تصویروں میں" بچوں کے لئے ایک معلوماتی کتاب ہے۔ اس میں سادہ اور سہل انداز میں بچوں کو ستاروں، سیاروں اور دوسرے فلکی اجسام کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ یہ کتاب رنگین تصویروں سے مزین ہے۔

قارئین کے لئے یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ پچھلے سال تک تاشقند میں "رادوگا" اشاعت گھر کی شاخ اردو میں بھی کتابیں شائع کرتی رہی۔ ان میں زیادہ تر کتابیں جدید دور کے ادیبوں کی تخلیقات ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مجموعہ پیش کیا جا سکتا ہے جس کا عنوان ہے "ممتاز سوویت افسانہ نگار"۔ اس مجموعے میں تیس برس (۱۹۲۰ء تا ۱۹۵۰ء) کے سوویت ادب کے ارتقاء کا اظہار ہوتا ہے، اس میں میکسم گورکی، الکسئی تالستائی اور میخائیل شولوخوف جیسے معروف نامور ادیبوں کی کہانیاں شامل ہیں۔ شاندار ادبی اسلوب کے مالک دوسرے نثر نگار اندرئی پلاتونوف، کنستانتین پاؤستوفسکی اور لیونید سوبولیف کی بھی کہانیاں پڑھ کر قاری کو متنوع سوویت تہذیب کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس مجموعے کا ہر افسانہ خواہ وہ قدرت سے متعلق پاؤستوفسکی کا مختصر افسانہ ہو خواہ ایک محنت کش سے متعلق پلاتونوف کا طویل افسانہ، اپنے اپنے انداز سے دلچسپ ہے اور قارئین کو متاثر کرے گا۔

ریاستی انعام یافتہ روسی ادیب بورس واسیلیف بہت سے ملکوں میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "سحر یہاں پُرسکون ہے ..." پانچ نوجوان سوویت لڑکیوں اور ایک سارجنٹ میجر کی شجاعت و بہادری کی داستان ہے جنہوں نے نازیوں کے خلاف جنگ میں اپنی زندگیاں قربان کیں لیکن پھر بھی ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

تاشقند سے اردو میں ایک اور شائع شدہ کتاب الکسئی تالستائی کا ناول "دوشیزۂ مریخ" ان کا ایک سائنسی خیالی ناول ہے۔ اس میں مریخ سیارے کی طرف جس پرواز کا تصور پیش کیا گیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم کی قوت کا آخری اور واحد مقصد نوعِ انسان کی بھلائی ہوتی ہے اور اس کے برعکس جہالت اور کم ظرف پستی بگاڑ اور بدی پیدا کر سکتی ہیں۔

تاشقند کی شاخ سے اردو میں کئی سوویت ریپبلکوں مثلاً ازبکستان، آذربائیجان اور آرمینیا کے ادیبوں کی تخلیقات شائع کی گئیں۔ پیریمقل قادروف نامور ازبک سوویت ادیب ہیں جن کا تاریخی ناول "ظہیر الدین بابر" ان کی عالیہ تصانیف میں سے ایک ہے۔ مصنف نے اس ناول میں ظہیر الدین محمد بابر کی متاثر کن شخصیت کی بڑے بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم

کتب خانہ رام پور

کتب خانہ رام پور

صبح صاحبزادہ عبدالصمد خاں صاحب چیف منسٹر ریاست رامپور کے مکان پر ملنے گیا تھا۔ بہت اخلاق سے پیش آئے اور جنرل ڈکسن صاحب مرحوم کا ذکر کرتے رہے۔ جو ان کے دوست تھے۔ میں نے کہا میں ۱۹۰۶ء میں جنرل ڈکسن کے ہمراہ رامپور آیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی نہیں آیا۔ جنرل ڈکسن مسلمان تھے اور میرے مرید تھے اور ہر سال دہلی میں لندن سے مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اور نظامیہ سلسلہ کے اذکار اور اشغال سیکھتے تھے۔ چیف منسٹر صاحب نے کہا۔ افسوس ہے کہ ان کی تجہیز و تکفین عیسائی طریقہ پر ہوئی۔ میں نے کہا دہلی میں وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنے انجام کا فکر ہے کہ میری بیوی بچی عیسائی ہے۔ مرنے کے بعد میری لاش عیسائیوں کے حوالے کردے گی اس واسطے عربی حروف میں میں نے کلمۂ توحید اپنی کلائی پر گدوا لیا ہے تاکہ مرنے کے بعد سب کو معلوم ہو جائے کہ میں مسلمان ہوں اور میری میت مسلمانوں کے حوالے کردی جائے تو میں نے جنرل ڈکسن سے کہا تھا کہ تم اس کی کچھ پروا نہ کرو چاہے تم کو عیسائیوں میں دفن کیا جائے اور چاہے ہندوؤں میں۔ مگر تم مرنے کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچ جاؤ گے۔ جن کی غلامی اور اطاعت کو تم نے اقرار کرلیا ہے۔

چیف منسٹر صاحب نے کہا۔ بے شک یہ ٹھیک ہے۔ جو جس سے محبت رکھتا ہے وہ اسی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ چیف منسٹر صاحب بڑے مستعد اور محنتی آدمی ہیں۔ نواب صاحب مرحوم کے زمانہ میں ریاست کو جتنی ترقیاں حاصل ہوئیں وہ سب انہی صاحب کی قابلیت اور محنت کا نتیجہ تھا۔

جس شخص نے رامپور کی اسلامی ریاست کو اپنی زندگی کا بہت زیادہ وقت خرچ کرکے ترقی دی اور برباد ہونے سے بچایا وہ خدا کے ہاں جاکر بھی اجر پائے گا اور دنیا میں بھی اس کی قدر کی جائے گی اور ہو تو وہ نواب صاحب بھی اپنی بیدار مغزی سے ایک ایسے بے مثل عالی وزیر کی قدر دانی کریں گے اور میں نے دیکھا کہ آج کل ہز ہائی نس نواب رضا علی خاں بہادر کوئی کام اپنے چیف منسٹر کی رائے لئے بغیر نہیں کرتے۔ اور میرے دل پر بہت اثر ہوا جب ہز ہائی نس نے چیف منسٹر کو چچا کہکر آواز دی اور چیف منسٹر ہاتھ جوڑ کر دوڑتے ہوئے ان کے سامنے آئے۔ آقا کو ایسا ہی برتاؤ زیبا تھا اور ماتحت کے لئے بھی ایسی ہی اطاعت اور ادب و تہذیب مناسب تھی۔

رامپور کا کتب خانہ تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ چیف منسٹر صاحب کی اجازت لے کر اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے اس کی خواہش کی تو چیف منسٹر صاحب نے فوراً اجازت نامے لکھ کر متعلقہ افسروں کو بھجوا دئے۔

کتب خانہ ایک عالیشان قلعہ کے اندر ہے جس میں مرحوم نواب صاحب نے بہت ہی خوبصورت اور بلند عمارتیں بنوائی ہیں۔ میں جب وہاں گیا تو ابر گھرا ہوا تھا۔ باغ کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ حامد منزل وغیرہ عمارتیں سناٹے میں کھڑی تھیں۔ جگہ جگہ بندوق اور سنگین کے پہرہ دار کھڑے تھے مگر وہ بھی خاموش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ابھی نواب صاحب مرحوم یہاں سے گئے ہیں اور ان کی جدائی کو ہر چیز محسوس کر رہی ہے۔

کتب خانہ میں داخل ہوا تو وہاں کے عملے نے بہت موزوں خیر مقدم کیا۔ شجاعت علی خاں صاحب نائب مہتمم کتب خانہ نے اپنے پاس لے جاکر بٹھایا اور فوراً تصوف کی کتابوں کی ایک بہت ضخیم فہرست منگا کر میرے سامنے رکھ دی۔

شجاعت علی خاں صاحب علی بہادر خاں کے عزیز ہیں۔ نوعمر ہیں اور اپنے فرائض میں بہت مستعد معلوم ہوتے۔ ان کو کتب خانہ کی ترقی کا ذاتی طور پر بھی شوق معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تصوف کی چند کتابیں فہرست سے چھانٹیں اور ان کو منگا کر دیکھا۔ پھر شجاعت علی خاں صاحب نے کتب خانہ کی چند نادر اور نایاب کتابیں منگا کر دکھائیں۔ ایک کتاب پر شاہجہاں بادشاہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت تھی۔ شاہجہاں

کا خط بہت اچھا تھا۔ اسی کتاب پر شاہجہاں کی لڑکی جہاں آرا بیگم کی تحریر بھی تھی جس کا خط کچا تھا۔ میں نے کہا تین سو برس پہلے بھی عورتوں کے خط ایسے ہی ہوتے تھے جیسے آج کل ہوتے ہیں۔ اس تحریر میں بھی جہاں آرا بیگم نے یہ لکھا ہے کہ میں چشتیہ خاندان میں مرید ہوں۔ جہاں آرا بیگم کی قبر میرے ہاں درگاہ میں ہے اور اس پر جہاں آرا بیگم کی لکھی ہوئی عبارت ایک لوح پر کندہ ہے اور وہ عبارت یہ ہے۔

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبرپوش غریباں ہمیں گیاہ بس است
الفقیرۃ الفانیہ جہاں آرا مرید خواجگان چشت
بنت شاہجہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ۔
سنہ ۱۰۹۲ ہجری۔

چنگیز خاں کی باتصویر تاریخ بھی دکھائی گئی۔ جو فارسی زبان میں ہے۔ مگر خط عربی ہے۔ اس کتاب میں تصویریں نہایت عمدہ ہیں اور ان تصویروں سے چنگیز خانیوں کی شکلیں اور لباس اور ان کی عورتوں کے لباس اور عجیب و غریب رسموں کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں اور سروں پر ٹوپیاں پہنتی تھیں اور ٹوپیوں کے اوپر کئی گچھوں کے پھندنے ہوتے تھے۔ جو کلغی کی طرح اوپر اٹھے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ انگریزی وضع کی چھجہ دار ٹوپیاں بھی اوڑھتے تھے اور بوٹ تو سب پہنتے تھے۔

ایک باتصویر دیوان حافظ بھی دکھایا گیا اس کی تصویریں ایسی عمدہ تھیں کہ میں نے ایسی نفیس قلمی تصویریں آجتک نہیں دیکھیں۔

شجاعت علی خاں صاحب نے کتب خانہ کے شیعہ سنی علماء سے بھی ملایا۔ جو ایک بڑی تاریخ کی تالیف میں مصروف ہیں اور چھ سات سال سے وہ تاریخ لکھی جا رہی ہے۔ ایک میں ہوں کہ ایک مہینہ میں ۴۰۰ صفحے کی سیرت نبوی لکھدی اور ایک یہ ہیں کہ ہلاراعلا چھ سات برس سے ایک کتاب لکھ رہا ہے۔ مگر محققانہ تاریخیں اس سے بھی زیادہ محنت اور وقت چاہتی ہیں۔ اور کم وقت میں جو کام کیا جائے وہ زیادہ مستند نہیں ہو سکتا۔

اس کتب خانہ میں جو بیس پچیس ہزار کتابیں ہیں جن میں نو ہزار قلمی اور نادر کتابیں بھی ہیں۔

شجاعت علی خاں صاحب کمال اخلاق سے قلعہ کے باہر تک پہنچانے آئے اور میں نے مہمان خانہ میں آکر یادداشت لکھی۔ پھر نواب صاحب باندہ سے باتیں کیں۔ اور اس کے بعد نواب صاحب کے محل خاص باغ میں گیا۔ وہاں چیف منسٹر اور پرائیویٹ سکریٹری اور نواب صاحب کے چھوٹے بھائی صاحب . . . . . سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ نواب صاحب لہارو کے عزیز خسرو مرزا صاحب بھی ملے۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ یہاں ٹھہرا۔ پھر سب سے رخصت ہو کر مہمان خانہ میں آیا۔ اور کھانا کھا کر ریل پر چلا آیا۔

مہمان خانوں کے کنٹرولر واجد علی صاحب بھی ملنے آئے تھے۔ بہت لائق اور منتظم عہدہ دار ہیں احمد حسین صاحب منصرم ریل تک پہنچانے آئے اور ساڑھے آٹھ بجے ٹرین میں سوار کر کے واپس گئے۔ جو گاڑی میری سواری میں تھی اس کے کوچبین شاہ نواز خاں بڑے کٹر تیرہ کے پٹھان ہیں۔ شیر کی سی صورت ہے اور ان کی باتیں بھی بہادر پٹھانوں کی سی ہوتی ہیں۔

مولانا سید محمد یحییٰ صاحب فرمانروا بھی آج لکھنؤ جا رہے ہیں۔ وہ یہاں پانچ دن ٹھہرے مگر نواب صاحب اس قدر کم فرصت اور ریاست کے انتظامات میں مصروف ہیں کہ ان کو ملاقات کا وقت نہیں دے سکے۔ اس لئے آج مولانا واپس جا رہے ہیں۔ کہتے تھے کہ نواب صاحب مرحوم نے ایک دفعہ ان کو بلایا تھا اور بہت سے علما کو جمع کر کے گفتگو کی تھی۔ مگر اس کے بعد میں پھر کبھی یہاں نہیں آیا۔

مرحوم نواب صاحب کی میت ایک صندوق میں بند کر کے امانت رکھدی گئی ہے۔ صندوق ایک کمرہ میں رکھا ہے اور اس کے دروازہ پر تیغہ لگا دیا گیا ہے۔ نجف اشرف میں مقبرہ تیار ہوا ہے میت وہاں بھیجی جائے گی۔

ساڑھے آٹھ بجے لکھنؤ سے ڈاک گاڑی آئی اور میں اس میں سوار ہو کر نو بجے مرادآباد پہنچا اور فوراً دہلی کی گاڑی میں سوار ہوا۔ جو دوسرے پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ دس بجے تک تاریخ اردو پڑھتا رہا۔ دس بجے کے بعد ٹرین روانہ ہوئی پھر سو گیا۔ صبح چار بجے دہلی پہنچا۔ ٹیلیفون سے گھر کی خیریت معلوم ہوئی۔ کرایہ کی موٹر میں دہلی سے گھر میں آیا۔ سڑک پر سید ابن عربی اور سید نثار علی اور بھولا اور مجی اور حمید روشنیاں لئے ہوئے کھڑے تھے۔ پہلے زنانہ میں گیا۔ خواجہ بانو بیدار تھیں۔ سب بچے سوتے تھے بورڈنگ ہاؤس میں آیا۔ غسل کر کے نماز پڑھی۔ پھر ڈاک پڑھنے بیٹھ گیا۔ پارہ آج ۸۰ درجہ پر تھا۔

فن کتابیات میں مسلمانوں کا حصہ

افضل حق قرشی - عمیرہ شاہ

مسلمانوں کی علمی تاریخ میں "کتابیات" کا آغاز علم و دانش کے آغاز و ارتقاء کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ بہت سے دوسرے علوم و فنون کی طرح "فن کتابیات" کا سرا بھی مسلمانوں کے سر ہے۔ جیوفرے روپر کے بقول:

"معاملے کو تاریخی نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اپنی تہذیب کے زریں عہد میں اس وقت عربوں اور خود مسلمانوں نے شمارياتی کتابیات پر خاص توجہ دی جب اہل یورپ اس کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں تھے۔"(۱)

عباسی عہد میں علوم کی کثرت تنوع سے اہل علم کتابیات کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ ذخائر علوم سے آگاہی ہو۔ علماء نے موضوعی اور خود نوشت کتابیات کا سلسلہ شروع کیا۔ وراقوں نے مختلف کتب خانوں کے ذخائر سے فائدہ اٹھا کر اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں کتابیات تیار کیں۔ یہ سلسلہ اتنا پھیلا کہ کتابیات کو فہرست، برنامج، ثبت، مشیخہ، معجم کے مختلف ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔

نویں، دسویں صدی عیسوی میں موضوعی کتابیات کی ترتیب و تدوین شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ جابر بن حیان (۷۳۷- ۸۱۳) کے نامور شاگرد خرقی کی تصانیف کی دو فہرستیں تھیں۔ ایک فہرست کبیر جو کیمیا گری اور دوسرے فنون سے متعلق تھی اور دوسری فہرست صغیر جو صرف علم کیمیا گری کی کتابوں کے بارے میں تھی۔(۲) حنین بن اسحاق۔ (۸۱۰- ۸۷۳) نے جالینوس کی کتابیات مرتب کی۔ اس میں جالینوس کی تصانیف کے مختلف تراجم کا ذکر تھا جو نویں صدی عیسوی تک موجود تھے۔(۳) حنین نے ۱۲۹ کتابوں کی فہرست دی ہے جن میں سے سو کے تراجم خود اس نے کئے۔ ابو بکر محمد بن زکریا رازی (۸۶۳- ۹۲۵) نے اس کتابیات پر استدراک "کتاب فی استدراک ما بقی کتب جالینوس مما لم یذکرہ حنین ولا جالینوس فی فہرست" کے نام سے لکھا۔(۴) ابو زکریا یحییٰ بن عدی (۸۹۳- ۹۷۳) ابن ندیم کا ہمعصر تھا۔ ابن ندیم کے بقول اسی عہد میں اقران و معاصرین کی علمی قیادت اس کے ہاتھ میں تھی۔(۵) اس

نے ایک کتابیات ... بن مرتب کی تھی۔ ابن ندیم نے اس سے استفادہ کیا اور اکثر اسکے حوالے دیئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ میں نے یہ چیز یحییٰ بن عدی کی فہرست کتب میں خود اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہے۔(۶) نیز یحییٰ بن عدی نے اپنی فہرست کتب میں ارسطو کی ان تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے۔(۷) ابو الحسن علی بن کوفی (م ۹۶۰) کی مرتبہ کتابیات کا ذکر بھی ابن ندیم کے ہاں ملتا ہے۔ مورخ ہشام کلبی کے تذکرہ میں ہے کہ میں یہاں اس کی تصنیفات اسی ترتیب سے بیان کروں گا جس طرح ابو الحسن بن کوفی کی تحریر میں ہیں۔(۸) نیز مدائنی کے تذکرہ میں ہے کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابو الحسن بن کوفی کی تحریر میں اس کی مندرجہ ذیل تصنیفات درج ہیں۔(۹) ابو ریحان البیرونی (۹۷۳۔ ۱۰۴۸) کی مرتب کردہ رازی کی کتابیات(۱۰) ابن رضوان (۹۹۸۔ ۱۰۶۱) کی مرتب کردہ جالینوس کی کتابیات(۱۱) اور ابن قیم (۱۲۹۲۔ ۱۳۵۰) کی مرتب کردہ ابن تیمیہ کی کتابیات(۱۲) بھی موضوعی کتابیات کی ذیل میں آتی ہیں۔

خود نوشت کتابیات کے ضمن میں جابر بن حیان (۷۳۷۔ ۸۱۳) اور ابو بکر محمد بن زکریا رازی (۸۶۴۔ ۹۳۵) کے حوالے ملتے ہیں۔ ابن ندیم نے ان سے استفادہ کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ جابر اپنی کتاب فہرست میں خود لکھتا ہے کہ ان کتابوں کے بعد میں نے تیس رسالے تصنیف کئے جو بے نام ہیں۔ پھر ان کے بعد میں نے چار مقالات تصنیف کئے۔(۱۳) نیز ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی تصانیف جو خود اسی کی فہرست سے منقول ہیں۔(۱۴) جابر بن حیان نے اپنی نگارشات کی دو فہرستیں مرتب کی تھیں۔ ایک بڑی جو فلسفیانہ اور کیمیائی تصنیفات کی اور دوسری چھوٹی جس میں اسکی کیمیائی تصنیفات درج تھیں۔ جابر کی کتابوں کی ایک تیسری فہرست بھی تھی۔(۱۵) ابن عارف اندلسی (م ۱۰۰۰) نے اپنی کتابوں کی کتابیات مرتب کی تھی۔(۱۶) ابن جوزی (۱۱۳۶۔ ۱۲۰۰) نے اپنی کتابوں کی فہرست مرتب کی۔(۱۷) سیوطی نے (۱۴۴۵۔ ۱۵۰۵) نے اپنی تصنیفات کی فہرست مرتب کی۔(۱۸) ابن طولون دمشقی (۱۴۷۳۔ ۱۵۴۶) نے اپنی نگارشات کی کتابیات مرتب کی۔(۱۹)

دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ابن ندیم (۹۳۵۔ ۹۹۰) نے الفہرست مرتب کی۔ اس نے اس عہد میں آنکھ کھولی جب اسلامی تہذیب اپنے اوج کمال پر پہنچ چکی تھی اور کتابوں کی کثرت کیوجہ سے کتب خانوں کا رواج بھی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے عہد کی کتابوں کا گہرا مطالعہ بھی کیا تھا اور اس عہد کے علماء اور فضلاء سے اسے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ اس کے اساتذہ کی فہرست میں الحسن بن سوار بن الخمار، ابو الفرج اصفہانی، ابو الحسن محمد بن یوسف الناقط، ابو اسحاق السیرانی، اسماعیل الصفار وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ

وہ دوسرے اصحاب علم سے بھی ملتا تھا اور ان کے کتب خانوں سے استفادہ بھی کرتا تھا۔ الفہرست اس کے وسیع علم و مطالعہ کا نچوڑ، اساتذہ سے استفادہ اور کتابی معلومات کا حاصل ہے۔ یہ کتاب دس مقالوں پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ کے تحت مختلف علوم و فنون کا ذکر ہے۔ مصنفین کا ذکر ترتیب زمانی سے کیا گیا ہے۔ پھر ان کی کتابوں کے نام تحریر کئے ہیں۔ اہم کتب کے بنیادی افکار و آراء کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے اصل مراجع و مصادر کی نشاندہی کی ہے۔ عموماً اہم علمی موضوعات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہر موضوع کی ابتداء میں ایک تمہید ہے، جس میں اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں اور ان کے مصنفین کے اعداد و شمار بھی موجود ہیں۔ الفہرست میں صرف کتابوں کے اعداد و شمار ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس میں کتابوں اور مصنفین کے متعلق نقد و بحث اور تحقیق بھی کی گئی ہے۔ الفہرست میں وہ تحریر کرتا ہے:

یہ عرب و عجم کی ان تمام کتابوں کی فہرست ہے جو عربی زبان اور اس کے رسم الخط پر مشتمل ہیں ---------- اس وقت سے معلومات فراہم کی گئیں جب سے وہ علوم عالم وجود میں آئے اور ہمارے زمانہ یعنی ۳۷۷ھ تک پائے جاتے ہیں۔ (۲۰)

ظاہر ہے کہ ان کا احاطہ کتابیات کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ خود ابن ندیم نے جابجا ان کا حوالہ بھی دیا ہے۔ لیکن الفہرست کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ "تمام" کا لفظ کثرت کتب کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد مصنفین کی مشہور متداول کتابوں کا تذکرہ ہے۔ فقیہ زعفرانی کے تذکرہ میں ہے:

"یہاں ہم زعفرانی کی روایت کردہ کتابوں کے نام لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیونکہ وہ بہت کم تعداد میں ہیں اور ان میں بیشتر دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں۔ اور بعد میں وہ قید تحریر میں نہیں لائی گئیں۔(۲۱)

منصوری کے تذکرہ میں ہے کہ وہ جلیل القدر اور عمدہ کتابوں کا مصنف ہے۔(۲۲)

الفہرست میں کتابوں کے ناموں کے اندراج میں کتاب کے معروف و غیر معروف دونوں نام نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مثلاً" مینہ بن خصال کی کتاب الامثال السائرة کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک جگہ میں نے اس کتاب کا نام "الابیات السائرة" لکھا ہوا دیکھا ہے۔(۲۳) سعید بن حمید کی کتاب "انتصاف العجم من العرب" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تسویہ کے نام سے معروف ہے۔ (۲۴)

مشتبہ مقام پر ماں باپ کی نسبت کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً" محمد بن حبیب کے متعلق لکھا ہے کہ حبیب ماں کا نام ہے۔(۲۵) اسماعیل بن علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ علیہ ماں کا نام ہے۔(۲۶)

مصنفین کے اسلوب تحریر کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں مثلاً" ہنائی کے بارے میں تحریر ہے کہ اس کی تصانیف میں سے ایک کتاب مجرد الغریب ہے جو انداز و اسلوب میں تو کتاب العین سے ہم آہنگ ہے لیکن ترتیب میں اس سے مختلف ہے۔(۲۷) کیمی کے بارے میں تحریر ہے کہ وہ اچھا مولف ہے(۲۸) مصنفین کے علمی مقام و مرتبہ پر بھی بات کی ہے۔ مثلاً" اصمعی کے بارے میں لکھا ہے کہ ہمارے شیخ ابو سعید نے ابوالعباس مبرد کی روایت بیان کی ہے کہ اصمعی شعر اور معانی میں سب پر برتری اور تفوق رکھتا تھا(۲۹)۔ مصنفین میں باہم فرق اور زیادہ مہارت کی بات بھی کی ہے۔ مثلاً" ابومخنف کے ضمن میں لکھا ہے کہ میں نے احمد بن حارث خزار کی ایسی تحریر پڑھی ہے کہ اہل علم کے نزدیک ابومخنف معاملات عراق' اس کے واقعات اور فتوحات کے بارے میں سب سے فائق ہے۔ مدائنی امور خراسان' ہند اور فارس میں' واقدی امور حجاز اور سیرت میں دوسروں کی نسبت زیادہ آگاہ ہیں۔ البتہ فتوحات شام کے واقعات و اطلاع کے بیان میں سب برابر کے شریک ہیں۔(۳۰) کوئی کتاب اگر کسی سے منسوب ہو تو اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً" فتح بن خاقان کی کتاب البستان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ فتح بن خاقان کی طرف منسوب ہے۔ مگر جو شخص اسے معرض تصنیف میں لایا اس کا نام محمد بن عبدربہ اور لقب راس البغل ہے۔ (۳۱) بعض مقامات پر کتاب کے مندرجات کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے۔ مثلاً" ابن ابی یعفور کی کتاب "ابواب الخلفاء" کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سے مقصود ان لوگوں کا ذکر ہے جن سے خلفاء مانوس تھے' جن سے مشورہ لیتے تھے اور جن سے فکری و عقلی راہنمائی حاصل کرتے تھے اور امداد و استواری کے طالب ہوتے تھے۔(۳۲) مشترک مصنفین کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مثلاً" بنو صباح کے تحت محمد' ابراہیم اور حسن تین علمائے نجوم اور ان کی تصانیف کا ذکر ہے۔ اس میں کتاب "برھان منحہ الاسطرلاب" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب محمد نے تصنیف کی جو ناتمام تھی۔ اسے ابراہیم نے مکمل کیا۔ اسی طرح کتاب "عمل نصف النہار بقیۃ واحدۃ بالہندسہ" کے بارے میں ہے کہ اس کی تصنیف کا آغاز محمد نے کیا اور تکمیل حسن نے کی۔(۳۳)

مختلف دواوین کے اشعار کی تعداد بھی بیان کی ہے۔(۳۴) جگہ جگہ کتابوں کے اوراق کی تعداد بتائی ہے۔(۳۵) ایک مقام پر وضاحت کی ہے کہ جہاں کہیں بغیر کسی نسبت کے ورق کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد "ورق سلیمانی" ہے جو بیس سطروں کو محیط ہوتا ہے' یعنی ہر ورق کے صفحہ میں بیس سطریں ہوتی ہیں۔ ہر جگہ اس بات سے ان اشعار کی کمی اور بیشی کا حساب لگایا جائے۔ یہ اندازہ اغلبیت اور تقریب پر مبنی ہے کیونکہ ہمارے برسوں کے تجربہ نے ہمیں یہی بتایا ہے۔(۳۶)

ابن ندیم نے کسی اہم کتاب کا نسخہ کہیں دیکھا تو اس کی تفصیل پیش کی مثلاً" زجاج نے معتضد کی خواہش پر بحرہ کی کتاب "جامع المنطق" کی شرح لکھی۔ اس کا ایک ہی نسخہ تھا جو معتضد کے کتب خانے میں تھا۔ ابن ندیم نے تحریر کیا ہے کہ سلطنت کی تباہی و بربادی کے بعد یہ شرح سلطان کے بقیات میں سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں دستیاب ہوئی۔ اس نے اسے دیکھا ہے۔ باریک و نرم طلحی کاغذ پر لکھی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے زجاج نے بڑی عظمت حاصل کی۔(۳۷)

ابن ندیم نے کتابوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ماخذ کی نشاندہی بھی کی ہے۔ چنانچہ جن کتابوں کو خود دیکھا' ان کے کاتبوں کے ناموں کی وضاحت کی ہے' جن علماء سے معلومات حاصل کیں ان کا حوالہ دیا ہے۔ اور دوسرے ذرائع مثلاً" کتابیات وغیرہ کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

ابن ندیم کی الفہرست کے بعد دوسری اہم کتابیاتی تالیف محمد بن الحسن بن علی ابو جعفر الطوسی (۹۹۵-۱۰۶۷) کی فہرست "کتب الشیعہ" ہے۔ وہ شیعہ مذہب کا عظیم مجتہد تھا اور شیخ الطائفہ یا صرف "الشیخ" کے لقب سے مشہور ہے۔

اس کی اساس ابن ندیم کی الفہرست پر ہے لیکن شیعہ مصنفین اور ان کی تصانیف کے بارے میں خاصے وقیع اضافے کئے ہیں۔ الفہرست اور فہرست کتب الشیعہ کے درمیان اور بھی بہت سی کتابیات مرتب کی گئیں۔ الطوسی اپنی فہرست کے دیباچے میں اس امر کا تذکرہ کرتا ہے۔ وہ تحریر کرتا ہے:

"مجھ سے پہلے میرے دوستوں نے فہرستیں مرتب کیں لیکن ایک مرتبہ ابوالحسن احمد بن الحسین الغضائری کے سوا سبھی ناقص تھیں۔ (۳۸) دوسری کتابیات میں ابن نہیک' احمد بن محمد' ابن بابویہ کی مرتب کردہ کتابیات شامل تھیں۔(۳۹)

فہرست میں طوسی نے ۸۹۳ قدیم اور معاصر مصنفین کی تصانیف کی فہرست دی ہے۔ اندراجات مصنفین کے ناموں کے تحت حروف تہجی کے اعتبار سے پہلے حرف تہجی کے تحت ترتیب دیئے گئے ہیں۔(۴۰)

طوسی کی فہرست کے بعد دوسری اہم کتابیاتی تالیف شیخ احمد بن علی النجاشی (م ۱۰۳۳) کی اسماء الرجال ہے۔ اس کا زمانہ تالیف بھی تقریباً وہی ہے جو الطوسی کی فہرست کا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ ایک مکمل کام ہے لیکن طوسی کی فہرست کے ساتھ تقابل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس کا نیا ایڈیشن ہے۔ یہ زیادہ مکمل اور صحیح ہے۔ اس میں ۱۲۳۶ مصنفین کا تذکرہ ہے۔

رشید الدین ابی جعفر محمد بن علی بن شہر اشوب السروی (۱۰۹۲ - ۱۱۹۲) کی کتاب معالم العلماء فی فہرست کتب الشیعہ و اسماء المصنفین" الطوسی کی فہرست کا نیا ایڈیشن ہے۔(۳۱) اسے مولف نے ۱۱۷۷- ۱۱۸۵ کے دوران مرتب کیا۔ اس نے ابتداء سے اپنے عہد تک کے علماء اور ان کی تصانیف کی فہرست دی ہے۔ اس میں الطوسی اور النجاشی کی فہرستوں پر زیادہ اضافہ نہیں۔ ماسوا ان مصنفین کی کتابوں کے جو الطوسی اور النجاشی سے چھوٹ گئے یا ان کے عہد کے بعد ہوئے۔(۳۲) •

منتجب الدین علی بن ابی القاسم القمی (۱۱۱۰- ۱۱۸۹) کی "اسماء مشائخ الشیعہ و مصنفیم" الطوسی کی فہرست کا ضمیمہ ہے۔ یہ ۱۱۷۷- ۱۱۹۶ کے دوران مرتب کی گئی۔ اس میں ۵۰۰ مصنفین کا تذکرہ ہے۔ جو یا تو الطوسی کے معاصر تھے یا متاخر اور جن کا ذکر فہرست کتب الشیعہ میں نہیں۔(۳۳)

ابو بکر محمد بن خیر بن عمر بن خلیفہ الاموی الاشبلی (۱۱۰۸- ۱۱۷۹) ماہر لسانیات اور محدث تھا۔ اس کی شہرت کا سبب وہ کتابیات ہے جو "فہرست مارواہ عن شیوخہ من الدواوین المصنفہ فی ضروب العلم و انواع المعارف" کے نام سے معروف ہے۔ یہ ہمارے کتابیاتی ورثے میں اہم کتب میں سے ہے۔ تقریباً" ان ۱۴۰۰ کتب پر مشتمل ہے جو اس نے اندلس کے مختلف مقامات پر اپنے اساتذہ سے پڑھیں یا جن کی انہوں نے اسے اجازت دی - تعارف کے بعد مصنف نے ان کتب کی فہرست دی ہے جو اس نے قرآنی علوم کے سلسلے میں پڑھیں۔ پھر حدیث، سیرو انساب، فقہ مالکی، صرف و نحو، لغت، ادب اور شاعری کی کتب کا بیان ہے اور آخر میں ان کتابیات کا تذکرہ ہے جو اس سے پہلے مرتب کی گئیں۔ وہ ہر مضمون میں اپنے اساتذہ کا ذکر کرتا ہے اور مختلف مقامات کے حوالے سے ان کی جماعت بندی کرتا ہے۔(۳۴)

مولف روایت کا اسلوب اپنائے ہوئے ہے۔(۳۵) یہ کتابیات ابن خیر کے عہد کے مسلم سپین میں پائی جانے والی اور پڑھائی جانے والی کتابوں کے سلسلے میں ایک اہم ترین دستاویز ہے۔(۳۶)

طاش کبری زادہ (۱۳۹۵- ۱۵۶۱) ابن حجر اور دیگر علمائے کبار کا معاصر تھا۔ اس کی تصنیف "مفتاح السعادۃ" و "مصباح السیادہ علوم اسلامیۃ" کی تاریخ و تصنیف کے سلسلے میں دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب قیمتی کتابیاتی معلومات کو سموئے ہوئے ہے۔ اس میں اہم مولفین اور تالیفات کا ذکر ہے۔ مصنف نے کتاب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول نظری طریقے کو حاصل کرنے کی کیفیت کی طرف رہنمائی پر مشتمل ہے۔ اس حصے

کے مباحث پانچ فصلوں میں تقسیم ہیں۔ فصل اول میں خطی علوم کا ذکر ہے۔ فصل دوم میں ان علوم کا ذکر ہے جو الفاظ سے متعلق ہیں اور اس ضمن میں تدوین شدہ کتابوں کا نام اسی فصل میں شاعروں مصنفوں ' عروضیوں ' نثر نگاروں ' لغت نویسوں ' نحویوں اور قاریوں کے حالات دیئے ہیں۔ علم تاریخ کا اسی فصل میں ذکر ہے۔ مورخین کے حالات اور ان کتابوں کا ذکر ہے۔ فصل سوم میں علم منطق ' علم آداب الدرس ' علم الجدل کا اور ان کے مصنفین کا ذکر ہے۔ فصل چہارم میں علوم حکمیہ ' علم الکلام ' طب و زراعت وغیرہ کا ذکر ہے اور ان دوائر میں مصنفین اور کتب کا ذکر ہے۔ فصل پنجم میں علم الاخلاق ' خانہ داری ' علوم شرعیہ مثلاً قرات' تفسیر' حدیث ' فقہ 'اصول فقہ اور ان کے علماء کے حالات اور تصانیف کا تذکرہ ہے۔ دوسرے حصے میں فصل ششم تزکیہ سے متعلق علوم کے بارے میں ہے۔(۴۷)

حاجی خلیفہ (۱۶۰۸۔ ۱۶۵۷) کی کشف الظنون عن اسماء الکتب و الفنون ' مفتاح السعادہ کا تکملہ اور ضمیمہ ہے۔(۴۸) اس نے اس کتاب کا مواد جمع کرنے کے لئے تقریباً بیس برس صرف کئے۔ یہ پندرہ ہزار سے زائد اندراجات پر مشتمل ہے۔ حاجی خلیفہ نے اندراج کے لئے مصنف کی بجائے عنوان کتاب کا استعمال کیا ہے۔ اندراجات کی ترتیب عربی حروف تہجی کے مطابق ہے۔ ہر کتاب سے متعلق وہ اس کے مصنف ' سال تصنیف 'کتاب کے حصوں اور ابواب کی تقسیم کا اصول اس کی مختلف شروح ' فرہنگوں اور تردیدات و تنقیدات کی تفصیلات اور کتاب کا موضوع بیان کرتا ہے۔اس نے ان تمام کتابوں کا جو اس نے دیکھیں پہلا جملہ لکھ دیا ہے۔ تاکہ کتابوں کے پہچاننے میں آسانی ہو۔ اس نے کشف الظنون میں ۹۵۰۰ سے زائد مصنفین اور ۳۰۰ سے زائد علوم و فنون کا احاطہ کیا ہے۔(۴۹) بعد کے لوگوں نے اس کے متعدد ضمیمے مرتب کئے۔ ان میں سے آخری اسماعیل پاشا بغدادی (م ۱۹۲۰) کی "ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون" ہے۔ اس نے تیس برس اس پر کام کیا اور انیس ہزار (۱۹۰۰۰) اندراجات مرتب کئے۔(۵۰)

ان کے علاوہ سید اعجاز حسین کنتوری (۱۸۲۵۔ ۱۸۷۰) کی "کشف الحجب و الاستار عن اسماء الکتب و الاسفار" محمد محسن المعروف آقا بزرگ الطہرانی و علی نقی منزوی کی الذریعہ الی تصانیف الشیعہ ' سید عبدالحی لکھنوی (۱۸۶۹۔ ۱۹۲۳) کی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ' عربی زبان میں مختلف علوم کے بارے میں فواد سیزگین کی جرمن کتابیات ' یوسف الیان سرکیس کی معجم المطبوعات العربیہ و المعربہ ' مصر سے السیل الشتانی ' ترکی سے محمد طاہر کی عثمانلی مولفری اور تورک ببلیو گرافیاسی ' ایران سے خان بابا مشار کی فہرست کتابہائی چاپی ایران ' پاکستان سے انجمن ترقی اردو پاکستان کی "قاموس الکتب" قابل ذکر ہیں ۔

حوالہ جات

۱۔ Geoffrey Roper, "The Bibliography of the Arab Middle East..." in Arabic Resources, ed. David Burnett (London: Mansell, 1987), 16.

۲۔ ابن ندیم، الفہرست (مصر المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، ۱۳۴۸ھ) ص ۵۰۰

۳۔ ایضاً ایضاً ص ۴۰۳

۴۔ ایضاً ایضاً ص ۴۱۷

۵۔ ایضاً ایضاً ص ۳۶۹

۶۔ ایضاً ایضاً ص ۴۵۲

۷۔ ایضاً ایضاً ص ۳۵۲

۸۔ ایضاً ایضاً ص ۱۴۰

۹۔ ایضاً ایضاً ص ۱۴۸

۱۰۔ Arab Islamic Bibliography, ed. Diana Grimwood-Jones, Derek Hopwood and J.D. Pearson (Sussex, England: Harvester Press, 1977), 5

۱۱۔ محمد تقی دانش پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانہ اہدای آقای سید محمد مشکوۃ بہ کتابخانہ دانشگاہ تہران، جلد سوم بخش دوم، (تہران دانشگاہ تہران ۱۳۳۲)

۱۲۔ پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانہ آقای سید محمد مشکوۃ، جلد سوم بخش سوم، (۱۳۳۵)۔

۱۳۔ ابن ندیم، الفہرست، ص ۲۵۷

۱۴۔ ایضاً ص ۲۹۹

۱۵۔ پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانہ آقای سید محمد مشکوۃ، جلد سوم بخش دوم

۱۶۔ ایضاً ایضاً جلد سوم، بخش دوم۔

۱۷۔ ایضاً ایضاً

۱۸۔ بروکلمان، "السیوطی" در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۱۔

۱۹۔ پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانہ آقای سید محمد مشکوۃ، جلد سوم، بخش دوم

۲۰۔ ابن ندیم، "الفہرست" ص ۲

۲۱۔ ایضاً ص ۲۹۷

۲۲۔ ایضاً ص ۳۰۶

۲۳۔ ایضاً ص ۴۲

۲۴۔ ایضاً ص ۱۶۹

۲۵۔ ایضاً ص ۱۵۵

۲۶۔ ابن ندیم، الفہرست ص ۳۱۷

۲۷۔ ایضاً ص ۱۳۴

۲۸۔ ایضاً ص ۱۲۵

۲۹۔ ایضاً ص ۸۲

۳۰۔ ایضاً ص ۱۳۷

۳۱۔ ایضاً ص ۱۶۹-۱۷۰

۳۲۔ ایضاً ص ۱۵۹

۳۳۔ ایضاً ص ۳۸۵

۳۴۔ ایضاً ص ۲۲۳-۲۴۲

۳۵۔ ایضاً ص ۱۳۲، ۱۵۷، ۱۶۷

۳۶۔ ایضاً ص ۲۲۷

۳۷۔ ایضاً ص ۹۰

۳۸۔ الطوسی، "فہرست الطوسی (کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۸۵۵ء) ص ۱-۲

۳۹۔ A. Sprenger, "Preface" in Fihris al Tusi (Calcutta: Asiatic Society, 1855), 1

۴۰۔ ایضاً ایضاً ص ۴

۴۱۔ عباس اقبال، "دیباچہ" در کتاب معالم العلماء، مولفہ ابن شہر آشوب (تہران ۱۳۲۳) ص ۵

۴۲۔ ایضاً ایضاً ص ۱۱

۴۳۔ ایضاً ایضاً ص ۴

۴۴۔ Encyclopaedia of Islam, New ed., S.V. "Ibn Khayr" by C.H. Pellat.

۴۵۔ محمد ماہر حمادہ، "المصادر العربیۃ والمعربۃ" (بیروت موسسۃ الرسالۃ، ۱۹۸۰ء) ص ۳۷

۴۶۔ Pellat "Ibn Khayr" op.cit.

۴۷۔ حمادہ، المصادر ص ۴۱-۴۲

۴۸۔ ایضاً ص ۴۰

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانہ آقای سید محمد مشکوۃ، جلد سوم، بخش اول

● ●

ضمیمہ ۲

بعض اہم تحریریں جو پیشِ نظر مجموعے کی ضخامت بڑھ جانے کے سبب نکالنی پڑیں کم سے کم ان کا ذکر تو کر ہی دیا جائے تاکہ اگر کسی کو ضرورت ہو تو ان حوالوں کے ذریعہ آسانی سے اپنے مأخذ تک پہنچ سکے۔ یہ درج ذیل ہیں۔

"المعارف" اشاریہ (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور)	مرتبہ: اختر النسار	اقبال	اکتوبر ۱۹۹۱ء
"الشریعہ" جلد ۳،۴ (اکتوبر ۹۱ء تا ستمبر ۹۳ء) کی مکمل فہرست۔		الشریعہ	ستمبر ۱۹۹۳ء
ہمارا ادب (کشمیر کلچرل اکیڈمی) سرینگر کا اشاریہ۔	عبدالمجید بٹ حاجنی	بازیافت	جلد ۹ شمارہ ۱۲، ۱۳/ ۱۹۹۲ء
خدا بخش لائبریری میں اردو رسائل پر خام مواد	شعائر اللہ خاں	اخبار اردو	فروری ۱۹۹۳ء
ساختیات یا ترکیبیت	حسین مجید (پٹنہ)	عصری آگہی	اگست۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء
دیباچہ غرۃ الکمال کی اصوات	قاضی جمال حسین	فکر و نظر	جنوری ۱۹۹۳ء
امیر خسرو اساطیر کے نرغے میں	رشید ملک	المعارف	مئی، جون ۱۹۹۳ء
خالق باری	گیان چند	ایوان اردو	اپریل ۱۹۹۳ء
مولانا سید سلیمان اشرف صاحب	شبیر احمد نوری/سید نور محمد قادری	اقبال	〃 ۱۹۹۲ء
رشید احمد صدیقی مرحوم کا مضمون: بیچے کا سید	رشید احمد صدیقی	افکار	〃 ۱۹۹۲ء
عمل تحقیق کی قاضی عبدالودودی روایت	محمد محسن	زبان و ادب	۱۸ (۱-۲)
قاضی عبدالستار کا افسانہ آنکھیں	قاضی عبدالستار	آفتاب (خصوصی شمارہ)	۱۹۶۰ء--۱۹۸۰ء
ایک پاکستانی القدس میں (سفر نامہ)	محمد مہربان اعوان	اردو ڈائجسٹ	اپریل ۱۹۹۳ء
دانشور، نقاد فراق گورکھپوری	جمیل جالبی	نقوش (شمارہ ۱۴۰)	نومبر و دسمبر ۱۹۹۲ء

شکاگو سے شکاگو (سفرنامہ)	مظفر الدین فاروقی	آگہی	ستمبر ۱۹۹۲ء
شیشہ (افسانہ)	" "	تحریر	جون ۱۹۹۱ء
رتھ (")	" "	"	جنوری ۱۹۹۳ء
لال گنبد کا پتھر (افسانہ)	" "	"	جون، جولائی ۱۹۹۳ء
مذہب کون؟	" "	... ...	... ...
خواجہ احمد عباس کا افسانہ: سردار جی	خواجہ احمد عباس	روشن خیال (۴)	
آقائے ہاشمی کے عجائب خواب (فارسی افسانہ)	محسن دلاادی (ترجمہ) نیر مسعود	نیا دور (لکھنؤ)	جنوری ۱۹۹۳ء
مکتوباتِ شیخ الاسلام کا ایک مطالعہ	عتیق الرحمٰن سنبھلی	الفرقان	جنوری فروری ۱۹۹۳ء
پطرس بخاری کا مضمون، قلم کا وسیلۂ اظہار	احمد سلطان	قومی زبان (آندھرا)	مئی، جون ۱۹۹۳ء
مولانا آزاد کا الہلال اور نئی روشنی	سیدہ سیدین	اسلام اور عصر جدید	اکتوبر ۱۹۹۲ء ۲۴/۴
رئیس المترجمین حنین بن اسحاق	علی عبداللہ الدفاع	آیات	ستمبر۔ دسمبر ۱۹۹۲ء
ابن نفیس۔ حیات و خدمات	عبدالعلی	"	جنوری۔ اپریل ۱۹۹۳ء
ابن الہیثم۔ عظیم ماہر بصریات	احمد مرسی	"	مئی۔ اگست ۱۹۹۳ء
عرب جہاں راں اور انجم شناسی	حسن صالح شہاب	"	" " "
اسپین میں عربی علوم کے تراجم	سعد عبداللہ البشری	"	" " "
ترجمۃ التسویۃ بین الافادہ والقبول	محمد عبدالسلام	فکر و نظر (علیگڑھ)	جنوری ۱۹۹۳ء
حضرت امام مالکؒ اور ان کے فقہی اصول	احسان اللہ فہد فلاحی	اسلام اور عصر جدید	اپریل ۱۹۹۲ء
روزہ اور اس کی حکمتیں	اسحاق بھٹی	المعارف	فروری، مارچ ۱۹۹۲ء
مسلم پرسنل لا میں مداخلت	... ...	دین دنیا	مارچ ۱۹۹۳ء
خاندانی منصوبہ بندی پر ایک نظر	رشید احمد جالندھری	المعارف (لاہور)	فروری، مارچ ۱۹۹۳ء
جدید حیاتیاتی علوم اور اسلام	محمد آفتاب شیخ	المعارف	" " "
قائد اعظم اور سیکولر سیاست	سبط حسن	روشن خیال	۳/۸

سر ظفر اللہ نے قائد اعظم کو کافر سمجھ کر ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔	قمر الحسنین	نقیب ختم نبوت	مئی ۱۹۹۳ء
ایمان اور عقلیت کے درمیان تعلق	پال بیدھم / سید جمال الدین	اسلام اور عصر جدید	اپریل ۱۹۹۲ء
یہ سیہ وقتی فروغ شب تلک کی بات ہے (ایودھیا)	راحت سعید	ذہن جدید	جون۔ اگست ۱۹۹۳ء
تشخص کا بحران	عالم خوندمیری	المعارف	جنوری ۱۹۹۳ء
تعلیمی بوجھ بچوں کا عہد طفولیت چھین رہا ہے	ایم۔ اے۔ سراج	آموزگار	مئی۔ جون ۱۹۹۳ء
سرکاری درسی کتابوں میں ترجمات کا خلاصہ	حبیب اللہ افغی	رفیق منزل	مارچ ۱۹۹۳ء
ترجمان القرآن: قرآن مجید کی ایک اچھوتی اور منفرد تفسیر	عالم خوندمیری	المعارف	خصوصی شمارہ ۹ اور ۱۰
فن سیر و مغازی: ایک تعارف	قاضی اطہر مبارکپوری	الحق	جنوری۔ فروری ۱۹۹۳ء
مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا	علی مظفر نواب	زبان و ادب	۱۸(۳-۴)، ۱۹۹۱(۱-۳)
ہندوستان کا ایک جدید غزل گو: ظفر گورکھپوری	رؤف امیر	فنون	ستمبر۔ دسمبر ۱۹۹۲ء
امیر شکیب ارسلان	سید احتشام الدین ندوی	الحق	جنوری۔ فروری ۱۹۹۳ء
بے پور کے دو قدیم رسائل	ڈاکٹر فیروز احمد	نخلستان	اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۲ء
راجستھان میں تحقیق: دانش گاہوں سے باہر	پروفیسر نثار احمد فاروقی	نخلستان	اپریل۔ جون ۱۹۹۳ء
خوشامدی ادب: کیوں اور کیسے؟	محمد حسن	عصری ادب	اپریل ۱۹۹۳ء
ڈم ڈم کروٹی: شخصیت اور فن	فاروق بخشی	نخلستان	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۲ء
محمد حسن: اپنے بارے میں	محمد حسن	عصری ادب	اپریل ۱۹۹۳ء
کلام اقبال کی بازیافت	اکبر حیدری کاشمیری	شیرازہ (کشمیر)	جلد ۲۹/۳،۵

اقبال پر اہم مضامین جو مجموعے کی ضخامت بڑھ جانے کے سبب ضمیمہ نمبر ۱ میں نہ آسکے۔

علامہ اقبال اور خطائے الہام	مرزا محمد منور	اقبال	اکتوبر ۱۹۹۱ء
اقبال اور خانصاحب منشی سراج الدین احمد (میر منشی)۔ (۱)	کلیم اختر	"	" "
علامہ محمد اسد اور علامہ محمد اقبال	" "	"	اکتوبر ۱۹۹۲ء تا جنوری ۱۹۹۳ء
اقبال اور میاں محمد شاہنواز	افضل حق قریشی	"	اپریل ۱۹۹۳ء
اقبال کا نادر و نایاب کلام	پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری	شیرازہ	۵/۳/۲۵
کلام اقبال کی بازیافت۔ ایک حیرت انگیز دریافت	" "	اکادمی	جنوری۔ جون ۱۹۹۳ء
علامہ محمد اقبال اور خان صاحب میر خورشید احمد	کلیم اختر	اقبال	جولائی ۱۹۹۳ء
علامہ اقبال اور عرشی (۱)	محمد اقبال شاہد	دانش (۳۳)	ستمبر ۱۹۹۳ء
تیموری مغل عہد کے شعراء اور اقبال	فرخ جلالی	اقبال	اکتوبر ۱۹۹۲ء تا جنوری ۱۹۹۳ء
علامہ محمد اقبال اور خواجہ محمد شجاع ناموس	ڈاکٹر رحیم بخش شاہین	"	" "
سید نور محمد قادری اور اقبالیات	سید محمد عبداللہ قادری	"	" "
زمیندار کالج گجرات میں اقبال شناسی	ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری	"	" "
بحلہ شاہین میں مندرج مضامین			
اشاریۂ اقبالیات امروز (زمانی اعتبار سے)	تسلیم احمد تصور	"	" "
تشابہات اقبال	محمد منصور عالم	شب خون	جنوری، فروری ۱۹۹۳ء
علامہ اقبال کا خطبۂ لاہور (آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور، ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء)	مترجم: پروفیسر محمد جہانگیر عالم	اقبال	اکتوبر ۱۹۹۱ء
سر محمد اقبال کا خطبۂ صدارت (بجلاس آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد، دسمبر ۱۹۳۰ء)	مترجم: سید نذیر نیازی	"	" "
اقبال، قائد اعظم اور کشمیر	ترجمہ: محمد سہیل	المعارف	اپریل ۱۹۹۳ء
فکر اقبال میں شخصیت، تقدیر اور وقت	عالم خوندمیری	"	مئی، جون ۱۹۹۳ء
خدا رحمت کند: اقبال و آزاد کجا این تفاوت رہ	سید حسن احمد	فکر و نظر (علیگڑھ)	

ضمیمہ-۳

"اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں"

مکمل فہرست

فہرست

رسالے جو تاخیر سے شائع ہوتے ہیں

ضمیمہ-۱

ضمیمہ ۔ ۲

تصحیحات

اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں

صفحہ / کالم / سطر	
چار / ۱ / ۱۵	حریم (لکھنؤ)
چار / ۱ / ۱۶	حیات نو (مبریا گنج، اعظم گڑھ)
چار / ۲ / ۱۰	راہ اسلام (دہلی)
پانچ / ۲ / ۶	نقوش حیات (گھروی بازار، بستی)
پانچ / ۰ / ۱۶	ضیاء (سر ضیاءالدین ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۱۸
پانچ / ۲ / ۱۷	عصری آگہی (دہلی)، ۲۱۹
پانچ / ۳ / ۱۸	علی گڑھ میگزین (علیگڑھ)، ۲۲۱
پانچ / ۳ / ۹ ۱۹۴ / ۳ / ۱	فصیل (کرناٹک)، ۲۲۳
پانچ / ۳ / ۱۰ ۱۹۴ / ۳ / ۲	فکر و تحقیق (دہلی)، ۲۲۴
پانچ / ۳ / ۱۱ ۱۹۴ / ۳ / ۳	فن اور شخصیت (بمبئی)، ۲۲۵
پانچ / ۳ / ۱۲ ۱۹۴ / ۳ / ۴	قومی زبان (آندھرا پردیش)، ۲۲۷
پانچ / ۳ / ۱۳ ۱۹۴ / ۳ / ۵	کاوش (لاہور)، ۲۲۸
پانچ / ۳ / ۱۴ ۱۹۴ / ۳ / ۶	محسن (محسن الملک ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۲۹
پانچ / ۳ / ۵ ۱۹۴ / ۴ / ۱	معیار تحقیق (ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ)، ۲۳۱
پانچ / ۳ / ۳ ۱۹۴ / ۴ / ۲	نیا دور (کراچی)، ۲۳۶
پانچ / ۳ / ۶ ۱۹۴ / ۴ / ۳	وقار (وقار الملک ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۴۳

مراسلات

ڈاکٹر عطا خورشید

خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۷۸-۸۰ کے بارے میں

نواب رحمت اللہ خاں شروانی صاحب کے ہاں خدا بخش لائبریری جرنل ۸۰-۷۸ نظر سے گذرا۔ مطالعہ کے لیے ان سے ایک شب کے لیے عاریۃً مانگ لایا۔ مطالعہ کے بعد چند باتیں ذہن میں آئیں جسے ایڈیٹر ہونے کے ناطے آپ کے گوش گذار کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آئندہ شماروں میں اس کی خوبیاں تو برقرار رہیں لیکن خامیوں کا اعادہ نہ ہو۔

(۱) ڈاکٹر متین احمد صبا کا مقالہ "مثنوی حالنامہ/گوی وچوگاں" محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ لیکن چند باتیں غور طلب ہیں۔ عنوان (ہاف ٹائٹل) میں عارفی ہروی کی وفات کا سنہ ۹۵۰ھ لکھا گیا ہے جو کہ نسخہ کے کاتب میر علی کا سال وفات ہے۔ اندر آپ نے بھی نوٹ میں عارفی ہروی کا سال وفات ۹۵۰ھ لکھا ہے۔ جبکہ خود آپ نے اسی صفحہ پر قبلاً ۸۵۳ھ ہی لکھا ہے۔

کسی نسخہ کو ایڈٹ کرنے کے وقت اس کے تمام نسخوں کے متعلق ساری معلومات یکجا کر لینی چاہیے۔ نیز جہاں تک ممکن ہو سکے ان تمام نسخوں کی بازیافت کی بھی کوشش کرنی چاہیے اور پھر تمام نسخوں کی روشنی میں متن کی تدوین کرنی چاہیے۔ مثنوی گوی وچوگاں کی ترتیب میں صرف خدا بخش کے دو نسخوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ جبکہ اس کے نسخے مختلف جگہوں پر بھی ملتے ہیں نیز میر علی الکاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نہایت ہی خوبصورت نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی موجود ہے اور کوئی بعید نہیں کہ یہ نسخہ نسخۂ خدا بخش سے قدیم تر ہو (اس نسخے پر سنہ کتابت موجود ہے جبکہ نسخۂ خدا بخش پر

موجود نہیں) لہٰذا اس نسخے کو بھی ترتیب کے وقت مدنظر رکھنا چاہئے تھا۔ اس سے ایک نئی بات یہ بھی سامنے آتی کہ کیا ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے دو نسخوں میں بھی اختلافات نسخ ملتے ہیں یا نہیں، اور اگر صرف نسخۂ خدابخش کو ہی متعارف کرانا مقصود تھا تو اس کا عنوان رکھنا چاہئے تھا۔ "مثنوی حالنامہ / گوی و چوگان، نسخۂ خدابخش۔"

ص ۱۵۰ پر جامی کی تصنیف "بہارستان" سے ایک عبارت نقل کی ہے اور فٹ نوٹ کا نمبر بھی دیا ہے لیکن فٹ نوٹ میں وہ حوالہ موجود نہیں، غالباً کتابت میں چھوٹ گیا اور پروف ریڈر صاحب نے بھی اس پر دھیان نہیں دیا۔

ص ۱۵۰ پر ہی علی شیر نوائی کے حوالے سے مولانا عارفی کی مماثلت سلمان سے دکھائی گئی ہے۔ چونکہ علی شیر نوائی کی عبارت نقل نہ کرکے مقالہ نگار موصوف نے اس کا مفہوم درج کیا ہے اور اپنے الفاظ میں تحریر کیا ہے اس لئے مولانا عارفی کے لیے احترام کے الفاظ استعمال کرنا چاہئے تھا جیسا کہ اس سے قبل اور مضمون کے بقیہ حصوں میں کیا ہے۔ "عارفی ... مماثل تھا ... مبتلا تھا۔" یہ جملے طبیعت پر گراں گذرتے ہیں۔ پروف ریڈر کو بھی جملوں میں تھوڑا بہت اصلاح کا اختیار رہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ اختیارات استعمال کرلینا چاہئے۔

مقالہ نگار موصوف نے اس مثنوی کے تعارف میں اسے "فارسی میں مناظرہ گوئی کی روایت اور اس کے ارتقا کی تاریخ میں ایک اہم کڑی۔" (ص ۱۴۷) بتایا ہے لیکن مناظرہ گوئی والی بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ پوری مثنوی پڑھ لینے کے بعد بھی کہیں بھی اس میں مناظرہ گوئی نظر نہیں آتی ہے۔ مقالہ نگار موصوف کے نزدیک مناظرہ سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت ضروری تھی۔

(۲) جناب زاہد منیر عامر نے "دیوان میر سوز" کے نسخۂ کراچی کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔ لیکن ایک بات کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جہاں دو سنین کے اواخر اور اوائل کا ذکر ہو وہاں اس کی مطابقت عیسوی یا دوسرے سنین سے نہیں کرنا چاہئے ورنہ مفہوم خبط ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ ص ۱۸۵ پر "۱۷۶۱-۶۲ کے اواخر یا ۱۷۶۲-۶۳ کا آغاز" سے مفہوم واضح نہیں ہو پاتا۔ یہاں صرف ہجری سنہ ہی کافی تھا۔

ص ۱۸۷ کی سطر ۲ پر نسخہ کا سائز ساڑھے اکیس اور ساڑھے پندرہ سم (سینٹی میٹر) بتایا گیا ہے جسے کاتب نے ۲۱.۵×۱۵.۵ لکھا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اردو ہندسوں کے مطابق یہ کچھ کا کچھ ہوگیا۔ اردو ہندسوں کے ساتھ اردو اعشاریہ استعمال کرنا چاہئے۔ اس کی ہدایت کاتبوں اور پروف ریڈرز کو دی جائے ورنہ انگریزی اعشاریہ اردو میں صفر کا ہمشکل مانا جائے گا۔

(۳) "دیوان ہاشم" کے تعارف میں ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے نسخۂ ڈھاکا کا سنہ کتابت ۱۰۸۳ھ بتایا ہے اور اسکی

جیساکہ اس نسخہ پر لگی ایک مہر کے سنہ پر رکھی ہے۔ کسی نسخہ پر ثبت مہر کی تاریخ سے نسخہ کے ACCURATE سنہ کتابت کا پتا نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ مہریں ایک بار کسی سنہ میں بن جایا کرتی تھیں اور وہ برسوں چلا کرتی تھیں۔ ہر سال کی الگ الگ مہریں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ لہٰذا اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ سنہ کتابت سے قبل کی مہریں بھی ثبت ہوا کرتی تھیں۔ اسی لیے کلیم سہسرامی صاحب کا یہ استخراج کہ چونکہ مہر ۱۰۸۳ھ کی ہے اس لیے کتابت بھی ۱۰۸۳ھ کی ہوگی، صحیح نہیں ہے۔

(۴) ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری صاحب کا مرتبہ فکر و نظر کا اشاریہ بھی آپ نے اس شمارے میں شائع کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ مستقل یہ سلسلہ شروع کرتے اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے اساتذہ نے M.Phil کی ڈگری کے لیے طالبعلموں سے اشاریے تیار کرانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، آپ ان میں معیاری اشاریوں کو بھی اپنے جرنل میں شائع کرتے۔

اردو میں اشاریہ سازی کی اہمیت و افادیت کو ابھی تک نہیں سمجھا گیا ہے۔ اسے لوگ بیکار کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ریسرچ اسکالرز کے لیے اہم REFERENCE TOOL کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے اہمیت نہ دینے کی بنیادی وجہ ہے اشاریہ سازوں کی تن آسانی، جس کے تحت صرف مشتملات کو ابجدی ترتیب سے نقل کر دینا ہی اشاریہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اشاریہ، اشاریہ ہی کیا جس میں ریسرچ اسکالرز کو اپنے مطلوبہ مواد کے لیے مکمل اشاریے کو دیکھنا پڑے۔ اشاریہ دراصل اشارے کو کہتے ہیں کہ ہلکے سے اشارے سے ریسرچ اسکالر اپنے مطلوبہ مواد تک بغیر وقت صرف کیے پہونچ جائے اور اسے ایک ہی جگہ سارا مواد مل جائے۔ اگر اپنے مواد کے لیے اسے مکمل اشاریہ دیکھنا پڑے تو اشاریہ کا مقصد ہی فوت ہوگیا۔

اشاریوں میں اس طرح کی بنیادی غلطیوں کی موجودگی کی وجہ صرف یہ ہے کہ اردو میں اب تک اس کے اصول منضبط نہیں کیے گئے ہیں۔ ہر اشاریہ ساز اپنی راہ خود بنا کر اس پر چل پڑتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے اس کے اصول بنائے جائیں۔ اس کے لئے خدابخش لائبریری ہی قدم اٹھا سکتی ہے۔ اشاریہ، ببلیوگرافی وغیرہ پر ایک چھوٹی سی نشست بشکل سمینار کر لی جائے تو مناسب ہوگا۔

ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری کے مرتبہ اشاریے کا اشاریہ ادارہ کی طرف سے تیار کرا کر شامل کیا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ تشنگی دور کرنے کی بجائے خود تشنگی کا شکار ہوگیا۔ غالباً اس اشاریہ کو جرنل کی ابتدا میں رکھنے کا ارادہ ہوگا اس لیے اشاریے کا اشاریہ بھی صفحہ نمبر ۱ کے حساب سے بنایا گیا لیکن بعد میں اسے درمیانی حصہ میں شامل کیا گیا، لیکن اشاریے کے نمبر اپنی ہی جگہ رہ گئے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اب اس سے کسی طرح کی کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

بعد میں نظر ڈالنے پر پتا چلا کہ اشاریہ کا علیحدہ سے ایک صفحہ نمبر ہر صفحہ کے نچلے حصّے میں ڈالا گیا ہے جو غالباً بعد میں ڈالا گیا ہوگا۔ اس سے آسان صورت یہ تھی کہ اشاریہ کے اشاریے میں پہلے کے صفحہ نمبر کو مٹا کر تسلسل والے صفحہ نمبر کی کتابت کرا دی جاتی کیونکہ قاری کی نظر میں وہی نمبر ہوتے ہیں جو تسلسل کے ساتھ پورے شمارے میں ہر صفحہ پر اوپر میں ڈالے جاتے ہیں۔ اوپر نیچے دو، دو صفحہ نمبر ڈال کر اسے کمپلیکیٹڈ اشاریہ کو مزید کمپلیکیٹیڈ بنا دیا گیا۔

فاضل اشاریہ ساز نے اسے توضیحی اشاریہ بتایا ہے، لیکن وضاحت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے اشاریہ میں وضاحت لازمی ہے لیکن یہ وضاحت ایک، دو یا زیادہ سے زیادہ تین جملوں پر مشتمل ہونا چاہئے۔ جو عنوانات وضاحت طلب ہیں، فاضل اشاریہ ساز نے وہاں تو وضاحت نہیں دی ہے لیکن بعض جگہوں پر بلا ضرورت وضاحت پیش کی ہے اور وہ بھی اتنی طویل کہ وہ اشاریہ کے مزاج سے میل نہیں کھاتی ہے۔ مثلاً "دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے" (ص ۳۰۴)۔ "مشینی دماغ اردو کی خدمت میں" (ص ۳۰۵)۔ "ماضی تمام کے تین صیغے" (ص ۳۰۵)۔ "سماج اور شعر" (ص ۳۰۶)۔ "گونڈوانا لینڈ" (ص ۳۰۷) وغیرہ وضاحت طلب مضامین میں کوئی وضاحت نہیں جبکہ "جسٹس سید محمود" (ص ۳۲۴) "حاجی اسمٰعیل اور چند غیر معروف رفقا" (ص ۳۲۵) "حکیم احمد شجاع" (ص ۳۳۵) "خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں" (ص ۳۳۶)۔ "خلیفہ عبدالحکیم" (ص ۳۳۶)۔ "خواجہ منظور حسین" (ص ۳۳۷) "ڈاکٹر سید محمود" (ص ۳۳۷) وغیرہ جیسے مضامین میں اول تو وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر وضاحت دی تھی تو اتنی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سلسلے کی دوسری بات یہ کہ وضاحت کا کیا معیار قائم کیا گیا ہے اس کا پتا نہیں چلتا ہے۔ کہیں معروف شخصیت کے ساتھ بھی وضاحت ہے جہاں کوئی ضرورت نہیں تھی اور کہیں کسی غیر معروف شخصیت کے ساتھ وضاحت نہیں جبکہ اس کی ضرورت ہے۔

اب آیئے اشاریے کے موضوعات کی طرف۔ پہلا موضوع ہی آنکھوں کو کھٹکتا ہے کیونکہ یہ موضوع بھی ہے اور غالباً عنوان بھی۔ ہر عنوان کو اس کے موضوع کے تحت رکھنا چاہئے۔ لہٰذا اس "افتتاحیہ" کو بھی اس کے موضوع میں رکھنا چاہیے تھا۔ افتتاحیہ کوئی موضوع نہیں ہوتا ہے اور غالباً ادارہ نے بھی اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اشاریے کے اشاریے میں یہ شامل نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اسے کاٹ کر نکال دینا چاہیے تھا۔

ص ۳۰۴ پر "نفسیاتی افسانہ" جسے "افسانہ" موضوع کے تحت رکھا گیا ہے موضوع سے یہ پتا نہیں چل پاتا ہے کہ آیا یہ کوئی افسانہ ہے یا افسانہ پر تنقید؟ اسی طرح ص ۳۰۹ پر "انگریزی ڈراما" کے تحت دو عنوانات ہیں۔ "ابسن کا گڑیا گھر — ایک مطالعہ" اور "بندھن"۔ اول الذکر ایک ڈرامے پر تنقید ہے، اور

ثانی الذکر غالباً ایک انگریزی ڈراما ہے لیکن موضوع (انگریزی ڈراما) سے اس فرق کا پتا نہیں چلتا ہے۔ اس کا موضوع انگریزی ڈراما کی جگہ "انگریزی ادب" ہونا چاہیے تھا۔ نیز اشاریہ سازوں کے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہیے کہ اگر ایک موضوع پر کافی عنوانات ہوں تب تو ان کی تقسیم در تقسیم کرتے جائیں لیکن اگر عنوانات کم ہوں تو انھیں بنیادی موضوع کے تحت ہی رکھنا چاہیے۔

اشاریہ سازی میں موضوعات کی تقسیم ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ پورے مضمون یا مقالے کو پڑھ کر اس کا مناسب موضوع منتخب کرنا بہت ہی دماغ سوزی کا کام ہے۔ اکثر ایک عنوان کئی کئی موضوعات پر محتوی ہوتا ہے۔ ایسے مضامین کو ان تمام موضوعات کے تحت رکھنا چاہیے۔ نیز ہر موضوع کے اندر عنوانات کی ترتیب بھی موضوعاتی ہونا چاہیے۔ مثلاً ص ۲۳۲ کا نمبر ۵۷۹ "بابائے اردو مولوی عبدالحق" اور ص ۳۴۲ کا نمبر ۱۰۰۷ "مولوی عبدالحق" ان تینوں مضامین کو ایک جگہ ہونا چاہیے لیکن ابجدی ترتیب کے سبب اول الذکر دونوں حرف ب کے تحت اور ثانی الذکر حرف م کے تحت رکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح ص ۳۳۳ کا نمبر ۱۲۹۱ "پروفیسر رشید احمد صدیقی" اور ص ۳۴۴ کا نمبر ۱۳۲۱ "ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی، کچھ اپنے خیالات" اول الذکر کو حرف پ کے تحت اور ثانی الذکر کو حرف ت کے تحت رکھا گیا ہے، اسی طرح منظر عباس نقوی کا مضمون "رشید صاحب کا اسلوب" اردو ادب۔ تاریخ و تنقید کے ذیل میں رکھا گیا ہے حالانکہ اسے بھی رشید صاحب کے تذکرے کے ذیل میں محولہ بالا مضامین کے ساتھ ہی رکھنا چاہیے تھا۔ عربی ادب کے تحت ص ۲۱۸ پر نمبر ۲۱، ۲۲ (نہج البلاغہ) اور اسلامیات کے تحت ص ۳۰۸ پر نمبر ۸ کے "حکمت و دانش (نہج البلاغہ کی روشنی میں)" ان تینوں کو بھی ایک ہی جگہ ہونا چاہیے۔ یہ اشاریہ موضوعات کے ساتھ ساتھ عنوانات میں بھی شتر گربگی کا شکار ہے جس کی اصلاح طباعت سے قبل ضروری تھی۔

اشاریہ ساز عموماً تذکرہ کے ذیل میں صرف انھیں مضامین کو شمار کرتے ہیں جن میں صاحبِ تذکرہ کے صرف حالاتِ زندگی ہوتے ہیں کہ کہاں اور کب پیدا ہوئے، کہاں تعلیم پائی، کہاں پرورش پائی، کہاں اور کب مرے۔ یہ غلط فہمی عام طور سے ہے اور پیشِ نظر اشاریہ کے مرتب موصوف بھی اس غلط فہمی کے شکار ہیں۔ حالانکہ تذکرے کو اتنا محدود کر دینا صاحبِ تذکرہ کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ اس کے تحت وہ سارے مضامین آئیں گے جن میں صاحبِ تذکرہ کے حالات کے علاوہ ان کے کارنامے، ان کے خیالات، ان کے افکار، ان کے واقعات، ان کی تنقید، ان پر کی گئی تنقیدیں، غرض مختلف النوع قسم کے وہ سارے موضوعات جن کا تعلق اس شخص سے براہِ راست یا بلاواسطہ ہو، تذکرہ کے ذیل میں آئیں گے۔ مثلاً فکر و نظر کے اشاریہ ساز موصوف نے اردو شاعری کے تحت انیس، ناسخ

وغیرہ پر لکھے گئے مضامین کو جمع کیا ہے۔ حالانکہ ان مضامین کو ان کے تذکرے کے تحت ہونا چاہیے تھا۔ "کتابیات" کے تحت مرتب موصوف کا ہی ایک مضمون (اشاریہ) نقش ذاکر کے نام سے ہے جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی تصانیف کی وضاحتی فہرست پیش کی گئی ہے اور دوسرا مضمون "ڈاکٹر ذاکر حسین" کے عنوان سے تذکرہ کے ذیل میں ص ۲۳۷ پر موجود ہے۔ ان ہر دو مضامین کو تذکرہ کے ذیل میں اور ایک ہی جگہ ہونا چاہیے۔ موضوعات کو جتنا سمیٹ سکیں اتنا بہتر ہے۔ ہر مضمون کو ایک نیا موضوع دینا بھونڈا پن ہے۔ اور اگر "کتابیات" موضوع ہی رکھنا تھا تو "علم کتابخانہ" ص ۳۱۸ موضوع کے ذیل میں احتشام بن حسن کا مرتبہ "اشاریہ فکر و نظر" کو بھی "کتابیات" کے ہی ذیل میں رکھنا چاہیے۔

الغرض یہ کہ فکر و نظر کے اس اشاریہ کو شائع کرنے سے قبل اس پر ایک بھرپور تنقیدی نظر ڈال لی جاتی تاکہ موضوعات کے ساتھ ساتھ عنوانات کی شتر گربگی بھی دور ہو جاتی۔ موضوعات کی شتر گربگی دور کرنے کے لیے ادارہ کی طرف سے تو ایک فہرست دی گئی لیکن وہ خود خامیوں کا شکار ہو گئی اور زیادہ کارآمد نہ ہو سکی۔ حالانکہ اس فہرست کی جگہ اگر اشاریہ کی کتابت اسی فہرست کے مطابق کرائی جاتی تو یہ شتر گربگی نہ رہتی یا اگر کتابت ہو چکی تھی تب بھی ہر موضوع کو اس کے مضامین کے ساتھ کاٹ کر ادارہ کی فہرست کے مطابق چسپاں کر لیا جاتا تو کچھ بہتر صورت نکل آتی۔ خدابخش لائبریری جرنل جیسے معیاری رسالے میں اس طرح کی چیزیں طبیعت پر گراں گذرتی ہیں۔

(۵) مراسلات (مراسلہ؟ ص ۳۴۵) کے تحت جو بھی مراسلے شائع کیے گئے ہیں، انکا عنوان قائم کیا گیا ہے — "خدابخش لائبریری جرنل ۶۹-۴، کے بارے میں۔" لیکن صرف پہلا مراسلہ ہی جرنل - ۶۹-۴، کے بارے میں ہے۔ بقیہ مراسلات کا موضوع دیگر ہے۔ قاری عنوان دیکھ کر تمام مراسلات کا موضوع جرنل ۶۹-۴، ہی سمجھتا ہے۔ یہ شتر گربگی ادارہ کی ہے۔ اس ضمن میں ایک استفسار کی اجازت چاہوں گا کہ عبدالرؤف خاں کا مراسلہ جو کہ جرنل ۶۹-۴، کے متعلق ہے اسے مراسلات کے ذیل میں رکھا گیا ہے لیکن عارف نوشاہی کا مراسلہ جو اسی موضوع سے متعلق ہے، اسے مضمون کی شکل دے دی گئی۔ یہ تفریق کیوں؟

(۶) چلتے چلتے ایک دو باتیں مزید عرض کر دوں کہ کاتب اور پروف ریڈر ہر دو کو اس بات کی ہدایت کر دی جائے کہ سن کی جگہ سنہ، معرعہ کی جگہ مصراع یا مصرع، لئے، دئے، کئے کی جگہ لیے، دیے، کیے اور ڈرامہ کی جگہ ڈراما لکھا کریں۔ نیز پروف ریڈرس کو اس بات کا اختیار رہتا ہے کہ مضمون نگار کے جملوں کی بے ربطی کو مختصر سی ترمیم و تنسیخ کے ساتھ دور کر دے۔ مضمون نگار کی بے ربط تحریروں کو من و عن کتابت کرا دینا مناسب نہیں۔

(۷) اب ایک نظر کتابت کی غلطیوں کی طرف جو اگرچہ بہت کم ہیں لیکن خدابخش لائبریری جرنل جیسے معیاری

رسالے میں اتنی غلطیاں بھی راہ پا جائیں تو مناسب نہیں۔

ص ۲۱۰	س ۱۰	ترجیح (غلط)	ترجیع (صحیح)
ص ۲۲۱	س ۵	حالی (غلط)	خلیل (صحیح)
ص ۲۴۴	س ۴	جوامع الکلام (غلط)	جوامع الکلم (صحیح)
ص ۲۴۳	س ۱۷	ثمرۃ الفاسفہ (غلط)	ثمرۃ الفلاسفہ (صحیح)

(۹) ... یہ بات اور یاد آگئی کہ خدا بخش لائبریری جرنل کا مقالات شائع کرنے اور ایڈیٹنگ کرنے کیلئے ایک اصول ہونا چاہئے۔ اس میں جرنل کو مقالہ نگار کی نہیں بلکہ مقالہ نگار کو جرنل کے اصولوں کی پیروی کرنی چاہئے یا ہر صفحہ کا فٹ نوٹ اسی صفحہ پر کتابت کرائی جائے۔ یہ مناسب نہیں کہ ایک ہی شمارے میں کسی مقالے کا فٹ نوٹ اسکے آخر میں اور کسی مقالے میں ہر صفحے پر۔ ایسا پیش نظر شمارے میں ہے اور اس شتر گربگی کا الزام ادارہ کے سر جاتا ہے۔

●●

جناب فرخ جلالی

علی گڑھ

خدا بخش جرنل نمبر ۸۴ مل گیا۔

آپ نے نوٹ شایع کیا اچھا کیا۔ میرے پاس حضرت مظہر جان جاناں کے حالات جمع ہیں مگر اس وقت دستیاب نہیں۔ ایک نوٹ کسی کتبہ کے سلسلہ میں نوٹ کیا تھا۔ حوالہ کا دوسرا کاغذ اِدھر اُدھر ہوگیا اس میں ایک شجرہ ہے جو درج ذیل ہے۔ اس وقت یونہی لکھتا ہوں۔

جوھر علی خاں قاقشال

نواب مرزا مراد خاں از اولاد محمد بن حنیفہ (علوی)

امیر مرزا کمال الدین

خواجہ رستم شاہ

امیر محمد

امیر غلام محمد

بابا خاں قاقشال
شاہ بابا سلطان
مرزا محمد امان
مرزا عبد السبحان (رشتہ میں اکبر کا نواسا)
میرزا جان (میر حبیب اللہ)
شمس الدین مظہر جانجاناں خلیفہ نور محمد بداونی نقشبندی متوفی دہلی
مزار بازار چتلی قبر

مجنوں خاں قاقشال (عہد اکبر میں ایک بغاوت کی)
جباری خاں
محمد جمشید
محمد بہاری اتی (صاحب عقول عشرہ و تاریخ محفل مفصل)

●●

hero of the Musslamans and Mahatma Gandhi a living idol of the masses.

But it is none the less his personal triumph and a testimony to his authentic mission that he stands approved and confirmed by his countrymen not merely as an ambassador, but as an embodied symbol of the Hindu-Muslem Unity.

Who can foretell the secrets of to-morrow ? Who foresee the hidden forces that some-times work to build our destiny higher than our dream ? Perchance it is written in the book of the future that he whose fair ambition it is to become the Muslim Gokhale may in some glorious and terrible crisis of our national struggle pass into immortality as the Mazzini of the Indian Liberation.

HYDERABAD, DECCAN. Sarojini Naidu

survey of Mohomed Ali Jinnah's work were both untimely and unfair to a man in the very prime of life and on the threshold of his public achievement.

A casual pen might surely find it easier to describe his limitations than to define his virtues. His are none of the versatile talents that make so many of his contemporaries justly famed beyond the accepted circle of their daily labours. Not his the gracious gifts of mellow scholarship, or rich adventure or radiant conversation; not his the burning passion of philanthropy or religious reform. Indeed by his sequestered tastes and temperament Mohomed Ali Jinnah is essentially a solitary man with a large political following but few intimate friendships, and outside the twin spheres of law and politics he has few resources and few accomplishments.

But the true criterion of his greatness lies not in the range and variety of his knowledge and experience but in the faultless perception and flawless refinement of his subtle mind and spirit; not in a diversity of aims and the challenge of a towering personality but rather in a lofty singleness and sincerity of purpose and the lasting charm of a character animated by a brave conception of duty and an austere and lovely code of private honour and public integrity.

The tale of his actual contribution is still comparatively slender. But it is not by the substance but by the rare significance of his patriotic service that he holds to-day his unique place in the front rank of our national leaders.

Like others of our generation, he suffers from a system of education so widely separated from the familiar traditions and culture of our race, and lacking the magic of a common medium, he may never perhaps hope to establish between himself and his people that instinctive and inviolable kinship that makes the interned Mohomed Ali for instance, a living



The Ambassador of Unity.

a magnetic presence, an impressive delivery, and a voice which while lacking volume has an arresting timbre. But though occasionally he has attained a moment of wholly unconscious and stirring eloquence, he has the cogent force of a brilliant advocate rather than the glowing fervour of a brilliant orator. And it is not on a public platform, but at a round table conference that he finds full scope for his unusual powers of persuasion, luminous exposition, searching argument and impeccable judgement. It is an open secret that his was a large and responsible share in the recent discussions regarding the Muslim University as well as the anxious deliberations of the joint Congress League Committee that sat at Lucknow last year to formulate a scheme of Indian reforms elaborated from the Memorandum of the Nineteen.

There was, it must be admitted, a growing surprise and reproach in the minds of his followers that so ardent an apostle of Indian Self-Government should hold aloof from the recently organised Home Rule movement which was rousing the country like a clarion call to freedom. It may have been partly due to a lingering sense of allegiance to a school of politics in which he had been trained, but whose timid and stationary doctrines he had long since outgrown or it may have been due to the habitual caution of a nature slow to commit itself to new and far-reaching responsibilities. However, the news of Mrs. Besant's internment last June, which evoked such unparalleled demonstrations throughout India, moved Mohomed Ali Jinnah to a prompt and militant chivalry in defence of the immutable laws of justice and liberty so rashly and so ruthlessly assailed. He immediately joined the Bombay Home Rule League not merely as a member, but undertook, as its president, the delicate task of guiding its fortunes and guarding its interests through that troubled period of its indignant activities.

* * * * *

VI

To attempt at this stage more than a brief general

entered in a body to greet and bless their comrades of the Muslim League.

The new year dawned cloudless for this valiant fighter of national battles, bringing him some of the highest awards of his professional and public career. He added much lustre to his forensic reputation by his masterly conduct of two sensational law-suits that aroused deep interest throughout the country, connected respectively with Mr. Horniman, the trusted friend, and Mr. Tilak, the beloved tribune of the Indian people.

In the autumn he was once more elected by the Mussalmans of his province to the Viceregal Council where he commands unanimous respect and esteem by his personal dignity of character and his fearless and vigilant championship of Indian rights and demands.

Towards the close of 1916 Mohomed Ali Jinnah was twice called upon to make a public declaration of his political creed, as President of the Bombay Provincial Conference held at Ahmedabad in October, and two months later, as President of the All-India Muslim League at Lucknow.

Both his Gujrat address, in which he indicated a tentative system of administrative reforms partly based on Gokhale's scheme, since published, and in his Lucknow pronouncement where he so firmly and clearly defined the place and purpose of Muslim India in the national regeneration he proved the remarkable breadth and boldness of his statesmanship, his consummate grasp of both the transitional phases and the abiding principles of political evolution, and his incorruptible faith in the vision of a free and federated India claiming hershonoured place and making her matchless contribution in the mighty republic of world-nations and civilisations.

As a speaker Mohomed Ali Jinnah has the triple assets of

uary 1915 brought Hindus and Mussalmans close together in a bond of common loss and sorrow. It was keenly felt that the time was now ripe for a more direct and definite *rapprochement* between the two great communities that had so recently exchanged such cordial expressions of goodwill and fellowship from afar.

The Indian National Congress was to hold its sittings that year in Bombay and there could be no better centre of reconciliation than this cosmopolitan capital of India.

Mohomed Ali Jinnah, supported at that time by all the leading local Mussalmans, sent an invitation to the All-India Muslim League to hold its next annual sessions in Bombay during the national week in December.

The story of that invitation and its startling sequel is too well-known to be retold in all the details of its shameful and subterranean intrigue so carefully conceived, so cleverly manipulated. Sufficient to say that in an hour of such grave and bitter crisis, calculated to shatter the master-dream of Indian nationalism this dauntless soldier of unity rose to the heights of an invincible patriotism. With a proud and splendid indifference, to all personal suffering and sacrifice heedless alike of official dissuasion or disfavour, the aggressive malice and machinations of his opponents or even the temporary injustice of distant friends, Mohomed Ali Jinnah strove with an incomparable devotion and courage to create that supreme moment in our national history which witnessed the birth of a new India, redeemed and victorious in the love of her united children.

Seldom has the pageant of Time unrolled a scene so touching, so thrilling, so magnificent with drama and destiny as was enacted on the afternoon of the 30th December 1915, when amidst the tears and appaluse of a gathered multitude the veteran heroes of the National Congress

unnecessary and unaccountable set of new rules and restrictions hindering their admission into educational centres hitherto so hospitable and so easy of access.

On the eve of his departure for India in the autumn of 1913 at the express desire of his friends Messrs Mohomed Ali and Syed Wazir Hassan then in England Mohomed Ali Jinnah formally enrolled himself as a member of the All-India Muslim League to whose expanded outlook he had already contributed so signally by his example. Typical of his exquisite if somewhat exigent sense of honour is it to find that even so simple an incident partook of something like a sacrament. His two sponsors were required to make a solemn preliminary covenant that loyalty to the Muslim League and the Muslim interest would in no way and at no time imply even the shadow of disloyalty to the larger national cause to which his life was dedicated.

In May 1914 he returned to England as a member of the All-India Congress Deputation concerning the proposed reform of the India Council. He had already in this connection moved resolutions both at the Karachi sessions of the Congress a few months earlier and at the Agra sessions of the Muslim League.

In a country where the personal element forms so integral a part of public success, it was no small compliment to Mohomed Ali Jinnah's social as well as mental qualities that he was chosen to be the spokesman of articulate India before the representatives of the British Parliament and the British public. The leading English journals published numerous interviews and his concise and lucid statement of the Indian case which appeared in the London "Times" attracted widespread attention and comment.

• • • • •

V

The tragic death of Gopal Krishna Gokhale in Febr-

the later Council meeting, where being specially requested to speak, he gave his informal and invaluable support to Clause D of the new Constitution which materially embodies the Congress ideal of

"Attainment under the aegis of the British Crown of a system of Self-Government suitable to India through constitutional means, by bringing about, amongst others, a steady reform of the existing system of administration, by promoting national unity, by fostering public spirit among the people of India, and by co-operating with other communities for the said purpose."

* * * * *

IV

The year 1913 stands out as a distinct landmark in my friend's inner life. Not only did a wider measure of public recognition wake in him a deeper sense of personal responsibility, but one or two new and sympathetic influences brought an intimate touch of warmth and colour into his somewhat lonely and impersonal existence.

About the middle of April, he proceeded to Europe in search of a long idle holiday with Gokhale for fellow traveller, and the Arabian stars and Egyptian waters keep record, doubtless of their mutual hopes and dreams for the country of their devoted service.

Once in England, however, there was no rest for this tireless worker. He was at once drawn into the tangled web of the Indian student-world whose cause he espoused with such assiduous zeal and understanding. Within a few weeks of his arrival he founded the London Indian Association which forms so excellent a focus for the otherwise scattered energies and activities of young India in a foreign land; and it was mainly at his instance that a committee was appointed by the India Office to inquire into the legitimate grievances of Indian students suffering so keenly from an

weary details.

* * * * *

III

Meanwhile the Time-spirit, so busy altering world-values and world-visions, had been secretly at work, and the heart of Muslim India, always passionately faithful to its own spiritual traditions, became suddenly and vividly aware also of its own political inheritance and its own responsibility in shaping the national future.

The All-India Muslim League, started a few years previously at Dacca to voice current Mussalman opinion and aspiration, was found to be too narrow and too nebulous in its scope and aims for this intense and growing national consciousness. And about the middle of 1912 a Conference of Muslim Leaders met at Calcutta to consider the remodelling of its constitution on more progressive and patriotic lines. It was decided to send Mr. Syed Wazir Hassan, the indefatigable Honorary Secretary of the League, on an extensive tour to ascertain the views of Muslims in every province regarding so momentous a change of policy and perspective. And in the following December a special council meeting of the association was called, presided over by His Highness the Agha Khan to discuss the draft of an entirely new constitution, which was ultimately and enthusiastically adopted at the memorable sessions of the All-India Muslim League held at Lucknow on the 22nd March 1913—a date that inaugurates a new era in the political history of Muslim India.

Mohomed Ali Jinnah, pledged to the greater national welfare, had with characteristic independence and honesty kept apart from a movement till then so frankly and exclusively sectarian in its purpose. But by an act of courtesy which was in itself a graceful acknowledgement of his merits he was invited to attend the Calcutta Conference, and also



The Ambassador of Unity.

his name into such prominence. Interesting too, and suggestive in view of succeeding events, is it to find this future leader fo the Mussalmans present as a sort of "cross bencher" at the Conference of Hindu and Muslim leaders convened at Allahabad in 1910, under Sir William Wedderburn's benign direction to consider a somewhat premature and artificial *entente cordiale* between the two communities still so sharply divided by a gulf of mutual dislike and distrust.

In the autumn of 1910 he was elected by the Mussalamans of the Bombay Presidency as their representative to the Supreme Legislative Council, and though the question, naturally arises as to how far it was consistent with the avowed principles of so staunch a nationalist to represent a purely sectarian interest—the fact nevertheless remains that Mohomed Ali Jinnah invariably lent his willing support to every liberal measure involving the larger national issues like Gokhale's Elementary Education Bill, for instance, and Mr. Basu's Special Marriage Bill, to which conservative India as a whole was so violently opposed. His only original work, however, during this period was in connection with the Wakf Validating Bill, to introduce which he was specially nominated for an extra term in 1913 by Lord Hardinge, then Viceroy. His admirable skill and tact in piloting through such an intricate and controversial measure—the first instance of a Bill passing into legislation on the motion of a private member—won him not only the appreciation of his colleagues but also his first meed of general recognition from his co-religionists all over India, who while still regarding him a little outside the orthodox pale of Islam were so soon to seek his advice and guidance in their political affairs.

On his return from the Imperial Council in March, he gave his evidence before the Public Services Commission then sitting in Bomaby—a refreshing page in a vast mass of

the London Indian Society, and the guardian angel of young India in England. Who can exaggerate the value of such a noble inspiration in moulding the soul of a disciple so reverent and responsive ?

On his return to India in 1896 Mohomed Ali Jinnah found his family involved in heavy financial ruin; and this favourite of fortune, suddenly faced with unexpected poverty, set out to conquer the world equipped with nothing but the charmed missiles of his youth, his courage and his ambition.

After three years of severe hardship, his brave and buoyant patience bore fruit. Through the kind offices of an old friend he was granted permission to read in the Chambers of Mr. Macpherson, then acting Advocate-General of Bombay,—a courteous concession, the first of its kind ever extended to an Indian which its recipient still remember as a beacon of hope in the dark distress of his early struggles.

Occasional briefs now began to dribble in, and the obscure young lawyer needing only an opportunity soon proved his real mettle and started to lay the foundation of his notable legal success.

In 1906 when I met him in Calcutta at the historic Sessions of the National Congress where Dadabhai Naoroji first enunciated the glorious ideal of Self-Government for India, Mohomed Ali Jinnah, for the moment acting as private secretary to his old master, was already accounted a rising lawyer and a coming politician. For, true to his early teaching, and fired no doubt by the virile patriotism of men like the late Mr. Badruddin Tyabji and the lion-hearted Pherozeshah Mehta he had long since joined the ranks of the National Congress and regularly attended its annual gatherings. Incidentally it is interesting to note that his maiden speech at this National Assembly was made in connection with the Wakf-i-ala-aulad—a measure that was later to bring

Never was there a nature whose outer qualities provided so complete an antithesis of its inner worth. Tall and stately, but thin to the point of emaciation, languid and luxurious of habit, Mohomed Ali Jinnah's attenuated form is the deceptive sheathe of a spirit of exceptional vitality and endurance. Some-what formal and fastidious, and a little aloof and imperious of manner, the calm hauteur of his accustomed reserve but masks for those who know him, a naive and eager humanity, an intuition quick and tender as a woman's, a humour gay and winning as a child's—Pre-eminently rational and practical, discreet and dispassionate in his estimate and acceptance of life, the obvious sanity and serenity of his worldly wisdom effectually disguise a shy and splendid idealism which is of the very essence of the man.

• • • • •

II

Hindu by race and Muslim by religion—it may not be wholly idle to fancy something a little symbolic in the Khoja parentage of a child destined to become "an Ambassador of the Hindu-Muslim Unity".

Mohomed Ali Jinnah was born on the 25th December 1876—(there is no reliable record of the actual year)—the eldest son of a rich merchant of Karachi. Reared in careless affluence and adored by his family, he might so easily have grown into an indolent and ignorant boyhood. But he fortunately loved his studies and received his early education at the Madrassah and afterwards at the Mission School of his native city. In 1892 he was sent to England—"a tall thin boy in a funny long yellow coat,"—is an amusing description of him. There he joined Lincoln's Inn, studied law and was in due course called to the bar. It seems a pity that so fine an intelligence should have denied itself the hall-mark of a university training. But he had, instead, what from an Indian standpoint was the golden privilege of close association with the great Dadabhai Naoroji, then President of

MOHOMED ALI JINNAH

AN AMBASSADOR OF UNITY.

A PEN PORTRAIT.

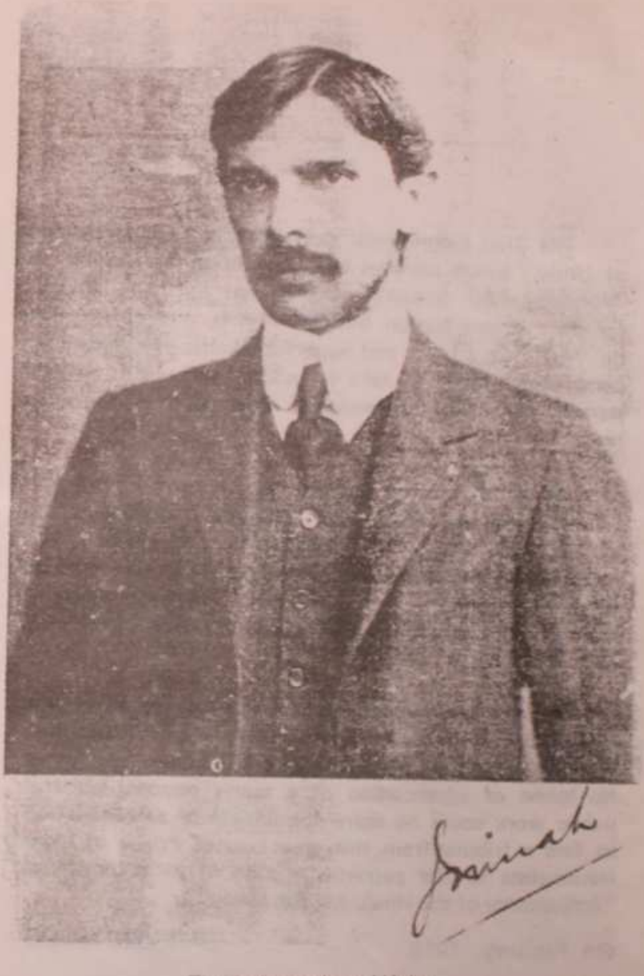
"It is my ambition to become the Muslim Gokhale," confessed Mohomed Ali Jinnah in a priceless moment of self-revelation.

In the light of this avowal it is interesting to recall Gokhale's own prediction about his gifted comrade in the service of India.

"He has true stuff in him," he said, *"and that freedom from all sectarian prejudice which will make him the best ambassador of the Hindu-Muslim Unity".*

These words, generous as they sound, are no more than a just tribute to a distinguished patriot who has so swiftly and so securely won his acknowledged place in the forefront of the national movement.

Few figures of the Indian Renaissance are so striking or so significant; to a student of psychology none more singularly attractive by the paradox of a rare and complex temperament, of strange limitations and subtle possibilities, that hides the secret of its own greatness like a pearl within a shell.



The Ambassador of Unity.

NOTE

The Brief biographical study entitled "An Ambassador of Unity" which prefaces this volume of the Hon'ble Mr. Mohomed Ali Jinnah's speeches was originally intended for the "Indian Nation Builders" series, and claims to be no more than a hasty and imperfect sketch of a remarkable personality, meant to take its place in that little national portrait gallery of impressionist drawings of distinguished men.

My cordial thanks are due to the many friends who have afforded me their ready assistance in retrieving from scattered sources, these valuable speeches, which, now collected for the first time, cannot fail to arouse profound and vivid interest in the minds of all who are concerned with the vital issues of contemporary political events and activities in India.

To my illustrious compatriot the Raja Saheb of Mahmudabad I am deeply indebted for the admirable and characteristic Foreword which he has so kindly contributed. No token of appreciation of a man's personal worth or public work could be more appropriate or auspicious than so fine a tribute from this great-hearted Prince of Indian Nationalists to the patriotic mission of an acknowledged "Ambassador of the Hindu-Muslim Unity"....

6th February, 1918. SAROJINI NAIDU

Mohammad Ali Jinnah

Sarojini Naidu

CONTENTS

1993

Price Rs.75/-

Printed by Liberty Art Press (Proprieters Maktaba Jamia Ltd.) 1528 Pataudi House, Daryaganj, New Delhi and published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna.

KHUDA BAKHSH LIBRARY JOURNAL

90-92

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

KHUDA BAKHSH LIBRARY JOURNAL

90-92

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna